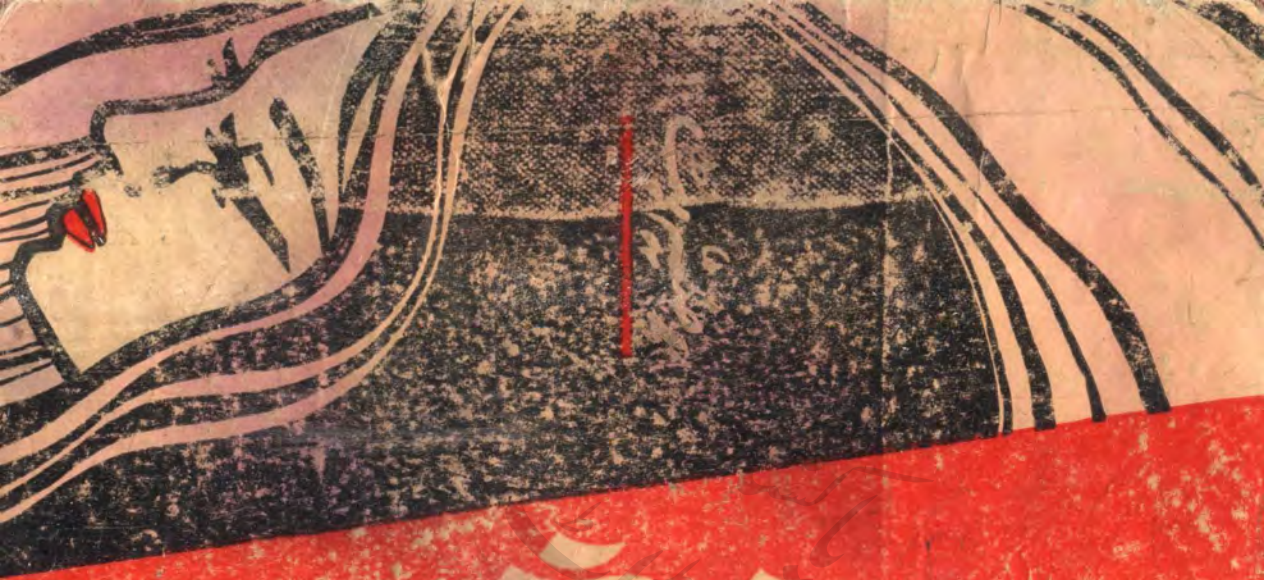

انجمن

ناہید، نائلہ، نورین، نمو، انیلا، صاعقہ، شیلو، وحشی، عاشی، شیخو اور بانو کے بعد "لغزش" حاضرِ خدمت ہے۔ اس ناول کو "خلش" کے نام سے پیشِ خدمت کرنا تھا۔ فلم "خلش" بھی میرے اسی ناول پر مبنی ہے۔ لیکن فلم کی پبلسٹی میں جب "خلش" نام آیا۔ تو جعلی رضیہ بٹ کے نام سے "خلش" ناول مارکیٹ میں آ گیا۔ اسی وجہ سے مجھے اپنے ناول کا نام تبدیل کرنا پڑا۔ کیونکہ موضوع کے لحاظ سے "خلش" بہترین نام تھا۔ قارئین کرام کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ فلم "خلش" میرے اسی ناول پر مبنی ہے اور مارکیٹ میں آنے والے "خلش" سے جو رضیہ بٹ ہی کے نام سے طبع ہوا ہے۔ فلم کا کوئی تعلق نہیں۔ میرے پبلشرز احسن برادرز چوک انارکلی، لاہور ہیں۔ ناول خریدنے اور پڑھنے سے پہلے یہ نام ضرور دیکھ لیا کریں۔

شکریہ

مخلصہ: رضیہ بٹ

فرح - وزیر آباد

صبح

ابھی پوری طرح بیدار نہیں ہوئی تھی۔ رات کی ظلمتوں میں صبح کا نور آہستہ آہستہ تحلیل ہو رہا تھا۔ موسم خاصا خوش گوار تھا۔ پچھلی رات خنک سی تھی۔ فرید کی آراستہ پیراستہ خواب گاہ کی چوڑی فرانسیسی کھڑکیوں کے ریشمی پردے مست خرام جھونکوں سے دل کے کسی مجرم احساس کی طرح کانپ رہے تھے۔ کمرے میں ملگجا سا اجالا تھا جس میں بیڈ سائڈ لیمپ کے برقی بلب کی روشنی ماند پڑ رہی تھی۔ کمرے کی فضا بڑی خواب ناک تھی۔ پرسکون سی خاموشی کا تسلط تھا۔ قیمتی اشیاء کمرے کے حسن و وقار میں اضافہ کر رہی تھیں۔

فرید نرم و گداز بستر پر تکیے پر دونوں ہاتھوں میں سر رکھے چت لیٹا تھا۔ پہلو میں اس کی خوبرو اور جوان بیوی سلمیٰ بے خبری کے عالم میں سو رہی تھی۔ اس کا بازو فرید کے سینے پر تھا۔ اور وہ لمبے لمبے گہرے گہرے سانس لے رہی تھی۔ جو گاہے گاہے خراٹوں میں تبدیل ہو جاتے تھے۔

فرید جاگ رہا تھا۔ کتنی ہی دیر سے جاگ رہا تھا۔

کوئی خاص سوچ بھی نہ تھی۔ پھر بھی ذہن شکنجے میں آیا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ طبیعت بوجھل تھی۔ اور دل خفیف سی گھبراہٹ سے ڈوبتا ڈوبتا لگتا تھا۔ سلمیٰ کی نیند ٹوٹ جانے کے ڈر سے وہ چت لیٹا تھا۔ سلمیٰ ان دنوں امید سے تھی۔ اور وہ جانتا تھا۔ اس کے لیے بھرپور نیند کتنی ضروری ہے۔

جاگ جاگ کر اس کی آنکھوں کے پپوٹے جلنے لگے تھے۔ وہ بار بار سوچ رہا تھا۔ کہ

اسے کونسی سوچ ہے۔ بار بار ذہن اس خسارے کی طرف جاتا۔ جو کاروبار میں اسے ہوا تھا لیکن یہ معمولی سا نقصان بے پناہ فائدے کی لپیٹ میں آکر اپنی کوئی اہمیت نہ رکھتا تھا لاکھوں کے کاروبار میں کبھی کبھی تھوڑا سا گھاٹے کا سودا ہو بھی جائے تو کیا فرق پڑتا ہے۔ اس سے اس کی تجارت متاثر ہوتی تھی۔ نہ ٹھاٹھ باٹھ کی زندگی۔

پھر — پھر وہ کیوں پریشان تھا۔ کیوں پریشان ہوا جا رہا تھا۔ اور کون سا غم، کیسا فکر تھا۔ جو شعور نہ سہی لاشعور ہی میں ہلچل مچا کر اسے بے کل کر رہا تھا۔

چند ماہ پہلے اس کی شادی سلمیٰ کے ساتھ ہوئی تھی۔ اس کی زندگی کا گویا حسین ترین دور شروع ہوا تھا۔ وہ ماضی کو بھول گیا تھا۔ مستقبل کی پرواہ نہ رہی تھی۔ حال اتنا حسین تھا۔ کہ اس پر ہر وقت لذت بخش مدہوشی کی سی کیفیت طاری رہتی تھی۔

لیکن آج۔ رات کا جانے کونسا پہر تھا۔ جو اس کی آنکھ کھل گئی۔ اور پھر ایسی کھلی کہ ہزار کوششوں کے باوجود بند نہ ہو سکی۔ طبیعت بوجھل ہوتی گئی۔ سینے پر دباؤ سا بڑھتا گیا۔ بے کلی سی طاری رہی۔ اور وہ چت لیٹا چھت کی طرف دیکھتے ہوئے الجھا رہا۔

اچانک سلمیٰ نے کروٹ بدلی۔ وہ خود ہی پلنگ کے دوسرے کنارے سے لپٹ کر سو گئی۔ فرید نے اس کی طرف دیکھا۔ اس کے سونے کا بہکا ہوا انداز بڑا ہی جذبات انگیز تھا۔ سڈول کندھوں پر اس کے گھنے سیاہ بال بکھرے ہوئے تھے۔ کمر کا خم چلتے کی طرح تھا۔ اور ان دنوں کولہے نچھور اور بھرے بھرے سے نظر آنے لگے تھے۔ سلمیٰ کا سراپا بڑا بڑا حسین ہو گیا تھا۔ کوئی اور وقت ہوتا تو شاید فرید کا جوان دل کوئی گستاخی کرنے پر مجبور ہو جاتا۔ لیکن اس وقت طبیعت کی بے کلی بہت بڑھ رہی تھی۔ خوش گوار فضا کے باوجود حبس اور گھٹن کا احساس ہو رہا تھا۔ سلمیٰ کی طرف سے رخ پھیر کر اس نے کروٹ بدلی۔ قریبی میز پر اس کے سگریٹ پڑے تھے۔ ذہنی الجھاؤ اور پژمردگی دور کرنے کے لیے اس نے سگریٹ سلگایا۔ اور لمبے لمبے گہرے گہرے کش لے کر بے دلی سے دھواں چھوڑنے لگا۔

ایک دو تین۔ اس نے متواتر کئی پھونک ڈالے۔ صبح کی سانولی روشنی کمرے میں در آئی تھی۔ سگریٹ نوشی بھی طبیعت بحال نہ کر سکی۔ گھٹن کچھ اور بڑھ گئی۔ فرید نے باہر ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا میں جا کر پرسکون ہونے کا سوچا۔ ادھ جلا سگریٹ ایک لمبے کش کے بعد ایش ٹرے میں پھینک دیا۔ آہستگی سے پلنگ سے اٹھا۔ مڑ کر سلمیٰ کو دیکھا۔ اس کے اٹھنے سے سلمیٰ کی نیند نہیں ٹوٹی تھی۔

ایک گہرا سانس لیتے ہوئے اس نے اپنا گاؤن اٹھایا۔ اور پہنتے ہوئے کمرے سے باہر نکل گیا۔

تاریکیاں چھٹ رہی تھیں۔ درختوں اور پودوں سے ہوا کی چھیڑ مسرور کن تھی۔ رات کافی بدل چکی تھی۔ سردی کی آمد آمد تھی۔ نیلے آسمان پر سرمئی بادلوں کے ٹکڑے تیرتے پھر رہے تھے۔ کہیں کہیں کوئی ستارہ اب بھی ٹمٹماتا نظر آ رہا تھا۔ آسمان کا مشرقی گوشہ خون آلود تھا۔ شفق گہری سرخیوں اور انتہا اندھیروں کا مخلوط سا نظر آ رہی تھی۔

فرید نیلے گاؤن کی ڈوریاں باندھتے ہوئے برآمدے سے نکل کر چمن میں آ گیا۔ اس کی خوبصورت کوٹھی کا وسیع و عریض چمن سرسبز گھاس، رنگ برنگے پھولوں اور کئی قسم کے خوش نما درختوں سے مزین تھا۔ سلمیٰ کی نفاست پسندی نے تو چمن کی حالت ہی بدل ڈالی تھی۔ چمن پہلے بھی یہی تھا۔ حالی بھی یہی تھے۔ لیکن یہ حسن۔ یہ نکھار یہ بانکپن صرف سلمیٰ کی حسن پسند فطرت کی غماز تھی۔ پھولوں سے اسے والہانہ لگاؤ تھا۔ دور دور سے اس نے اپنی پسند کے پھول دار پودے منگوا کر لگوائے تھے۔

لیکن فرید کو اس وقت قدرت کا یہ حسن بھی متاثر نہ کر سکا۔ روش کے ساتھ ساتھ بے معنی نظروں سے پھولوں کو دیکھتا وہ آہستہ آہستہ قدم اٹھائے چلا جا رہا تھا۔ چاندی کی طرح چمکتے ہوئے گیٹ سے ابھی وہ چند قدم ادھر ہی تھا۔ کہ گیٹ کے قریب سے اسے کسی نوزائیدہ بچے کے رونے کی آواز آئی۔

"اس وقت یہاں کون ؟"

اس کے قدم آگے بڑھ گئے۔

لیکن گیٹ کے قریب گولڈ مور کے درخت کے نیچے کپڑے میں لپٹے ہوئے رونے والے بچے کو دیکھ کر اس کے اوسان خطا ہو گئے۔ قدم جہاں تھے۔ وہیں رک گئے۔ آنکھیں پھٹ جانے کی حد تک کھل گئیں۔ سارا بدن تشنجی اکڑاؤ سے گھٹ گیا۔ منہ کھل گیا۔ اور اک بے آواز چیخ اس کے حلق میں گھٹ گئی۔

چند ثانیے وہ بے حس و حرکت کھڑا بچے کو دیکھتا رہا۔ اس کے ذہن میں قیامت کی آندھیاں چلنے لگیں۔ اور اس بے بس کر دینے والے شور میں ایک ہی جملہ گونجنے لگا

"میں تم سے ایسا بدلہ لوں گی۔ کریاد رکھو گے۔"

اس جملے کی ذہن میں تکرار نے اسے تڑپا دیا۔ اس نے آنکھیں بند کر کے دونوں ہاتھ کانوں پر رکھ لیے۔ دل و دماغ، ذہن اور جسم کو جھلستے ہوئے کئی لمحے بیت گئے۔ بچہ بدستور رو رہا تھا۔ اس نے آنکھیں کھولیں۔ بیرونی گیٹ کا ایک پٹ کھلا تھا۔ فرید نے پہلے گیٹ کی طرف دیکھا۔ پھر بچے پر نگاہ ڈالی۔

وہ ایک ٹک بچے کو دیکھنے لگا۔ اس کی ذہنی اور جسمانی کیفیت بدلنے لگی۔ ایک خونخوار خیال ذہن کو اپنی گرفت میں لے چکا تھا۔

وہ جھپٹ کر آگے بڑھا۔ بچے پر جھکتے ہوئے اس نے اپنے دونوں ہاتھ اس کی گردن دبوچنے کو بڑھا دیے۔ اس کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ دانت پیستے ہوئے اس نے بچے کی گردن دبوچنا چاہی۔

لیکن وہ ایسا نہ کر سکی۔ ابھرتے ہوئے حیوانی خونخوار جذبے کو عمل کی راہ نہ دے سکا۔ اس کی انگلیاں اکڑی رہ گئیں۔ بچے کے چہرے پر معصومیت کا ایسا ہالہ تھا۔ جسے گناہ کے ہاتھ توڑ نہ سکے۔

بے دم ہو کر وہ درخت کے قریب زانو کے بل جھک گیا۔ اس کے ذہن میں اب بھی قیامت کی آندھیاں چل رہی تھیں۔ اور شور ہی شور مچ رہا تھا۔ سوچنے سمجھنے سے قاصر وہ کپڑے میں لپٹے روتے بچے کو دیکھے جا رہا تھا۔

"چلی گئی — اُف — کتنا دور ڈرا میں —" الٹا بے ربط جملوں پر فرید نے پلٹ کر دیکھا۔ فتو مالی گیٹ کے اندر آتے ہوئے ہانپ رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں کالی کشمیری شال تھی۔ فرید احساس جرم سے لرز گیا۔ اسے یوں لگا جیسے اس کا برہنہ جرم مالی کی نظروں میں آ چکا ہے۔ اس نے اٹھ کر بھاگ جانا چاہا۔ لیکن درخت کے تنے پر ہی کانپتے ہوئے جھک گیا۔ قدم من من کے ہو رہے تھے۔

"صاحب جی — صاحب — جی" فتو مالی اسے دیکھتے ہی ہانپتی کانپتی آواز میں بولا۔

فرید کے رگ و پے میں جیسے موت سرایت کر رہی تھی۔ بمشکل درخت کا سہارا لیے کھڑا رہا۔ زبان سے کچھ بھی تو نہ کہہ سکا۔

"صاحب جی" فتو بچے کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ اس کے سانس اب بھی درہم برہم تھے۔ تیز دوڑ سے سانس پھول گیا تھا۔

"یہ — یہ — صاحب جی — یہ بچہ — ایک جوان عورت ڈال کر بھاگ گئی" فتو نے شال بازو پر ڈالتے ہوئے کہا۔

فرید کا رنگ سپید پڑ گیا۔ آنکھوں میں افشائے راز کا ڈر کانپنے لگا۔

"صاحب جی" اس نے شال فرید کو دکھاتے ہوئے غیر متوازن سانسوں میں کہا۔ "میں ادھر آیا۔ تو ایک عورت پچھلی طرف سے بھاگتی آئی۔ بچے کو گیٹ کے پیچھے ڈالا۔ اور خود بھاگ گئی۔ میں جلدی سے ادھر آیا۔ دیکھا تو یہ بچہ پڑا تھا۔ میں اس کے پیچھے لپکا۔ لیکن اس کی شال ہاتھ آئی۔ وہ پرلے موڑ کی کوٹھی کی دیوار پھلانگ کر بھاگ نکلی۔"

فرید کی طرف دیکھے بغیر وہ بچے پر جھک گیا۔ اور کچھ جھجکتے ڈرتے بچے کو ہاتھوں پر اٹھا لیا۔ فرید اب اس کالی شال کو گھور رہا تھا۔ جو بالی کے بازو پر پڑی تھی۔

کالی شال! — کالی شال! — اس کے دل و دماغ طوفانی لپیٹ میں آ چکے تھے۔ مالی خدا جانے کیا کہہ رہا تھا۔ فرید کچھ کہے سنے بغیر مشینی انداز میں اپنی جگہ سے ہلا۔ اور گیٹ سے باہر جانے لگا۔ فتو سمجھا۔ مالک اس عورت کو پیچھا کرنے جا رہا ہے۔ جلدی سے اٹھ کر فرید کے سامنے آ گیا۔

"وہ تو بھاگ گئی صاحب جی —" پھر دور آخری سرے والی کوٹھی کی طرف ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ "اس کی کوٹھی کی دیوار پھلانگ گئی وہ۔ میں بہتیرا تیز دوڑا لیکن پکڑ نہ پایا۔ خدا جانے پاگل تھی۔ شال ہاتھ آ گئی۔ خود نکل گئی۔" فتو اپنے آپ سے کہہ رہا تھا۔

"اس کا کیا کریں صاحب جی۔" بچہ مالی کے ہاتھوں میں چپ ہو گیا تھا۔

"آں —" فرید جیسے خواب سے چونکا۔ لیکن پھر سر جھکا کر سڑک کی جانب جانے لگا۔

"یہ — یہ — کیا ہے فتو —" نوکر گھر سے رحمت خانساماں ادھر آ گیا تھا۔ وہ نماز کے لیے مسجد جانے کو ادھر آیا تھا۔

"ارے — بچہ —؟" فتو کو حیرت سے دیکھتے ہوئے رحمت بولا۔ "یہ — کس کا ہے —" دریں اثنا فرید گیٹ سے باہر نکل چکا تھا۔

فتو نے ساری روئداد رحمت کو کہہ سنائی۔ وہ چند لمحے ششدر سا رہا۔ پھر اپنی ادھیڑ عمر کے تجربے کی بنا پر دھیرے سے مسکرایا۔

"کیوں؟" جوان فتو اس ادھیڑ مسکراہٹ کو نہ سمجھ سکا۔

"ایسا ویسا ہو گا بچہ —؟" رحمت نے مسکراہٹ کی وضاحت کر دی۔ "پھینک گئی

کوئی اپنا بوجھ۔ جرم کو چھپانے کا اچھا طریقہ ہے۔"

فتو ڈر گیا۔ لیکن سنبھل کر بولا۔ "وہ لڑکی بھلی سی لگتی تھی۔" رحمت جہاندیدہ انداز میں مسکرا دیا۔

"اس کا کیا کریں اب —؟" فتو بولا۔ بچہ پھر رونے لگا۔

"صاحب جی نے کیا کہا؟"

"وہ تو کچھ بولے ہی نہیں۔ میرے خیال میں اس عورت کو دیکھنے باہر چل دیئے ہیں۔"

"کہیں یہ ان کا۔" رحمت نے آنکھوں ہی آنکھوں میں فتو کو معنی خیز اشارہ کیا۔

"چھوڑ دیا۔ حد کر دی تو نے۔ اپنے صاحب جی۔ کے متعلق تو ایسی بات کہہ سکتا ہے۔ میں نہیں۔ اپنے صاحب تو بڑے پرہیزگار ہیں۔"

رحمت ہنس پڑا۔ "بھئی میں نے تو یونہی سرسری سی بات کہہ دی۔ ورنہ صاحب جی۔"

"اب یہ بتاؤ اس کا کیا کروں۔" فتو بازوؤں میں بچے کو ہلاتے ہوئے چپ کرانے لگا۔

"اندر لے چلو۔ بیگم صاحبہ اور صاحب جی ہی سے پوچھنا ہو گا۔"

"رو رہا ہے۔ میری بیوی بھی میکے گئی ہے۔ اس کا کیا کروں؟ مجھے تو چپ کرانا ہی نہیں آ رہا۔"

"میری بیوی کے پاس لے چلو اسے۔" رحمت نے کہا۔ "بیگم صاحبہ تو ابھی سو رہی ہوں گی۔ جب تک وہ سنبھال لے گی۔"

دونوں باتیں کرتے ہوئے نوکر گھروں کی طرف چل دیئے۔

—+—

"لڑکی ہے۔"

"دس پندرہ دن کی ہوگی مشکل سے۔"

"ہاں ہاں ناف کچی ہے ابھی۔"

"کھوبصورت کتنی ہے۔"

"اے بہن ایسے بچے کھبصورت ہی ہوتے ہیں۔"

"توبہ یا اللہ۔ کیا جمانہ آگیا ہے۔"

"اپنا بوجھ اور پھینک گئی کسی کے دَر پر۔"

"اتنی پیاری بچی کا گلا گھونٹنے کو جی نہ چاہا ہوگا۔"

"دیکھو تو کیسے ٹکر ٹکر دیکھ رہی ہے۔"

"پیچ سے دودھ بھی پی لیا۔"

"سلا دو۔"

لیکن مجھے تو سمجھ نہیں آتی ہے کہ اس کا کریں گے کیا۔"

"یہ تو بیگم صاحبہ ہی بتلا دیں۔ یا صاحب جی۔"

"پلس کے حوالے کرنی چاہیئے۔"

"ہے۔ ہے۔ نابینا۔ پلس کے حوالے تو میں کبھی نہ کروں۔ لڑکا ہوتا تو بات بھی تھی۔ لڑکی ہے۔ بیٹی اپنی کیا اور پرائی کیا۔ یہ سانجھ کا رشتہ ہے بی بی۔"

"سو گئی۔ کیا صورت بنائی ہے بنانے والے نے۔ پلکیں تو دیکھو۔ کالی جھالر کی

طرح ہیں۔"

"بڑی ہی کھبصورت ہے۔"

"گناہ کا پھل ہے نا۔"

رحمت کے کوارٹر میں خانساماں مالی بیرہ دھوبی اور جمعدار سبھی کی بیویاں جمع ہو گئی تھیں۔ گیٹ کے پاس فتو کو ملنے والی بچی رحمت کی بیوی صغرا کی گود میں تھی۔ اور اس کے گرد جمع شدہ عورتیں بچی کو دیکھتے ہوئے قیاس آرائیوں میں مشغول تھیں۔ کوارٹر سے باہر پان کی کھری چارپائیوں پر رحمت، فتو، ہیرا، بیلی اور نظام بیٹھے تھے۔ مٹی کے حقے میں تمباکو بھر کر فتو لے آیا تھا۔ سبھی اس بچی کے بارے میں قیاس آرائیوں میں مشغول تھے۔ بچی کے متعلق یہ متفقہ رائے تھی۔ کہ کسی بے راہ رَو کی لغزش کا عملی نتیجہ ہے۔ لیکن سوال یہ تھا۔ کہ اب اس کا کیا کیا جائے۔ گو سب نے آخری فیصلہ بیگم صاحبہ اور صاحب جی پر ڈال رکھا تھا لیکن باتوں کے لیے کچھ تو مواد چاہیئے۔

"میرے خیال میں تو بچی کو تھانے لے جانا چاہیئے۔" رحمت نے حقہ کو گڑگڑاتے ہوئے کہا۔

"ہاں پولیس کے حوالے ہی کرنا ہوگی۔" نظام نے رائے دی۔

"بلے کیسی عورت تھی۔" بیلی نے فتو سے پوچھا۔ جو انگلی کا ناخن چباتے ہوئے سوچوں میں گم تھا۔

"کیا کہا؟" فتو چونکا۔

"تم نے تو دیکھی نا وہ عورت؟" بیلی نے فتو سے پوچھا۔

"ہاں" فتو نے جواب دیا۔

"کیسی تھی؟ بیلی نے پھر پوچھا۔

"کیا احمقوں سا سوال کر رہے ہو" رحمت نے کہا۔ اور حقے کی نَے نظام کی طرف کر دی۔ "بدمعاشی کسی کے منہ پر لکھی ہوتی ہے۔"

"بھلی سی لڑکی تھی۔" فتو سوچتے ہوئے بولا۔

"بچی بھی تو بڑی خوبصورت ہے۔ ہیرا حقے کی نے پکڑتے ہوئے بولا۔" تم نے اچھی طرح دیکھی وہ عورت۔"

"ہاں" فتو نے کہا۔

"کبھی پہلے بھی دیکھنے میں آئی۔" بیلی نے وکیلوں کے سے انداز میں پوچھا۔ "میرا مطلب ہے۔ کہیں اسی علاقے کی کوئی لڑکی تو نہیں۔"

فتو نے ذہن پر زور دیتے ہوئے نفی میں سر ہلایا۔ "نہیں۔ میں نے ایسی لڑکی پہلے کبھی نہیں دیکھی۔"

"بھئی اس علاقے کی لڑکی کا یہ کام نہیں ہو سکتا۔" رحمت نے جہاندیدہ انداز میں کہا۔

سب خاموشی سے سوچنے لگے۔ اس خاموشی کو حقے کی گڑگڑاہٹ توڑتی رہی۔

"چلو بھئی اٹھو۔ آج کام سے چھٹی کر لی کیا۔" بیلی نے اٹھتے ہوئے کہا۔ چارپائی کے قریب زمین پہ بیٹھا ہیرا بھی اپنا فرشی جھاڑو پکڑ کر اٹھ بیٹھا۔ "ہاں بھئی چلو اٹھو۔ کام کرو۔ باقی لڑکی کے متعلق تو فیصلہ صاحب ہی کریں گے کہ کیا کرنا ہے۔ ہمیں کیا لینا دینا۔"

"بالکل" رحمت نے کہا۔

"ہم خواہ مخواہ گناہ اپنے سر چڑھا رہے ہیں۔" نظام بولا۔ "بغیر تحقیق کے بچی کو حرامی قرار دے دیا۔ خدا جانے کیا معاملہ ہے۔"

فتو نے نظام کی بات کی تائید کی۔ "ہاں بھئی سچ کہتے ہو۔ ہو سکتا ہے۔ اس کی ماں ابھی ابھی واپس آ جائے۔ سارا بھید کھل جائے۔"

رحمت نے معنی خیز نظروں سے فتو کی طرف دیکھتے ہوئے سر نفی میں ہلایا۔ "خیر ہمیں کیا۔ دیکھتے ہیں کیا بنتا ہے۔"

وہ کچھ اور کہنے کو تھا۔ کہ کوٹھی کی طرف سے سانولی ادھر آ گئی۔ سانولی سلمیٰ کی خاص

خدمت گار تھی۔ اور رحمت نے اسے بیگم صاحبہ کو بیدار کرنے کی غرض سے بھیجا تھا۔

"کیوں؟" اس کے آتے ہی رحمت نے استفہامیہ نظروں سے دیکھا۔

"بیدار ہیں بیگم صاحبہ" سانولی نے کہا۔

"بتا آئی سارا قصہ" بیلی بولا۔

"نہ بابا۔ تم خود ہی بتاؤ جا کر" سانولی نے بدن چرایا۔

"چلو ہم بتا آتے ہیں۔" رحمت اٹھتے ہوئے بولا۔ "اپنے کمرے سے باہر آ گئیں بیگم صاحبہ؟"

"نہیں ابھی خواب گاہ ہی میں ہیں۔" سانولی نے جواب دیا۔

"اور صاحب آ گئے۔" فتو نے پوچھا۔

"وہ تو کمرے میں نہیں ہیں۔" سانولی نے فتو سے کہا۔

"خواہ مخواہ ہی پیچھا کرنے گئے ہیں صاحب۔" فتو نے کہا۔ "وہ تو چھلاوے کی طرح غائب ہو گئی تھی۔ میں کتنا تیز دوڑنے والا ہوں۔ لیکن اسے پکڑ نہ سکا۔ اتنی اونچی دیوار پھاند کر غائب ہو گئی۔"

"تمہیں تیزی سے اس کوٹھی کے دوسری طرف جا کر سامنے سے اسے لینا چاہیئے تھا۔"

"توبہ کرو۔ میرے اس طرف پہنچنے تک وہ خدا جانے کہاں سے کہاں پہنچ گئی ہوتی۔"

"خیر۔"

"چلو بیگم صاحبہ کو تو بتا دیں۔"

"ہاں۔"

"بچی کو بھی لے چلیں۔"

"تو اور؟"

"جا سانولی صغرا سے بچی کو لے آ۔"

سب چارپائیوں سے اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ رحمت ان سب میں معمر تھا۔ یوں

معتبر تھا۔ اس لیے سب اس کی قیادت میں بیگم صاحبہ کے پاس جا رہے تھے۔ سانولی کوارٹر کے اندر گئی۔ تھوڑی دیر بعد صغرا بچی کو کندھے سے لگائے باہر آ گئی۔ جمو دھوبن ایلس جمعدارنی اور باقی نوکروں کی بیویاں بھی ملگجے آنچلوں کے گھونگھٹ نکالے باہر آ گئیں۔

سلمیٰ ابھی اپنی خواب گاہ ہی میں تھی۔ شب خوابی کا مہین خوبصورت لباس اتار کر اس نے دوسرے کپڑے پہن لیے تھے۔ اب بالوں میں برش کر رہی تھی۔ فرید کے انتظار میں اس نے چائے بھی نہیں پی تھی۔ صبح کی چائے میز پر جوں کی توں پڑی تھی۔

"بیگم صاحب جی" سانولی نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔

"ہوں!" سلمیٰ ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑی بالوں میں برش کرتی رہی۔

"بیگم صاحب جی" سانولی اس کی پشت پہ آ کھڑی ہوئی۔

"کیا ہے سانولی" سلمیٰ نے آئینے میں سانولی کو دیکھا۔

"وہ رحمت آیا ہے جی" سانولی دوپٹے کا کنارہ مسلتے ہوئے بولی۔

"کیا کہتا ہے" سلمیٰ نے برش رکھ کر مڑتے ہوئے کہا۔

"جی آپ خود ہی برآمدے میں جا کر سن لیں" سانولی کچھ لجائی، کچھ مسکرائی۔

برآمدے سے نوکروں کے کھسر پھسر کرنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ سلمیٰ نے حیران ہو کر سانولی کو دیکھا۔ پھر بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اٹھی۔ دوپٹہ درست کیا۔

"کوئی خاص بات ہے" سلمیٰ نے دروازے کی طرف جاتے ہوئے سانولی کی طرف دیکھا۔ سانولی نے مسکراتے ہوئے سر ہلایا۔

سلمیٰ دروازے میں آ کھڑی ہوئی۔ نوکروں کی پوری پلٹن برآمدے میں جمع تھی۔ ایک طرف ان کی بیویاں اور بچے بھی تھے۔ سلمیٰ کچھ نہ سمجھی اور جب انسان کچھ نہ سمجھے۔ تو دل اک انجانے خوف سے کانپ ضرور جاتا ہے۔ فرید کا صبح صبح کمرے سے چلے جانا۔ حالاں کہ وہ دن چڑھے اٹھنے کا عادی تھا۔ اور اب سب نوکروں کا اجتماع۔ دھڑکتے

دل اور گھبرائے ہوئے لہجے میں سلمیٰ نے ان سے یہاں آنے کی وجہ پوچھی۔

رحمت نے فتو کی طرف دیکھا۔ فتو نے سر ہلا کر بات کرنے کا اشارہ کیا۔ صغرا بچی کو ہاتھوں میں لیے آگے بڑھی۔ اور سلمیٰ کے آگے ننھا سا وجود کر دیا۔

"یہ۔ یہ کس کا بچہ ہے" سلمیٰ نے بچے کو دیکھ کر سب کی طرف استفہامیہ نظروں سے دیکھا۔ فتو کی بیوی کے بچہ ہونے والا تھا۔ لیکن وہ تو میکے گئی ہوئی تھی۔

سلمیٰ کی حیرانگی رحمت نے پوری روداد سنا کر دور کر دی۔ لیکن حیرانگی دور کہاں ہوتی۔ اس کا تو شاید دورہ سلمیٰ پہ پڑا۔ آنکھیں پھاڑے بچے کو دیکھتے ہوئے بولی "لیکن لیکن عورت، بچہ یہاں کیوں ڈال گئی"۔

صغرا نے آنکھیں مٹکائیں۔ جمو زیر لب مسکرائی۔ ایلس نے بھی شرمانے کی اداکاری کی۔ سب نے اشاروں کنایوں میں جتلا دیا۔ کہ بچی گناہ کا ثمر ہے۔

"خدایا" سلمیٰ نے بے ساختہ کہا اور ہاتھ منہ پر رکھ لیا۔

"اب اس کا کریں کیا بیگم صاحبہ۔" رحمت نے قدرے توقف کے بعد کہا۔

"صاحب آ لیں۔ پھر فیصلہ کریں گے۔" فتو جلدی سے بولا۔

"پولیس کے حوالے کرنا ہوگا" سلمیٰ نے ہراساں نظروں سے بچے کو دیکھا۔

"عجیب بات ہے۔ مجھے تو کچھ سمجھ نہیں آ رہا" فتو نے پھر ایک بار صبح کا واقعہ دہرایا سلمیٰ نے فیصلہ کیا۔ کہ بچی کو پولیس کے حوالے ہی کیا جائے۔

"بیگم صاحب جی" جمو لجاجت سے بولی "بیٹی کا دھن ہے۔ پولیس کے حوالے نہ کریں"۔

"تو اور کیا کریں ــــ یہ" سلمیٰ نے نفرت و حقارت سے فرشتوں کی طرح معصوم بچی کو دیکھتے ہوئے بات ادھوری چھوڑ دی۔

نوکر کھسر پھسر کرنے لگے۔ سلمیٰ نے اپنی حیرانگی پر قدرے قابو پایا۔ اور بولی "فی الحال

اسے لے جاؤ۔ ہو سکتا ہے۔ اس کی ماں لوٹ ہی آئے۔ اگر نہ آئی۔ تو صاحب ہی بتائیں گے کہ اس کا کیا کریں۔ سلمیٰ اندر واپس آ گئی۔ اس کی سوچیں مفروضوں سے ٹکرا رہی تھیں۔

اور نوکر باتیں کرتے ہوئے چل دیئے۔ بچی کو صغرا کے ہاتھوں سے جمو نے لے لیا۔ موہنی سی صورت پر جمو کو بے طرح پیار آ رہا تھا۔

"اسے تو میں خود ہی پال لوں گی۔" جمو نے پیار سے کہا۔

"کیوں؟" بچہ کھلانے کی ابھی ہوس ہے۔" صغرا نے ہنس کر کہا۔

"بچوں کی پھوج بنانا چاہتی ہے تو۔" زہری بولی۔

"اے ہے پھوج تیری کیا کم ہے۔" جمو نے برا مانا۔

"میں اسی لیے تو بچی کو پال لینے کی خواہش نہیں کر رہی۔" زہری نے ہنس کر جواب دیا۔ جمو اپنے سات عدد بچوں کو فوج کہے جانے پر برا مان گئی تھی۔ صغرا جہاندیدہ عورت تھی۔ جلدی سے بولی۔ "ضرور جمو بچی کو تو ہی پال لینا۔ ثواب کا کام ہے بی بی۔ پلس کے حوالے کر دی بچی تو خدا جانے کہاں سے کہاں پہنچے۔"

"اسی کھدا کھوفی سے تو میں کہہ رہی تھی۔ میں خود ہی پالوں گی اسے۔" جمو نے بچی کو پیار سے سینے سے لگا لیا۔

— ٭ —

کوئی دس ماہ ادھر کی بات ہے۔ سردی کا موسم تھا۔ غالباً جنوری کا آغاز تھا۔ فرید پچھلے تین ماہ سے مسلسل کاروباری مصروفیات کے بار تلے دبا تھا۔ والد کی وفات کے بعد لاکھوں کے کاروبار کا بوجھ اس کے کندھوں پر آن پڑا تھا۔ گو اس بوجھ کو اس نے بطریق احسن سنبھالا تھا۔ لیکن تین ماہ دن رات کی مشقت سے اس کا جسم تھک چکا تھا۔ ذہن بھی بوجھل تھا۔ چند دنوں کے لیے وہ پُرسکون ہو کر آرام کرنا چاہتا تھا۔

اس نے پہاڑ پر جانے کا سوچا۔ یوں بھی برف باری دیکھے اک مدت ہو چکی تھی۔ اور ان دنوں خوب برف پڑ رہی تھی۔ پہاڑ پر اس کی ذاتی کوٹھی تھی۔ گرمیوں میں چند دنوں کے لیے خود جاتا۔ اکثر دور پار کے رشتہ دار ہی وہاں موسم گزارتے۔

اس نے پہاڑ پر جانے کا پروگرام بنایا۔ اور کوٹھی کے رکھوالے کو اپنے آنے کی اطلاع کر دی۔ اس کا سارا سامان اس کے ذاتی نوکر نظام نے ٹھیک ٹھاک کیا۔

"ضرورت کی ساری چیزیں رکھ دی ہیں نا۔" فرید نے اٹیچی کیس، ہولڈال اور چرمی بیگ دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"جی صاحب۔" نظام نے مؤدبانہ کہا۔

"اوور کوٹ۔ دستانے۔ برساتی" فرید نے پوچھا۔

"جی سب کچھ رکھ دیا۔" نظام بولا۔

"بس ٹھیک ہے۔"

"میں بھی چلوں گا صاحب۔"

"نہیں۔ تمہاری ضرورت نہیں۔ وہاں چوکیدار ہے جو۔"

"جیسے آپ کی مرضی۔"

"میں بہت تھک گیا ہوں نظام۔ وہاں جا کر مکمل طور پر آرام کرنا چاہتا ہوں۔"

فرید مسکرایا۔

"تمہیں ساتھ لے گیا تو باتیں کر کر کے دماغ چاٹ جاؤ گے میرا۔ آرام کم، بے آرامی زیادہ ہو گی۔"

"صاحب جی جیسے آپ کی مرضی ـــــ بات تو میں ایک ہی کرتا ہوں۔ زیادہ تو نہیں" نظام شہہ پا کر بولا۔

"ایک ہی بات بار بار۔ توبہ۔ شادی میری فکر نہیں۔ ارے بھئی۔ میرے متعلق فکر نہ کیا کرو۔ جب حالات مناسب ہوں گے تمہاری بات مان لوں گا۔ ٹھیک۔"

"خدا بخشے بڑی بیگم صاحب ارمان دل ہی میں لے گئیں۔ مالک بھی چل بسے۔ آپ کی خوشی ان کے نصیب میں نہ تھی۔ پر صاحب جی۔ اب تو آپ کو شادی۔"

"اچھا۔ اچھا۔" فرید نے ہاتھ کے اشارے سے اسے روکتے ہوئے متبسم لبوں سے کہا۔

"چلو سامان رکھو گاڑی میں۔ واپس آ کر سوچوں گا۔"

نظام نے کندھے پر پڑے میلے سے جھاڑن سے چمکتا ہوا کالا چرمی بیگ پونچھ کر اٹھایا۔ پھر دوسرے ہاتھ میں سوٹ کیس اٹھایا۔ اور دونوں چیزیں لے کر پورچ میں کھڑی بڑی سی گاڑی کی ڈگی میں رکھ دیں۔

"بستر تو جناب وہاں بھی تھے۔" نظام نے ہولڈال اٹھاتے ہوئے کہا۔

"نہیں بھئی۔ خدا جانے انہیں کون کون سی استعمال کرتا رہا ہے۔ میں اپنا بستر

ساتھ لے جاؤں گا۔"

نظام سامان گاڑی میں جمانے لگا۔ فرید کوریڈور میں رکھے ٹیلیفون کی طرف بڑھا۔ اور مینیجر کو کام کے متعلق ایک بار پھر ہدایات دینے لگا۔ اس کا پروگرام آٹھ دس دن کا تھا۔ فون کر کے وہ واپس برآمدے میں آیا۔ خالہ حمیدہ اپنا بھاری بھرکم وجود سنبھالتے دوسری طرف سے آ رہی تھیں۔

خالہ حمیدہ فرید کی خالہ تھیں بھی یا نہیں۔ وہ بچپن سے اسے خالہ حمیدہ کہتا چلا آیا تھا۔ خالہ حمیدہ کی جوانی اسی گھر میں کٹی تھی۔ بڑھاپا بھی یہیں اتر رہا تھا۔ بے اولاد تھیں بیوگی کو سہارا اسی گھر میں ملا تھا۔ دن رات اللہ اللہ کرتی رہتیں۔ ان کی بے ضرر ذات کسی پر بار نہ تھی۔ کبھی کبھی جاگیر پر بھی چلی جاتیں۔ فرید کی اماں کا ہاتھ بٹایا کرتی تھیں لیکن ان کے مرنے کے بعد تو الگ تھلگ ہو بیٹھی تھیں۔ فرید انہیں عزیز تھا۔ اور اس کی بھی سعادت مندی تھی۔ جو ان کا احترام ماں کی طرح کرتا تھا۔

"جا رہے ہو۔" خالہ حمیدہ نے اس کے قریب آتے ہوئے کہا۔

"جی خالہ۔"

"لوٹو گے کب۔"

"یہی کوئی آٹھ دس دن تک آ جاؤں گا۔"

خالہ حمیدہ نے اس کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیر کر دعائیں دیں۔ فرید انہیں سلام کر کے گاڑی کی طرف بڑھا۔

فتو مالی۔ ہیرا رحمت۔ بیلی اور کاکا سبھی گاڑی کے قریب آ گئے۔ سب نے باری باری صاحب کو سلام کیا۔

"صاحب۔ میری ضرورت ہوئی تو کہلا بھیجئے گا۔ آپ کو وہاں کام کاج کی کوئی تکلیف نہ ہو۔" نظام نے کھڑکی کے قریب آتے ہوئے اپنی خدمات پھر پیش کیں۔ فرید نے ہاتھ

کے اشارے سے شکریے کا مفہوم ادا کیا۔ اور مسکرایا۔ اور گاڑی کی چابی گھمادی۔

کوٹھی سے نکلتے ہی جیسے اس کے ذہن سے منوں بوجھ اتر گیا۔ کاروبار! کاروبار! مشینی زندگی۔ وہ کس قدر اکتا چکا تھا۔ ان ساری مصروفیات کو بھول کر وہ پوری دلجمعی سے تفریح کے ارادے سے گھر سے نکلا تھا۔ شہر کی گنجان آباد سڑکوں پر زندگی رواں دواں تھی۔ مصروف زندگی، تھکا دینے والی زندگی سرگرم عمل تھی۔ فرید جلد از جلد یہاں سے نکل کر خاموش فضاؤں کے طلسماتی حسن اور سحر خیز دلکشی میں کھو جانا چاہتا تھا۔

گاڑی پیچ و خم کھاتی سڑکوں پر بلندی کی طرف جا رہی تھی۔ میدانی موسم کچھ اور یخ بستہ سا ہو رہا تھا۔ فرید موٹے اونی اوورکوٹ میں ملبوس گاڑی چلا رہا تھا۔ سگریٹ کے بل کھاتے لہراتے دھوئیں کو دیکھتے ہوئے وہ آٹھ دس دن کے تفریحی پروگرام کی ترتیب میں مصروف تھا۔

سڑک بل کھاتی اوپر ہی اوپر اٹھ رہی تھی۔ ہریالی نگاہوں کو فرحت بخش رہی تھی سرخ پہاڑی مٹی میں کہیں چھپے کہیں اُن چھپے کالے پتھروں کا اپنا ہی حسن تھا۔ پہاڑی نالے اوپر جم جانے والی برف کی وجہ سے مضمحل سی رفتار سے بہہ رہے تھے۔ کہیں کہیں تو پانی بالکل خشک تھا۔ شگافوں میں جمی ہوئی سلیں احساس دلاتی تھی۔ کہ یہاں پانی بہتا رہا ہے۔

گاڑی جوں جوں بلندی کی طرف جا رہی تھی۔ موسم سرد تر بن ہوتا جا رہا تھا۔ درختوں، پودوں اور خودرو سبزے پر برف کی سفید تہیں جمی تھیں۔ یہ تہیں اوپر ہی اوپر جانے پر دبیز ہوتی جا رہی تھیں۔

فرید اس حسین منظر سے مدہوش سا ہوا جا رہا تھا۔ اطمینان، سکون اور بے فکری سے اس کے ذہن کے بوجھ چھٹ رہے تھے۔ آبادی قریب آ رہی تھی۔ پہاڑی ڈھلانوں پر بنے ہوئے مکانوں کی لوہے کی چادروں کی نالی دار چھتیں برفیلی تہوں میں لپٹی تھیں۔ سفید روئی بکھری ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ بعض جگہ تو مکان برف میں دھنس چکے معلوم ہوتے تھے۔ سڑک کے دونوں طرف برف کے تودے جمع تھے۔ راستہ ہر وقت صاف کیا جاتا تھا۔ بیلچوں سے

مزدور سڑک پر پڑی برف ہٹا کر راستہ بناتے رہتے تھے۔ یہاں سڑک قدرے پھسلنی ہو گئی تھی۔ دھوپ نکھری ہوئی تھی۔ حدت سے برف کچھ پگھل کر پانی بنتی جا رہی تھی۔

فرید بڑی احتیاط سے گاڑی چلا رہا تھا۔ سڑک پر آمد و رفت نہ تھی۔ کبھی کبھی ملٹری کی کوئی جیپ یا برف باری کے نظارے کے لیے آئے ہوئے لوگوں کی کار قریب سے گزر جاتی۔ اس وقت وہ سنسان سڑک پر جا رہا تھا۔

نیا سگریٹ سلگا کر اس نے لمبا سا کش لیا۔ سگریٹ انگلیوں میں پکڑے اس نے سٹیئرنگ پر ہاتھ رکھا۔ اس کی نظر سامنے سڑک پر گئی۔ سڑک کے عین بیچوں بیچ کوئی عورت سر پر ٹوکرہ اٹھائے بے نیازی کے عالم میں چلی جا رہی تھی۔ فرید نے اسے دیکھا۔ موٹر کی آواز شاید اس کے کانوں تک نہ پہنچ رہی تھی۔ یا اس پر ہی خود فراموشی کا عالم طاری تھا۔ وہ سڑک کے کنارے کی طرف نہ ہوئی۔ اپنے راستے پر چلتی گئی۔ فرید کی گاڑی اس سے چند گز کے فاصلے پر تھی۔ لیکن وہ چلی جا رہی تھی۔

اچانک فرید کو شرارت سوجھی۔ گاڑی اس کے قریب لے جا کر اس نے زور سے ہارن کیا اور بریک لگا دی۔ وہ اچھلی۔ پلٹی۔

اس اچھلنے پلٹنے میں اس کے سر پر رکھا ہوا ٹوکرہ زمین پر آ رہا۔ اور رنگا رنگ چیزیں زمین پر بکھر کر ڈھلان کی طرف لڑھکنے لگیں۔ آلو۔ ٹماٹر۔ گوشت۔ پھل۔ دالیں بسکٹ کے ڈبے غرضیکہ کئی چیزیں تھیں۔

فرید نے اسے دیکھا۔ لڑکی کی بدحواسی اور بے ساختہ اچھلنے پر ہنسی آ گئی۔ اس نے قہقہہ لگایا بے فکری۔ دل لگی اور تفریح کا مظاہر قہقہہ۔

لڑکی پریشانی کے عالم میں رو دینے کو تھی۔ لیکن جب اس نے فرید کو یوں قہقہہ لگاتے دیکھا تو بپھر گئی۔ اور اس کی گاڑی پر جھپٹ پڑی۔ فرید کے قہقہے بے قابو ہو گئے۔

لڑکی نے گاڑی کی کھڑکی کے اٹھے شیشے پر دوہتڑ مارا۔ خدا جانے وہ اسے کیا کیا

جلواتیں سنا رہی تھی۔

فرید نے کھڑکی کا شیشہ گرا دیا۔ ہنسی کو قابو میں کرتے ہوئے بولا۔ "کیوں کیا ہوا؟"

"میرا ٹوکرہ گرا دیا۔ اور پوچھتا ہے کیا ہوا" لڑکی کی آنکھوں میں خون اتر رہا تھا۔

"ٹوکرہ میں نے گرایا۔" فرید نے سنجیدہ ہونے کی کوشش کی۔

"اور کس نے؟ لڑکی قیامت بنی جا رہی تھی۔

سڑک کے بیچوں بیچ چلی جا رہی تھی۔ میں گاڑی کس طرف سے لے جاتا۔" فرید نے سنجیدہ بنتے ہوئے کہا۔

"قصور تیرا اپنا اور کوس رہی ہے مجھے۔" فرید نے لڑکی کو ڈانٹ دیا۔ لڑکی اب ہراساں نظر آ رہی تھی۔ واقعی قصور اس کا اپنا تھا۔ اسے ایک ہاتھ چلنا چاہیئے تھا۔

فرید ہونٹ دانتوں تلے دبائے اس کی بے بس ہراسانی کو دیکھ کر لطف اندوز ہو رہا تھا۔ لڑکی نے گھوم کر سڑک پر بکھری ہوئی چیزوں کو دیکھا۔ اس کی گھبراہٹ اور پریشانی دید کے قابل تھی۔

"چاچی مجھے مار ڈالے گی۔" وہ بڑبڑائی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

اس جملے میں بیچارگی کے جانے کون سی ادا تھی۔ فرید کا دل پسیج گیا۔ ذرا سی شرارت لڑکی کی پریشانی کا باعث بن گئی تھی۔

آنکھوں میں چھلکتے آنسو لیے لڑکی نے فرید کی طرف دیکھا اور پھر الٹے ہاتھ سے آنکھیں پونچھتی چیزیں اکٹھی کرنے لگی۔

"اے۔ بات سن" فرید نے کھڑکی سے گردن نکال کر لڑکی کو بلایا۔ وہ اب بھی آنسو پونچھے جا رہی تھی۔

"اے — ادھر آ —" اس نے پھر لڑکی کو بلایا۔ وہ کافی سنجیدہ نظر آنے لگا تھا۔ لڑکی چند لمحے اس کی طرف دیکھتی رہی۔ پھر اٹھ کر گاڑی کے قریب آ گئی۔

"کتنا نقصان ہوا۔" فرید نے سنجیدگی سے پوچھا۔

"بسکٹ سارے ٹوٹ گئے۔ ٹماٹر آلو بھی لڑھک گئے۔" وہ آنچل سے آنکھیں پونچھتے ہوئے بولی۔

"چاچی پیٹ ڈالے گی۔"

فرید نے بٹوا نکالا۔ دس روپے کا نوٹ اس کی طرف بڑھایا۔ "لو جا کر ساری چیزیں لے آؤ۔" لڑکی تذبذب کے عالم میں کھڑی رہی۔

فرید نے مشفقانہ انداز اختیار کیا۔ نوٹ لڑکی کی طرف بڑھایا۔ لڑکی سہم کر اسے دیکھنے لگی۔

"لے لو نا۔ جو جو چیز خراب ہوئی ہیں اور لے آؤ۔"

"لیکن؟ —"

"لیکن ویکن کیا۔ چاچی کو بتا دینا۔ چیزیں گر گئی تھیں۔ میری وجہ سے تمہارا نقصان ہوا ہے۔ شاباش۔ لو۔ کوئی بات نہیں۔ جاؤ اس کی چیزیں خرید کر لے جاؤ۔ چاچی سے مار نہ پڑے گی۔"

"چاچی۔" لڑکی کے ہونٹوں سے خوف کی سسکی نکلی۔ فرید نے نوٹ گاڑی سے باہر پھینک دیا۔

"چلو اٹھا لو۔" اس نے واپس بٹوا جیب میں رکھتے ہوئے کہا۔

"لڑکی نے اپنے پاؤں کے قریب پڑے ہوئے نوٹ کو دیکھا۔ پھر فرید کی جانب دیکھنے لگی۔ اسے کیا کرنا چاہیئے تھا۔ وہ فیصلہ نہ کر پائی۔

"اٹھا لو" فرید نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔ "جلدی کرو۔ ٹوکرہ اٹھاؤ اپنا مجھے آگے جانا ہے۔ جلدی۔ جلدی۔"

لڑکی نے جھک کر نوٹ اٹھایا۔ متشکرانہ فرید کو دیکھا۔ دھیرے دھیرے بڑھی

سڑک کے درمیان پڑے ٹوکرے کو جھک کر اٹھایا اور بکھری چیزیں جلدی جلدی ٹوکرے میں ڈالنے لگی۔

فرید نے نیا سگریٹ سلگایا۔ اور لمبے لمبے کش لیتے ہوئے لڑکی کے سڑک سے ہٹنے کا انتظار کرنے لگا۔ لڑکی ٹوکرہ سر پر اٹھا کر سڑک سے نیچے اتر گئی۔ اور پگڈنڈی پر نیچے جانے لگی۔ یہ پگڈنڈی ان چند دکانوں کو جاتی تھی۔ جہاں سردی کے اس ٹھٹھرے ہوئے موسم میں کھانے پینے اور دیگر ضروریات کی چیزیں مل جایا کرتی تھیں۔

فرید سگریٹ کے دھوئیں اڑاتا گاڑی چلانے لگا۔ کچھ ہی دیر بعد وہ اگلے موڑ پر تھا جہاں سے کچھ نیچے اتر کر اس نے پھر لمبا چکر کاٹ کر گاڑی پارک کر دی تھی۔ اور پھر پہاڑ سے فرلانگ بھر کی چڑھائی چڑھ کر واپس اسی موڑ کے اوپر آ کر اپنی کوٹھی تک جانا تھا۔

اس کی کوٹھی ایک انتہائی خوبصورت مقام پر تھی۔ گو وہاں تک گاڑی نہ پہنچ سکتی تھی اور پہاڑ پر آ کر یہی تکلیف محسوس ہوتی تھی۔ لیکن کوٹھی کا گرد و پیش اتنا حسین، اتنا خاموش اور اتنا آرام دہ تھا۔ کہ یہ ذرا سی تکلیف گوارا کر لی جاتی تھی۔

اس کے مرحوم باپ نے یہ کوٹھی بڑی چاہت سے بنوائی تھی۔

—— ؛ ——

آج موسم بے حد نکھرا ہوا تھا۔ رات برف باری ہوئی تھی۔ نئی روئی کے گالوں کی طرح سپید سپید نرم نرم برف پہاڑ کے سینے پر بکھری ہوئی تھی چاندنی رات میں برف باری کا نظارہ فرید نے اپنی خواب گاہ کی بیرونی کھڑکیوں کے شیشوں سے کیا تھا۔ نور میں لپٹی ہوئی سفید دھند کا احساس ہوتا تھا۔ وہ کتنی ہی دیر بند کھڑکی کے صاف شفاف شیشوں میں قدرت کے اس حسین نظارے سے لطف اندوز ہوتا رہا تھا۔ صبح وہ دیر تک سویا رہا۔ لیکن جب آنکھ کھلی تو کھڑکیوں سے تازہ دم دھوپ کی چمکتی کرنیں اندر آ رہی تھیں۔ اور حد نگاہ تک سفید برف کی چادر سی تنی دکھائی دے رہی تھی۔

آج اسے یہاں آئے دوسرا دن تھا۔ کل پورا دن تو سو کر ہی گزار دیا تھا۔ لیکن آج باہر گھومنے پھرنے کا ارادہ تھا۔ اسے اپنے دوست کیپٹن افضل سے بھی ملنے اس کے فوجی مرکز جانا تھا۔

لیٹے لیٹے اس نے آج کا پروگرام مرتب کیا۔ سگریٹ سلگایا اور بڑی دل جمعی سے دھواں اگلتے ہوئے کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔

دروازہ کھلا۔ فرید نے سر گھما کر ادھر دیکھا۔ شمسو اندر جھانک رہا تھا۔

"کیوں بھئی۔" فرید نے اسے دیکھا۔ "چائے وائے نہیں ملے گی۔"

"ابھی لایا سرکار۔ میں تو دو دفعہ آ کر دیکھ چکا۔ آپ سوئے ہوئے تھے۔ رات دیر تک جاگتا رہا۔"

"کیوں صاحب۔"

"برف باری کا نظارہ کرتا رہا۔"

"بہت برف پڑی ہے جناب۔ دو فٹ سے بھی زیادہ۔ ہوا بھی چل رہی ہے آج سردی بھی بہت ہو گی۔"

"رات تو ٹھنڈ کوئی خاص نہیں تھی۔"

"برف جو گر رہی تھی جناب۔"

"برف گرتے وقت گرمی ہو جاتی ہے۔"

"جی صاحب۔ گھٹن اور حبس ہو جاتی ہے۔ لیکن بعد میں جب ہوا چلے تو ظلم کی سردی پڑتی ہے۔"

"اس کا مطلب ہے باہر خوب ٹھنڈ ہے۔"

"جی صاحب بہت زیادہ۔"

"تم تو ایک سویٹر ہی پہنے ہوئے ہو۔ ٹھنڈ نہیں لگتی۔ کمبل ہی اوڑھ لو۔"

"ہم تو عادی ہیں جناب۔" شمسو مالک کی طرف عقیدت سے دیکھ کر مسکرایا۔

"میں چائے لے آؤں سرکار۔"

"لے آؤ" فرید نے ریشمی رضائی سینے سے سرکائی۔ قدرے اونچا ہو کر پشت پر کے چوبی تکیے سے لگا دی۔ اور نئے سگریٹ کو ہونٹوں میں دباتے ہوئے لائٹر جلا سگریٹ سلگا کر وہ ایک انگریزی میگزین دیکھنے لگا۔ شمسو چائے لینے چلا گیا۔

شمسو اس کا پرانا ملازم تھا۔ کوٹھی کا تھا اور بیرے خانسامے کے فرائض بھی ادا کرتا تھا۔ ان فرائض کی ادائیگی معقول تنخواہ کی صورت پاتی تھی۔ اس وہ لگن سے کام کرتا تھا۔ سردی گرمی وہ یہیں گزارتا تھا۔ بیوی اور بچے بھی ساتھ رہتے چائے کی ٹرے اٹھائے وہ جلد ہی آ گیا۔ رسالہ دیکھ کر فرید نے ایک طرف

انگڑائی لی۔

"شاباش شمسو" فرید نے کہا۔

شمسو نے چائے میز پر رکھ دی۔ اور خود قالین پر بیٹھ کر صاحب کے لیے چائے بنانے لگا۔ فرید اس کے بوڑھے ہاتھوں کو مستعدی سے کام کرتے ہوئے دیکھنے لگا۔ اچانک اسے اس کے بڑے بیٹے کا خیال آ گیا۔

"اے شمسو۔"

"جی۔"

"کرامت کہاں ہے اسے میں نے نہیں دیکھا۔"

"جی وہ تو آجکل کراچی میں ہے۔"

"کراچی؟"

"جی صاحب۔"

"کیا کرتا ہے وہاں۔"

"مزدوری۔"

"کچھ تمہیں بھی بھیجتا ہے۔"

"ہاں صاحب، کبھی دوسرے تیسرے مہینے بھیج ہی دیتا ہے۔ دس بیس۔"

"خوب مزے ہیں شمسو تمہارے۔" فرید نے یونہی وقت گزاری کے لیے بات بڑھائی۔ "بیٹا کماؤ ہو گیا۔ بیٹیاں بیاہ دیں۔ اب چھوٹے دو ہیں یا تین؟"

"جی تین ہیں سرکار۔"

"بیٹے ہی ہیں نا۔"

"جی سرکار۔"

شمسو نے چائے بنا کر پیالی فرید کی جانب بڑھا دی۔ فرید مزے مزے چائے

کے گھونٹ حلق میں انڈیلنے لگا۔ شمسو بابا اب اپنی کتھا سنائے جا رہا تھا۔ مزید بے خیالی میں کوئی ایک آدھ جملہ سن کر ہوں ہاں کر دیتا۔

"پریشانی تو اب اس لڑکی کی ہے۔" شمسو بابا نے کندھے پر جھاڑن ٹھیک سے جماتے ہوئے کہا۔

"ہوں" فریدنے بلا ارادہ کہا۔ لیکن پھر چونک کر شمسو کی طرف دیکھا۔ کس لڑکی کی پریشانی کا شمسو ذکر کر رہا تھا۔ فریدنے دھیان سے اس کی بات سنی ہی نہ تھی۔

"بھائی مر گیا۔ بھاوج پاگل ہے۔ لڑکی کا بوجھ میرے سر ہی آن پڑا۔" شمسو کہہ رہا تھا۔

"تو تمہاری بھتیجی ہے" فریدنے یوں ظاہر کیا جیسے وہ بڑی توجہ اور دلچسپی سے شمسو کی رام کہانی سن رہا ہے۔

"جی سرکار۔"

"ہوں" فریدنے پھر بلا ارادہ آواز نکالی۔ چائے کی پیالی خالی کر کے اس نے آگے بڑھا دی۔ شمسو مودبانہ قدمے اٹھا اور پیالی صاحب کے ہاتھ سے تھام لی۔

"اور بناؤں صاحب۔"

فریدنے سر نفی کے انداز میں ہلایا۔ پھر انگڑائی لی۔ رضائی پرے پھینکی اور بستر سے باہر نکل آیا۔ شمسو ٹرے اٹھا کر باہر جانے لگا۔

"اے۔"

"جی صاحب۔"

"دوپہر کا کھانا میں نہیں کھاؤں گا۔ ایک دوست کے پاس جانا ہے۔ ناشتہ نو بجے تک تیار ہو۔"

"بہت بہتر سرکار!" شمسو بولا۔

"آں۔" فریدنے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ "دیکھو۔ کھانا تیار کر ہی دینا۔ ممکن ہے

انفضل نہ ملے۔ ہاں یہ ٹھیک ہے۔ تم کھانا تیار کر دینا۔ میں آ گیا تو کھا لوں گا۔ نہ آیا، تو رات کھا لوں گا۔ سمجھے۔"

"جی سمجھ گیا۔"

"جاؤ ناشتہ تیار کراؤ۔ میں تیار ہو کر آتا ہوں۔" فریدنے کہا۔ شمسو چلا گیا۔ اور فریدا ونی گاؤن پہنے کھڑکی سے باہر برفانی منظر دیکھنے لگا۔

اور پھر جب اس نے گھڑی دیکھی تو وقت کافی ہو گیا تھا۔ وہ جلدی سے غسلخانے کی جانب لپکا۔

ٹھیک نو بجے تیار ہو کر وہ کھانے کے کمرے میں پہنچ چکا تھا۔ نیلے گرم سوٹ میں اس کا نکھرا ہوا رنگ سردی کی شدت سے سرخ ہو رہا تھا۔ آتش دان میں موٹی موٹی لکڑیاں جل رہی تھیں۔ ان کے شعلوں کے عکس سے اس کی آنکھیں یوں سرخ دکھائی دے رہی تھیں۔ جیسے نشے میں ہوں۔

ناشتے کے بعد اس نے اپنا موٹا اوورکوٹ، فر کی ٹوپی اور دستانے اٹھائے اور کمرے سے باہر نکل گیا۔

افضل کورس پر گیا ہوا تھا۔ فریدہ کو سخت مایوسی ہوئی۔ کتنا کٹھن راستہ طے کر کے وہ اس کی میس تک پہنچا تھا۔ لیکن وہ تین ہفتے کے کورس پر باہر گیا ہوا تھا۔ اس کے کولیگ۔ فریدہ سے بڑے تپاک سے ملے تھے۔ وہ کچھ دیر ان کے پاس بیٹھا رہا تھا۔ لیکن جب واپس لوٹا تو طبیعت مکدر سی تھی۔ اس کی برق رفتاری سست رفتاری میں بدل چکی تھی۔ برفانی راستوں پر چلنا اذیت دہ تھا کئی جگہ اس کے پاؤں برف سے پھسلے۔ کتنی ہی جگہ وہ ٹخنوں تک برف میں دھنسا۔ برف پوش جھاڑیوں کا سہارا لے کر وہ اپنے راستے پر چلتا آیا۔

لطف کی جگہ کوفت نے لے لی تھی۔ افضل بڑا ہنس مکھ اور بذلہ سنج نوجوان تھا۔ اس کی صحبت میں چند دن گزارنے ہی وہ یہاں آیا تھا۔ اب تو اسے یہاں رہنا بے مقصد ہی لگ رہا تھا۔ تنہا کوٹھی۔ برف۔ اور وہ۔ بھلا کب تک۔ ان چیزوں سے دل بہلایا جا سکتا تھا۔ برف باری اس نے رات دیکھ لی تھی۔ برف پر چلنے کا شوق آج پورا ہو گیا تھا۔ باقی کیا رہ گیا تھا۔ سردیوں کی بارش کا بھی امکان تھا۔ بادل گھر رہے تھے۔ اور فضا میں سکوت اس بات کا غماز تھا۔ کہ بارش ہو گی۔

فریدہ ذہنی طور پر غیر آسودہ گھر کی جانب جا رہا تھا۔ طبیعت وہاں جانے کو نہ چاہ رہی تھی۔ لیکن کرتا بھی کیا۔ نام نہاد بازار وہاں سے دو کوس تھا۔ تھکاوٹ مانع تھی۔ اور پھر بازار میں بھی کبھی ہوتی رونق ہی ہو گی۔ کیا لینا وہاں جا کر۔

وہ یہاں تنہائی میں پر سکون ہونے آیا تھا۔ لیکن ایک آدھ دن ہی میں اسے احساس

ہونے لگا تھا۔ کہ تنہائی سے زیادہ تکلیف دہ اور کوئی شے نہیں۔ اسے اپنی حماقت پر غصہ آ رہا تھا۔ جو کسی پر رونق جگہ جانے کی بجائے اس نے اس برفانی ویرانے میں آنے کا پروگرام بنایا تھا۔ اس نے کل ہی واپس چلے جانے کا فیصلہ کر لیا۔

وہ سوچ میں ڈوبا گھر کی طرف جا رہا تھا۔ دو بجنے کو تھے۔ کالے کالے بادلوں نے سینۂ چرخ پر دھاوا بول دیا تھا۔ ہوا تھمی تھمی تھی۔ موسم بوجھل ہو گیا تھا۔ فریدہ اکتایا جھلایا ہوا تھا اس جھلاہٹ میں اسے جانے نظام کیسے یاد آ گیا۔ وہ ہمیشہ شادی کر لینے پر ہی زور دیا کرتا تھا۔ فریدہ کو خدا جانے کیوں نظام کی یہ بات حقیقت افروز لگی۔ واقعی اس وقت اس کے ساتھ اس کی بیوی ہوتی۔ تو اس برفانی ویرانے میں بہار آ گئی ہوتی۔

بیوی کے رنگین و حسین تصور نے اس کی رگوں میں دوڑتے ہوئے خون میں حدت سی پیدا کر دی۔ جوان اور خوبصورت عورت کا ساتھ اور برفانی تنہائیاں۔ فریدہ کی سوچوں پر کوئی پہرہ نہ رہا۔ اس کے ذہن کے پردے پر کئی عکس لہرائے۔ شائستہ سے اس کی بڑی دوستی تھی۔ ناصرہ اس کی کلب کی ساتھی تھی۔ نیٹا سے اس کے گہرے مراسم تھے۔ صبوحی بھی بے تکلفی سے ملنے والوں میں سے تھی۔ رانیہ اس کی جواں سال سیکرٹری تھی۔ کیا ہی اچھا ہوتا۔ جو وہ ان میں سے کسی کو ساتھ آنے کی دعوت دے دیتا۔ بیوی نہ سہی دوستوں کا ساتھ ہی خوش گوار ہوتا۔ لیکن ——— وہ سوچنے لگا۔ بے باکی بے تکلفی کے باوجود ان لڑکیوں میں سے کوئی بھی اس کے ساتھ آ جانے کو تیار ہوتی۔ جواب نفی ہی میں تھا۔ جوانی اور تنہائی آگ اور تیل کا ملاپ۔ ہونہہ۔ فریدہ نے سر جھٹک دیا۔

وہ اپنی کوٹھی کے قریب آ چکا تھا۔ ذہن سے ان بیہودہ خیالات کو جھٹک کر وہ برآمدے میں آیا۔ اوورکوٹ اتارا۔ ٹوپی اور دستانے میز پر پھینکے۔ پاؤں جھٹک کر برف کے گالوں بوٹوں سے ہٹائے۔ اور اپنے کمرے کی طرف چلا گیا۔

کمرے میں داخل ہوتے ہی وہ ٹھٹکا۔

آتش دان میں لکڑیاں تیزی سے جل رہی تھیں۔ کمرہ خاصہ گرم تھا اور اک خوش گوار تاثر کا حامل تھا۔

اس کی نظر آتش دان پر نہیں پڑی۔ نہ ہی نرم نرم ریشمی بستر پر۔ اس نے گدے دار کرسیوں کو بھی نہیں دیکھا۔ اور موٹے ایرانی قالین پر بھی نگاہ نہیں ڈالی۔ اس کی نظر بند کھڑکی کے صاف شفاف شیشوں پر پڑی۔ شیشوں سے منہ لگائے کوئی اندر دیکھ رہا تھا۔

وہ اک لڑکی تھی۔ اسے دیکھتے ہی ۔ لیکن پھر دیکھنے سے زیادہ گھورنے لگی پلکیں جھپکا جھپکا کر دیکھا۔ آنکھیں کھول کھول کر دیکھا۔ جیسے پہچاننے کی کوشش کر رہی ہو۔

فرید کو حافظے پر زیادہ زور نہیں دینا پڑا۔ وہ لڑکی یقیناً وہی تھی۔ جو کل سڑک پر اسے ملی تھی۔ جسے ہارن سے اس نے ڈرایا تھا۔ اور جسے دس روپے دے کر وہ یہاں چلا آیا تھا۔ لڑکی کو دیکھ کر اسے حیرت سے زیادہ مسرت ہو رہی تھی۔

وہ لڑکی یہاں کیسے آ گئی۔ فرید نے سوچا۔ پھر تیزی سے بڑھا اور بند کھڑکی کا پٹ ذرا سا کھول دیا۔

لڑکی جیسے سحر زدہ سی تھی۔ ایک ٹک اسے دیکھتے برف پر کھڑی رہی۔

"تم ۔۔۔ تم وہی ہو نا۔ کل والی۔" فرید نے مسکرا کر لڑکی کی طرف دیکھا "پہچانا مجھے۔" لڑکی نے منہ سے جواب دینے کی بجائے سر ہلا دیا۔ اس کی آنکھوں میں پہچان کی چمک تھی۔

"یہاں کیسے آ گئیں۔" فرید نے پوچھا اسے یوں محسوس ہونے لگا۔ جیسے تنہائی کی اذیتیں ٹوٹ رہی ہوں۔

"میں یہیں رہتی ہوں۔" لڑکی نے رکتے رکتے جواب دیا۔

"یہاں؟" فرید نے حیرت سے اسے دیکھا۔ پھر اسے شمسو کی باتیں یاد آ گئیں۔

"جوان بھتیجی۔ توبہ شمسو کی جوان بھتیجی ہے۔" فرید نے دل ہی دل میں کہا۔

"شمسو تیرا چچا ہے؟" فرید نے لڑکی سے پوچھا۔

"ہاں" اس کا لہجہ کھردرا نہیں تھا۔ وہ فرید کو اب بھی حیرت و مسرت کی ملی جلی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ "آپ شہر والے صاحب جی ہیں نا۔ چچی نے کل سودا آپ کے لیے ہی منگوایا تھا۔"

"کل پٹائی تو نہیں ہوئی تھی چچی سے" فرید نے لڑکی کو چھیڑا۔

"نہیں۔" لڑکی قدرے خوف زدہ سی ہو گئی۔ "میں ۔ میں سب کچھ لے آئی تھی نا۔ چچی کو پتہ بھی نہ چلا۔"

فرید مسکرایا۔ لڑکی نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر ہرنی کی سی حیرت سے جس میں پریشانی شامل ہو گئی تھی۔ فرید کی طرف دیکھا۔ "صاحب جی۔ چچی کو نہ بتائیے۔ کہ۔ کہ۔"

"اچھا بھئی! نہیں بتائیں گے۔ چلو تم جاؤ۔ شمسو سے کہو کھانا لگائے۔" فرید نے کھڑکی بند کرتے ہوئے کہا۔ لڑکی سے جانے اسے کیوں کچھ خوف سا آنے لگا تھا۔ جلی آگ لگ رہی تھی وہ۔

"شمسو چاچا بازار گیا ہے" لڑکی جلدی سے بولی۔

"کھانا نہیں لگایا؟" فرید نے قدرے پٹ کھول کر پوچھا۔ اس کی نظریں لڑکی کے چکنے گالوں سے پھسل گئیں۔

"پکایا ہے جی" اس نے کہا۔

"تو لگا دو۔ میں کھانا کھاؤں گا" فرید بولا۔ وہ جیسے کسی آزمائش سے دوچار تھا۔

"اچھا جی۔" وہ پھسلی۔ برف پر بڑے اعتماد سے چلتی، کوٹھی کے پچھلے حصے کی جانب چلی گئی۔ اس کی پُر اعتماد چال پر بھی زلزلے کے جھٹکوں کا احساس ہوتا تھا۔

فرید نے جلدی سے کھڑکی بند کر دی۔ جتنی دیر وہ لڑکی یہاں کھڑی رہی۔ اسے ٹھنڈی ہوا اور برفانی فضا کا احساس نہ ہوا تھا۔ یہ اس کے خیالات کی گرمی کا اثر تھا۔ یا لڑکی کی جوانی مجسم آگ تھی۔ فرید کچھ نہ سمجھتے، کچھ نہ سوچتے مڑا۔ اور کرسی آتش دان کے قریب کھینچ کر بیٹھ گیا۔ کل تو اس نے لڑکی کو اچھی طرح سے نہ دیکھا تھا۔ آج اسے دیکھتے ہی بہکنے لگا تھا۔ اس نے بے قراری سے کرسی پر پہلو بدلا۔ اور آتش دان پر نظریں جما دیں۔

اٹھتے شعلے، لپکتے شعلے، بجھتے شعلے، اس کی نظروں کے سامنے تھے۔ آگ! آگ! آگ اور انسان لازم و ملزوم ہیں۔ آگ سے انسان کا صدیوں پرانا رشتہ ہے قرنوں سے انسان اس سے دامن بچاتے ہوئے بھی جلتا چلا آیا ہے۔ اس کی جلن میں انسان نے ہمیشہ لذت پائی ہے۔"

آگ۔ جلتی ہوئی آگ۔ ٹھنڈی آگ۔ رگ و پے میں تیرتی آگ۔ ذہن کو جھلستی آگ۔ خیالات میں بہتی آگ۔ کسی نہ کسی طور پر یہ آگ انسان سے منسلک رہتی ہے۔ اور انسانی فطرت اس کی تپش میں لذت و تسکین کا احساس پاتی ہے۔

فرید کی سوچوں میں بھی اس وقت آگ ہی آگ تھی۔ بیوی کا تصور آگ تھا۔ شائستہ ناصرہ، نیلا اور رافیہ کا خیال آگ تھا۔ اور! اور اب شمسو کی جوان بھتیجی! اُف۔ آگ!۔

"کھانا لگا دیا ہے صاحب" پشت پر سے آواز آئی۔

فرید اٹھا۔ شمسو کی بھتیجی دروازے میں کھڑی تھی۔

فرید نے غور سے اسے دیکھا۔ اس کا سن انیس بیس کے درمیان ہوگا۔ حسین یقیناً نہیں تھی۔ لیکن اسے دیکھ کر حسن کا احساس ضرور ہوتا تھا۔ رنگت سپید نہ تھی لیکن یوں لگتا تھا۔ رات کی ظلمتیں صبح کے نور میں مل کر شفق میں ڈوب گئی ہوں۔

اس کے بھرے بھرے بدن کے کٹاؤ بڑے جذبات انگیز تھے۔ چہرے کی تنی اور چمکیلی جلد تھی۔ جس سے نظریں بار بار پھسل سکتی تھیں۔ بغیر چھوئے ہی اس کے بدن کی چکناہٹ اور مچھلی کی طرح پھسلنی تڑپ محسوس کی جا سکتی ہے۔ چھینٹ کے لال اور نیلے کپڑوں میں میل گندھی ہونے کے باوجود وہ کوئی صاف ستھری شفاف سی شے لگ رہی تھی۔

فرید کو جھرجھری سی آ گئی۔ اس نے ذہن کو جھٹک دیا۔ خواہ مخواہ اس لڑکی کے متعلق وہ قیافے لگانے لگا تھا۔

"چلو! میں آتا ہوں۔" اس نے لڑکی سے کہا۔ لڑکی

لڑکی چلی گئی۔ ایک بار پھر گرم کمرے کے باوجود اسے محسوس ہوا۔ کہ ٹھنڈ بہت زیادہ ہے۔ کھانے کے کمرے میں شمسو کی بیوی موجود تھی۔ گرم گرم کھانا میز پر لگا دیا گیا تھا۔

"شمسو کہاں گیا۔"

"بازار جی۔"

"ہوں۔"

فرید کھانا کھاتے ہوئے شمسو کی بیوی سے باتیں کرنے لگا۔ جو میلی سی چادر ماتھے تک کیے دروازے کے قریب کھڑی تھی۔ اور رک رک کر ٹھہر ٹھہر کر بڑے احترام سے فرید کی باتوں کا جواب دے رہی تھی۔

"ارے بلو۔" شمسو کی بیوی نے فرید کے کھانا کھا چکنے کے بعد دروازے میں کھڑے ہو کر پکارا۔

"آئی چاچی" آواز آئی۔

"بلو" فرید کے ذہن میں یہ نام نور ظلمت اور شفق کے گندھے ہوئے پیکر سے

ٹکرا گیا۔

"بیٹھا لے آ۔" شمسو کی بیوی کہہ رہی تھی۔

تھوڑی ہی دیر بعد بلو بیٹھا لیے اندر آ گئی۔

"یہ شمسو کی بھتیجی ہے سرکار" اس نے جلدی سے کہا۔ "سلام کر ری صاحب کو"

بلو نے سلام کیا۔ لیکن اس کی آنکھوں میں شوخی کی چمک تھی۔ بھرے بھرے باہر کو نکلے ہوئے ہونٹوں پر استہزائیہ مسکراہٹ تھی۔ جیسے چاچی کی کم فہمی پر ہنس رہی ہو۔

فرید نے بھی سر کے اشارے سے سلام کا جواب دیا۔

اس کی نظریں لڑکی کے پھیلے گالوں پر اٹکنے کی کوشش کر رہی تھیں۔

"شمسو کا بھائی مر گیا صاحب جی۔" چاچی چادر سے ہاتھ پونچھتے ہوئے بولی۔ "بیوی پاگل ہو گئی۔ لاہور پاگل خانے میں ہے۔ اس لڑکی کو ہم یہاں لے آئے۔ اور کیا کرتے صاحب جی۔"

فرید نے ایک بار پھر لڑکی کی طرف دیکھا۔ ماں اور باپ کے ذکر پر اس کے چہرے پر غم اور مایوسی کے بادل سے گھر آئے تھے۔

"اوہو۔" فرید نے اظہار ہمدردی کیا۔ "کہاں رہتا تھا شمسو کا بھائی۔"

"جی لاہور میں" وہ بولی۔ "ساری عمر وہیں گزار دی تھی اس نے۔"

"ہوں" فرید نے کہا۔ لڑکی کی بول چال میں شہریت اسی لیے رچی بسی تھی۔ لڑکی گنوار اور جاہل بالکل نہ لگتی تھی۔

"وہاں نوکری کرتا ہوگا۔" فرید نے بلو کی طرف پھر دیکھا۔

"جی" چاچی کی جگہ بلو نے جواب دیا۔ "میرا ابا بنک میں چوکیداری کرتا تھا۔"

"کس بنک میں" فرید نے لڑکی کی غالباً ذہانت پرکھنا چاہی۔

لڑکی نے بنک کا نام بتا دیا۔

فرید کچھ دیر دونوں کے ساتھ باتیں کرتا رہا۔

پھر

اٹھ کر اپنے کمرے میں آ گیا۔

جہاں کتنی ہی دیر جلتے بجھتے شعلوں پر نظریں جماتے وہ سوچوں میں ڈوبا رہا۔ افضل کے نہ ملنے پر مایوسی میں اس نے یہاں سے کل ہی واپس چلے جانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

لیکن آگ کے شعلوں کو دیکھتے ہوئے اس کی نظریں غماز تھیں۔ کہ اس فیصلے کو عملی جامہ پہنانے کا اب وہ کوئی ارادہ نہیں رکھتا۔

——— ٭ ———

گرم کمرہ اور آرام دہ بستر فرید کی آنکھوں میں نیند نہ لا سکے۔ آنکھوں میں خواب کی پرچھائیاں ڈولتی رہیں۔ یہ پرچھائیاں کبھی اندھیروں میں ڈوب جاتیں کبھی نیند میں نہا لیتیں اور کبھی شفق سے ٹکرا کر لہولہان ہو جاتیں۔

یہ برنافی سنانے اور بہکتی جوانی کس کی طالب تھی۔ فرید نے ہاتھوں پر سر گرا کر کئی بار سوچا۔ کئی بار سر جھٹکا۔ کتنی ہی بار اٹھ کر کمرے میں ٹہلا۔ بستر پر بیقراری کروٹیں لیں۔ خاموش تقاضے بڑھتے ہی گئے۔ اور وہ ان کے سامنے مجبور و بے بس ہوتا گیا۔

بلو کو شمسو نے اس کی خدمت پر مامور کر دیا تھا۔ خدا جانے وہ فرید کی شرافت سے مرعوب ہوا تھا۔ یا بوڑھے بدن میں دوڑ دھوپ کی ہمت نہ رہی تھی۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ غربت کے چیتھڑوں میں لپٹی بلو کی بھرپور جوانی کو وہ برف کی طرح ٹھنڈی اور پتھر کی طرح سخت سمجھ بیٹھا ہو۔ بہرحال بلو ہی اب فرید کا ناشتہ لے جاتی۔ وہی کھانا لے جاتی کافی وہی بناتی۔ اور فرید کے ساتھ کتنی کتنی دیر بیٹھی باتیں بھی وہی کرتی۔

تین چار یوم ہی میں وہ اس کے ساتھ کافی بے تکلف ہو گئی تھی۔ فرید کھانا کھاتا وہ سامنے کھڑی رہتی۔ فرید اپنے کمرے میں ہوتا۔ وہ قالین پر بیٹھی کبھی اس کے جوتے صاف کرتی۔ کبھی اس کے کپڑے تہہ کر کے رکھتی۔

فرید کے من میں ہلچل سی مچ جاتی۔ لیکن ہر بار وہ بیہودہ خیالات اور نجس خواہشات کو دبا کر رہ جاتا۔ ایک دم اسے کمرے سے نکل جانے کا کہہ دیتا۔ وہ ہرنی کی سی حیران آنکھوں سے اسے دیکھتے ہوئے کمرے سے چلی جاتی۔

لیکن حیرانی کا یہ انداز فرید کے سینے میں آگ سی لگا دیتا۔ یہ آگ آج بے طرح جل اٹھی تھی۔ بلو کمرے کے اندر آ رہی تھی۔ اور وہ کمرے سے باہر نکل رہا تھا۔ دونوں غیر ارادی طور پر ٹکرا گئے۔ ٹکراؤ غیر ارادی تھا۔ لیکن فرید کی حالت دنیا کے اس پہلے انسان کی سی تھی۔ جس نے دو پتھروں کو رگڑ کر آگ دریافت کی تھی۔ خوشی اور خوف کے ملے جلے جذبات سے وہ جیسے پاگل ہو گیا۔ اس نے بے صبری سے بلو کو اپنے بازوؤں میں دبوچ لیا۔ لیکن دوسرے ہی لمحے زور سے جھٹکا دے کر پرے ہٹا دیا۔ یوں جیسے آگ نے اسے جھلس ڈالا ہو۔

بلو تیزی سے بھاگ گئی۔ اور وہ لڑکھڑاتے قدموں سے بستر پر آن گرا۔ اسے شدت کی پیاس محسوس ہو رہی تھی۔ یوں لگ رہا تھا۔ جیسے چاروں طرف پانی ہی پانی ہے۔ لیکن اس پانی کے باوجود وہ پیاسا ہے۔ سیراب نہیں۔ یہ پانی پی کر پیاس بجھا نہیں سکتا۔

کیوں؟ کیوں؟ کیوں؟ یہ آتشیں کیوں؟ اس کے ذہن سے ٹکرا رہا تھا۔

یہ تشنہ سوال اس کے دماغ میں گونج رہا تھا۔

سزا و جزا کا تصور انسانی کردار کا محاسب بھی ہے اور محافظ بھی۔ بستر پر لیٹے لیٹے فرید نے اس تصور کی قید میں اپنا کردار محبوس کر دیا۔ لیکن جس سے اس کا دم گھٹنے لگا۔ بے چینی، انتشار اور پریشانی نے اسے گھیر لیا۔

رات بھیگتی جا رہی تھی۔ اور فرید کی ذہنی کش مکش بڑھتی جا رہی تھی۔ ایک طرف اس کے فطری تقاضوں کے بہاؤ تھے۔ اور دوسری طرف توبہ کا حصار۔

وہ کبھی سیلِ بے کراں میں حقیر تنکے کی طرح بہہ جاتا۔ اور کبھی توبہ کے سنگین حصار میں محفوظ ہو جاتا۔ وقت گزرتا چلا گیا۔ توبہ کی سنگین دیواروں سے فطری تقاضوں کے بہاؤ ٹکراتے رہتے۔

اور اسی بہاؤ اور ٹکراؤ میں وہ اونگھ سا گیا۔ اس کے خواب بھی منتشر تھے بیابانی وادیاں بھی تھیں۔ جن میں وہ ہلکا پھلکا ہو کر ہواؤں کے دوش پر تیرتا پھر رہا تھا عمیق

کھائیاں بھی تھیں۔ جن میں صدیوں کی زہریلی گیس بھری تھی۔ اور جن میں نیچے ہی نیچے اترتے ہوئے اس کا دماغ چکرا چکرا کر ماؤف ہو رہا تھا۔

کبھی وہ آسمان کی نیلگوں وسعتوں میں ستارہ بن کر چمک رہا تھا۔ اور کبھی پاتال کی گہرائیوں میں بو چھوڑتے ہوئے مردہ جسم کی طرح سڑ رہا تھا۔ رات بیت گئی۔ دن نکلا۔ لیکن یہ دن روشن نہیں تھا۔ رات کی ہی طرح دھندلا یا دھندلایا سا تھا۔ سورج کی کوئی کرن کوئی چمک، کوئی روشنی نظر نہ آتی تھی۔ گھٹاؤں کا گھٹا ٹوپ اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔

فرید نے آنکھ کھولی۔ تو بلو چائے کی ٹرے لیے اندر آ رہی تھی۔ وہی چھینٹ کے میلے کچیلے کپڑے تھے۔ لیکن کپڑوں کی بوسیدگی میں بھی اس کا نکھار پھوٹا پڑ رہا تھا۔ وہ بڑے ہی حسین انداز میں اسے دیکھ کر مسکرائی۔ اس کی آنکھوں میں کل شام کے نکھار کا تاثر زندہ اور جاندار تھا۔

فرید نے پوری آنکھیں کھول کر اسے دیکھا۔ ٹرے میز پر رکھتے ہوئے بلو نے اس کی نظروں کی بیباکی سے اپنا جسم چرانے کی کوشش کی۔ فرید کئی لمحے اسے شوق و تجسس سے دیکھتا رہا۔

"بلو"۔

"جی"۔

"تمہیں ٹھنڈ نہیں لگتی"۔

"جی۔ جی۔ لگتی ہے"۔

"پھر کوئی گرم کپڑا کیوں نہیں پہن لیتی"۔

"ہے ہی نہیں"۔

"اوہ"۔

فرید ایک دم بستر سے نکلا۔ دوسرے کمرے میں الماری میں اس نے صغیرہ آپا کے کچھ گرم کپڑے رکھے دیکھے تھے۔ غالباً وہ اگلے سیزن کے لیے یہیں چھوڑ گئی تھیں۔ صغیرہ آپا کو ان کپڑوں کی ضرورت بھی کیا تھی۔ اور خرید سکتی تھیں لیکن یہ! یہ! جوان سی لڑکی۔ سردی میں ٹھٹھر رہی تھی۔ اسے ان کپڑوں کی زیادہ ضرورت تھی۔ وہ دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ اور الماری سے سارے کپڑے اٹھا لایا۔ قالین پر پھینکتے ہوئے بولا:

"یہ کپڑے تم لے لو"۔

"جی۔ میں۔ میں"۔ بلو نے حیران نظروں سے فرید کی طرف دیکھا۔

"ہاں ہاں تم۔ صاف ستھری رہا کرو۔ میرا کھانا پکاتی ہو نا۔ مجھے گندگی سے گھن آتی ہے۔ اٹھا لو۔ کچھ چاچی کو دے دینا۔ لے جاؤ"۔

"لے جاؤ نا" فرید نے پلنگ پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "گرم کپڑے ہیں۔ پہن کر آؤ۔ یہ کالی شال تم لینا"۔

بلو کی خوشی کی انتہا نہ رہی تھی۔ اس نے کالی شال سر پہ ڈال لی۔ اور باقی کپڑے بازوؤں میں بھرتے کمرے سے نکل گئی۔

فرید نے اطمینان سے سگریٹ سلگایا۔ اور لمبے لمبے کش لیتے ہوئے سوچنے لگا۔ اس نے جو فعل کیا ہے کیا وہ مستحسن ہے؟

"غریبوں کی مدد کرنی چاہیئے۔ آخر ان میں بھی جان ہے۔ اس بلا کی سردی میں بیچاری لڑکی سوتی کپڑے پہنے پھرتی ہے۔ وہ بھی انسان ہے۔ جانور تو نہیں۔ ہم جیسے لوگوں کو ان کا خیال رکھنا چاہیئے۔ یہ اخلاقی فرض ہے"۔

وہ سگریٹ کا دھواں چھوڑتے ہوئے اپنے آپ سے مخاطب تھا۔ لیکن اس کا اپنا آپ بڑا ٹائٹ کھیٹ تھا۔ جھوٹ کی پردہ پوشی نہیں کر سکتا تھا۔ فرید پر طنزیہ

قہقہوں کی بارش کرتے ہوئے جواب دے رہا تھا "کیوں ستر پوشی کرتے ہو میاں تم نے غریب کو رحم کر کے ڈھانپا نہیں ہے۔ نہ ہی تمہیں اس کی سردی کا احساس ہو ہے سچی بات تو یہ ہے کہ تم اس لڑکی کو اپنے قریب لانے کے وسیلے تلاش کر رہے ہو۔ تمہیں اس کے میلے کچیلے کپڑوں سے گھن آتی ہے۔ اور اسے قریب کرنے سے پہلے تم چاہتے ہو۔ وہ جاذب نظر اور قابل توجہ بن جائے۔ اور یوں اسے احسان مند کر کے قربت کی راہ ہموار کر رہے ہو۔

فرید سٹ پٹا گیا۔ رات کی کش مکش کیا کم تھی۔ جو ضمیر نے ایک اور شوشہ چھوڑ دیا تھا۔ وہ بے توجہی سے سگریٹ پر سگریٹ پھونکتا چلا گیا۔ ضمیر کی آواز اک حقیقت تھی۔ جسے جھٹلانے کی پوری کوشش کرنے کے باوجود وہ تسلیم کر چکا تھا

"صاحب جی" شمسو کی آواز پر وہ چونک پڑا۔

"کیوں؟"

"یہ کپڑے صاحب" شمسو کے ہاتھ میں کپڑوں کا وہ ڈھیر تھا۔ جو ابھی ابھی اس نے بلو کو بخشا تھا۔

"کیوں؟"

"آپ!۔ آپ نے دیے ہیں۔ یا لڑکی الماری سے نکال لے گئی؟" فرید خوش دلی سے ہنسا۔

"ہم غریبوں کے لیے یہ۔"

"اوہ! شمسو" فرید بستر میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اپنے مالک کی طبیعت کا تجھے اب تک پتہ نہ چل سکا۔"

"جی۔ جی صاحب" شمسو حیران تھا۔

"لے جاؤ یہ کپڑے۔ میں نے ہی بھجوائے ہیں۔ کچھ بیوی کو دے دینا۔ کچھ بلو

کو۔ اتنی بلا کی سردی ہے۔ خدا جانے لوگ کیسے گزارہ کرتے ہیں۔ میں نے تمہارے لیے بھی ایک کوٹ رکھا ہوا ہے۔ میں تو تم لوگوں کو دیکھ کر بھی ٹھٹھرنے لگتا ہوں تو یہ سردی بھی تو قیامت کی ہے۔ یہ کپڑے اپنی بیوی اور بلو کو پہناؤ۔ ہمارے لیے یہ بیکار ہی ہیں۔"

فرید جس اپنائیت اور خلوص کا اظہار کر رہا تھا۔ بوڑھے شمسو کے لیے کچھ جچ جانے کا مقام تھا۔

"خدا آپ کو اس کا اجر دے صاحب۔" بوڑھے کی زبان احسان کے بوجھ سے لڑکھڑا گئی۔ اس کی آنکھوں میں پانی سا تیرنے لگا۔

"بھئی مجھے گندگی سے گھن آتی ہے۔ بلو میرا کھانا لاتی ہے۔ تو اسے گندے لباس میں دیکھ کر جی متلانے لگتا ہے۔ کم از کم جتنے دن میں یہاں ہوں۔ تم سب لوگوں کو صاف ستھرا رہنا پڑے گا۔" فرید نے ہنستے ہوئے کہا۔

شمسو نے جھک کر صاحب کو سلام کیا "سرکار اب آپ کو شکایت کا موقعہ نہیں ملے گا۔"

"پھر تم بھی اپنا کوٹ لے لینا۔"

"بہت بہتر سرکار۔ خدا آپ کا بھلا کرے۔ کرامت کی ماں تو سردی کی وجہ سے بیمار ہو گئی ہے۔ پسلیوں میں درد رہتا ہے۔"

"یہ گرم کپڑے اسے پہنا دو۔ ٹھیک ہو جائے گی۔"

شمسو منہ سے ہزاروں اور دل سے لاکھوں دعائیں دیتا کمرے سے نکل گیا۔ گرم شالیں، گرم سوٹ اور گرم سویٹر! یہ سب اس کی بیوی کے تھے۔ اپنی کمائی سے تو وہ عمر بھر میں ایسا ایک بھی جوڑا بیوی کے لیے نہ بنوا سکا تھا۔

— ٭ —

دو گھنٹے باہر گھومنے پھرنے کے بعد گھر آیا۔ تو بلو اسے برآمدے میں ہی مل گئی۔ گہرے فیروزی سمر کے سوٹ پر اس نے کالی کشمیری کڑھائی کی شال اوڑھ رکھی تھی۔ کپڑے ڈھیلے ڈھالے تھے۔ صغیرہ آپا کا جسم بھاری تھا نا۔ لیکن ان ڈھیلے ڈھالے کپڑوں میں بھی بلو جیسے قیامت کا روپ دھار گئی تھی۔

"اوہو" میں سمجھا۔ کوئی مہمان آیا ہے۔" فرید نے جان بوجھ کر بلو سے کہا۔

بلو کسمسائی، شرمائی اور کالی شال کا سر سے کھسکتا پلو سر پہ جمانے لگی۔

"تم تو بالکل شہری لڑکی لگ رہی ہو۔" فرید نے پُرشوق نظروں سے اسے دیکھا۔ "اتنی خوبصورت ہو تم۔"

بلو شرما کر وہاں سے کھسک گئی۔

فرید گنگناتا ہوا اپنے کمرے میں آ گیا۔ اسے یوں لگ رہا تھا۔ کہ رات جو اس نے توبہ کا سنگین حصار اپنے کردار کے گرد تعمیر کیا تھا۔ وہ دراصل ریت کا مینار تھا۔ جو اوپر اٹھنے کی بجائے پھیلتا چلا گیا تھا۔

اس کی توبہ ٹوٹ چکی تھی۔

اور ــــ جب توبہ ٹوٹ جائے۔ تو اخلاق و کردار کے سبھی بند ٹوٹ جاتے ہیں۔ سزا و جزا کا تصور بے معنی ہو کر رہ جاتا ہے۔ گناہ و ثواب کی تمیز مٹ جاتی ہے۔ اور انسان محض اپنے جذبات کا غلام ہو کر رہ جاتا ہے۔ یہ غلامی وقتی طور

پر بڑی ہی مسحور کن ہوتی ہے۔ بڑی ہی لذت بخش اور بڑی ہی خوبصورت دکھائی دیتی ہے۔

فرید جذبات کے آگے ہتھیار ڈال چکا تھا۔ بلو اس کے حواس پہ چھا گئی تھی۔ وہ اس کی دسترس سے دور نہ تھی۔ فرید نے اس پہ ڈورے ڈالنا شروع کر دیئے۔

محبت کا فریب بڑا حسین ہوتا ہے۔ بھولی بھالی بے سہارا لڑکی اس فریب میں جلد ہی آ گئی۔ اس کی آنکھیں صرف فرید کو دیکھنے کے لیے وقف ہو گئیں۔ اس کے کان فرید کی آواز سننے کو مخصوص ہو گئے۔ اور اس کے جوان کنوارے دل کی دھڑکنیں فرید ہی کے لیے سمٹ گئیں۔

"بلو! تم کتنی حسین ہو۔"

"تم اب تک کہاں تھیں۔"

"تم نے تو مجھے بے بس کر دیا ہے۔"

"میری دلہن بنو گی نا۔"

"تم میرے دل کی رانی ہو۔"

"تم میری جان ہو۔"

قربتیں سمٹ رہی تھیں۔ اور یہ مدہوش کن فقرے بلو کے کانوں میں فردوسی نغموں کی طرح ٹپک رہے تھے۔ سہانے مستقبل کا دلفریب تصور حواس پر نشہ بن کر چھا رہا تھا۔ اس نے لاہور میں بڑی بڑی لمبی کاروں میں بیٹھی بیگمیں دیکھی تھیں۔ اس نے بڑے بڑے شو کیسوں دکانوں میں جھلملاتی ساڑھیوں والی امیر عورتوں کو خریدتے اور فروخت کرتے دیکھا تھا۔ اس نے حسین و نوجوان مردوں کے بازوؤں کے سہارے ناز و انداز سے چلنے والی بیویاں بھی دیکھی تھیں۔ انہیں دیکھ کر دل مچلا ضرور کرتا تھا۔ لیکن حد فہم و ادراک سے بھی یہ خیال بعید تھا۔ کہ کبھی وہ بھی ان کی طرح ریشمی چمکیلے، بھڑکیلے کپڑے پہن کر ایک حسین نوجوان مرد کے مضبوط بازو پہ جھولتی لمبی سی چمکتی

موٹر سے باہر نکل کر ناز و انداز سے چلتی بڑے بڑے شو کیسوں والی دکانوں میں قیمتوں کا تعین کیے بغیر چیزیں خریدا کرے گی۔

فرید اسے ایک جھلملاتے خواب آگیں مستقبل کا بہلاوہ دے رہا تھا۔ بلو آنکھیں بند کیے اس کی طرف لپک رہی تھی۔

سہ پہر ڈھل رہی تھی۔ فرید اور بلو اوپر سے نیچے جا رہے تھے۔ راستہ برف سے پٹا ہوا تھا۔ فرید نے بلو کا ہاتھ تھام رکھا تھا۔ بلو دوسرے ہاتھ سے خود رو ٹہنیوں کا تھام تھام کر توازن برقرار رکھ رہی تھی۔ ہوش و حواس فرید کے ہاتھ کی مضبوط گرفت سے زائل ہوتے جا رہے تھے۔

اچانک اس کا پاؤں پھسلا۔ یا جھوم جھوم جانے والے ذہن کا ذکر چلا۔ بلو بے سہارا ہو کر لڑھکی۔ فرید نے لپک کر اسے اپنے دونوں بازوؤں میں تھام لیا۔

"ہائے ۔" بلو کے ہونٹوں سے یہ صدا نکلی۔ فرید کے ہونٹوں نے دوسرے ہی لمحے اس آواز کو جذب کر لیا۔ اور پھر وہ بے نام سی صدائیں وحشیانہ طریق سے جذب کرتا چلا گیا۔

بلو پر شادیٔ مرگ کی سی کیفیت طاری تھی۔ اس کا سارا جسم کوئی گاڑھی گاڑھی سیال سی چیز بن گیا۔ جو فرید کے بازوؤں سے پھسل پھسل گیا۔ اس کی آنکھیں بند ہو گئیں۔ بیہوشی اور مدہوشی کے بین بین کوئی کیفیت اس پر طاری ہو گئی۔

فرید بے بس ہوا جا رہا تھا۔ اس کا چہرہ لالی بھبوکا ہو رہا تھا۔ اور اس کی آنکھوں سے آگ کی لپٹیں نکل رہی تھیں۔ چاروں طرف برف ہی برف تھی۔ ہوا میں بھی تندی آ رہی تھی۔ لیکن وہ بھٹی کی طرح جل رہا تھا۔

بلو نے کچھ سہارا لیا۔ فرید کی حالت سے وہ خوف زدہ سی ہو گئی۔

"چھوڑ دو مجھے" اس نے مچلتے ہوئے کہا۔

"نہیں۔" فرید بدمست شرابی کی طرح بہکا ہوا تھا۔

"ہائے ہائے!" وہ اس کے بازوؤں سے نکلنے کی جدوجہد کرنے لگی۔

"تم میری ہو بلو۔ بالکل۔ میری۔ میرے دل کی رانی۔ میرے گھر کی ملکہ۔" فرید جیسے نشے میں تھا۔

لیکن ۔ اب تو ۔ چھوڑ دو نا۔ کسی نے دیکھ لیا تو ۔" بلو چکنی مچھلی کی طرح فرید کے ہاتھوں سے پھسل گئی۔ فرید لڑکھڑاتے ہوئے اس کی جانب بڑھا۔

"ہونہہ ۔ بڑے وہ ہو جی تم ۔" بلو نے اپنی شال اٹھاتے ہوئے پیار سے فرید کو گھورا۔

"تنگ نہ کرو بلو ۔ آ جاؤ ۔" اس نے دونوں ہاتھ پھر پھیلا دیے۔

سر کو نفی میں ہلاتے ہوئے بلو برف پر دوڑی۔

فرید لپکا۔ کچھ ہی دور اس نے بلو کو پھر جا لیا۔

"بلو۔"

"چھوڑ دو مجھے۔"

"نہیں۔"

"پاگل تو نہیں ہو گئے۔ میرا تو دل ڈوبنے لگا ہے۔"

"پاگل ہی ہو گیا ہوں۔"

"چلو گھر ۔ اتنی ٹھنڈ ہو رہی ہے ۔"

"ایک شرط پر چلتا ہوں۔"

"وہ کیا ۔"

"جان جاؤ ۔"

"[illegible] ہوں۔"

"ٹھیک!"

"ہائے ہائے۔ کیا کرتے ہو۔"

"رات آؤ گی نا۔"

بلو خاموش ہو گئی۔ جذبات کی جس ڈگر پر چل رہی تھی۔ انکار بھی ممکن نہ تھا۔ ا
ان دیکھی دنیا کی جھلک دیکھ کر باؤلی سی بھی ہو رہی تھی۔ لیکن خوف زدہ بھی تھی۔ چاچ
کا ڈر تھا۔

لیکن فرید کا اصرار، لجاجت، شوق اور محبت۔ یہ بھی تو زوردار آزمائش
تھیں۔ پھر وہ فرید کی ہو ہی چکی تھی۔ اپنے آپ کو اس کے اختیار میں دے دینا ہی
فرید نے محبت کا داؤ ایک بار پھر مارا۔

"بلو! تم میری جان ہو۔ میری زندگی ہو۔ میری ہونے والی دلہن ہو۔ میرے گ
کی ملکہ ہو۔ میرے صبر کو نہ آزماؤ بلو۔ وعدہ کرو۔ کر دو وعدہ۔"

اور بلو بے سہارا جوانی بے آسرا نسوانیت فرید کے جھانسے میں بڑی خام
رضامندی اور شوق سے آ گئی۔

رات چاچی بے خبر سو رہی تھی۔ شمسو اور تینوں چھوٹے لڑکے بھی خوابوں کی
میں بے سدھ پڑے تھے۔ بلو بار بار کروٹیں بدل رہی تھی۔ اس کا دماغ کام نہ
کر رہا تھا۔ صرف دل دھڑک رہا تھا۔ فرید سے کیے ہوئے وعدے کی لے پر
رہا تھا۔ آنکھوں میں سنہری مستقبل انگڑائیاں لے رہا تھا۔

سب کے بے خبری سے سو جانے پر وہ اٹھی۔ چوروں کی طرح ادھر ادھ
دیکھتے ہوئے بے آواز قدم اٹھاتے کمرے کا بند دروازہ کھولا۔ مڑ کر اطمینا
شمسو کو جھک کر دیکھا۔ مامی کے خراٹے سنے۔ بچوں کی طرف گئی۔ سب سو
رہے تھے۔

وہ سو رہے تھے۔ بلو بھی تیزی سے قدم اٹھاتے اپنا نصیب سلانے چل دی۔
فرید اپنے کمرے میں اس کے انتظار میں بے چینی سے ٹہل رہا تھا۔ بلو حواس
باختہ سی کمرے میں داخل ہوئی۔

دوسرے ہی لمحے وہ فرید کے بازوؤں میں تھی۔

انجام و عواقب سے بے نیاز ہو کر اس نے اپنا آپ فرید کے حوالے کر دیا۔

اور

فرید نے بھی انجام و عواقب سے بے خبر ہو کر بہیمانہ طور پر اسے اس طرح لوٹ
لیا۔ کہ رات کا سانس رک گیا۔ اور فضا ساکت ہو گئی۔

انسانیت کا سر نگوں ہو گیا۔ اور شرافت کی دھجیاں بکھر گئیں۔

—— ٭ ——

بلّو اس پُراعتماد مسافر کی طرح تھی۔ جسے منزل تک پہنچنے کا اتنا مستحکم یقین ہو کہ ہر گام منزل سے ٹکراتا نظر آئے۔ اپنا تن من اس نے فرید کے حوالے کر دیا تھا۔ وہ اس کی ہو گئی تھی۔ یہ سمجھ کر کہ فرید اس کا ہے۔ اس کا مجازی خدا۔ اس کا مستقبل۔ اس کی خوابوں کی تعبیر۔ اس جھوٹ اور فریب کو اس نے زندہ حقیقت مان کر اپنا جسم فرید کی خواہشات کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھا دیا تھا۔

یوں اس کی کئی راتیں فرید کے سنگ مہکتی رنگینیوں میں کھو گئیں۔

فریب سُود اتنا مسحور کن تھا۔ کہ احساسِ زیاں جاتا رہا۔

وہ اپنے آپ کو فرید کی باحیا اور پاکباز بیوی متصور کیے ہوئے تھی۔ بیویوں کے سے انداز بھی خدا جانے اسے کیسے آ گئے تھے۔ شاید یہ نسوانی حس تھی۔ وہ اسے تنگ کرتی۔ مستانی ناز و انداز دکھاتی۔ روٹھ جاتی۔ انتظار کرواتی۔ لیکن بالآخر انداز سپردگی سے مچل جاتی۔

"میرے راجہ" وہ فرید کے گلے میں بانہیں ڈال کر پکے ہوئے پھل کی طرح اس کی آغوش میں گر جاتی۔ فرید اسے رانی کہہ کر بازوؤں میں جکڑ لیتا۔

اور بلو کو یوں لگتا۔ جیسے وہ سارے زمانے کے حادثات سے محفوظ ہو گئی ہو۔ تحفظ کا احساس جبلّی ہے۔ بلو جو اس جبلی جذبے کی تسکین کے لیے اک عرصے سے خاموشی سے تڑپ رہی تھی۔ اب اک تواتر سے تسکین پانے لگی۔

شراب کتنی ہی تند و تیز ہو اور اس کا نشہ کیسا ہی بھرپور۔ اک وقت آتا ہے

کہ نشہ ٹوٹنے لگتا ہے۔ دھت ہونے کا بھی عرصہ ہوتا ہے۔ بے سدھ ہونے کا بھی وقت ہوتا ہے۔

فرید کی آنکھوں میں نشے کی جو کیفیت چھائی تھی۔ ٹوٹنے لگی تو اسے اپنا آپ اور بلو صحیح طور پر نظر آنے لگی۔

وہ کیا کر چکا تھا۔ اس پر اسے کچھ پچھتاوہ تھا۔ لیکن جو ہو چکا سو ہو چکا۔ اب اسے کیا کرنا چاہیئے؟ یہ سوچ ابھرنے لگی تھی۔ احساسِ گناہ، لذتِ گناہ پہ بھاری پڑنے لگا تھا۔

پھول کی رعنائیاں اور شادابیاں لوٹ لینے کے بعد بھونرا اڑنے کو پر تولنے لگتا ہے۔ روکھے پھیکے پھول میں مہک ہی نہیں رہتی۔ یا اس کا لوٹ لینے کا جذبہ تسکین پا چکا ہوتا ہے۔ بہرحال بھونرا اڑ ہی جاتا ہے۔

بلو کے چکنے ملائم گالوں کی جاذبیت۔ اس کے مچھلی کی طرح پھسلتے جسم کا حسن اب فرید کے لیے کوئی کشش نہ رکھتا تھا۔ وہ واپسی کا سوچنے لگا۔

"کیا سوچ رہے ہو راجہ!" بلو نے فرید سے ایک دن پوچھ ہی لیا۔

"واپس جانے کا سوچ رہا ہوں۔" فرید نے صاف کہہ دیا۔

"کب جاؤ گے۔" اس نے بے صبری سے پوچھا۔

"دو ایک دن میں۔" فرید نے اس کے تاثرات کا جائزہ لینے کو اس کے چہرے پر نظریں گاڑ دیں۔ بلو کے چہرے پر غم و فکر کا کوئی سایہ نہ تھا۔ اک اطمینان بھری اور شرمگین سی مسکراہٹ تھی۔

"تمہیں میرے چلے جانے کا دکھ تو ہو گا۔" فرید نے معاملہ جانچنا چاہا۔

"کیوں؟" وہ حیرانگی سے بولی۔ "مجھے بھی تو ساتھ لے جاؤ گے نا۔"

"اوہ۔" فرید ٹھٹک گیا۔

"کیا سوچ رہے ہو راجہ۔" بلو نے فرید سے ایک دن پوچھ ہی لیا۔

"واپس جانے کا سوچ رہا ہوں۔" فرید نے صاف کہہ دیا۔

"کب جاؤ گے؟" اس نے بے صبری سے پوچھا۔

"دو ایک دن میں" فرید نے اس کے تاثرات کا جائزہ لینے کو اس کے چہرے پر نظریں گاڑ دیں۔ بلو کے چہرے پر غم و فکر کا کوئی سایہ نہیں تھا۔ اک اطمینان بھری شرمگیں سی مسکراہٹ تھی۔

"تمہیں میرے چلے جانے کا دکھ تو ہوگا۔" فرید نے معاملہ جانچنا چاہا۔

"کیوں؟" وہ حیرانگی سے بولی۔ "مجھے بھی تو ساتھ لے جاؤ گے نا۔"

"اوہ!" فرید ٹھٹک گیا۔

"کیوں" وہ گھبرا گئی۔ "کیا مجھے ساتھ نہیں لے جاؤ گے؟"

فرید نے پینترا بدلا۔ مسکرا کر اس کے سڈول بازوؤں کو تھام کر اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولا۔

"پگلی۔ تجھے یوں تھوڑا لے جاؤں گا۔"

"تو پھر؟" ۔ پھر کیسے لے جاؤ گے" وہ جیسے چکرائی جا رہی تھی۔

"دلہن بنا کر" فرید نے اسے سینے سے لگا کر بھینچ لیا۔

بلو کو جانے آج بازوؤں کا یہ حصار کیوں کھوکھلا لگا۔ کھوکھلا تو شروع ہی سے تھا جنسی جذبات کی گرمی نے کبھی اس کھوکھلے پن کو محسوس نہ ہونے دیا ہو تو بات اور تھی۔ دونوں ہاتھ فرید کے سینے پر رکھتے ہوئے اس نے فرید کو قدرے پرے دھکیلا اور اس کی آنکھوں میں اپنی حیران آنکھیں ڈالتے ہوئے بوکھلائی سی بولی۔

"راجہ۔ دھوکہ تو نہ دو گے۔"

"یہ تم نے کیوں کر سوچ لیا بلو۔" فرید نے اس کی تسکین کی خاطر کہا۔

"تم۔ تم چلے گئے۔ تو میں کیا کروں گی۔" وہ آنسو بھری آنکھوں سے التجا کرنے لگی۔

"دلہن بننے کی تیاری۔" فرید نے اس کے ہونٹوں کو چھونا چاہا۔ لیکن وہ رو دی۔

"پگلی" فرید نے سہارا دے کر کہا۔ "بھلا اس میں رونے کی کیا بات ہے۔"

"راجہ"

"ہوں۔"

"مجھے ساتھ ہی لے چلو۔ میں اب تمہارے ساتھ ایک دن نہیں رہ سکتی۔"

بھری آنکھوں سے فرید کا چہرہ دیکھتے ہوئے بلو نے دل ہلا دینے والی عاجزی سے کہا۔

"بلو" فریدہ نے بہلاوہ دیا۔ "تم نہیں سمجھتیں۔ کہ تم کتنے بڑے آدمی کی بیوی بننے والی ہو۔ میں تمہیں اپنے خاندانی وقار اور عزت کے ساتھ بیاہ لے کر جاؤں گا۔ اگر یونہی لے جاؤں تو خاندان اور ملنے جلنے والوں میں تمہاری کیا عزت ہوگی۔ سمجھیں۔"

بلو کچھ نہ سمجھی۔ وہ تو صرف اتنا ہی سمجھ پا رہی تھی۔ کہ فرید عنقریب اسے چھوڑ کر چلا جائے گا۔ اس کا کلیجہ مسلا جا رہا تھا۔

"چلو یوں ہمت ہار دو گی۔ تو میرا حوصلہ بھی ٹوٹ جائے گا۔" اس نے روتی ہوئی بلو کی پشت پر تھپکی دی۔

"راجہ" وہ بے خود ہو کر اس کے کندھے سے لگ کر رونے لگی۔

فرید خاموش رہا۔ جانتا تھا رو دھو کر خود ہی چپ ہو جائے گی۔

کئی لمحے گزر گئے۔ پھر بلو نے چہرہ اوپر اٹھایا۔ بھیگے گالوں کو کالی شال سے پونچھا۔ اور بے اعتباری سے فرید کی آنکھوں میں جھانک کر ڈوبتی آواز میں کہا۔

"راجہ اگر تم اپنا وعدہ بھول گئے۔ تو ۔۔۔"

"کیسے بھول سکتا ہوں۔" فرید نے اس کا گال تھپ تھپایا۔ "فکر نہ کرو میں ضرور آؤں گا۔"

"کب؟" اس نے جلدی سے پوچھا۔

"آں۔" فرید ایک دم کچھ نہ کہہ سکا۔ پھر سوچتے ہوئے بولا۔ "یہ تو اب وہاں کے حالات پر منحصر ہے نا۔ جب سارا انتظام ہو جائے گا۔ تو آجاؤں گا۔ آخر ایک شاندار شادی کی تیاری میں وقت بھی تو لگتا ہے نا۔ تمہارے لیے خوبصورت لباس تیار کروں گا۔ سونے کے بھاری بھاری زیور بنواؤں گا۔"

بلو کو یہ جھانسے مطمئن نہ کر سکے۔ "پھر بھی کتنے دنوں بعد؟" وہ جھلا کر بولی۔

"مہینہ دو تو لگ ہی جائیں گے۔" فرید نے کھڑکی کی طرف مڑتے ہوئے سگریٹ سلگایا۔

"راجہ" اس نے فرید کی پشت پر بے تابی سے ہاتھ رکھ کر کہا۔

"ہوں" فرید نے گردن کو خم دے کر اس کی طرف دیکھا۔

"مہینہ دو۔" وہ اس کے سامنے آکر کلیجہ پکڑ کر بولی۔

"ہاں۔ بلو۔ کم از کم اتنا عرصہ تمہیں انتظار کرنا پڑے گا۔" فرید نے سگریٹ کا کش لیا۔

"اور۔ اور۔ جو۔" بلو نے مٹھی سے اپنا گریبان مسلتے ہوئے کسی تباہ کن بات کے متعلق کہنا چاہا۔ فرید نے اس کے سراپا پر گہری نظر ڈالی۔

بلو نے تشویش ناک نظروں سے اسے دیکھا۔ اس کی نظروں نے جو کہا۔ فرید نے سمجھ لیا۔ ایک لمحہ کو اس کا دماغ بھی چکرا گیا۔

یہ مہکتی ہوئی تنہائیاں۔ یہ رنگین راتیں یہ جذبات کے بہکاوے، کوئی رنگ بھی تو لا سکتے تھے۔ ان کی یاد میں بلو کے وجود میں ڈھل بھی تو سکتی تھیں۔ فرید نے پہلے تو سوچا ہی نہ تھا۔

"راجہ۔" بلو تڑپ کر رو دی۔ "اگر۔ اگر کچھ ہو گیا۔ تو۔ تو۔"

"تم فکر نہ کرو۔" فرید نے بمشکل کہا۔ "سب ٹھیک ہو جائیگا۔"

فرید نے ہر طرح سے اسے تسلی دے کر مطمئن کرنے کی کوشش کی۔ بلو کو اپنے غیر محفوظ

ہونے کا احساس ایکا ایکی ڈسنے لگا۔ اس کی چھٹی حس آنے والے دور کی المناکی اور تباہی کا سنگل دکھا رہی تھی۔

روتے دھوتے وہ فرید کے کمرے سے نکل گئی۔ اور اس کے جانے کے بعد فرید کے ذہن کا بار بڑھ گیا۔ ایک ہی سوچ کو بار بار سوچنے لگا۔ اگر واقعی۔ واقعی۔ کچھ ہو گیا۔ تو۔ تو۔" فرید کی گھبراہٹ بڑھتی گئی۔

وہ ایک اونچے خاندان کا باوقار فرد تھا۔ عزت، دولت، شہرت اس کے گھر کی باندی تھی۔ اس کا اپنا مقام تھا۔ جس پر تقدیس کے آنچل سایہ کیے تھے۔ لیکن اب!۔ اب!۔ وہ گناہ کے چھینٹوں سے اپنا دامن آلودہ کر چکا تھا۔ یہ چھینٹے اگر دوسروں کو بھی نظر آ گئے۔ تو اس کی ساکھ کو جو نقصان پہنچے گا۔ اس کی تلافی ممکن نہ ہو گی۔

وہ جوں جوں سوچتا گیا۔ اس کی پریشانی بڑھتی گئی۔ اسے کیا کرنا چاہیئے۔ کیا کرنا چاہیئے۔ بلو کی اسے پرواہ نہ تھی۔ لیکن بلو کے وجود میں اس کی کوئی یاد ڈھل گئی۔ تو کیا ہو گا؟ اسے کیا کرنا چاہیئے؟ کیسے اپنے فعل کی پردہ پوشی کرنا چاہیئے۔

سگریٹ پھونکتے ہوئے۔ کمرے میں ٹہلتے ہوئے، آتش دان کے قریب بیٹھتے ہوئے وہ اس سوال کا جواب سوچنے لگا۔

ذہن بیکار ہو تو زنگ آلود سا ہو جاتا ہے۔ لیکن جب اس سے کام لیا جائے تو بڑے کام کی باتیں سوچ لیتا ہے۔ مسلسل کئی گھنٹوں کی سوچ کے بعد فرید کو بھی اپنے مسئلے کا حل ہاتھ آ گیا۔

—— ✣ ——

"شمسو۔"

"جی سرکار۔"

"میں کل واپس جا رہا ہوں۔"

"جی کہاں؟ یعنی واپس۔"

"ہاں۔"

"کیوں سرکار۔ کچھ دن اور رہ جاتے۔"

"نہیں بھئی۔ کام کا حرج ہو رہا ہوگا۔ پہلے ہی دن کافی دن ہو گئے۔ میں تو صرف آٹھ دن کے لیے آیا تھا۔"

"جی صاحب"

"لیکن یہ پہاڑی موسم پاؤں کی زنجیر بن گیا۔ خوب لطف اٹھایا میں نے تو۔"

"جی۔ جی۔ آپ کے آنے سے کافی رونق تھی صاحب جی۔ ہم پھر اکیلے کے اکیلے رہ جائیں گے۔"

"اکیلے تو نہیں۔ گھر کے افراد کافی ہیں۔ اور پھر تمہیں ملنے بھی تو تمہارے دوست آتے رہتے ہیں۔"

"جی صاحب۔ چوکیدار اللہ دتہ اوپر والی تین کوٹھیوں کی رکھوالی کرتا ہے۔ کبھی وہ آجاتا ہے کبھی میں چلا جاتا ہوں۔ یا کبھی کریمو آ بیٹھتا ہے۔"

"وہ جوان سا آدمی کون ہے؟"

"کون؟ صاحب جی۔"

"وہ جو کل تمہارے ساتھ بیٹھا چلم پی رہا تھا۔"

"اچھا۔ وہ فضل دین ہے صاحب۔"

"نام تو اس کا کچھ ہوگا ہی میں پوچھ رہا ہوں وہ ہے کون۔"

شمسو فرید کا شاید عندیہ نہ سمجھ سکا۔ اس کا منہ دیکھنے لگا۔ فرید آتش دان کے قریب بیٹھا ایک انگریزی جریدہ کھولے شمسو سے باتیں کر رہا تھا۔ شمسو ڈرائنگ روم کی صفائی کر رہا تھا۔ جھاڑن ہاتھ میں لیے وہ چمکتی ایش ٹرے پونچھ رہا تھا۔ فرید کی بات نہ سمجھتے ہوئے اس کی طرف دیکھنے لگا۔

"وہ آدمی مجھے کچھ اچھا نہیں لگا۔"

"جی۔ وہ تو بڑا شریف آدمی ہے۔"

"تمہارا رشتہ دار ہے۔"

"نہیں جی۔ اللہ دتہ چوکیدار ہے نا اس کی سالی کا بیٹا ہے۔"

"تو تمہارا کیا لگا۔"

"جی کچھ۔ کچھ بھی تو نہیں۔"

"پھر تیرے پاس کیا لینے آتا ہے۔"

"یونہی جی۔ چلم پینے آجاتا ہے کبھی کبھی۔ اس کی سبزی کی دکان ہے صاحب۔ کبھی کبھی آ بیٹھتا ہے۔"

"شمسو تو بڑا ہو گیا۔ لیکن دماغ میں عقل نہ آئی۔"

"جی۔؟"

فرید نے رسالہ میز پر رکھ دیا۔ اور اٹھتے ہوئے بولا۔ "تیرے گھر میں جوان لڑکی ہے۔ یوں غیر مردوں کو گھر میں آنے کی کھلی چھٹی دی۔ تو کسی دن پچھتائے گا۔"

شمسو کی جیسے آنکھیں کھل گئیں۔ فرید سچ ہی تو کہہ رہا تھا۔

"زمانہ بڑا خراب ہے شمسو۔ تو بے وقوف کا بے وقوف ہی رہا۔ جوان لڑکی کی ذمہ داری تجھ پر پڑی ہے۔ ہوش سے رہا کر۔"

"بلو بڑی سمجھ دار لڑکی ہے صاحب جی۔" شمسو نے دھیمی آواز میں کہا۔

"سمجھ داری اور جوانی دو الگ الگ چیزیں ہوتی ہیں۔ جھکتے دیر نہیں لگتی۔" وہ یوں کہہ رہا تھا۔ جیسے شمسو کا سب سے زیادہ ہمدرد وہی ہو۔

شمسو اس کی بات کی تائید میں دھیرے دھیرے سر ہلانے لگا۔

"خیر۔ یہ تمہارا ذاتی معاملہ ہے۔ مجھے کچھ کہنا تو نہیں چاہیئے تھا۔ پھر بھی تم جیسے سیدھے سادے آدمی کو آگاہ کر دینا ضروری سمجھا۔ باقی جیسے تمہاری مرضی ویسے کرو۔ ہمیں کیا۔"

"بڑی مہربانی سرکار! آپ نے میرے فائدے کی بات ہی کی ہے۔ آپ کو ہم غریبوں کی عزت کا خیال نہیں ہوگا۔ تو اور کسے ہوگا۔ آپ سچ ہی کہتے ہیں زمانہ بڑا خراب ہے کسی کی نیت بدلتے کیا دیر لگتی ہے۔"

"نیت بدلتے واقعی دیر نہیں لگتی۔" فرید بڑبڑاتے ہوئے کمرے سے نکل گیا۔

شمسو جھاڑن ہاتھ میں لیے ساکت سا وہیں بیٹھا صاحب کی باتوں پہ غور کرتا رہا۔ صاحب کے ہمدردانہ مشورے نے تو جیسے اسے خرید ہی لیا۔ دل ہی دل میں اس کی جوانی اور اقبال کو دعائیں دیتا رہا۔ اس نے عہد کر لیا۔ کہ آئندہ گھر میں کسی غیر مرد کو یوں کھلے بندوں آنے کی اجازت نہیں دے گا۔ غیر مرد! خواہ وہ اللہ دتہ ہو یا اس کی سالی کا بیٹا فضل دین۔ صاحب نے کتنی ہمدردی سے، کتنے بڑے خطرے سے اسے بروقت آگاہ کر دیا تھا۔

فرید کا احترام شمسو کے دل میں پہلے ہی کم نہ تھا۔ اب تو کئی گنا اور بڑھ گیا۔ فرید

کے ہمدردانہ اور پرخلوص مشورے کا ذکر اس نے اپنی بیوی سے بھی کیا۔ وہ تو بلو سے یوں بھی خدا واسطے کا بیر رکھتی تھی۔ بیٹھے بٹھائے خواہ مخواہ کا بوجھ سر پہ آن پڑا تھا۔

"تجھے تو کچھ ہوش ہی نہیں ہوتی۔ لڑکی بھی تو دیکھو۔ نچلا بیٹھنا تو اس نے سیکھا ہی نہیں۔ کوئی لڑکا ڈھونڈ اور دو بول پڑھوا دے۔ زمانہ واقعی بڑا خراب ہے۔ یہ نہ ہو لینے کے دینے پڑ جائیں۔ لڑکی کی رکھوالی ہونے سے رہی۔ سارا دن خدا جانے کہاں کہاں گھومتی پھرتی ہے۔ موسم دیکھو۔ اور اس کا باہر گھومنا پھرنا دیکھو۔" ناک منہ چڑھاتے ہوئے لگائی بجھائی کے انداز میں بیوی نے جو کچھ کہا۔ شمسو نے تشویش سے سنا۔

"بہن کریماں کو چٹھی لکھ۔ اس کے لڑکے سے بیاہ دے اسے۔" بیوی نے بلو کا بوجھ سر سے فوری طور پر اتار پھینکنے کی تجویز پیش کی۔

"ہائے وہ لچا لفنگا!" شمسو نے نفرت سے منہ بنایا۔

"تو پھر کوئی شریف زادہ ڈھونڈ تا پھر۔ اتنی دیر میں کوئی چاند چڑھا دے گی۔" والے بیوی۔ تو تو خواہ مخواہ ہی بکے جا رہی ہے۔ دیکھو اللہ نے چاہا تو کوئی بندوبست ہو جائے گا۔ ویسے اپنی بلو کوئی ناسمجھ بھی نہیں ہے۔ تسلی رکھ۔ ہوشیار لڑکی ہے۔"

"میرا کیا ہے۔ جو جی میں آئے۔ کر۔ میں تو کہتی ہوں۔ جوان جہان ہے۔ رشتہ ڈھونڈھ اور بیاہ دے۔ کوئی لڑکا۔"

"اپنا کرامت جو ہے۔" شمسو نے بیوی کی بات کاٹ دی۔

"ہائے ہائے۔ میرے کرامت کے لیے یہی رہ گئی۔ آج نام لیا ہے تو پھر نہ لینا۔"

بیوی کے تیور لڑائی کے تھے۔ شمسو بیچارہ سیدھا سادا آدمی تھا۔ پیش از وقت لڑائی کا کیا فائدہ۔ نیت تو اس کی پکی تھی۔ کہ بلو کا بیاہ کرامت ہی سے کرے گا۔

اتنی جلدی بھی کاہے کی ہے۔ جب وہ کراچی سے بہت سارو پیہ کما کر لائے گا۔ تو بلو اور اس کا بیاہ دھوم سے کرے گا۔ بیوی ہوتی کون ہے مخالفت کرنے والی۔ اپنے مرحوم بھائی کی نشانی وہ اپنے سینے سے ہی لگا کر رکھے گا۔

بیوی بک بک کرتی رہی۔ اور وہ اٹھ کر کام میں مصروف ہو گیا۔ وہ اللہ دتہ اور فضل دین کو اپنے گھر آنے سے منع کرنے کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اللہ دتہ سے تو اس کی برسوں کی دوستی تھی۔ ایک دم کسی کو دو ٹوک فیصلہ سنانا آئین دوستی کے خلاف تھا۔ لیکن صاحب کا ہمدردانہ مشورہ بھی ذہن میں تھا۔ اللہ دتہ ہی کی وجہ سے فضل دین بھی آنے جانے لگا تھا۔

بڑی ہمت کر کے اس نے رات اللہ دتہ سے ڈھکے چھپے لفظوں میں کہہ ہی دیا۔ فضل دین کوئی ایسا ویسا آدمی نہیں تھا۔ غریب تھا لیکن شرافت کا دامن تھامے ہوئے تھا۔ اللہ دتہ شمسو کا خدشہ سمجھ گیا۔ لیکن فضل دین کی شرافت اور پاکبازی کے متعلق خاصی تقریر کر ڈالی۔ شمسو کچھ خفیف سا ہو گیا۔ لیکن ذہن میں زید کی بات گھر کر چکی تھی۔ اس نے زمانے کے اونچ نیچ اللہ دتہ کو بتائے۔ پھر پرائی بیٹی کی ذمہ داری بھی بڑی چیز تھی۔ اللہ دتہ کو دل میں برا تو لگا۔ لیکن فضل دین کو شمسو کے ہاں آ کر چلم پینے سے منع کرنے کا وعدہ کر ہی لیا۔

ادھر شمسو نے احتیاطاً بلو کو بھی یوں باہر آزادانہ گھومنے پھرنے کی ممانعت کر دی۔ پیار سے سمجھایا۔ کہ برفانی موسم خطرناک ہوتا ہے۔ بلو میدانوں کی پروردہ تھی۔ ٹھنڈ لگنے کا خطرہ تھا۔ بلو کے لیے اب گھر سے باہر کشش ہی کیا رہ جاتا تھی۔ فرید تو واپس جا رہا تھا۔ اب تو اس کے لیے گھر ہو یا باہر سب ایک ہی تھا۔ تنہائیوں کو گلے لگا کر پڑ رہتا تھا اور بس۔

—— ٭ ——

فرید

شمسو کا ذہن فضل دین کی طرف منتقل کر کے مطمئن ہو گیا۔ اب کوئی ایسی ویسی بات ہوئی بھی تو اس کا ذمہ دار فضل دین ہی کو متصور کیا جائے گا۔ ایک گناہ کو چھپانے کے لیے اس نے دوسرا اخلاقی گناہ کر ڈالا۔ لیکن اسے اب کوئی خوف تھا نہ ڈر۔ اس نے اپنے دامن کو سیاہی کے متوقع چھینٹوں سے اپنی دانست میں بالکل محفوظ کر لیا تھا۔

رات شمسو نے اس کا سامان ٹھیک ٹھاک کر دیا۔ فرید نے شمسو پر احسان کا بار جاتے جاتے اسے اپنی کئی چیزیں عنایت کر دیں۔

"یہ بوٹ پہن کر دیکھو شمسو۔" فرید نے کالا بوٹ پاؤں سے شمسو کی طرف پھینکا۔

"جی سرکار۔" شمسو نے نئے چمکتے بوٹوں پہ اپنی پوری کھلی آنکھیں گاڑ دیں۔

"بھئی دیکھ کیا رہے ہو۔ پہن کر دیکھو۔ پورا آتا ہے تو لے لو۔ برف میں چلنے پھرنے میں آسانی ہو گی۔" فرید نے کہا۔

شمسو کی حالت دید کے قابل تھی۔ ہاتھ لرز رہے تھے۔ اور پاؤں بوٹ میں گھسنے کی بے تابی سے بہک رہے تھے۔ بوٹ پورا نہ بھی آتا۔ تو اس نے یہ جوتا حاصل کرنے کے لیے جھوٹ بول دینا تھا۔ لیکن خوشی کی بات جوتا اس کے پاؤں میں بالکل فٹ آیا۔

"سرکار کا اقبال بلند ہو۔" خوشی سے ناچتی آنکھوں اور مسرت کے دباؤ سے بیٹھتی آواز میں شمسو نے ہاتھ اونچا کر کے دعا دی۔

"اور یہ اوورکوٹ بھی رکھ لو۔ تین سال پرانا ہے۔ میرے پاس تو نیا بھی ہے

بابا حد ہو گئی سردی کی۔ میں تو حیران ہوں۔ تم اتنی سردی میں کیسے زندہ رہتے ہو۔" شمسو
پر تو شادیٔ مرگ کی سی کیفیت طاری تھی۔ ایسا نفیس اور بھاری اوورکوٹ۔ کبھی
سوچا بھی نہ تھا۔ اس کا جی چاہا صاحب پر جان بھی نچھاور کر دے۔

"خدا آپ کو اس سے بھی زیادہ دے سرکار۔ ہم غریبوں کا آپ کو اتنا خیال ہے
یہ میرا فرض ہے شمسو۔" فرید نے ہمدردی سے کہا۔ "ابا جان خدا بخشے ا
خیالات کے تھے۔ لیکن میرا دل تو نہیں مانتا۔ کہ خود اتنے ٹھاٹھ باٹھ سے رہوں
اور نوکر چاکر جانوروں کی سی زندگی بسر کریں۔ خدا کے خوف سے ڈرتا ہوں۔"

شمسو کا دل فرید نے موہ ہی تو لیا۔ فرید کے والد مخیر ضرور تھے۔ لیکن اتنے نہیں
جتنا فرید۔ وہ تو صرف تنخواہ ہی دیا کرتے تھے۔ کبھی موج میں آئے دن۔ تیوہار پر
کچھ دے دلا دیا۔ یا کبھی کبھی لنڈے سے خرید کر گرم کپڑے نوکروں میں تقسیم کر دیے
لیکن فرید نے تو اپنے ذاتی استعمال کی چیزیں بھی خوشی سے اسے دے ڈالی تھیں
ایسی خدا ترسی!

"جگ جگ جیو صاحب" شمسو نے قصیدہ پڑھا۔ "اللہ زندگی کی خوب بشیا
نصیب کرے۔ دلہن آئے۔ پھول سے بچے۔"

"نا نا — نا —" فرید نے ہنستے ہوئے کانوں پر ہاتھ رکھا۔ "بھئی ایسی با
سے ہم باز ہی رہے۔ اور پھر! شمسو دلہن کی دعا نہ ہی مانگو تو اچھا ہے۔ اس میں
ہی بھلا ہے۔"

"کیوں صاحب جی" شمسو دوستانہ انداز میں بولا۔

"بھئی! دلہن آ گئی۔ تو تمہارے یہ مزے نہ رہیں گے۔ بھلا کون سی بیوی ا
ہو گی جو نا بک کا بنا اوورکوٹ اور بوٹ نوکر کو دینا پسند کرے گی۔" شمسو کے
دل لگی اور وہ کھلکھلا کر ہنس پڑا۔

فرید شمسو کے ذہن میں اپنی شخصیت کا ایسا پرتو چھوڑنا چاہتا تھا۔ کہ اگر بلو
کے خدشات پورے ہو بھی گئے۔ تو یہ پرتو اس کی نیکی۔ پارسائی اور خدا ترسی کا ضامن
ہو گا۔ بلو اگر برملا بھی کہہ دے گی۔ جب بھی شمسو اپنے مخیر اور نیک دل صاحب پر
شک کرنے کا حوصلہ نہیں کرے گا۔

وہ اب پوری طرح مطمئن تھا۔ شمسو اوورکوٹ اور بوٹ اٹھا کر کمرے سے نکل
گیا۔ خوشی سے اس کی چال لغزیدہ تھا۔ فرید کی چال نے اس کی چال بہکا دی تھی۔ سگریٹ
سلگا کر ہونٹوں سے لگاتے ہوئے فرید اپنی چال کی کامیابی پر دل ہی دل میں مسکرانے
لگا۔ آج وہ واپس جا رہا تھا۔ اپنے ذہنی بوجھ یہیں جھٹک جانے والا تھا۔

رات بلو اس کے پاس آئی تھی۔ اور اس کے پہلو سے لگی سسکیاں بھرتی رہی تھی۔
ایفائے عہد کے وعدے لے رہی تھی۔ بھول نہ جانے کی قسمیں دلا رہی تھی۔ اور فرید
یک بیخبر ہوتے شکاری کی طرح اسے اپنے دام میں لا رہا تھا۔

رات کا بیشتر حصہ وہ اس کے پاس رہی تھی۔ فرید نے آج اپنی پُر فریب محبت
کا کچھ زیادہ ہی بے تابانہ اظہار کیا تھا۔

"بلو! میں نہیں جانتا۔ تمہارے بغیر دن کیسے گزار سکوں گا۔ تم تو میری ساری
ہستی پر چھا چکی ہو۔ تمہیں دیکھے بغیر تو قرار نہیں آتا۔"

"مجھے ساتھ ہی لے چلو راجہ۔"

"مجبوری ہے بلو۔ تم میری خاندانی روایات سے آگاہ نہیں ہو۔"

"جلدی آنا۔ ورنہ — میں خود ہی آ جاؤں گی۔"

"نا نا۔ ایسا نہ کرنا بلو۔" فرید ایک دم پریشان ہو گیا۔ "اس میں میری رسوائی
ہے۔ میں نہیں چاہتا۔ کہ میری ہونے والی بیوی کے متعلق کسی کی رائے سبک ہو۔
میں خود ہی آ جاؤں گا۔ سمجھیں۔"

بلو نے روتی آنکھوں سے اسے دیکھا۔ اور پھر اثبات میں سر ہلا دیا۔ فر
پیار کے اظہار کے طور پر اسے بازوؤں میں جکڑ لیا۔ اور غریب معصوم اور مجبو
اس کے حسین وعدوں کے سہارے تھوڑی دیر کو بہل گئی۔

دوپہر کا کھانا کھا کر فرید نے واپسی کا پروگرام بنایا تھا۔ شمسو کے تینو
اس کے گرد آ کھڑے ہوئے تھے۔ فرید نے ان کے میلے کچیلے کپڑوں اور گند
چہروں کے باوجود ان سے بڑے پیار کا سلوک کیا تھا۔ شمسو اور اس کی بیوی
کی نوازش سے پہلے ہی مرعوب اب بچوں سے اتنے پیار اور لگاؤ سے
کرنے پر تو وہ فرید کے قدموں میں بچھ بچھ گئے۔ فرید نے بچوں میں کچھ پیسے بھ

"نہ صاحب جی۔" شمسو کی بیوی بچوں سے پیسے لیتے ہوئے بولی۔ فر
ہاتھ کے اشارے سے اسے روکا۔ شمسو کی بیوی نے جلدی جلدی پیسے اپنے
کے آنچل میں باندھ لیے۔

"اچھا بھئی شمسو! سامان کا کیا کیا؟" فرید نے پوچھا۔

"کچھ میں اٹھا لوں گا۔ کچھ مزدور۔" شمسو نے کہا۔ "کہیں تو میں ہی دو پھ

"نہیں بھئی۔ فرید نے گھڑی دیکھی۔ "یوں دیر ہو جائے گی۔ مزدور بلا لو۔ گاڑ
لے جائے گا۔"

"ابھی بلا کر لاتا ہوں سرکار۔" شمسو جلد جلد قدم اٹھاتا باہر لپکا۔ فرید مڑا
شمسو کے بیٹے سے کہا۔

"میں اپنے کمرے میں ہوں۔ سامان چلا جائے تو بتا دینا۔"

"اچھا صاحب جی۔"

فرید انہیں وہیں چھوڑ کر کمرے میں چلا آیا۔ صبح سے اس نے بلو کو نہیں د
آج اس کا ناشتہ بھی شمسو لایا تھا۔ اور کھانے کی میز پر بھی شمسو کی بیوی مو

"بے وقوف لڑکی کہیں چھپ چھپ کر رو رہی ہو گی۔" فرید نے دل ہی دل میں کہا
اور کھلی کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے سوچ میں ڈوب گیا۔

فرید کوئی گھاگ مجرم نہیں تھا۔ نہ ہی اس میدان کا پیشہ ور کھلاڑی تھا۔ گو لڑکیو
سے واسطہ بھی کوئی نئی چیز نہ تھی۔ لیکن آج تک اس کا دامن گناہ آلود نہیں ہوا تھا۔
خدا جانے اس بلو میں کیا طلسماتی کشش تھی۔ جو وہ یوں اخلاق و کردار کی حدیں توڑ
گیا تھا۔ جوانی واقعی اندھی ہوتی ہے۔ لیکن اس کا اندھا پن پہلے تو یوں اس پر اثر انداز
نہیں ہوا تھا۔

فرید کو اپنے کردار کی برہنگی پر خفت سی ہونے لگی تھی۔ اور ایک بے گناہ لڑکی کو
ڈاکو بن کر لوٹ لینے پر بھی دل ملامت کرنے لگا تھا۔ شمسو مزدور کو ساتھ لے آیا۔ اور
سامان لے کر پھر پہاڑی برفانی راستے پر جانے لگا۔

فرید بھی گھر سے نکلا۔ شمسو کی بیوی اور بچے اسے سلام کر کے لوٹ گئے۔ اس نے
رک کر چند لمحے انتظار کیا۔ بلو کہیں نظر نہ پڑی۔ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتے وہ اپنے
راستے پر جانے لگا۔

آج چمکیلی دھوپ نکلی تھی۔ جس سے فضا بڑی نکھری ہوئی تھی۔ سنسان راستے
پر فرید ماحول سے بے نیاز چلا جا رہا تھا۔

"راجہ" ایک برفیلی چٹان کے عقب سے بلو نکل کر اس کے سامنے آ گئی۔
اس کے بال بکھرے تھے۔ آنکھیں رو رو کر سوجی ہوئی تھیں۔ گالوں کی چمکتاہٹ
ماند پڑ چکی تھی۔ رنگ اڑا اڑا تھا۔ اور آنکھوں کے نیچے کالے کالے حلقے نمایاں تھے۔
فرید نے اسے دن کی جگمگاتی روشنی میں شاید دنوں کے بعد آج دیکھا تھا۔ اس کی تازگی
اور بشاشت بالکل ختم ہو چکی تھی۔ اس پژمردہ اور باسی پھول کی طرح لگ رہی تھی۔
جس کا رس بھونرا چوس چکا ہو۔

فرید کے ضمیر پر تازیانہ تو لگا۔ لیکن اس نے اپنے آپ پر جلد ہی قابو پا لیا۔ تسلی
کے چند جملے کہے۔ اس کی آواز کا پھیکا پن بڑا ہی نمایاں تھا۔
بلو کالی شال سے بھیگی آنکھیں پونچھتی رہی۔ اور وہ راستے پر سر جھکائے
چلا گیا۔ ندامت اور پریشانی کا بوجھ بڑھتا چلا جا رہا تھا۔
بلو دیر تک اسے کھڑی دیکھتی رہی۔ پھر بوجھل قدموں سے اوپر چڑھنے لگی
وہ اس موڑ پر آ کر رک گئی۔ جہاں سے نیچے جانے والی سڑک نظر آتی تھی۔ وہ کتنی
دیر وہاں کھڑی رہی۔ فرید کی موٹر اس موڑ سے گزر کر چکر کھاتے راستوں پر نیچے
نیچے چلتی گئی۔
بلو دل تھامے وہاں سے اوپر گھر کی طرف جانے لگی۔
جوں جوں وقت گزر رہا تھا۔
بلو اور فرید کے درمیان فاصلہ بڑھتا جا رہا تھا۔

—— ٭ ——

واپسی

آ کر فرید اپنی کاروباری مصروفیتوں میں الجھ گیا۔ کئی دن کی غیر حاضری
کام پر کافی اثر انداز ہوئی تھی۔ گو اس کا مینیجر ایک دیانت دار اور محنتی
آدمی تھا۔ پھر بھی اس کی عدم موجودگی میں کئی ضروری کام رکے رہ گئے تھے۔ اور فرید
ان کاموں کو سلجھانے میں کچھ ایسا منہمک ہوا۔ کہ کچھ اور سوچنے کی فرصت ہی نہ ملی۔
ہاں رات جب فارغ ہو کر بستر پر لیٹتا۔ تو بلو کا خیال ضرور آ جاتا۔ یہ خیال یاد نہ
تھی جو وہ تڑپ تڑپ اٹھتا۔ اس خیال کے ساتھ کبھی تو جسمانی تسکین کا احساس ہوتا
اور کبھی ندامت کا پریشان کن تاثر۔ لیکن یہ [illegible] ت کی چڑھی آندھی کے دور کی
طرح کچھ ہی دنوں میں گزر گیا۔
فرید کی مصروفیات بڑھتی گئیں۔ اپنی دوست لڑکیوں کی صحبت میں اس کے دن
گزارنے لگے۔ فرید ان سے بے باکی کی حد تک بے تکلف ہوتا گیا۔ جذبات بہکنے لگے۔
لیکن کوئی بھی لڑکی سادہ لوح اور معصوم بلو کی طرح محبت کے بہلاوے میں آنے کو تیار نہ
ہوئی۔ صبوحی نے تو صاف صاف کہہ دیا۔ کہ اتنے ہی بے تاب ہو تو شادی کر لو۔ شائستہ
بے تکلف دوست تھی۔ اور اس نے دوستی اور شادی کے درمیان حد فاصل رکھی تھی۔
نیلا ایسی لڑکی نہ تھی۔ جسے وہ شادی کے لیے انتخاب قرار دے سکتا اور رافیہ کی خاندانی
غربت فرید اور اس کی یک جائی کے درمیان اٹھی ہوئی دیوار تھی۔
فرید کا ذہن الجھاؤ اور انتشار کا شکار تھا۔
انہی دنوں خالہ حمیدہ جاگیر سے آ گئیں۔ وہ ہاشم علی کے گھر ہو کر آئی تھیں۔ اور

ہاشم علی کی بڑی بیٹی سلمیٰ کی شکل وصورت اخلاق وکردار ایسا تھا۔ کہ دل ہی دل میں فرید کے گھرانے کی ٹکر کا تھا۔ دولت دنیا کی کمی نہ تھی۔ لیکن جاہ وحشم نے مزاجوں کو دماغ نہیں تھا۔ شرافت بے مثال تھی۔ ہاشم علی اور ان کی بیگم دونوں ہی ہنس مکھ خلیق اور ملنسار انسان تھے۔ سلمیٰ نے بی اے تک تعلیم پائی تھی۔ لیکن خاندانی وقار اور سادگی نے مل کر اس کی شخصیت کو بڑا ہی پرکشش بنا دیا تھا۔

خالہ حمیدہ کو لڑکی بہت پسند آئی تھی۔ لیکن فرید سے پوچھے بغیر وہ کوئی لفظ زبان سے نکالنے کی اہل نہ تھیں۔ مانا کہ فرید ان کا ادب کرتا تھا۔ اور اس کے گھر میں وہ اک ماں کی شان کے ساتھ رہا کرتی تھیں۔ لیکن پھر بھی انہیں اپنی ہستی کا جائز حد تک احساس تھا۔

فرید کو سے آئے تقریباً تین ماہ ہو چکے تھے۔ جانے سے پہلے وہ اسے ملی تھیں۔ اب ملنے کے بہانے بھاگی چلی آئیں۔

حسب عادت فرید بڑے خلق سے پیش آیا۔ احوال پرسی کی۔ اور لاڈ سے بولا۔ "شکر ہے خالہ آپ آگئیں۔ گھر سونا ہو رہا تھا۔"

"گھر کو اب آباد کرنا۔" خالہ ایک دم سے بول اٹھیں۔

"میرا تو خیال تھا آپ ماں کی جگہ ہیں۔ میرا فکر کر رہی ہوں گی۔" وہ ہنس کر بولا۔ "لیکن ـــ"

"یہ بات ہے تو میں دنوں میں بندوبست کر دوں گی۔"

"واللہ! خالہ دل خوش کر دیا۔"

"مذاق میں نہیں ٹال بیٹے۔ اب تجھے شادی کر ہی لینا چاہیئے۔"

"ضرور۔ ضرور۔"

"پھر وہی مذاق۔"

"نہیں خالہ! میں سنجیدہ ہوں۔"

رات خالہ نے کھانے کی میز پر دانستہ پھر شادی کا ذکر چھیڑ دیا۔ وہ اس وقت خاصی سنجیدہ تھیں۔ لیکن فرید مذاق کے موڈ میں تھا۔

"اچھا تو خالہ پھر کب ہو رہی ہے اپنی شادی۔" فرید نے اپنی پلیٹ میں سالن نکالتے ہوئے پوچھا۔

"بہت جلد۔" خالہ نوالہ توڑنے لگی۔

"لیکن لڑکی؟" فرید چپاتی اپنی پلیٹ میں رکھتے ہوئے بولا۔

"ڈھونڈ لی میں نے" خالہ نے شوربے میں نوالہ بھگوتے ہوئے جواب دیا۔

"توبہ۔ توبہ۔ آپ کی ڈھونڈی ہوئی لڑکی۔"

"کیوں؟" کیا اپنی پسند کی لانے کا ارادہ ہے۔"

"اپنی پسند کا تو ابھی سوال نہیں۔ لیکن آپ کی پسند؟ ـــ توبہ توبہ۔"

"کیوں؟ بار بار توبہ کیوں کر رہا ہے۔"

"خالہ آپ تو کوئی بی ملانی ہی پسند کریں گی۔ جسے تسبیح اور مصلے سے فرصت ہی نہ ملے گی۔" وہ کھلکھلا کر ہنس دیا۔ وہ خالہ بھی مسکرانے لگیں۔

"بیٹے! تم بات کو مذاق میں اڑا رہے ہو۔" خالہ نے قدرے توقف کے بعد کہا۔ "لیکن اب اس معاملے پر سنجیدگی سے غور کرو۔ اب نہیں کرو گے تو کیا بوڑھے ہو کر شادی کرو گے۔"

"کون کافر کہتا ہے خالہ۔" فرید نے ہنس کر کہا۔

"تو پھر۔ حامی بھر لو نا۔"

"کہاں"

"وہی ہاشم علی کی بیٹی سلمیٰ۔"

"کون؟ کون؟" فرید نے دلچسپی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

"اے ہے۔ ہاشم علی کو نہیں جانتے۔ وہ گاؤں والے۔"

"وہ۔ جن کی زمینیں ہماری زمینوں کے ساتھ ساتھ ہیں۔"

"ہاں۔ ہاں وہی۔"

"وہ تو آجکل گاؤں میں نہیں رہتے۔"

"رہائش شہر میں ہے۔ فصل کی کٹائی کے موقع پر ہاشم علی اور ان کی بیگم اکثر آجاتے ہیں۔ اب کے بیٹیاں ساتھ آئی ہوئی ہیں۔"

"اور آپ ان کی بیٹیاں دیکھ کر ریجھ گئیں۔ واہ خالہ۔ کیا کہنے۔"

"فرید بیٹے۔ ہاشم علی کی بڑی بیٹی سلمیٰ کا تو کوئی جواب نہیں۔ پڑھی لکھی خوبصورت، خوب سیرت۔ بی اے تک تعلیم پائی ہے۔ لیکن۔"

"لیکن یوں لگتا ہے جیسے بالکل ان پڑھ ہو۔" فرید نے خالہ کی بات کاٹتے ہوئے قہقہہ لگایا۔ خالہ کو اس کی بات پر ہنسی تو آئی۔ لیکن سنجیدگی سے بولیں:

"تم سے بات کرنا ہی فضول ہے۔ ہر بات مذاق میں اڑا دیتے ہو۔ ماں باپ رہے نہیں۔ چھوٹا بڑا خاندان میں کوئی ہے نہیں۔ میں نے تو تمہارے بھلے کو ہی سوچا۔ باقی تمہاری اپنی مرضی۔ ایک کیا بیسیوں لڑکیاں تمہیں مل سکتی ہیں۔ ماشاءاللہ جوان خوبصورت ہو۔ لاکھوں کے تنہا مالک ہو۔ لڑکیوں کی بھلا کیا کمی۔"

"لیکن ابھی تک تو ایک بھی نہیں ملی خالہ۔ آپ بیسیوں کی بات کر رہی ہیں۔" فرید نے خالہ کی سنجیدگی سے تو ڈرے مرعوب ہو کر کہا۔

"مل ہی جائے گی۔" خالہ نے کھانے سے ہاتھ کھینچ لیا۔

"خفا ہو گئیں خالہ۔" فرید نے لاڈ سے کہا۔ "یہ میٹھا تو آپ نے لیا ہی نہیں۔"

"بس۔ تم کھاؤ۔"

خالہ میز سے اٹھ گئیں۔ فرید مسکراتے ہوئے انہیں دیکھتا رہا۔

ان کے جانے کے بعد فرید میز پر اکیلا ہی بیٹھا رہا۔ خالہ کی باتوں کی گونج ذہن میں اٹھنے لگی تھی۔ ہاشم علی اور ان کی بیگم کو وہ جانتا تھا۔ بچپن میں ان کی بیٹیوں کے ساتھ کھیلا بھی تھا۔ دونوں گھرانے ایک ہی گاؤں میں آباد تھے۔ لیکن کئی برس گزرے۔ اس کے ابا نے شہر میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ اور ہاشم علی بھی کسی دوسرے شہر میں جا کر آباد ہو گئے تھے۔ یوں دونوں گھرانوں کے مراسم تقریباً ختم ہو چکے تھے۔ اس دفعہ اتفاق ہی تھا۔ جو ہاشم علی مع بال بچوں کے گاؤں آئے تھے۔ خالہ نے ایک مدت بعد انہیں دیکھا تھا۔ ان کی جوان بیٹی سلمیٰ تو ان کو بہت ہی اچھی لگی تھی۔ خالہ کی باتوں سے فرید کا تجسس اور شوق بیدار ہو گیا۔

خالہ کے جانے کے بعد فرید اپنے ذہن پر زور دے دے کر سلمیٰ کی شبیہہ تصور میں لا رہا تھا۔ لیکن کوشش کے باوجود کوئی خاکہ ذہن پا رہا تھا۔ گاؤں کی ایک نہیں کئی ہم عمر لڑکیوں کے خاکے ذہن میں اڑتے ہوئے رنگوں کے ساتھ گڈمڈ ہو رہے تھے۔ لیکن سلمیٰ کا واضح پیکر کسی طور نہ ڈھل رہا تھا۔ بہرحال سلمیٰ کو دیکھنے کی خواہش دل میں انگڑائیاں لینے ضرور لگی۔

دوسرے دن پھر خالہ سے سامنا ہوا۔ تو فرید کو کل کی بھولی باتیں پھر یاد آ گئیں۔ پچھلے صحن میں بچھے تخت پر خالہ گاؤ تکیہ کے سہارے بیٹھی تسبیح کے دانوں پر ورد کر رہی تھیں۔ فرید اپنا بریف کیس اٹھائے کمرے سے نکلا۔ جانا تو باہر تھا۔ لیکن خالہ کو دیکھتے ہی ادھر آ گیا۔

"آپ نے آج ناشتہ کیوں نہیں کیا خالہ۔"

"طبیعت کچھ ٹھیک نہیں۔"

"رات کی بات پہ ناراض تو نہیں۔"

"لے میں بھلا ناراض کیوں ہونے لگی۔"

فرید خالہ کے گھٹنے کو تھام کر تخت کے کونے پر بریف کیس رکھ کر بیٹھ گیا۔ اور گھٹنے جھنجھوڑتے ہوئے لاڈ سے بولا۔ "مجھے معلوم ہے خالہ آپ خفا نہیں۔"

"نہیں بیٹے۔ اس میں خفگی کی کیا بات۔"

"اچھا تو وہ سلمیٰ۔"

"سلمیٰ کی بات چھوڑو۔"

"دیکھا۔ میں نے ٹھیک سمجھا۔ آپ خفا ہو گئیں۔ اچھی خالہ۔ دیکھیں۔ میں آپ کی بات مان لوں گا۔ شادی تو اب مجھے کرنا ہی ہے۔ آپ کے سوا اور ہے ہی کون۔ جو یہ فریضہ انجام دے گا۔"

فرید کو سنجیدگی سے بات کرتے دیکھ کر خالہ خوشی سے پھولی نہ سمائیں۔ چٹاپٹ اس کا چہرہ تھام۔ پیشانی چوم بلائیں لے ڈالیں۔

"میرے بچے۔ سلمیٰ جیسی لڑکی پا کر تو عمر بھر عیش کرے گا۔"

"واہ۔ وا۔"

"پھر وہی مذاق۔ اللہ قسم چاند سی بچی ہے۔ گھرانہ بھی باوقار۔ ایسے رشتے قسمت ہی سے ملتے ہیں۔"

"اچھا خالہ! سب آپ کی باتیں مان لیں۔ لیکن ایک بات میری بھی مانیں۔"

"وہ کیا؟"

"میں سلمیٰ کو دیکھ کر ہی کوئی فیصلہ کر سکتا ہوں۔ لڑکی کو دیکھے بغیر۔"

"یہ کیا مشکل ہے۔ آجکل وہ گاؤں آئے ہوئے ہیں۔ ایک چکر لگا لے تو بھی۔"

"بات تو سو فیصدی ٹھیک کہی آپ نے۔" فرید۔ "یوں بھی تو مجھے فضل کے حساب کتاب کے لیے وہاں جانا ہی ہے۔"

"بالکل۔"

"تو پھر ٹھیک۔" اس نے خالہ کا ہاتھ تھام لیا۔

"ٹھیک!" خالہ مسکرا کر بولی۔ فرید مسکراتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔

"اب بات سے مکر نہ جانا۔" خالہ نے پیار سے گھورا۔

"بالکل نہیں خالہ۔ سلمیٰ کو میں نے پسند کیا۔ تو بس آپ فوراً تیاریاں شروع کر دیجئے گا۔ آپ کو پورا پورا اختیار ہوگا۔ ہاں پسند نہ آئی تو۔" وہ شریر نظروں سے خالہ کو دیکھ کر مسکرانے لگا۔

"لڑکی چندے آفتاب چندے مہتاب ہے۔ ناپسند کا تو سوال ہی نہیں۔" خالہ نے بڑے اعتماد سے کہا۔ "دیکھتے ہی لٹو نہ ہو گیا تو کہنا۔"

"یہ تو گاؤں جا کر ہی پتہ چلے گا۔ وہ مسکرا کر بریف کیس اٹھانے لگا۔

"پھر کب جانے کا پروگرام ہے۔" خالہ بے صبری سے بولیں۔

"کسی دن چلیں گے۔"

"کسی دن کیوں؟ آج ہی کیوں نہیں چلتا۔"

"توبہ خالہ۔ ایسی بے تابی۔ کسی دن چلیں گے آرام سے۔"

"میں تو کہوں گی آج ہی چلو۔ کون سا سینکڑوں میل کا راستہ ہے۔ آج چلو کل واپس آجانا۔"

خالہ تو واقعی سنجیدہ ہو رہی تھیں۔ فرید کو تو سلمیٰ کو محض دیکھنے کا اک بے نام سا شوق اکسا رہا تھا۔ ورنہ شادی کے متعلق تو اس نے ابھی دل جمعی سے سوچا ہی نہ تھا۔ بہرحال خالہ کے اصرار کے سامنے اسے جھکنا ہی پڑا۔

"چلو گے آج۔" خالہ نے پھر پوچھا۔

"آج تو مجھے بہت سے کام کرنا ہیں۔"

"کل سہی۔"

"کل؟ — آں — کل — کل میں فارغ تو ہوں —"

"بس پھر ٹھیک ہے —"

"جیسے آپ کی مرضی —"

"آج اطلاع کروا دینا گاؤں —"

"اچھا —"

باتوں ہی باتوں میں گاؤں جانے کا فیصلہ ہو گیا۔ خالہ بڑی خوش نظر آنے لگی تھیں۔ ہزاروں لاکھوں دعائیں دے رہی تھیں۔

فرید انہیں سلام کر کے باہر چلا گیا۔

—— ٭ ——

رات

فرید کو اچھی طرح نیند نہ آئی۔ خالہ سے اس نے گاؤں جانے کا پروگرام بنا لیا تھا۔ سلمیٰ کی تعریفوں میں خالہ رطب اللسان تھیں۔ پہلے تو فرید بات مذاق میں ٹالتا رہا تھا لیکن اب قطعی سنجیدہ تھا۔ آخر اسے شادی کرنا ہی تھی۔ بھلے گھر کی بھلی سی لڑکی مل جانا خوش نصیبی ہی تھی۔ یوں بھی اس کے منتشر ذہن کو ایک مرکز کی ضرورت تھی۔ جذبات کے بہکاؤ اسے پہلے ہی معراجِ انسانیت سے گرا چکے تھے۔ مزید لغزشوں کے امکان قدم قدم پر تھے۔ لیکن اب وہ سنبھل چکا تھا۔ شادی کر کے اطمینان کی زندگی بسر کرنے کا شدت سے خواہاں تھا۔ اس لیے اس نے طے کر لیا۔ کہ سلمیٰ جو یقیناً ایک سلجھی ہوئی شریف لڑکی ہو گی۔ اسے شریکِ حیات بنا لے گا۔

لیکن اس مصمم ارادے کے گرد اگرد جو جذباتی چڑھاؤ تھے۔ انہوں نے فرید کو رات بھر پریشان رکھا۔ شادی کا جھانسا اس نے بلو کو بھی دیا تھا۔ بلو —— ایک معصوم اور سادہ سی لڑکی۔ جسے اس نے بڑی مکاری اور بڑی عیاری سے لوٹا تھا۔ اس کا گناہ قابلِ معافی نہیں تھا۔ ضمیر کی چبھن بجا قرار دیتے رہی۔ فرید نے لاکھ قصوروار بلو کو بھی ٹھہرایا۔ اس کی رضا و رغبت کو موردِ الزام ٹھہرایا۔ لیکن ضمیر ملامت کرتا رہا۔

فرید اب حالات کے جس موڑ پر تھا۔ ضمیر کے کچوکے ضرر رساں تھے۔ اس ضمیر کو تھپک تھپک کر سلا دینے ہی میں مصلحت تھی۔ فرید نے بھی یہی وطیرہ اختیار کیا۔ صبح جب وہ بیدار ہوا تو خاصہ بشاش تھا۔ رات بھر کی مضمحل نیند کسی طور پر اس کے چہرے پر اثر انداز نہ تھی۔ شاید اس لیے کہ وہ اپنے ضمیر کو سلا کر آئندہ کا پروگرام ترتیب دے چکا تھا اپنی خطاؤں

کی اس نے خدا سے خلوصِ دل سے معافی مانگی تھی۔ اور شاید اسی لیے وہ مطمئن اور پُرسکون ہو چکا تھا۔

آج موسم بڑا ہی دلفریب تھا۔ سردی کا دم خم تو کبھی کا ٹوٹ چکا تھا۔ گرمیوں کی آمد آمد تھی۔ گرمی کی آمد اور سردی کی رخصت کے بین بین یہ موسم بڑا ہی سہانا تھا۔ کانپتی، لرزتی اور ٹھٹھرتی ہواؤں کی جگہ نوخیز چلبلی اور مستانی ہواؤں کا دور دورہ تھا۔ مطلع بالکل صاف و شفاف تھا۔ اور فلک کی نیلاہٹیں بڑی ہی تازہ دم تھیں۔ فضا میں رچی بسی تازگی کا احساس بھی فرحت بخش تھا۔ چمکتا ہوا، نکھرا ہوا دن پوری تابانی سے طلوع ہو رہا تھا۔ فرید نے اس کی خوش گواری اور بشاشت کو اپنی نئی زندگی کے آغاز کے لیے نیک فال سے تعبیر کیا۔ گاؤں جانے کے لیے اب وہ ذہنی طور پر آمادہ ہو چکا تھا۔

روانگی دوپہر کھانے کے بعد تھی۔ صبح اسے کچھ کاروباری کاموں کو نپٹانا تھا۔ ادھر خالہ تو صبح ہی صبح تیار ہو بیٹھیں۔ ان کا بس چلتا۔ تو پر لگا کر اڑ جاتیں۔ فرید انہیں عزیز تھا۔ اس کی خوشی ان کی خوشی تھی۔ لیکن ان کی خوشی کے کئی اور پہلو بھی تھے۔ وہ فرید کی مختارِ کل کا رشتہ طے کروانے جا رہی تھیں۔ اس مختاری سے انہیں تسکین و تفاخر کا احساس ہو رہا تھا۔ خود بے اولاد تھیں۔ عمر بھر کی محرومی اسی طرح فراغت پا رہی تھی۔ اس لیے بے طرح خوش نظر آ رہی تھیں۔

وہ فرید کے تیار ہو کر باہر آنے کا انتظار کرتی رہیں۔ لیکن مایوسی ہوئی۔ گھبرا کر اس کے کمرے کی طرف لپکیں۔ فرید اپنے مینیجر اور سیکرٹری کو کچھ ضروری ہدایات دے رہا تھا۔ خالہ کو دیکھ کر مسکرانے لگا۔

"آئیے خالہ۔ تشریف رکھیئے۔"

خالہ ایک گدے دار کرسی پر بیٹھ گئیں۔ اور فرید اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔ دس منٹ کے صبر آزما انتظار کے بعد وہ فارغ ہوا۔ مینیجر اور سیکرٹری کمرے سے نکل گئے

تو خالہ بے صبری سے بولیں۔

"گاؤں نہیں جانا۔"

بغیر نہ رہ سکا۔ انہیں چھیڑنے کی غرض سے سنجیدہ صورت بنا کر بولا۔ "گاؤں؟" ۔ کس لیے؟"

خالہ نے ہاتھ ماتھے پر مار کر ایسی مضحکہ خیز نظروں سے فرید کی طرف دیکھا۔ کہ وہ کھلکھلا کر ہنس پڑا۔

"توبہ خالہ آپ گاؤں جانے کے لیے کتنی بے چین ہیں۔ معلوم ہوتا ہے۔ مجھے سزا دینے کی قسم کھا رکھی ہے آپ نے۔"

"سزا؟"

"اور کیا؟ شادی سے بڑی سزا اور کیا ہو گی ۔۔ اچھی بھلی آزاد زندگی ہے۔"

"بس اب اور کچھ نہیں کہنا۔"

"بہت بہتر۔" اس نے منہ پر انگلی رکھ لی۔

"دیکھو فرید" خالہ کو فرید کا مذاق نہیں بھایا۔ "اگر تم شادی کے معاملہ میں بالکل سنجیدہ ہو۔ تو گاؤں جا کر لڑکی دیکھ لو۔ اگر یونہی مذاق میں بات ٹالنا ہے۔ تو پھر وہاں جانے کی قطعی ضرورت نہیں۔"

خالہ منہ بنا کر اٹھ کھڑی ہوئیں۔ فرید مسکراتے ہوئے ان کے سامنے آ گیا۔

"ہٹو جی" خالہ نے خفگی سے کہا۔

"بس ناراض ہو گئیں۔" فرید نے ان کے کندھوں پر ہاتھ رکھ دیئے۔

"میں کچھ نہیں جانتی۔"

"میں کچھ نہیں جانتی۔ توبہ بھلی۔ جی چاہتا ہے تو کرو شادی۔ نہیں چاہتا۔ تو نہ کرو مجھے کیا۔؟"

کیا مل جائے گا مجھے؟ یوں ہی دوڑ دھوپ کروں؟" خالہ بدستور خفا تھیں۔

"لو جی۔ آپ کو کچھ ملے گا ہی نہیں۔" فرید مسکرایا۔

"ہاں تو۔ کیا ملے گا۔" خالہ نے فرید کو گھورا۔

"چاند سی بہو۔" فرید نے خالہ کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں پکڑ کر پیار سے ہلا

"اور پھر دو تین سال کے اندر اندر پانچ سات پھول سے بچے۔" فرید کی

پر خالہ کو مسکرانا ہی پڑا۔

"چل ہٹ۔ شادی تو کر۔ پھر دو تین سال میں پانچ سات بچے بھی ہو جائیں

"بس شادی ہوئی کہ ہوئی۔"

"جی۔ ہاں۔"

"اللہ قسم خالہ۔ بس آج معاملہ طے ہی سمجھیے۔ گاماں پہنچنے کی دیر ہے۔"

"تیار تو تو ہو نہیں رہا۔"

"دوپہر کھانا کھا کر چلیں گے۔"

"ابھی کیا ہرج ہے۔"

"کام ہے خالہ۔ باہر سے مال آ رہا ہے۔ اس کے متعلق کچھ ضروری امور

کرنا ہیں۔"

"تو پھر۔"

"دو بجے یہاں سے نکل جائیں گے۔"

"کام ختم ہو جائے گا۔"

"ہاں۔"

"دو بجے۔"

"ہاں خالہ پورے دو بجے ہماری گاڑی گاؤں کی سڑک پر ہو گی۔" فرید دوا

دکھاتے ہوئے بولا۔

"وہاں پہنچیں گے کے بجے۔"

"تین بجے۔"

"ٹھیک ہے۔"

"بالکل ٹھیک خالہ۔" فرید ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ کی ہتھیلی بجاتے ہوئے

خوشی سے بولا۔

"تین بجے وہاں پہنچیں گے۔ چار بجے سلمیٰ کی زیارت کریں گے۔ پانچ بجے میں

اپنا آخری فیصلہ آپ کو سنا دوں گا۔ چھ بجے آپ ہاشم صاحب سے بات کیجیے گا۔

سات بجے ہاں ہو جائے گی۔"

"اور آٹھ بجے نکاح سے بھی فارغ ہو جائیں گے۔" خالہ نے بات کاٹ کر سرزنش

کے انداز میں فرید کو گھورتے ہوئے کہا۔

"بالکل۔ بالکل۔" فرید کھلکھلا کر ہنس دیا۔ "اب آپ سمجھیں۔"

"ہتھیلی پر سرسوں نہیں جما کرتی بیٹے۔"

"خیر۔ اچھا تو خالہ آپ دو بجے تک تیار رہیے گا۔ مذاق برطرف۔ آج ضرور

گاؤں جانا ہے۔ اور اگر واقعی سلمیٰ بقول آپ کے لاجواب اور بے مثال ہوئی۔ تو

میری طرف سے آپ کو اجازت ہو گی۔ کہ معاملہ طے کر دیں۔ اب اس مرحلے سے بھی

گزر ہی جانا چاہیے۔"

خالہ نے پھر پیار سے اس کی پیشانی چوم لی۔ اور پرخلوص دعاؤں سے نوازنے لگیں۔

"میں دو بجے آپ کو بلا بھیجوں گا۔" خالہ کمرے سے جانے لگیں تو فرید نے کہا۔

"میں تو تیار ہی ہوں۔ تمہاری مرضی اور سہولت پر ہے۔ جس وقت چاہے چلے

چلو۔ ہاں تین چار گھنٹوں میں پھر مکر نہ جانا۔" خالہ نے پیار سے کہا۔

"وہ تو مذاق ہوتا ہے خالہ۔" فرید ہنسا۔

"ایسا بھی کیا مذاق۔"

"ایسا ویسا تو میں جانتا نہیں۔ اتنا جانتا ہوں۔ کہ اپنی خالہ سے یہ چلتا ہی رہے گا

"بڑے شریر ہو۔"

خالہ مسکراہٹ دبائے کمرے سے نکل گئیں۔

اور

فرید گنگناتے ہوئے غسل خانے کی طرف بڑھ گیا۔

شیو کرنے کے بعد اسے نہا دھو کر ابھی دفتر جانا تھا۔

—— ٭ ——

گندم

کی فصل پک کر تیار ہو چکی تھی۔ اور کھیتوں میں کٹائی کا کام زوروں پر تھا کئی کھیت کٹ چکے تھے۔ اور گندم کے پشتے کے پشتے لگے تھے۔ کئی کھیتوں میں چمکتی ہوئی تیار فصل کھڑی کٹائی کی منتظر تھی۔ کسانوں کی شبانہ روز محنت کا صلہ زمیندار وصول کر رہے تھے۔

سورج آغوشِ مغرب میں سما جانے کو بے تابی سے ہمک رہا تھا۔ آسمان کی نیلاہٹوں میں سنہری سرخی بکھر رہی تھی۔ گاؤں کی کھلی فضا لہلہاتا سبزہ۔ ہرے بھرے درخت اور گندم کی پکی ہوئی سنہری کھیتیاں ماحول کو اک حسن عطا کر رہی تھیں۔ گاؤں کی فضا کا ایک جداگانہ اور ہوش ربا حسن ہوتا ہے۔ اس کا اپنا ہی نکھار ہوتا ہے۔ اپنا ہی وقار ہوتا ہے۔ سارا دن انتھک محنت کے بعد مرد، عورتیں اور بچے اپنی اپنی تفریح کے پہلو نکالتے ہیں۔ مرد سرِ شام ہی کھانا کھا کر چلم تمباکو لے کر گاؤں کے کسی پرانے پیڑ تلے جمع ہو جاتے ہیں۔ ادھر ادھر کی باتیں ہوتی ہیں۔ منظوم لوک کہانیاں گائی جاتی ہیں۔ اور تھکن حقے کی گڑگڑاہٹوں میں دور کی جاتی ہے۔ بچے بالے گلیوں میں اودھم مچاتے ہیں۔ عورتیں گھروں کے کاموں میں جٹ جاتی ہیں۔ کوئی چرخا لے بیٹھتی ہے۔ تو کوئی سوت کی اٹیاں کھولنے بیٹھ جاتی ہے۔

ابھی شام پوری طرح نہیں ڈھلی تھی۔ کٹائی ختم کرنے کے بعد پرانے تانبے کی سی رنگت والے کسان کاٹی ہوئی گندم کو ایک جگہ اکٹھا کر رہے تھے۔ بچے اور عورتیں بھی مردوں کا ساتھ دے رہے تھے۔

فرید تین بجے گاؤں پہنچ گیا تھا۔ بڑی مدت کے بعد گاؤں آیا تھا۔ مالک کو دیکھنے

کے لیے زکر چاکر ٹوٹ پڑے تھے۔ مزارعے بھی پہنچ گئے تھے۔ اور چھوٹے موٹے زمیندار بھی علیک سلیک کو حاضر ہوئے تھے۔ فرید کے والد اپنے انکسار اور حلیمی کی وجہ سے گاؤں والوں میں بے حد مقبول تھے۔ انہی کے واسطے سے لوگ فرید کے پاس بھی آتے تھے۔ فرید پڑھا لکھا نوجوان تھا۔ چاک اور خلوص کی قدر و قیمت جانتا تھا۔ سب سے اس طرح ملا۔ کہ لوگ مرعوب ہو گئے۔

شام انہی لوگوں سے نپٹتے ہو گئی۔ خالہ ہاشم علی کے ہاں جا چکی تھیں۔ فرید نے انہیں ملنے جانا تھا۔ بصد مشکل لوگوں سے چھٹکارا کر وہ گھر سے باہر نکلا۔ تو سورج آغوش مغرب میں سما جانے کو بے تابی سے ہمک رہا تھا۔

ہاشم علی کی حویلی فرید کی زمینوں کے آخری سرے کے قریب واقع تھی۔ وہ ایک کے بعد گاؤں آیا تھا۔ لیکن سارے راستے اسے اب بھی یاد تھے۔ رحمو اور برکت نے دکھانے کو ساتھ جانے کی پیش کش کی تھی۔ لیکن فرید نے شکریے کے ساتھ ان کی پیش کش ٹال دی تھی۔ اسے سب راستے بخوبی یاد تھے۔ اور جب ان راستوں پر اس کے قدم اٹھنے لگے تو ذہن کے گوشوں سے چپکی بے شمار باتیں شعور میں ٹپکنے لگیں۔

وہ پرانے کنوئیں کے قریب سے گزرا تو اسے وہ دن یاد آ گیا۔ جب وہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ اس کنوئیں پر گولیاں کھیلا کرتا تھا۔ یہاں رہٹ تھا۔ اور بڑے شوق سے آنکھوں پر پٹی باندھے بیلوں کے گھومنے اور گدی پر بیٹھ کر چکر میں خوشی محسوس کیا کرتا تھا۔

بڑ کے پرانے درخت کو دیکھ کر اسے اپنے ہم جولی یاد آ گئے۔ اور گندے کا وہ جوہڑ دیکھ کر اسے امی سے اپنی پٹائی بھی یاد آ گئی۔ وہ مچھلیاں پکڑنے اس گندے میں اپنے دو تین ساتھیوں کو لے کر اتر گیا تھا۔ ایک ساتھی تو ڈوبتے ڈوبتے بچا اسی بات پر امی سے اس کی خوب پٹائی ہوئی تھی۔

وہ ان پرانی یادگاروں پر تھوڑی تھوڑی دیر رکا۔ خاموش کھڑا عقیدت بھری نظروں سے انہیں دیکھتا رہا۔ وقت کے قدم نہیں رکتے۔ زمانہ گزرتے چلے جانے کا نام ہے لیکن بعض پرانی یادیں ذہن سے کسی نہ کسی طور وابستہ رہتی ہیں۔ وہ جب شیشم کے اس بڑے درخت کے نیچے سے گزرا جو پرانی منڈیر پہ جھکا ہوا تھا۔ تو اسے بچپن کا ایسا واقعہ یاد آ گیا۔ جو اب اس کی زندگی پہ اثر انداز ہو رہا تھا۔

اسے اچھی طرح یاد تھا۔ کہ اس کے ہم جولی جن میں سلمیٰ بھی تھی۔ اس درخت پر چڑھے تھے۔ چڑیوں اور کوؤں کے گھونسلوں سے انڈے نکالنے کا خبط تھا۔ خدا جانے کتنے گھونسلے برباد کرنے کے بعد وہ سب نیچے اتر آئے لیکن سلمیٰ اوپر ہی الجھی رہ گئی۔ وہ چڑھ تو گئی تھی لیکن اترنا نہیں آ رہا تھا۔ وہ اور اس کے ساتھی درخت کے نیچے کھڑے اسے ہدایتیں دے رہے تھے۔ لیکن وہ ڈر رہی تھی۔ اور پھر ڈر اس حد تک بڑھا۔ کہ اس نے چیخ چیخ کر رونا شروع کر دیا۔ کئی لڑکے سزا کے خوف سے بھاگ گئے۔ لیکن وہ وہیں رہا۔ جی میں جانے کیا آئی۔ کہ ایک دم درخت پر چڑھا اور سلمیٰ کے قریب پہنچ گیا۔ سلمیٰ کو اپنی پشت پر لادا۔ اس کی بانہوں کی گرفت اس کی گردن پر تھی۔ سہار سہار کر قدم رکھتا وہ درخت سے نیچے اتر آیا۔ سلمیٰ کو اس نے درخت سے کسی نہ کسی اتار ہی لیا تھا۔

اس پرانے واقعے کو یاد کر کے اس کے ہونٹوں پر تازہ ہنسی بکھر گئی۔

سلمیٰ — آج اسی سلمیٰ کو وہ اک خاص زاویۂ نگاہ سے دیکھنے جا رہا تھا۔ اپنی گردن کے گرد سلمیٰ کے حمائل بازوؤں کا تصور بڑا ہی جاں گداز تھا۔ گنگناتے ہونٹوں کی لے پر قدم رکھتے وہ آخری کھیت کو بھی عبور کر گیا۔ سامنے ہی ہاشم علی کی بہت بڑی حویلی تھی۔

سلمیٰ کے متعلق ہی سوچتا وہ دائیں جانب مڑ گیا۔ تصور اتنی خاکے مبہم مبہم سے تھے سلمیٰ کا ہیولیٰ کانپ کانپ کر بکھر جاتا۔ اس کی کوئی واضح شکل اب تک ذہن میں نہ

ڈھل سکی تھی۔

اچانک اس کی نظر سامنے والے ادھ کٹے کھیت پر پڑی۔ اور مجھے وہ ادھر ا
دیکھتا رہ گیا۔

کھیت کے ایک خالی حصے میں اسٹینڈ، کینوس اور رنگ نظر آئے۔ ایک جوا
سال لڑکی بڑے انہماک سے مصروفِ کار تھی۔ لڑکی کی اس کی طرف پشت تھی۔ اور
حدِ نگاہ تک پھیلے سنہری بالیوں والے کھیتوں، ڈوبتے سورج اور سرخی مائل سنہری نیلا
والے آسمان کی تصویر کشی میں مشغول تھے۔

اس نے شہری وضع کے خوبصورت مگر سادہ کپڑے پہن رکھے تھے۔ اور اس کی خوبصو
گردن ناگن ایسی سیاہ چوٹی کی زد میں آئی ہوئی تھی۔ فرید کو اندازہ کرنے میں دقت نہ ہوئی
لڑکی سلمیٰ ہی ہے۔

اس حویلی میں حویلی کے قریب کینوس اور رنگوں سے شغل کرنے والی شہری وضع
کے لباس میں اور کون ہو سکتی تھی۔ یہ سرو قد لڑکی یقیناً سلمیٰ ہی تھی۔

سلمیٰ کے نام پر فرید کا دل دھڑک اٹھا۔ اسے دیکھنے کی آرزو اس شدت سے
کہ اس کے قدم خود بخود اس کی جانب اٹھ گئے۔ وہ اس کے قریب جا کر رک گیا۔

قدموں کے رکنے کی آواز پر لڑکی نے سر گھما کر دیکھا۔ اس کے ایک ہاتھ میں گھلے
رنگ کی پیالی اور دوسرے ہاتھ میں برش تھا۔

"آ۔۔۔ آپ۔۔۔" وہ ایک شہری کو اپنے اتنے قریب اور یوں اچانک د
گھبرا سی گئی۔ فرید ایک ٹک اسے دیکھے جا رہا تھا۔ وہ ہیولی جو کانپ کانپ کر بکھر
تھے۔ وہ تصوراتی خاکے جو مبہم مبہم سے تھے۔ مجسم ہو کر پوری آب و تاب، پوری
شوکت کے ساتھ اس کی نظروں کے سامنے تھے۔ شوق، تجسس اور دلچسپی
وہ اسے دیکھے جا رہا تھا۔

"آپ کون ہیں؟" لڑکی نے سنبھالا لیا۔ برش اور رنگ دیکھ کر دوپٹہ سر پر ڈالتے ہوئے بولی۔

"فرید۔" اس نے بڑی شائستگی سے کہا۔

لیکن لڑکی آنکھوں میں پہچان کی کوئی چمک نہ آئی۔ سراسیمگی سے اس کی آنکھوں کے پھیلاؤ بڑھ گئے۔

"آپ نے ابا جان سے ملنا ہے۔ تو وہ حویلی میں ہیں۔"

فرید نے احترام و عقیدت سے سر قدرے خم کیا۔ "شکریہ۔۔۔ کیا آپ مجھے ان تک پہنچا سکتی ہیں۔"

"جی۔ جی۔" وہ کچھ الجھی۔ "آپ سامنے چلے جائیے۔ کوئی نہ کوئی آپ کو ان کے پاس لے جائے گا۔"

"آپ۔۔۔ سلمیٰ ہی ہیں نا۔" فرید نے اس کی بات ان سنی کرتے ہوئے شوق سے پوچھا۔

"جی۔" وہ کچھ اور گھبرائی۔ ایک اجنبی اسے کیوں کر جانتا تھا۔ یہ سوال ابھی ذہن میں آ ہی رہا تھا۔ کہ فرید بولا۔

"آپ نے مجھے پہچانا نہیں۔"

"جی نہیں۔" وہ جلدی سے بولی۔ اور حیرت زدہ نظروں سے فرید کو دیکھا۔

"ہاں۔۔۔ اتنی مدت ہو گئی۔ پہچان بھی کیسے سکتی ہیں۔ خود مجھے آپ کی شکل یاد نہ تھی۔ لیکن پہچان ایک نظر ہی میں لیا آپ کو۔" فرید بڑے مہذب انداز میں گفت گو کر رہا تھا۔

"آپ آئے کہاں سے ہیں؟" قدرے رک کر لڑکی نے اس کی طرف دیکھا۔

"وہاں سے۔" فرید نے دور درختوں میں گھری اپنی شاندار حویلی کی طرف اشارہ کیا۔

"اسحاق چاچا!۔" لڑکی نے انگلی دانتوں میں دبا کر مسکراہٹ چھپا لی۔ "آپ۔۔۔ آپ۔۔۔"

"جی! میں ان کا بیٹا فرید ہوں۔ آپ کا بچپن کا ساتھی۔" فرید نے شوخی سے اسے دیکھا۔

سلمیٰ کے گال تمتما اٹھے۔

"کچھ یاد آیا۔" فرید نے شوق سے پوچھا۔ سلمیٰ سر جھکا کر مسکرا دی۔

"بچپن میں ہم دن رات اکٹھے اودھم مچایا کرتے تھے۔ ایک مدت کے بعد ان پرانی جگہوں کو دیکھا۔ تو کئی باتیں یاد آ گئیں۔" فرید نے شوق سے سلمیٰ کو دیکھا۔

"آئیے میں آپ کو ابا جان کے پاس لے چلوں۔" سلمیٰ کراتے ہوئے بولی۔ اس کے ذہن میں بھی ماضی کچھ کچھ لوٹ رہا تھا۔ دس بارہ سالہ دبلا پتلا گورے گورے رنگ اور منڈھے سر والا فرید اسے یاد آ رہا تھا۔ آنکھیں جھپک جھپک کر اس نے سامنے کھڑے جواں سال خوب رو اور چمک دار سیاہ بالوں والے فرید کی طرف دیکھا۔ کل کے فرید اور آج کے فرید میں کوئی مناسبت نہ تھی۔ سلمیٰ کے لبوں پر لطیف سی مسکراہٹ چمکنے لگی۔

"پورے بارہ سال بعد آپ کو دیکھا ہے۔" فرید نے سلمیٰ کی بات پھر ان سنی کر دی۔ ان دنوں آپ اتنی سی تھیں۔"

فرید نے زمین سے کوئی دو فٹ ہاتھ اونچا کرتے ہوئے کہا۔ سلمیٰ ہنس پڑی۔

"خیر اتنی تو نہیں تھی میں۔ آٹھ سال کی ہوں گی۔ مجھے اسحاق چچا کی شکل بڑی اچھی یاد ہے۔ خالہ جان بھی یاد ہیں۔ خالہ جان تو فوت۔"

"ابا امی جان دونوں۔"

"ہائے اللہ اسحاق چچا بھی۔"

"جی ہاں۔ انہیں وفات پائے دوسرا سال ہے۔"

سلمیٰ نے دلگیر سی صورت بنا لی۔

اب شوق اور تجسس سے پھسل کر گفت گو سنجیدہ معاملات کی طرف آ گئی تھی۔ فرید اپنے امی اور ابا کے بارے میں مختصر الفاظ میں سلمیٰ کو معلومات بہم پہنچانے لگا۔ سلمیٰ کو اس کی باتیں سن کر دکھ ہو رہا تھا۔ بچپن میں وہ اسحاق چچا کی بڑی لاڈلی ہوا کرتی تھی۔ وہ جب

بھی دور دراز شہروں میں جاتے۔ اس کے لیے اچھی اچھی گڑیاں لانا نہ بھولتے تھے۔ بیتے دنوں کی یادگار ایک بڑی سی سونے جاگنے والی گڑیا۔ اس نے اب تک سنبھال کر رکھی ہوئی تھی۔ شہر کی مشینی زندگی نے دونوں خاندانوں کو اس طرح اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ کہ ایک دوسرے سے دور سے دور ہوتے چلے گئے تھے۔ اجنبیت کی دیواریں اٹھ آئی تھیں۔ لیکن اس اجنبیت کے باوجود زندگی کا ابتدائی دور تو ایسا تھا جس کی قربتیں آج کی اجنبیت کو لمحوں میں توڑ سکتی تھیں۔

فرید کو سلمیٰ سے مل کر اور سلمیٰ کو فرید کا سامنا کر کے جو خوشی ہوئی تھی۔ یہ زندگی کے ابتدائی دور کی انہیں قربتوں کا صلہ تھا۔ جو آج کی اجنبیت کو لمحوں میں پھلانگ آئی تھیں۔

"ابا جان اور امی آپ سے مل کر بے حد خوش ہوں گے۔" سلمیٰ نے باتوں کے دوران کہا۔

"آپ خوش نہیں ہوئیں۔" فرید نے بلا جھجک کہہ دیا۔

"کیوں نہیں۔" سلمیٰ سادگی سے بولی۔ فرید کے چہرے پر مسرتوں کے عکس لہرا گئے۔ اس کی آنکھوں میں شوخ سی چمک ابھری۔ سلمیٰ کی آنکھوں میں اتنے مسحور کن اور دلفریب انداز میں جھانکا۔ کہ وہ بوکھلا گئی۔ دوپٹے کا آنچل مروڑتے ہوئے گھبرا کر سوچنے لگی۔ کیا اسے یوں نہیں کہنا چاہیئے تھا؟ فرید نے مطمئن ہو کر وہاں سے چلے جانے کو قدم اٹھایا۔ سلمیٰ بھی ساتھ جانے لگی۔

"آپ اپنا کام کیجئے۔ میں خود ہی ہاشم چچا کے پاس جاؤں گا۔"

"ادھر سے جائیے گا۔" سلمیٰ نے دائیں ہاتھ اشارہ کیا۔

"شکریہ۔" فرید نے خوش دلی سے کہا۔ "میں کوئی اجنبی نہیں۔ اس حویلی کے چپے چپے سے واقف ہوں۔ کچھ بھی تو نہیں بھولا۔ اور اب تو سب کچھ ہی یاد آ گیا ہے۔"

فرید مسکراتے ہوئے پلٹ گیا۔ اور سلمیٰ زیر لب مسکراتی اس کے وجیہہ پیکر کو دیکھتی رہی۔

—— ٭ ——

فریدی

خالہ کے ساتھ صرف دو دن کے لیے گاؤں گیا تھا۔ لیکن آج پورے بارہ دن کے بعد لوٹ رہا تھا۔ یہ بارہ دن یوں لگتا تھا جیسے پلک جھپکنے میں گزر گئے ہوں۔ ہوا کے لرزتے جھونکے کی طرح آئے اور چلے گئے ہوں۔ ہاشم علی کل شام چلے گئے تھے۔ سلمیٰ بھی چلی گئی تھی۔ اس کے جاتے ہی فرید کو یوں محسوس ہوا تھا، جیسے بہاریں ایک دم مرجھا گئی ہوں۔ رونقیں یک سر معدوم ہو گئی ہوں اور زندگی ایک بے روح پیکر بن کر رہ گئی ہو۔ ان بارہ دنوں میں وہ دونوں ایک دوسرے کے کتنے قریب آ گئے تھے۔ اور یہ ان کی خوش قسمتی تھی۔ کہ والدین نے اس قربت کو ہمیشگی کا رنگ دے دیا تھا۔ منگنی کی رسم دھوم دھام سے ادا کرنے کی تاریخ مقرر کر دی گئی تھی۔

شہر آتے ہی خالہ منگنی کی تیاریوں میں لگ گئی۔ بھاری قیمتی ساڑھی خریدی۔ ہیرے کی خوش وضع انگوٹھی لائی۔ فرید کی والدہ کا خوبصورت زیور جس کا تو پڑا تھا۔ فرید نے سیف کھول دی اور خالہ کے نظرِ انتخاب پر یہ معاملہ چھوڑ دیا۔ خالہ نے جڑاؤ کنگنوں کی جوڑی بھی منگنی پہرانے کے لیے نکالی۔

فرید کو ان رسوم کا کیا علم تھا۔ کیا دھرتا خالہ ہی تھی۔ اور جس محبت اور لگن سے خالہ فرض انجام دے رہی تھی۔ فرید کی نظروں میں اس کی وقعت اور اس کے مقام کا تقدس اور بڑھ گیا تھا۔

خالہ اپنے کاموں میں مگن تھی۔ اور فرید اپنی لگن میں۔ دن رات سلمیٰ ہی کا خیال تھا۔ رات وہی سپنوں میں رنگ بھرتی۔ اور دن اٹھتے بیٹھتے تخیل کے پرتو اسی کی وجہ سے رنگین نظر آتے۔

ہاشم علی کے خاندانی دستور کے مطابق منگنی پر فرید بھی ان کے ہاں گیا۔ ایک بہت بڑے جشن کا اہتمام کیا گیا تھا۔ شہر کے سرکردہ لوگ جمع تھے۔ زرق برق لباس جگ مگاتی روشنیوں میں پُر بہار نظر آ رہے تھے۔ موسیقی کی دھنیں فضا کو رومان پرور بنا رہی تھیں۔ سلمیٰ کو فرید کی لائی ہوئی سرخ بھاری ساڑھی پہنائی گئی تھی۔ آرائش نے حسن کو جہاں سوز بنا دیا تھا۔ شرم و حیا کے ہا[illegible] ہی تھی۔ سنگ سہیلیاں اسے تھام کر لے آئیں۔ اور صوفے پر فرید کے پہلو میں بٹھا دیا۔ فرید کی دنیا ہی بدلی جا رہی تھی۔ خوشبوؤں میں بسی سلمیٰ اس کے پہلو میں بیٹھی اس کے صبر و شوق کو آزما رہی تھی۔ زرق برق لباسوں میں ملبوس نوجوان عورتوں اور لڑکیوں نے دونوں کو گھیرے میں لے لیا تھا۔

ہنسی مذاق کی پھوار پڑ رہی تھی۔ فرید کی زندہ دلی سے سب ہی محظوظ ہو رہے تھے۔ فضیلت اور ہاشم علی کو فرید کے انتخاب پر داد دی جا رہی تھی۔ دونوں میاں بیوی خوشی سے پھولے نہ سما رہے تھے۔

"لو بیٹا۔" خالہ نے انگوٹھی نکال کر فرید کے ہاتھ میں دی۔

"اسے کیا کروں۔" فرید نے پوچھا۔

"پہناؤ سلمیٰ کو۔ بسم اللہ کر کے پہناؤ۔" خالہ نے پیار سے کہا۔

"یہ مشکل کام ہے خالہ" فرید نے کندھے جھٹکتے ہوئے سلمیٰ کے جھکے ہوئے سر کی طرف دیکھتے ہوئے مسخروں جیسی شکل بنائی۔ لڑکیاں کھلکھلا کر ہنس پڑیں۔

"چلو پہناؤ۔" خالہ نے لڑکیوں کے ہجوم میں دھچکے کھاتے ہوئے کہا۔

"کیسے پہناؤں خالہ۔" فرید نے پھر شکل بنائی۔ "ان کا ہاتھ تو کہیں دور دور تک نظر نہیں آ رہا۔"

"لاؤ بیٹی اپنا ہاتھ۔" خالہ نے فرید کی مشکل آسان کرنے کو سلمیٰ کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔ "لو پہناؤ اسے۔"

خالہ کے بوڑھے ہاتھوں پر سلمیٰ کا صندلی ہاتھ رکھا تھا۔ نرم و گداز ہاتھ کی حنائی انگلیاں لرز رہی تھیں۔

"اللہ رے بے تابی۔" فرید سلمیٰ کی طرف جھکتے ہوئے بولا۔ "ہم تو سمجھے تھے کہ ناز نخرے دکھائیں گی۔ ہاتھ چھپائیں گی۔ یہ کریں گی وہ کریں گی۔ لیکن جناب انگوٹھی کو بے چین ہوئی جا رہی ہیں۔ توبہ۔ توبہ۔ کس بے باکی سے ہاتھ نکال کے رکھ دیا۔"

سلمیٰ نے تیزی سے اپنا ہاتھ واپس کھینچ لیا۔ لڑکیوں نے قہقہہ لگایا۔ اور خالہ کو الجھن ہونے لگی۔

"آپ جائیے خالہ۔" ایک نوجوان عورت نے خالہ کا کندھا پکڑتے ہوئے کہا۔ "انگوٹھی پہنا لیں گے انگوٹھی۔"

"ہاں ہاں واقعی۔" دو تین لڑکیوں نے خالہ کو گھیرے سے باہر دھکیلا۔ فرید کی پھاڑ سے وہ محظوظ ہو رہی تھیں۔

خالہ کے جانے کے بعد فرید کچھ اور بے تکلف ہو کر سلمیٰ کو چھیڑنے لگا۔ قہقہے پر قہقہہ پڑ رہا تھا۔ سلمیٰ شرم سے گٹھڑی بنی جا رہی تھی۔

"بھئی! یہ کیا ہو رہا ہے۔" سلمیٰ کے رشتے کی بھابی نصرت نے لڑکیوں کو ہٹا کر جگہ بناتے ہوئے کہا۔

"پہنا دی انگوٹھی؟" اس نے پوچھا۔

"جی نہیں۔ سلمیٰ صاحبہ کو انگوٹھی پہننے سے انکار ہے۔ خدا جانے انگوٹھی پسند نہیں۔ یا انگوٹھی پہنانے والا۔" فرید نے معصوم صورت بناتے ہوئے کہا۔

"انگوٹھی ناپسند کرنے کا تو سوال ہی نہیں۔ اتنی خوبصورت ہے۔ نگینہ ہنستے ہوئے۔"

"تو انگوٹھی پہنانے والا کیا کم خوبصورت ہے۔ ماشاء اللہ۔" بھاری بھرکم صغیرہ داد کے طور پر کہا۔ "لاکھوں میں ایک ہے۔"

"نوازش۔ عنایت۔ بڑی مہربانی۔" فرید نے ہاتھ سے جھک جھک کر سلام کرتے ہوئے صغیرہ کو دیکھا۔ "لیکن محترمہ آپ کے اعتراف سے کام بننے کا نہیں۔ معاملہ تو سلمیٰ صاحبہ کی پسند ہے۔ جو یقیناً مجھے پسند نہیں فرما رہیں۔"

"چلو ہٹو۔ شریر کہیں کے۔" نصرت بھابی نے پیار سے سرزنش کی۔ "ضرورت سے زیادہ باتونی ہو۔ تو پہناؤ انگوٹھی۔ کھانے کا وقت ہو رہا ہے۔ اب جلدی کرو۔"

نصرت نے زبردستی سلمیٰ کا ہاتھ کھینچ کر فرید کے سامنے کر دیا۔ ہنسی مذاق کے درمیان فرید نے سلمیٰ کی انگلی کو چھوا۔ اور اس کی ٹھنڈی ٹھنڈی انگلی میں انگوٹھی پہنا دی۔

سلمیٰ کے ہاتھ کا پہلا لمس فرید کے جسم میں برقی رو سی دوڑا گیا۔ کسی نسوانی ہاتھ کو چھونے کا یہ پہلا موقعہ نہیں تھا۔ لیکن سنسنی کی جو برقی لہر اس نے اپنے رگ و پے میں اٹھتی محسوس کی تھی۔ یقیناً یہ اس کے لیے نیا اور پہلا احساس تھا۔ بلوغ کی بھرپور جوانی سے جذباتی کھیل کھیل چکا تھا۔ لیکن ایسی پاکیزہ اور روح میں مسرت کے ہلکورے پیدا کرنے والی لذت اس نے ایک بار بھی محسوس نہ کی تھی۔ چند لمحے کیف و سرور میں ڈوبا وہ سلمیٰ کے ٹھنڈے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں تھامے محبت عقیدت اور احترام سے دیکھتا رہا۔ برف کی طرح ٹھنڈے ہاتھ میں انگاروں کی تپش تھی۔ نصرت بھابی چونکا نہ دیتی۔ تو فرید یہ ٹھنڈا انگارہ تھامے جانے کب تک کیف و سرور کی دنیا میں ڈوبا رہتا۔

ایک مرحلہ سر ہو گیا تھا۔ اب دوسرا مرحلہ سلمیٰ کا فرید کو انگوٹھی پہنانے کا تھا۔ نصرت نے انگوٹھی سلمیٰ کے ہاتھ میں دیتے ہوئے کہا۔ "اب پہناؤ فرید کو۔" سلمیٰ کسمسا کر رہ گئی۔

"اب ہماری باری ہے۔" فرید نے شوق سے سلمیٰ کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"جی ہاں۔" کوئی لڑکی بولی۔

فرید نے اپنے دونوں ہاتھ اپنی گود میں چھپانے کے انداز میں رکھ لیے۔ اور جسم کو سکوڑنے کی کوشش کرتے ہوئے آگے کو جھک گیا۔

"یہ کیا۔" اس کی حرکت پر لڑکیاں ہنس پڑیں۔

"یہ محترمہ گھنٹے بھر اپنا ہاتھ چھپائے رہیں۔ ہم دو گھنٹے چھپائیں گے۔" فرید بولا۔ سب لڑکیاں ہنس پڑیں۔ چھیڑ چھاڑ جاری رہی۔ لڑکیاں زبردستی فرید کا ہاتھ کھینچنے کی کوشش کرتیں۔ فرید ہاتھ ڈھیلا چھوڑ دیتا۔ لیکن جب اس کا ہاتھ سلمیٰ کے سامنے کیا جاتا۔ تو وہ ایک ہی جھٹکے سے ہاتھ واپس کھینچ لیتا۔ خوب شور شرابا۔ ہنسی اور قہقہے اڑے۔ تالیاں پیٹی گئیں۔ سبھی مسرور ہوتے۔ سبھی محظوظ ہوتے۔

"بھئی اب بس بھی کرو۔ کچھ شادی کے دن کے لیے بھی اپنے" نصرت نے فرید سے کہا۔

نصرت نے آپ کے بڑی مضبوطی سے فرید کا ہاتھ پکڑ لیا۔ "لو بھئی سلمیٰ۔ اب ڈال بھی دو انگوٹھی۔" سلمیٰ کے کسی نے ٹھوکا دیا۔ کسی نے کندھا جھنجھوڑا۔ کسی نے ملائمت سے کہا۔ سلمیٰ نے لرزتے کانپتے ہاتھ سے فرید کی انگلی میں انگوٹھی ڈال دی۔ فرید نے اسی ہاتھ سے سلمیٰ کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑ لیا۔ قہقہوں اور تالیوں کی گونج میں مبارک سلامت کا شور اٹھا۔ سلمیٰ گھبرائی لجائی شرمائی۔ ہاتھ کھینچنے کی بھرپور کوشش کی لیکن فرید کی مضبوط گرفت سے ہاتھ چھڑانا مشکل تھا۔

"اب چھوڑ دیجیے۔" نصرت نے سلمیٰ کا ہاتھ چھڑانے کی کوشش کی۔

"ایک شرط پر بھابی۔" فرید نے گرفت اور مضبوط کر دی۔

"وہ کیا؟" نصرت بولی۔

"سمجھ جائیے۔" فرید نے سلمیٰ کو دیکھتے کی آنکھوں ہی آنکھوں میں فرمائش کی۔ نصرت نے مسکراتے ہوئے نفی میں سر ہلایا۔

"نہیں تو نہ سہی۔" فرید نے سلمیٰ کا ہاتھ سختی سے دبایا۔ سلمیٰ کے ہاتھ کی ہڈیاں چٹخ گئیں۔ لذت درد نہ ہوتی۔ تو یقیناً سلمیٰ کی چیخ نکل جاتی۔ فرید نے سلمیٰ کے ہاتھ

کے ساتھ نصرت کی دو انگلیاں بھی جیسے پیس ڈالیں۔

"اُف۔" نصرت چیخی۔ "بخدا چھوڑ دو بھی ہاتھ۔ میری انگلیاں مفت میں مسل ڈالیں۔"

"آپ پہلے وعدہ کریں۔" فرید نے پھر ہاتھ دبایا۔

"اچھا بھئی وعدہ کرلو۔ وعدہ۔" نصرت نے چیختے ہوئے کہا۔

"سب گواہ رہیئے گا۔" فرید نے چاروں طرف گھبرائے لڑکیوں کو دیکھا۔ اور پھر پورے زور سے نصرت کی انگلیاں مسلتے ہوئے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔

"توبہ۔" نصرت دوسرے ہاتھ سے اپنی انگلیاں مسلتے ہوئے بولی۔

"وعدہ خلافی کی تو یاد رکھیئے گا۔" فرید نے ہنستے ہوئے دھمکی کے انداز میں کہا۔

"لو تم وعدہ ابھی دنا کرا لو۔" نصرت نے سلمیٰ کا گھونگھٹ کھینچ اس کا چہرہ فرید کی طرف گھما دیا۔ اس کا فعل اتنا اچانک اور آناً فاناً تھا۔ کہ سلمیٰ سٹ پٹا گئی۔ دونوں ہاتھوں پر چہرہ گرا کر چھپا لیا۔ لڑکیوں کے قہقہے فلک شگاف ہو گئے۔

فرید نے حسن کے بھڑکتے شعلے کی تمازت اک لمحے میں ہی شدت سے محسوس کر لی۔ اس کا انگ انگ مسکرا اٹھا۔ اور اس کی خوشیاں اپنی معراج کو چھونے لگیں۔

"شکریہ شکریہ۔" وہ نصرت بھابی کے سامنے کورنش بجا لایا۔ سب ہنسنے لگیں۔ یوں ہنستے مسکراتے منگنی کی تقریب خوش گوار ماحول میں طے پائی۔

—*—

"نومبر۔ جون کا آخر یا زیادہ سے زیادہ جولائی کا شروع۔"

"ارے ہے۔ کیا کہہ رہے ہو۔"

"دیکھو خالہ میں اس کام سے جلد از جلد فارغ ہو جانا چاہتا ہوں۔"

"لیکن ایسی بھی جلدی کیا۔ شادی ہے گڑیوں کا کھیل تو نہیں۔"

"گڑیوں کا کھیل ہے یا انسانوں کا۔ بہر حال میں نے آخری فیصلہ کر لیا ہے۔ آپ ہاشم چچا کو اس سے مطلع کر دیجئے۔"

"یعنی جون میں شادی کرنا چاہتے ہو۔"

"بالکل۔"

"اپنی بلا کی گرمی میں۔"

"کیا فرق پڑتا ہے۔"

"ایسی بھی کیا جلدی صبری۔" نومبر دسمبر نہ سہی۔ ستمبر کے آخر میں سہی۔ کچھ رت تو

"نہیں۔ نہیں۔ نہیں خالہ۔ ستمبر میں میں ملک سے باہر کاروبار کی غرض سے جا رہا ہوں۔"

"واپس کب آؤ گے؟"

"کچھ ٹھیک کہہ نہیں سکتا۔ ہو سکتا ہے۔ ایک ماہ میں کام ہو جائے۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ تین چار ماہ لگ جائیں۔"

"سچ کہتے ہو؟"

"ہاں خالہ! میں بالکل سنجیدہ ہوں۔"

"ہاشم علی تیار ہو جائیں گے۔"

"انہیں ہونا ہی پڑے گا۔"

"پہلی لڑکی کی شادی ہے۔ کوئی ایک کام تو نہیں ہوتا۔ مشکل ہی ہے۔ اور پھر جون کی چلچلاتی گرمی۔ تم کچھ زیادتی ہی کر رہے ہو فرید بیٹے۔"

"آپ ہاشم چچا سے جون کے آخر یا جولائی کے شروع میں کوئی تاریخ طے کر لیجئے۔ اور بس۔" فرید نے مستحکم آواز میں کہا۔ خالہ حمیدہ اس کا منہ دیکھنے لگی۔ فرید مسکرانے لگا۔

"ایسی جلدی بھی کیا۔" خالہ اس کی مسکراہٹ سے الجھ کر بولی۔

"کہہ جو دیا خالہ۔ آپ کل ان کے ہاں چلی جائیے۔ اور تاریخ مقرر کر لیجئے۔ ہاشم چچا کو یقیناً میرے اصرار پہ تاریخ طے کرنا ہی پڑے گی۔"

"کل چلی جاؤں۔"

"ہاں کل صبح کی گاڑی سے چلی جائیے۔"

"جیسے تم کہتے ہو کر لوں گی۔"

"یوں بے دلی سے نہیں خالہ۔ ہنستے مسکراتے حامی بھریئے۔" فرید نے خالہ کا سرد دونوں ہاتھوں میں پکڑ کر ہلایا۔ خالہ مسکرانے لگی۔

فرید سلمیٰ کو جلد از جلد پا لینے کا خواہش مند تھا۔ اس کی سوکھی پھیکی زندگی۔ زندگی کی حقیقی بہاروں سے روشناس ہونے کو بے تاب تھی۔ سرد یوں کی آمد کا انتظار صبر آزما تھا۔ اور وہ اب اپنے آپ پر تشدد کرنے کا قطعاً روادار نہ تھا۔

خالہ اور فرید کی گفتگو اس کا ملازم نظام بھی سن رہا تھا۔ فرید کی شادی کا وہ بھی خواہش مند تھا۔ اس نے صاحب کو ہمیشہ ہی شادی کر لینے کی رائے دی تھی۔ فرید کے کمرے سے جاتے ہی وہ خالہ کو دیکھ کر بولا:

"صاحب کی خواہش ہے۔ تو بی بی آپ کو اعتراض کیوں؟"

"مجھے اعتراض کیوں ہونے لگا۔" خالہ بی بی "گرمی کا خیال تو کرو۔ جون میں کس

گرمی ہوتی ہے۔"

"کیا فرق پڑتا ہے بُوا۔" نظام بولا۔ "دو چار دن کی بات ہے۔ پھر صاحب پہاڑ

چلے جائیں گے۔ پہاڑ پہ اپنی کوٹھی ہے ان کی۔ گرمی سے ان کا کیا واسطہ۔"

"ہاں یہ تو ٹھیک کہا تم نے۔"

"بس پھر بسم اللہ کیجئے۔"

"کل چلی جاتی ہوں۔ تاریخ طے ہو جائے۔ لڑکی والوں کی رائے بھی تو معلوم ہو۔ خا

گرمی میں شادی پہ رضامند بھی ہوں گے۔"

"انہیں ہونا پڑے گا۔" نظام کی بجائے فرید کمرے میں داخل ہوتے بولا۔ خالہ

ہلانے لگی۔

"خالہ انہیں کہہ دیجئے گا۔ کہ رسموں میں الجھنے کی ضرورت نہیں۔ سیدھی طرح

کر دیں اور بس۔"

"یہ تو اب ان کا زاویۂ نگاہ ہے نا۔ کہ رسموں میں الجھیں یا نہیں۔"

"بہرحال میرا فیصلہ آخری فیصلہ ہے۔"

اور اس آخری فیصلے کی تکمیل کے لیے خالہ کو دوسری صبح ہاشم علی کے ہاں جانا

نے اپنے بیرونی دورے کے متعلق پوری طرح سمجھا کر خالہ کو روانہ کیا۔

ہاشم علی نے بھی گرمی ہی کا اعتراض اٹھایا۔ البتہ فضیلت نے دو ماہ میں شادی

تیاری کے پیشِ نظر مفدرتی رویہ اختیار کیا۔ خالہ نے فرید کا اصرار ان کے گوش گزار کر

ستمبر میں ان کے باہر جانے اور غیر معینہ مدت کے قیام کا بھی ذکر کیا۔ لڑکے کا اصرار

ٹالنا لڑکی والوں کے لیے سود مند نہ ہو سکتا تھا۔ کچھ رد و کد کے بعد دونوں کو شاد

اور خالہ خوش خوش واپس آ گئی۔ وقت کم تھا۔ اور شادی عظیم الشان۔ دونوں طرف

سے تیاریاں زور و شور سے شروع ہو گئیں۔

تیاریاں عروج پہ تھیں۔ کوٹھی کا ہر فرد مصروفِ کار تھا۔ دور پار کی رشتہ دار عورتیں

خالہ کا ہاتھ بٹانے کو آ گئی تھیں۔ دن کام کیا جاتا۔ اور رات ڈھولک پر رومان پرور گیت گائے

جاتے۔ پُربہار سی گہما گہمی تھی۔ خوش گوار سا ہنگامہ تھا۔

فرید اس پُربہار گہما گہمی اور خوش گوار ہنگامے میں کھو گیا تھا۔ اس پون وہ خالہ اور ایک عزیز

دوست کی فیشن ایبل بیوی عقیلہ، حامد کے ساتھ بیش قیمت ساڑھیاں خرید کر لایا تھا۔

وہ بے طرح مسرور تھا۔ دفتر میں بیٹھا ان رنگا رنگ ساڑھیوں میں سلمیٰ کا تھرکتا وجود تصور میں

محسوس کرتے ہوئے مستی کے عالم میں بہک رہا تھا۔ ہر ساڑھی میں سلمیٰ ملبوس تصور کے آنچلوں

پر پھیلتی جا رہی تھی۔ حسن کے رنگا رنگ جلوے تھے۔ اور وہ کرسی کی پشت پر سر رکھے آنکھیں

بند کیے ان جلووں سے حظ اٹھا رہا تھا۔

اس کے عظیم الشان دفتر کا چوبی دروازہ دھیرے سے کھلا۔ چوکیدار اندر داخل ہوا۔ صاحب

کو آنکھیں بند کیے بے خبر کرسی پر نیم دراز دیکھ کر وہ چند لمحے خاموشی سے کھڑا اس کے خود ہی

متوجہ ہونے کا انتظار کرتا رہا۔ اپنی آمد سے مطلع کرنے کو اس نے کھنکارا بھی۔ لیکن فرید کا نشہ

تند و تیز تھا۔

"صاحب جی۔" کئی لمحے انتظار کرنے کے بعد چوکیدار نے پکارا۔

"ہوں۔ آں۔" فرید نے آنکھیں کھول کر دیکھا۔ "کیا ہے؟"

"صاحب جی ایک عورت ملنے آئی ہے۔"

"مجھے؟"

"جی۔"

"بھیج دو۔"

فرید سیدھا ہو کر بیٹھتے ہوئے بولا۔ اسے ملنے ایک دو کیا بیسیوں عورتیں آتی تھیں
کوئی کام پانے کے لیے، کوئی خیرات کے لیے، اور کوئی کاروباری ضرورتوں کے لیے
میز پر پڑے اپنے سیاہ چشمے سے کھیلتے ہوئے وہ عورت کے آنے کا انتظار کرنے لگا
دروازہ پھر کھلا اور خود بخود بند ہو گیا۔

وقتی وقار کے مدنظر فرید نے آواز پر توجہ تو دی لیکن مڑ کر نہیں دیکھا ضرورت ہی
خود اس کے سامنے آنا چاہیئے تھا۔ وہ عینک سے کھیلتا رہا۔ اور کسی بے جان لمحے پر
آنے والا کون تھا؟ فرید کو مڑ کر دروازے کی طرف دیکھنا پڑا۔ اس نے دیکھا اور اس کے
ہاتھوں سے چشمہ چھوٹ گیا۔

اس کا رنگ فق ہو گیا۔ اور آنکھیں پھٹ جانے کی حد تک کھل گئیں۔ ساکت صامت
بے حس و حرکت، وہ آنکھیں پھاڑے اس وجود کو دیکھتا رہا۔ جو میلی کچیلی چادر میں لپٹا تھا
یہ وجود بلو کا تھا۔

گو اس بلو اور پہاڑ کی کپکپاتی سردیوں میں دیکھی ہوئی بلو میں کوئی مناسبت نہ تھی۔ پ
پھر بھی اسے پہچان لینے میں کوئی دشواری نہ تھی۔

کینوس پر نیچے رنگوں سے بنی تصویر ابر و باراں سے دھل کر اپنی خوبصورتی تو کھو
ہے۔ لیکن خاکہ اپنی جگہ قائم رہتا ہے۔

بلو بھی اس خاکے کی مانند تھی۔ وہ حسن ختم ہو چکا تھا۔ مچھلی کی طرح چکنے اور
جسم کی رعنائی عنقا تھی۔ اپنے قدرے پھولے ہوئے پیٹ کو میلی سی چادر سے چھپا
کی کوشش کر رہی تھی۔

رنگ ہلدی کی طرح زرد تھا۔ آنکھوں کے گرد سیاہی مائل گڑھے تھے۔ ہونٹوں
سیاہی مائل پپڑیاں جمی تھیں۔ پیٹ کے سوا سارا جسم سوکھ کر کانٹا ہو رہا تھا۔ سارا

لیتے وقت اس کی ناک کے خم پھیل پھیل کر احساس دلا رہے تھے۔ کہ وہ سخت تکلیف
میں ہے۔ ہاں اس کی آنکھیں اب بھی وہی تھیں۔

ان آنکھوں میں انتظار کی ٹوٹتی کیفیت نے ایسا رنگ بھرا تھا۔ کہ دیکھنے والا دل تھام
لینے پر مجبور تھا۔

فرید میز پر جھک گیا۔ کہنیاں میز پر ٹکاتے ہوئے اس نے اپنا سر دونوں ہاتھوں میں
تھام لیا۔

بلو نے بھی دونوں ہاتھوں سے چہرہ ڈھانپ لیا۔ اور اس کی سسکیاں فضا میں
تھرکنے لگیں۔

—— ٭ ——

پہیہ تیزی سے گھوم رہا ہو۔ تو اس پر ساکت ہونے کا گمان ہوتا ہے۔ لیکن پہیے کا ساکت محسوس ہونا ہی اس امر کی دلیل ہے۔ کہ وہ میلوں کی مسافت تیزی سے طے کر رہا ہے۔

بلو کو یوں اچانک سامنے دیکھ کر فرید کا ذہن دل و دماغ سب گھومتے پہیے کی طرح تھے۔ اس تیزی سے گھوم رہے تھے۔ کہ یوں لگتا تھا۔ کہ جیسے زندگی ساکت ہو گئی ہے لیکن یہ احساس غلط تھا۔ فرید کا تیزی سے گھومتا دماغ واقعات اور حالات کو روندتا ہوا فرار کی راہیں تلاش کر رہا تھا۔

بلو کی سسکیاں تیز ہونے لگیں۔ تو فرید برق کی سی تیزی سے اٹھا۔ اور دروازہ بولٹ کر دیا۔ پھر کئی لمحے وہ بند دروازے سے ٹیک لگائے اپنے کانپتے وجود کو سہارا دیے کھڑا بلو کو دیکھتا رہا۔ معمولی سے وقفے میں اس کے دماغ نے برق رفتاری سے پیش آنے والے واقعے کا جائزہ لیا۔ اپنے گرد و پیش کو جانچا اپنے حالات کو پرکھا۔ اور اس واقعے سے نپٹنے کا فیصلہ کر لیا۔

"تم یہاں کیوں آئی ہو۔" اس بظاہر سادہ جملے میں دھمکی چھپی تھی۔ اس دھمکی کو بلو نے پہلے وار کی طرح قبول کرتے ہوئے آنکھیں پونچھیں۔ اور فرید کی طرف دیکھا۔ وہ منہ سے کچھ نہ بولی۔ لیکن آنکھوں نے فرار کی اذیت کا اظہار کر دیا۔

"تم یہاں کیوں آ گئی ہو۔" فرید اس کی نظروں کی سرزنش سے نادم ہوتے ہوئے بولا۔ اور پھر بڑھ کر کرسی پر بیٹھ گیا۔

"تم جو نہ آئے راجہ۔" بلو کی ہمت بندھی۔ "انتظار کرتے کرتے میں تھک گئی۔ اب۔ اب تو چاچی نے مجھے گھر سے نکال دیا ہے۔ میرا اور ٹھکانہ بھی کہاں ہے۔ تمہارے پاس ہی تو آنا تھا۔"

"اوہ۔" فرید نے ماتھا ہتھیلی پر ٹکا لیا۔

"راجہ۔" بلو ٹوٹی ہوئی آہ کی طرح لڑکھڑا کر اس کی کرسی کے قریب قالین پر بیٹھ گئی "مجھے مایوس نہ کرنا راجہ۔ تمہاری خاطر میں نے بڑے ظلم سہے ہیں۔ مجھ پر اب تو رحم کرو۔ میں تمہارے بچے کی ماں۔"

"اُف۔ بکواس بند کرو۔" فرید کانوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے چیخا۔

"راجہ!!" بلو کی آنکھیں حیرت سے پھٹ گئیں۔

"چلی جاؤ یہاں سے" فرید خونخوار لہجے میں بولا۔

"کہاں جاؤں" بلو نے سنجیدگی سے پوچھا۔

"جہاں مرضی ہے جاؤ۔ جہنم میں جاؤ۔" فرید گرجا۔ "میرا تم سے کوئی واسطہ نہیں ہے"

"سچ کہتے ہو؟" بلو نے ساکت نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"میں زیادہ بک بک نہیں سن سکتا۔" فرید نے میز پر ہاتھ مارا۔

"میں بھی کہیں نہیں جا سکتی۔" بلو نے فیصلہ کن آواز میں کہا۔

"بلو۔ اپنی اوقات سے نہ بڑھو۔" فرید اس کے آواز کے استحکام سے لرز گیا۔ "تمہیں پیسے کی ضرورت ہو۔ تو جتنا چاہے لے لو لیکن یہاں سے چلی جاؤ۔ میرا تم سے کوئی تعلق نہیں۔"

"یوں نہ کہو راجہ۔" بلو پھر رو پڑی۔ "اتنے کٹھور نہ بنو۔ میرا اب تمہارے سوا کون ہے۔ چاچی نے تو میری ہڈیاں پیس ڈالیں۔ میری جان کی بیرن ہو گئی۔ میرے خون کی پیاسی بن گئی۔ لیکن میں نے ــــ میں نے تمہاری امانت ضائع نہ ہونے دی۔ یہ ہمارے

پیار کی نشانی ہے۔ اسے میں نے ہر ظلم سہہ کر بھی اپنے خون سے پالا ہے۔ تم۔"

"اوہ۔" فرید نے دانت پیستے ہوئے اپنا سر دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔

بلو اس کی طرف رحم طلب نظروں سے دیکھنے لگی۔ یوں جیسے کہہ رہی ہو: "
میرے پیٹ میں تمہاری امانت پل رہی ہے۔ یہ ہمارے خوابوں کی حسین تصویر
یہ ہمارے پیار کی نشانی ہے۔ یہ ہمارے مستقبل کا اٹوٹ بندھن ہے۔ مجھے
آنکھوں پر بٹھاؤ۔ میرے ناز اٹھاؤ۔" مجھے احترام کی نظروں سے دیکھو۔ میرے
بانٹ لو راجہ۔ میرے دکھ بانٹ لو۔"

بلو بار بار اپنی میلی سی چادر سے اپنی آنکھیں پونچھ رہی تھی۔ اور فرید اپنے چکراتے
ہوئے سر کو ہاتھوں میں تھامے تیزی سے سوچ کی منزلیں طے کر رہا تھا۔

اس کی ذرا سی جذباتی اور اخلاقی لغزش اسے یہ دن دکھائے گی داس کا تو اسے
اور گمان بھی نہ تھا۔ وہ تو ان دنوں اپنی حسین زندگی کی بنیادیں رکھ رہا تھا۔ عشق
کی رنگین وادیوں میں کھو رہا تھا۔ ملازم خیال کبھی بلو کو بھی ذہن میں کھینچ لاتا۔ تو وہ
چیز کی طرح اسے نفرت و حقارت سے اسی لمحے جھٹک دیتا۔

لیکن اب! — اب بلو اس کی عملی لغزشوں کو اپنے وجود میں ڈھال کر اس کے
آگئی تھی۔ یہ اس کی لغزش کی ایسی گھناؤنی تصویر تھی۔ کہ اسے قبول کرنا تو ایک طرف
کی طرف دیکھنا بھی اس کے بس میں نہ تھا۔

وہ ایک شریف خاندان کا چشم و چراغ تھا۔ شرافت کی چہار دیواری دولت
مزین تھی۔ ایسی لغزش۔ ایسی خطا اور اسے جرم کا کوئی چھینٹا بھی اس چہار دیواری
نہ پڑ سکتا تھا۔ مجرم ہوتے ہوئے بھی وہ اپنا جرم صرف بلو پر ڈال دینے کا حق
بلو روتی۔ تڑپتی۔ مچلتی۔ واسطے دیتی۔ لیکن فرید کی شخصیت کسی داغ کی
نہ ہو سکتی تھی۔ اس کا خاص مقام تھا۔ جو اس گراوٹ کو برداشت نہ کر سکتا تھا۔

"تم کسی ڈاکٹر سے اپنی گلو خلاصی کروا لو۔ میں جتنا پیسہ بھی چاہو گے دوں گا۔" فرید
نے بلو کی ساری التجاؤں کے جواب میں کہا۔

"کیا؟" بلو اس کی تجویز سے کانپ گئی۔

"اس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں۔" فرید کا لہجہ اٹل تھا۔

بلو نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے فرید کو دیکھتے نفی میں زور سے سر ہلایا۔ دونوں گھٹنے
اکٹھے کر کے اپنے بازوؤں کے حلقے میں لیتے ہوئے اس نے اپنے پیٹ کو یوں چھپا لیا۔
جیسے مرغی چیل کے ڈر سے اپنے بچوں کو پروں تلے چھپا لیتی ہے۔ اس کی اذیت سے
پھٹ جانے والی نظروں میں ماما تڑپنے لگی تھی۔ اس کا مجروح پیار بلکنے لگا تھا۔

"تم — تم چاہتے ہو۔ میں اپنے بچے — کو مار ڈالوں؟"

"یہ کرنا ہی ہوگا۔"

"نہیں — نہیں — میں ایسا کبھی نہیں ہونے دوں گی۔"

"تو —"

"راجہ اتنا ظلم — تم سوچو تو سہی، کیا کہہ رہے ہو —"

"زیادہ بک بک مت کرو۔ تیار ہو۔ تو میں روپیہ دینے کو تیار ہوں۔ اگر نہیں چاہتیں
تو پھر جہاں جی چاہے چلی جاؤ۔ میرا تم سے کوئی تعلق نہیں — سمجھیں —"

"مجھ سے کوئی تعلق نہیں —؟"

"نہیں — نہیں — نہیں —"

فرید کے کرخت اور دو ٹوک انکار نے بلو کا دل ہلا دیا۔ فرید کا ترش اور گرجتا ہوا لہجہ
بلو تو شاید برداشت کر ہی لیتی۔ لیکن اس کے اندر کی عورت اس سختی اور ترش روئی سے
خوف ناک ہو کر تڑپ اٹھی۔ بلو ایک دم اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ اس کی آنکھوں سے
اب تک رحم و التجا کی تڑپ ہی آنسو بن کر برس رہی تھی۔ اب ان آنکھوں میں اک

خوف ناک اور بھرپور ارادے کی چمک لہرائی۔ غصے اور انتقام کی چنگاریاں برسنے لگیں۔ مجروح انا کے ٹکڑے تیروں کی طرح برسنے لگے۔

"تمہارا مجھ سے کوئی تعلق نہیں؟" اس نے دانت پیستے ہوئے بھیانک انداز میں پوچھا۔

"نکل جاؤ یہاں سے۔" فرید مرعوب نہ ہوا۔

"نکل جاؤں گی۔ لیکن چین تمہیں بھی نہ لینے دوں گی۔" اس کا سانس پھول رہا تھا نتھنے پھیل رہے تھے۔ اور آنکھوں سے آگ برس رہی تھی۔

"تم میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتیں۔" فرید اس کی دھمکی کے جواب میں بولا:

"میں بتاؤں گی۔ کہ میں تمہارا کیا کچھ بگاڑ سکتی ہوں۔"

"بکواس بند کرو۔ اور نکل جاؤ یہاں سے۔"

"سوچ لو۔ اچھی طرح سوچ لو۔" بلو ہانپتے ہوئے بولی۔ "ظلم کرنے سے پہلے اس کا نتیجہ بھی سوچ لو۔"

جب سوچ لیا ہے۔ دفع ہو جاؤ۔ ورنہ میں اپنے ملازموں سے دھکے دلوا کر تمہیں باہر نکلوا دوں گا۔" فرید نے مرعوب ہوتے بغیر کہا۔ وہ جانتا تھا۔ کہ اس کی ذرا سی جذباتی کمزوری بلو کو اس پر حاوی کر دے گی۔

"میں نے تمہاری باتوں پر اعتماد کیا تھا۔" بلو کی حالت خوفناک ہو رہی تھی۔ "اسی اعتماد کے سہارے میں چاچی کے ظلم سہہ سہہ کر بھی جیتی رہی۔ اور۔ اور تم تک پہنچنے کی کوشش میں لگی رہی۔ تم۔ تم۔ اتنے ظالم ہو۔ چاچی سے بھی زیادہ ظالم۔ میں۔ تم سے بھی نہیں ٹکراؤں گی۔ چھوڑوں گی نہیں تمہیں۔"

وہ گرجتی آواز میں کہتے ہوئے مڑی۔ اس کی آنکھوں سے شعلے برس رہے تھے۔ اس کے ہونٹوں کے کنارے کف آلود تھے۔ وہ بھوکی شیرنی دکھائی دے رہی تھی۔ فرید اس

کی دھمکیوں کو مایوسی کا ردِ عمل سمجھ رہا تھا۔ جو محض گیدڑ بھبکیاں ہوتی ہیں۔ ایک بے سہارا کمزور اور ناتواں لڑکی۔ ایک باعزت باحیثیت، امیرزادے کا بگاڑ بھی کیا سکتی تھی۔ رسوا ہی کرنے کا آخری راستہ تھا۔ سو وہ فرید کی حیثیت اور بے پناہ دولت اس راستے کو مسدود کرنے کو کافی تھی۔

بلو کو مڑتے دیکھ کر فرید نے جلدی سے اپنی سامنے والی بڑی سی دفتری میز کا دراز کھولا۔ اور اس میں نوٹوں کی صورت میں جتنی بھی رقم تھی۔ دونوں ہاتھوں میں سمیٹی۔ اور اٹھ کر بلو کے سامنے آتے ہوئے بولا۔ "یہ لے جاؤ۔ تمہاری ضرورت کو کافی ہوں گے۔"

بلو کی آنکھوں کے شعلے ایک دم بھڑک اٹھے۔ اس کے زردی مائل چہرے میں بجلیوں کی لپک کوند گئی۔ اس کے پپڑی جمے ہونٹ مسکرا گئے۔ اس کے اذیت سے پھیلتے سکڑتے نتھنے پھیل کر ساکت ہو گئے۔ فرید کے ہاتھ سے اس نے سارے نوٹ جھپٹ لیے۔

فرید نے سکون کا اک گہرا سانس لیا۔ لیکن یہ سانس ابھی باہر نکل بھی نہ پایا تھا۔ کہ بلو نے اپنی پوری قوت سے سارے نوٹ فرید کے منہ پر دے مارے۔

فرید بوکھلا گیا۔ نوٹ زمین پر بکھر گئے۔ اور بلو دھاڑی۔ "پاجی۔ کمینے۔ تو سمجھتا کیا ہے۔ تو نے مجھے برباد کیا۔ میری زندگی رہی تو تم سے ایسا بدلہ لوں گی کہ یاد رکھو گے۔"

آندھی اور طوفان کی سی تیزی سے بلو نے دروازہ کھولا۔ اور باہر نکل گئی۔ فرید پتھر کے بت کی طرح کھلے دروازے کو دیکھتا رہ گیا۔

—— ٭ ——

"میں تم سے ایسا بدلہ لوں گی کہ یاد رکھو گے۔"

"میں تم سے ایسا بدلہ لوں گی۔ کہ یاد رکھو گے۔"

"میں تم سے ایسا بدلہ لوں گی کہ یاد رکھو گے۔"

"میں تم سے ——"

"یا خدا" فرید اپنے چکراتے سر کو تھام کر زور سے چیخا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔ اور پیشانی پر عرقِ ندامت چمک رہا تھا۔

دفتر سے بلو کو دھتکار کر نکالتے وقت فرید کو احساس تک نہیں ہوا تھا۔ کہ اس کا ردِعمل اتنا شدید ہوگا۔ وہ اسے دھمکی دے کر چلی گئی تھی۔ چند لمحے اس دھمکی سے وہ مرعوب بھی ہوا تھا۔ لیکن جلد ہی اس نے اپنے آپ پر قابو پاتے ہوئے سارے نوٹ سمیٹ کر دراز میں ڈال دیئے تھے۔ اور اس سلسلے میں مزید کچھ سوچنے سے پہلے ہی اس کی سیکرٹری کچھ ضروری کاغذات لے کر آ گئی تھی۔ دو گھنٹے وہ اسی کام میں کھویا رہا تھا۔

شام بھی اس نے کلب میں گزاری تھی۔ بظاہر خوش باش اور پُرسکون۔ لیکن رات جب وہ تنہائی میں اپنے کمرے میں تھا۔ تو بلو پھر اس کے تصور میں آن دھمکی تھی۔ اپنی خفت اور پریشانی مٹانے کو وہ سگریٹ پہ سگریٹ پھونکتا رہا تھا۔ حلق سوکھ سوکھ جاتا تھا اور دل بیٹھتا ہوا محسوس ہونے لگتا تھا۔

تھک کر وہ آرام کرسی پر نیم دراز ہو گیا تھا۔ تھکاوٹ نیند کے جھونکے سے تسکین پانا ہی چاہتی تھی۔ کہ اس کے دماغ پر پھر ہتھوڑے سے برسنے لگے۔ بلو کی دھمکی دماغی فسوں

کو پھوڑنے لگی۔ اور وہ سر تھام کر مجبور ہو کر "یا خدا" چیخ اٹھا۔

اور اسی اضطراب سے رات گزر گئی۔ بلو فرید کے اعصاب پر ہوا بن کر چھا گئی۔ چلتے پھرتے اٹھتے بیٹھتے سوتے جاگتے وہ خوف زدہ سا رہتا۔

اس نے سلمیٰ سے عشق کا ناطہ جوڑا تھا۔ وہ اپنے دل کی ملکہ کو بہت جلد بیاہ کر لانے والا تھا۔ اس کی خوشیاں بامِ عروج پر تھیں۔ وہ کیف و مستی سے سرشار تھا۔ ہر طرف حسن ہی حسن تھا۔ زندگی کتنی دل فریب، دل گداز اور دلکش ہو گئی تھی۔ لیکن بلو نے اچانک آ کر سب کچھ درہم برہم کر دیا تھا۔

جس طرح طوفانی سمندر ساحلی علاقوں کو اپنی لپیٹ میں لے کر آناً فاناً تباہ و برباد کر دیتا ہے۔ ہنستی بستی زندگی کو اجاڑ کے رکھ دیتا ہے۔ آبادی کو سناٹوں میں بدل دیتا ہے گہما گہمی کو قبرستانوں کی سی بھیانک ویرانی بنا دیتا ہے۔ کچھ اسی سمندری طوفان کی طرح بلو بھی فرید کی ہنستی بستی زندگی کو نگل گئی تھی۔

کئی دن فرید کی ذہنی حالت اختیار سے باہر رہی۔ اس کے خوف، دھڑکے، وسوسے اور خدشے تلاطم بپا کیے رہے۔ اسے یوں لگتا۔ جیسے اس کی لغزش کا راز بلو نے برسرِ عام فاش کر دیا ہے۔ ہر آنکھ اسے نفرت و حقارت سے دیکھ رہی ہے۔ ہر زبان اس کے بارے میں قہر بھرے الفاظ اگل رہی ہے۔

کبھی اسے یوں لگتا جیسے ابھی ابھی سلمیٰ کی طرف سے انکار کا پیغام آ جائے گا۔ بلو سلمیٰ کو اپنے ساتھ ہونے والی ظالمانہ زیادتی کا لفظ لفظ کہہ چکی ہوگی۔

اس واقعے کو تین چار ہفتے گزر گئے۔ مزید کی حالت کچھ سنبھلی۔ وقت پر زخم پر پھاہا رکھنے کا مجاز نہ ہوتا۔ تو آج ہر زخم ناسور بن چکا ہوتا۔ وقت کی مسیحائی کا اعجاز تھا۔ جو فرید نے سنبھالا لے لیا۔ اور وہ یہ بات یقین کے ساتھ ماننے پر آمادہ ہو گیا۔ کہ بلو کی دھمکی محض دھمکی ہی تھی۔

جوں جوں دن گزرتے گئے۔ یہ احساس پختہ ہوتا گیا۔ اسے کہیں بھی نظر آئی تھی۔ ز
کی دھمکی کا کوئی اثر دکھائی دے رہا تھا۔ سلمیٰ کے ہاں شادی کی تیاریاں زور و شور سے
جاری تھیں۔ اور ادھر خالہ بھی تیاریوں میں دن رات مشغول تھی۔

بلو کی جانب سے بدلہ لینے کی دھمکی کا اثر تو بے شک زائل ہو رہا تھا۔ پھر بھی فرید کے
دل میں دھڑکا سما گیا تھا۔ وہ بظاہر تو اب اپنی نارمل حالت میں تھا لیکن اندر ہی اندر
دھڑکے، کچھ خوف اب بھی متلاطم تھے۔

لیکن اب وہ پوری دل جمعی سے سوچ سکتا تھا۔ ان دھڑکوں کو مٹانے اور اس
سے پیچھا چھڑانے کو اس نے اپنے ایک معتمد خادم کی خدمات حاصل کیں۔ اسے پہاڑ
صورتِ حال کا جائزہ لینے کو بھیجا۔

"شمسو کی بھتیجی بلو کے بارے میں پتہ کرنا ہے۔ کہ وہ ان دنوں کہاں ہے۔ ذرا
احتیاط سے کام لینا۔ یہ میرے ایک دوست کا راز ہے۔ سمجھے" فرید نے ساری بات
اس کے گوش گزار کرتے ہوئے کہا۔

ملازم نے سر جھکاتے ہوئے سینے پر ہاتھ رکھ کر رازداری اور احتیاط برتنے کا اقرار
اس لڑکی کا پتہ چلانا ہے کہ وہ کہاں ہے بس۔ یہ اس لڑکی پر بھی ظاہر نہ ہونے پائے۔
سمجھ گئے نا۔"

"جی آپ بالکل بے فکر رہیں۔"

فرید نے اسے انعام کا لالچ اور خرچ کے لیے کافی رقم بھی۔ چند ہی دنوں
رمضانی جو خبر لے کر آیا۔ وہ تھی تو افسوس ناک۔ لیکن فرید کے لیے خوش کن بھی تھی۔

بلو مر چکی تھی۔

"اسے چاچی نے مار پیٹ کر گھر سے نکالا۔ تو در بدر ٹھوکریں کھانے کے بعد نہایت
حالت میں ایک دور کی رشتہ دار کے پاس چلی گئی۔" رمضانی نے بتایا۔ فرید اپنی گھوم جا

والی کرسی پر بیٹھا سگریٹ کے لمبے لمبے کش لیتے ہوئے بلو کی روداد سن رہا تھا۔

"ہوں۔" اس نے لاپرواہی سے کہا۔

"اس کی رشتہ دار بڑی جہاں دیدہ عورت تھی۔ لڑکی کی حالت پر اسے رحم آ گیا۔ بخار میں
پھنک رہی تھی۔ مار پیٹ سے جسم پر نیل ہی نیل تھے۔" رمضانی نے بڑے گمبھیر لہجے میں کہا۔

"بڑی ظالم تھی اس کی چچی" فرید بڑبڑایا۔

"حضور وہ بھی سچی تھی۔ آپ کو تو بتایا ہی نہیں۔ وہ لڑکی ۔۔۔" رمضانی کچھ ہچکچایا۔ پھر
رکتے ہوئے بولا۔ لڑکی ۔۔۔ ناجائز ۔۔۔ بچے ۔۔۔ کی ماں بننے والی تھی سرکار۔ شمسو اور
اس کی عورت نے پہلے تو اپنا سر پیٹا۔ حضور غریب آدمی نے جوان بھتیجی کو گھر میں اس
لیے تو پناہ نہ دی تھی۔ کرتا بھی کیا۔ بس لڑکی پر ہی چلتا تھا۔ اور آپ جانیں جب غربت
غیرت بن جاتی ہے۔ تو اندھی ہو جاتی ہے سرکار۔ لڑکی پر ظلم تو چچا چچی نے توڑا لیکن
بدنصیب لوگ کرتے بھی کیا۔ شمسو غریب ہے بے غیرت نہیں۔"

"مر کیسے گئی وہ۔" فرید نے سگریٹ کے لمبے کش میں اپنے متلاطم جذبات کو
چھپایا ۔۔۔"

"بچے کی وقت سے پہلے ۔۔۔" رمضانی سر آنکھیں جھکاتے ہوئے بولا۔ "اس خدا ترس
رشتہ دار عورت نے لڑکی کو پناہ دی۔ لوگوں میں یہی مشہور کیا۔ کہ لڑکی مظلوم ہے۔ ظالم
شوہر نے گھر سے مار پیٹ کر نکال دیا ہے۔ لڑکی کا گناہ جانتے ہوئے بھی پردہ پوشی
کی۔ سرکار دنیا میں نیک لوگوں کی اب بھی کمی نہیں۔"

رمضانی باتیں کر رہا تھا۔ اور فرید کو یوں لگ رہا تھا۔ جیسے وہ اس کے چہرے
پر جوتے لگا رہا ہے۔ بمشکل اپنی حالت پر قابو پائے وہ رمضانی سے تفصیل کے ساتھ
معلومات حاصل کر رہا تھا۔

"گاؤں میں اب بھی کسی کو خبر نہیں حضور۔ کہ لڑکی کے ناجائز بچہ ہوا تھا۔ خیر وہ بیچاری

خود بھی چل بسی۔ بیماری سے کمزوری بیحد تھی۔ اس پر وقت سے پہلے مردہ بچے کو جنم دیا
اپنی سزا آپ ہی بھوگ مری۔"

"تم۔ تم اس گاؤں گئے تھے۔" فرید نے سگریٹ کی راکھ جھاڑتے ہوئے پوچھا

"جی سرکار۔ بڑی مشکلوں سے پتہ چلا۔ کہ اسی میں تو دس بارہ دن لگ گئے۔ لیکن
سرکار میں نے بھی عہد کر لیا تھا۔ کہ حضور کی خاطر ساری تفصیلات حاصل کر کے لاؤں گا"
رمضانی نے انعام کے لالچ میں اپنی کارگزاری کی داستان خاصی پُرخطر بنا کر سنائی۔

"اچھا بھئی۔ یہ میرے عزیز دوست کی عزت کا معاملہ ہے۔ اس لیے اس
میں تمہاری زبان سے کچھ نہ سنوں۔ ورنہ یاد رکھو۔"

رمضانی نے کھڑے ہو کر ہاتھ باندھ دیے۔

"تمہارا انعام۔" فرید نے میز کی دراز کھول کر سو سو کے پانچ نوٹ نکالے۔ خوشی
مسرت سے رمضانی کی آنکھیں پھیل گئیں۔ دونوں ہاتھوں سے نوٹ پکڑتے وقت
اس کی حالت دگرگوں تھی۔

"تو وہ لڑکی مر چکی۔" فرید نے نیا سگریٹ سلگایا۔

"جی سرکار۔ بالکل۔" رمضانی بولا۔

"پکی خبر ہے نا۔" فرید نے پھر پوچھا۔

"جی بالکل۔" میں خود اس گاؤں سے ہو کر آیا ہوں۔ ابھی پندرہ بیس دن
ہوئے ہیں۔ گاؤں کے بچے بچے کی زبان پر اس نوعمر لڑکی کی موت کا تذکرہ ہے۔
خدا ترس خاتون کی من گھڑت کہانی سے تو لوگوں کو مرنے والی سے بے پناہ ہمدردی
گئی ہے سرکار۔"

"چلو یہ بھی اچھا ہی ہوا۔"

"جی۔ جی۔"

"بس تمہارا کام ختم رمضانی۔ مجھے اپنے دوست کی خاطر یہ سارا مرحلہ طے کرنا
پڑا۔ اب جبکہ بیچاری لڑکی ہی ختم ہو گئی ہے۔ کچھ کیا ہی نہیں جا سکتا۔ ورنہ میں اپنے
دوست کو اس بدنصیب لڑکی کو اپنانے پر ضرور مجبور کرتا۔"

"سیدھی سادی لڑکی تھی۔ فریب کھا گئی۔ دنیا میں ایسا ہوتا ہی رہتا ہے قصور وار
مرد بھی ہوتا ہے۔ لیکن سزا بیچاری۔"

"بس کرو اب۔ جاؤ تم۔" فرید بے چینی سے کرسی پر گھوم کر میز پر پڑی فائل کو
الٹ پلٹ کرنے لگا۔

رمضانی نے نوٹوں کو ندیدہ پن سے دیکھا۔ اس کا جی چاہ رہا تھا جیب میں ڈالنے
کی بجائے انہیں ہونٹوں سے لگا لے۔ امیروں کے لیے بھی کیا ٹھاٹھ۔ دس بارہ دن
چھٹی لے کر گھوم پھر بھی آیا۔ اور پانچ ماہ کی تنخواہ کے برابر رقم بھی پا لی۔

فرید کچھ مضطرب، کچھ مسرور۔ فائلوں کو الٹ پلٹ رہا تھا۔

بلو مر چکی تھی۔ اس کے ساتھ ہی اس کے جرم کی گھناؤنی داستان دفن ہو چکی تھی۔
اب اس کے اعصاب پر پریشانی مسلط تھی۔ نہ دل میں خوف و ہراس۔ ہاں انسانیت
کے ناطے سے اسے بلو کے عبرت ناک انجام کا افسوس ضرور ہوا تھا۔

کیا یہ بلو کی موت کا ذمہ دار وہ نہیں تھا؟ یہ آتش اس کے دل و دماغ کو کئی دن تک
جھلستی رہی۔

لیکن پھر وہی دولت کی کرشمہ سازی۔ اس آگ کو بھی بجھا ڈالا۔ شادی کی تیاریاں
زوروں پر تھیں اور فرید خود کو زیادہ سے زیادہ ان تیاریوں میں مصروف رکھنے لگا۔

اب وہ ذہنی اور دماغی طور پر بالکل۔ بالکل آزاد تھا۔

——— ٭ ———

تو بہت کم رہ گئے۔ معاملہ کہاں تک پہنچا ہے خالہ۔" فرید نے
دفعتہً پر خالہ کے قریب بیٹھتے ہوئے ان کے کندھے پر تھوڑی ٹکا
خالہ دو درزیوں سے کام وصول کر رہی تھی۔ تخت پر کامدانی اور گوٹے کناری سے تو
رنگا رنگ لباس پڑے جگمگا رہے تھے۔

نالے ہے۔ تمہیں بھی کچھ ہوش آیا۔" خالہ نے شاکی لہجے میں کہا۔" مہینہ ڈیڑھ ہو گیا۔
تمہاری مصروفیتیں ہی ختم نہیں ہو رہیں۔ شکر ہے جو آج ادھر آنے کا وقت بھی ملا۔"

"اوہ خالہ ـــ" فرید نے گہری سانس لی۔ وہ خالہ کو کیوں کر بتا دیتا۔ کہ وہ ڈیڑھ
سے جذبات کے کس سینچے پر چڑھا۔ اپنے کس گناہ کی کیسی سزا بھگت رہا تھا۔

"آپ کو کونسا خیال آیا۔ کہ بیٹے کی احوال پرسی ہی کر لیتیں۔" فرید نے انگلیوں
کھیلتے ہوئے کہا۔

"کیوں۔ خدانخواستہ تم بیمار تھوڑے ہی تھے۔"

"بیمار نہیں تو اور کیا تھا۔"

"چلو جھوٹ نہیں بولو۔"

"خالہ کچھ بیماریاں ایسی بھی تو ہوتی ہیں۔ جو بظاہر نظر نہیں آتیں لیکن ہلاکت کے
سامان رکھتی ہیں۔ آپ کیا جانیں خالہ۔"

"اے ہے اللہ بچائے۔ منہ سے کوئی اچھی بات نکالو۔ تجھے تو اچھی بات
سوجھے گی ہی نہیں۔ چل ہٹ۔"

درزی اور دو ملازمائیں فرید کی باتوں پر زیر لب مسکرا رہے تھے۔ خالہ کی گھبراہٹ اور
فرید کو سرزنش کرنے پر بھی سبھی محظوظ ہوئے۔ خالہ بیچاری کیا جانتی۔ کہ فرید جھوٹ نہیں
سچ ہی کہہ رہا ہے۔ پچھلے دنوں تو وہ خود بھی اتنی مصروف رہی تھی۔ کہ دن میں اور کبھی دو
دن میں فرید سے چند منٹ کا سامنا ہوتا۔ دو دفعہ تو اسے ہاشم کے ہاں جانا پڑا تھا۔ ایسی
صورت میں وہ کیوں کر جان لیتی۔ کہ فرید کو کوئی ایسی بیماری لاحق ہے۔ جو بظاہر نظر نہیں آتی
لیکن ہلاکت آفرینی کے پورے سامان رکھتی ہے۔

"چھوڑیے ان باتوں کو۔ یہ بتائیے آپ کا کام پورا ہو گیا۔" فرید نے پوچھا۔

"بس ہو ہی گیا۔ خالہ نے درزیوں اور نوکرانیوں کو رخصت کرتے ہوئے کہا۔

"یہ سب کچھ سلمیٰ کے لیے ہے۔ فرید نے شوق سے پوچھا۔

"تو اور کیا۔" خالہ نے اترا کر کہا۔

"آپ نے تو زر کو آگ لگا دی ہے خالہ۔ فرید نے شوخی سے خالہ کی طرف دیکھا۔

"اتنا پیسہ مفت میں خرچ کر رہی ہیں۔ دلہن نہیں گویا آسمانی پری لا رہی ہیں۔"

"آسمانی پری ہی تو ہے وہ۔"

"واہ۔ وا۔ کیا کہنے۔ خالہ اتنی تعریفیں نہ کیا کریں۔ بس واجبی سی لڑکی ہے آپ
نے تو جانے اسے کیا بنا دیا۔"

"بس رہنے دے اب دل لگی کی باتیں۔ تجھے میں جانتی ہوں اچھی طرح سے۔"

خالہ سے دو چار دل لگی کی باتیں کرنے کے بعد اس نے سنجیدگی سے تیاری کے متعلق
پوچھا۔ خالہ نے اس کے مینیجر شفقت سے مل کر سارا کام تیار کر لیا تھا۔ کپڑا لتا زیور
سب کچھ تیار تھا۔ اس کے علاوہ مہمانوں کی تعداد بھی لکھی جا چکی تھی۔ کوٹھی کو سجانے کا
مرحلہ بھی طے کر لیا گیا تھا۔ دعوت کا پورا حساب کتاب بھی ہو چکا تھا۔

"اوہ۔ جیو خالہ" حسب عادت فرید نے خالہ کا سر زور سے ہلایا اور اٹھ کر چل دیا۔

اب فرید خوش و خرم تو تھا۔ لیکن دل میں بلو کی موت کا مجرمانہ احساس کبھی کبھی کانپ اٹھتا
تو اسے یوں لگتا۔ جیسے اس کے اندر کی کل ٹوٹ پھوٹ گئی ہے۔ اسی وجہ سے وہ بیٹھے
بیٹھے اداس ہو جاتا۔ ہنستے ہنستے چپ ہو جاتا۔ مذاق کرتے کرتے سنجیدہ ہو جاتا۔
اس کی طبیعت کی یہ تبدیلی خالہ نے تو محسوس نہ کی۔ ہاں قریبی دوستوں نے جانے
کی کوشش ضرور کی۔ لیکن فرید تو اب فریب دینے میں ماہر ہو چکا تھا۔ سب کو ہنس کر
ٹال دیتا۔ بھلا اپنی کمزوری کو وہ دوسروں کے سامنے بے نقاب بھی کیوں کر سکتا تھا۔
دن گزرتے گئے ۔۔ اور شادی کی تاریخ قریب آتی گئی ۔۔
فرید پر کبھی کبھی ہیجانی دورے پڑتے رہے۔ لیکن وہ اس کی اذیت کو خود ہی برداشت
کرتا رہا۔ وہ سمجھتا تھا۔ یہ اس کے گناہ کی سزا ہے۔ اس سزا کو بھگت کر وہ اپنا ضمیر
نہ کچھ ہلکا محسوس کرنے لگتا تھا۔
شادی ہو گئی۔ اپنی پوری آن بان اور شان و شوکت کے ساتھ ہو گئی۔ خالہ نے
کے ارمان جی کھول کر نکالے۔ اور اپنی بھوکی تمنا کی تسکین خوب ہی کی۔ لوگ اسے مبارک
دیتے۔ اس کے حسنِ انتظام کی تعریف کرتے تو اسے اتنی خوشی ہوتی کہ پاؤں زمین
نہ پڑتے ۔
اور جب فرید نے گلے میں بانہیں ڈال کر اس کی کارکردگی کی اس طرح داد
خالہ کمال کر دیا آپ نے ۔ اتنی دھوم دھام سے تو شاید میری امی بھی میرا بیاہ نہ کرتی
تو خالہ کو اپنی محنت وصول ہو گئی ۔ وہ خوشی سے جھوم گئی ۔ اور فرید کی کشادہ پیشانی
کو محبت سے چوم لیا۔ فرطِ مسرت سے اس کی آنکھیں ڈبڈبانے لگی تھیں۔
خالہ نے حجلۂ عروسی بھی سجانے میں کوئی کسر نہ چھوڑی تھی۔ خاندان کی نئی نویلی
کو اس نے اس کام پر مامور کیا تھا۔ ان دلہنوں نے اپنی اپنی ازدواجی زندگی کا حسین
خواب گاہ میں سمونے کی پوری پوری کوشش کی تھی۔ خواب ناک ماحول کو اتنا پرکشش

اور دل آویز بنا دیا تھا۔ کہ کمرے میں قدم رکھتے ہی انسان جذبات کی لہروں پر بہنے
لگتا تھا۔
فرید خواب گاہ میں لغزیدہ قدموں سے داخل ہوا۔ اس کا چہرہ بالکل سپید ہو رہا
تھا۔ ماتھے پسینے کی بوندیں چمک رہی تھیں۔ مدہوشی کی بجائے اس پر تلخ ہوش مندی
کا تسلط تھا۔ سلمیٰ جھلملاتے لباس اور جگمگاتے زیورات سے دعوتِ نظارہ دے رہی
تھی۔ لیکن فرید کسی مقناطیسی کشش سے اس کی جانب نہ کھنچ سکا۔ مسہری کے قریب
رکھی کرسی پر بیٹھ گیا۔ کرسی کی پشت پر سر لگاتے ہوئے اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ اس
کا سانس غیر ہموار تھا۔
فرید نوعمر چھوکرا نہیں تھا۔ کہ ایک حسین دلہن کی قربت سے جذباتی طور پر درہم
برہم ہو رہا تھا۔ وہ تو مضطرب تھا۔ بے چین تھا۔ پریشان تھا۔
یادوں کے صحراؤں میں جانے بلو جھکڑ کی طرح کیسے در آئی تھی۔ شعور نے تو بہتیرے
فرار کے راستے ڈھونڈے تھے۔ یہ دوزخ نکاح کے وقت بھی اس پر پڑا تھا لیکن اس
نے جلد ہی اپنے آپ کو گرد و پیش کی گہما گہمی میں کھو دیا تھا۔ جوان لڑکیوں کی چھیڑ چھاڑ
اور نئی دلہنوں کے بے باک مذاق فرار کے راستے تھے۔ اس نے اپنی سوچوں کو ان
راستوں پر چھوڑ دیا تھا۔
لیکن! ۔۔ لیکن اب وہ تنہا تھا۔ بلو یادوں کا جھکڑ بنی جا رہی تھی۔ لاشعور نے بڑی
معصومیت سے اپنے پٹ وا کر دیے تھے۔ بنتی یادیں محتسب کی نظریں بچا کر شعور میں
گھسی چلی آ رہی تھیں۔
اس نے بلو کو دلہن بنانے کے وعدے دیے تھے۔ اس جھلملاتی زندگی کے خواب
دکھائے تھے۔ ان وعدوں اور خوابوں کی اس نے اس سے کتنی بڑی قیمت وصول کی
تھی۔ اف! ۔۔ افوہ ۔۔

کتنا ہی وقت گزر گیا۔ لمحہ لمحہ رینگتا چلا گیا۔ دل کی تیز دھڑکنیں تھم سی گئیں۔ انتظار جھنجھلانے لگا۔ لیکن شرم مانع تھی۔ وہ سر اٹھا کر فرید کو دیکھ بھی تو نہ سکتی تھی۔ فرید کے ہونٹوں سے اُف نکلا۔

تو سلمیٰ نے گھبرا کر سر اٹھایا۔ فرید کرسی کی پشت پر سر رکھے آنکھیں میچے غیر محسوس طور پر جیسے تڑپ رہا تھا۔ سلمیٰ آنکھیں کھولے اسے دیکھتی رہی۔ لمحے رینگتے رہے۔ فرید نے آنکھیں نہ کھولیں۔ تو وہ بیقرار ہو گئی۔ گھبرا کر چھپر کھٹ سے اتری۔ جھجکتے جھجکتے فرید کے قریب آئی۔ آواز کانپ کانپ گئی۔ الفاظ ٹوٹ ٹوٹ گئے۔ لیکن بالآخر ہمت کر کے اس نے پوچھ ہی لیا۔

"آپ ۔۔ کی طبیعت ۔۔ ٹھیک تو ہے نا۔"

فرید نے آنکھیں ایک دم کھول دیں۔ رنگ و بو کے سیلاب کو اپنے اتنے قریب دیکھ کر وہ ششدر سا رہ گیا۔ سلمیٰ نے اک ادائے شرمگین سے اپنا چہرہ جھکا لیا۔

"سلمیٰ۔" فرید اٹھ کر اس کے سامنے کھڑا ہو گیا۔

"سلمیٰ" اس کی آواز گھمبیر ہوتی گئی۔

"سلمیٰ" اس نے شرماتی لجاتی سلمیٰ کو اپنے بازوؤں میں سمیٹ لیا۔

بلو پھر ماضی کی ۔۔ ں میں گم ہو گئی۔ فرید کی بانہوں میں اب سلمیٰ کا وجود تھا۔ ایک لڑکی کا وجود۔ لڑکی جو اس کی اپنی تھی۔

ہر لڑکی کی اپنی ہی خوشبو ہوتی ہے۔ اس خوشبو کا اپنا ہی نشہ ہوتا ہے۔ فرید سلمیٰ کی قربت میں اس حقیقت کو پوری طرح محسوس کر رہا تھا۔ اس انوکھی اور روح کو معطر کر دینے والی خوشبو سے وہ مدہوش سا ہوا جا رہا تھا۔

—— ❖ ——

سلمیٰ

فرید کی زندگی میں بہار بن کر آ گئی۔ فرید نے بھی ماضی کو بھلا ڈالا۔ ماضی ہے ہی بھلا دینے کی چیز۔ اسے بھلایا نہ جائے تو حال سے نپٹنے اور مستقبل کے متعلق سوچنے کی ذہن میں گنجائش ہی نہ رہے۔ یہ تو بعض یادوں کا اپنا ہی تیکھا پن ہوتا ہے۔ جو نوکیلے کانٹوں کی طرح ذہن کے کسی نہ کسی حصے سے چبھتی رہتی ہیں۔ اور کسی کسی موقعے پر اپنی تلخی کا احساس دلاتی رہتی ہیں۔

فرید بھی سلمیٰ کی معیت میں حال کی رنگینیوں میں گم تھا۔ مستقبل تابناک تھا۔ دونوں زندگی کی راہوں پر خراماں خراماں چلنے کو ہاتھ میں ہاتھ دیے قدم اٹھا چکے تھے۔

شادی کی گہما گہمی اور دعوتوں کے سلسلے کچھ ماند پڑے تو خالہ نے چاہا۔ فرید دلہن کو چند دنوں کے لیے پہاڑ پر لے جائے۔ اس نے پہاڑ والی کوٹھی میں ان کی رہائش اور آرام و آسائش کا پہلے ہی سے بندوبست کر دیا تھا۔

اس دن جب فرید اور سلمیٰ رحمان کے ہاں کھانے کے لیے مدعو تھے۔ خالہ نے موقع پا کر بات چھیڑی۔

"اب دعوتیں ختم ہونی چاہئیں۔

"کیوں؟" فرید نے پوچھا۔

"موسم ابھی خاصا گرم ہے۔ میں چاہتی ہوں تم دلہن کو چند دنوں کے لیے پہاڑ پر لے جاؤ۔"

پہاڑ کے نام پر فرید کو جھرجھری سی آ گئی۔ اسے یوں لگا۔ جیسے خالہ نے اسے کسی خوفناک غار میں دھکیلنے کی بات کی ہو۔

"واقعی۔" سلمیٰ شاید گرمی میں بھاری بھاری لباس اور زیورات پہنتے پہنتے تنگ آ گئی تھی۔ خالہ کی تجویز کی تائید میں بولی۔

"میں نے وہاں سب کچھ ٹھیک ٹھاک کروا دیا ہے۔ تم جانے کا پروگرام بناؤ۔ تو ایک دن پہلے نوکروں کو بھیج دوں۔"

"ضرور۔ خالہ۔ ضرور۔ میں تو گرمی میں پگھلتی جا رہی ہوں۔" سلمیٰ نے خوش ہو کر کہا۔

لیکن فرید خاموش تھا۔ اس کے ذہن میں ایک دم یادوں کی کرچیں چبھنے لگی تھیں۔ پہاڑ کے تو نام ہی سے آتا تھا۔ بلو اس دنیا میں نہیں تھی۔ اس کا جرم بلو کے ساتھ دفن ہو چکا تھا۔ لیکن ــــ لیکن بعض یادوں کا اپنا ہی تیکھا پن ہوتا ہے نا۔ جو نوکیلے کانٹوں کی طرح ذہن کے کسی نہ کسی حصے سے چبھتا رہتا ہے۔

"کیوں کیا خیال ہے بیٹے فرید۔ کب تک جاؤ گے۔"

"میں نہیں جاؤں گا۔" فرید کا لہجہ اتنا اکھڑا، کھردرا اور بے محل سا تھا۔ کہ سلمیٰ حیران اسے دیکھنے لگی۔

"کیوں؟" خالہ بیچاری کیا جانتی تھی۔

"بس کہہ دیا نا خالہ۔ فرید الجھ کر بولا۔ "پہاڑ پر میں نہیں جاؤں گا۔"

"ناراض ہونے کی کیا بات ہے بیٹا۔" خالہ بولی۔ "جیسے تمہاری مرضی۔ میں تو دلہن کہہ رہی تھی۔"

"ہر چیز بھی کیا تھا۔" سلمیٰ نے آہستگی سے کہا۔

فرید کو بے حد الجھن ہونے لگی تھی۔ وہ اس موضوع سے ہٹ جانا چاہتا تھا۔

"تم تیار ہو۔ رحمان کے ہاں جانا ہے۔"

"جی! میں تو تیار ہوں۔" سلمیٰ قدرے سہم سی گئی۔ فرید کے مزاج کی ایک دم تبدیلی وہ کچھ خائف سی نظر آنے لگی۔ فرید گھاگ آدمی تھا۔ سمجھ گیا۔ اپنے جذبات پر پوری

قابو پاتے ہوئے مسکرایا۔

"میں نہیں یورپ لے جا رہا ہوں سلمیٰ۔ چند دنوں بعد ہم بیرونِ ملک ہوں گے۔"

"مجھے پہلے بتا دیا ہوتا۔" خالہ نے روٹھتے ہوئے کہا۔

"اچھی خالہ" فرید نے اس کے کندھوں پر ہاتھ رکھ دیے۔ "کتنی بار تو بتا چکا ہوں کہ مجھے کام کے سلسلے میں باہر جانا ہے۔"

"یہ کب بتایا۔ کہ دلہن کو بھی ساتھ لے جاؤ گے۔"

"اوہو ــــ دلہن اور میں اب دو نہیں ہیں خالہ۔ جب میں کہوں کہ مجھے کہیں جانا ہے تو سمجھ جایا کیجئے۔ کہ میں سے مطلب فرید اور سلمیٰ ہوتا ہے ــــ" فرید نے ہنستے ہوئے کہا اور محبت بھری نظروں سے سلمیٰ کو دیکھا۔

"چل ہٹ" خالہ بھی مسکرائی۔

اور سلمیٰ تو جیسے فرید کی بات سے جھوم سی گئی۔ آنکھوں میں تشکر اور عقیدت کا ٹھاٹھیں مارتا سمندر لیے وہ فرید کو دیکھنے لگی۔ فرید نے پیار سے خالہ کے کندھے جھنجھوڑے اور پھر سلمیٰ کی کمر میں ہاتھ ڈال کر اسے تقریباً کھینچتا ہوا باہر لے گیا۔

خالہ کے لبوں پر مسکراہٹ کے ساتھ ساتھ دعائیں بھی تیر رہی تھیں۔ دن گزرتے چلے گئے۔ سلمیٰ اور فرید یورپ چلے گئے۔ چار ماہ کا پروگرام تھا۔ فرید کے کاروباری امور بھی تھے۔ اور سیاحت کے پروگرام بھی۔ وقت اتنا پُرلطف گزرا۔ اتنا پُرلطف کہ یادوں کا تیکھا پن کبھی محسوس ہوا بھی تو گراں نہ گزرا۔

دنوں سے سلمیٰ کی طبیعت گری گری سی رہنے لگی تھی۔ ان دنوں ان کا لنڈ
میں قیام تھا۔ فرید کا روباری امور بھی طے کر رہا تھا اور سیر و تفریح کے
پروگرام بھی تھے۔ لیکن سلمیٰ کی طبیعت کا بجھاؤ اب تفریح میں مانع سا تھا۔ اس دن
ہاؤس آف ویکس دیکھ کر واپس آئے۔ موم کے بنے مجسمے انسان کی صناعی کا لاجواب
کارنامہ تھے۔ خاص کر وہ سلیپنگ بیوٹی۔ حسن کا سویا ہوا شاہکار۔ ایک خوابیدہ
کا حسین مجسمہ، جس کے سینے پر پڑا ہوا لاکٹ سانس کے سے زیروبم سے ہلتا رہتا
انسان کی بہترین تخلیق تھی۔ سلمیٰ کا جی تو چاہتا تھا۔ اس حسن خاموش کو کھڑی پہروں
رہے۔ لیکن طبیعت بوجھل تھی۔ جی کچھ متلا رہا تھا۔ بے دلی سے باتیں کرتی واپس
آئی۔ ہوٹل میں آتے ہی وہ اپنے بستر میں گھس گئی۔

"کیوں؟" فرید اس پر جھک گیا۔ "تھک گئی ہو۔"

"پتہ نہیں کیا ہو رہا ہے۔" سلمیٰ نے کمبل کے اندر منہ چھپا لیا۔

"ٹھنڈ تو نہیں لگ رہی۔"

"نہیں۔ جی متلا رہا ہے۔"

"تم نے تو صبح ناشتہ بھی نہیں کیا تھا۔ کافی منگواؤں۔"

سلمیٰ نے نفی میں سر ہلا دیا۔

"ڈاکٹر کے پاس چلو۔"

"ابھی نہیں۔"

"کیوں۔"

"بس۔"

"طبیعت خراب ہے۔ چلو ڈاکٹر کے پاس۔ کوئی دوائی دے گا تو سنبھل جائیگی۔"

"نہیں جی۔ بس ٹھیک ہے۔ کچھ دیر آرام کروں گی۔ تو ٹھیک ہو جاؤں گی۔"

"آج تو زیادہ گھومے پھرے بھی نہیں۔"

"ہاؤس آف ویکس تو دیکھ لیا۔ کمال ہے جی ان لوگوں کا۔"

"یہ کیا دیکھا ہے ابھی سلمیٰ۔ اگلے سال تمہیں امریکہ لے جاؤں گا۔ وہاں ڈزنی لینڈ کی سیر کرونگی۔ تو حیران ہی رہ جاؤ گی۔ کم بختوں نے حد ہی کر دی ہے۔ موم کے چلتے پھرتے باتیں کرتے، کام کرتے انسان۔ عقل دنگ رہ جاتی ہے۔"

"واقعی؟" سلمیٰ نے تجسس سے پوچھا۔

"خدا قسم! تشخیص نہیں ہو سکتی۔ کہ یہ زندہ انسان نہیں ہیں۔ کوئی ایک چیز ہے۔ کمال ہی کر دیا ہے ان لوگوں نے۔"

فرید ڈزنی لینڈ کے متعلق حیرت انگیز اور دلچسپ معلومات سلمیٰ کے گوش گزار کرنے لگا۔ سلمیٰ بھی تجسس سے سن رہی تھی۔ کہ اچانک اسے ابکائی آئی۔ کمبل پرے پھینک وہ جلدی سے اٹھ کر غسلخانے کی طرف دوڑی۔

ابکائی پہ ابکائی آ رہی تھی۔ فرید گھبرا گیا۔ جب سلمیٰ قدرے سنبھلی تو اس نے پہلا کام اسے ڈاکٹر کے پاس لے جانے کا کیا۔

ڈاکٹر نے معائنے کے بعد جب مسکراتے ہوئے فرید کو یہ نوید سنائی۔ کہ ان کی ازدواجی زندگی ثمر پانے والی ہے۔ تو فرید کی گھبراہٹ تو دور ہو گئی۔ لیکن ذہن ایک بار پھر صحرائی جھکڑوں کی لپیٹ میں آ گیا۔ سلمیٰ بہار کے پھول کی طرح نظر آنے لگی۔

سلمیٰ امید سے تھی۔ پتہ تو اسے پہلے ہی تھا۔ اب ڈاکٹر نے تصدیق کر دی تھی۔ فرید

سے اسے حجاب آنے لگا تھا۔ اپنے کمرے میں پہنچ کر وہ شرمائی لجائی بستر کی طرف یوں بڑھی جیسے وہ نئی نویلی دلہن ہو۔

فرید نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ سلمیٰ نے حیا بار نظروں سے اسے دیکھا۔ اور پھر ہونٹوں کی جائیداد مسکراہٹ بکھیرتے چھوئی موئی کی طرح سمٹ کر اس کے چوڑے سینے میں منہ چھپا لیا۔

فرید کے بازوؤں میں جوش و ولولے کی بجلیاں نہ تھیں۔ پھر بھی اس نے سلمیٰ کا وجود پیار سے سمیٹ لیا۔ اسے پیار کرتے ہوئے وہ کھویا کھویا سا تھا۔ پرانی سوچ حاوی تھی۔

آج رات پھر سوتے جاگتے سپنوں میں بلو ہی بلو تھی۔ وہ بھی اس کے بچے کی ماں بنی اس کا بچہ!! اس ان دیکھے بچے پر اسے بے طرح ترس آنے لگا۔

اَن دیکھا بچہ ۔ جو دنیا میں سانس لینے سے پہلے ہی ختم ہو چکا تھا۔

بچہ مر چکا تھا۔ بلو ختم ہو چکی تھی۔ لیکن فرید کے ضمیر پر وقت بے وقت تازیانے پڑتے رہتے تھے۔ اور گناہ کا بوجھ بڑھتا جاتا تھا۔ یہ کیفیت وقتی ہوتی تھی۔ آج بھی ذہن نے جلد ہی سنبھالا لے لیا۔ آج تو اسے اپنے آپ پر بے طرح غصہ بھی آیا۔ کیا گڑھے مردے کو اکھاڑ لیتا تھا وہ؟ بلو زندہ ہوتی تو تردد کی بات بھی تھی۔ وہ مر چکی تھی۔ اس کے ساتھ سب کچھ ختم ہو چکا تھا۔ وہ ڈرپوک تھا۔ بزدل تھا۔ جو ذرا ذرا سی بات پر اب بھی چونک جاتا تھا۔ اور اپنی خوشیوں کا چہرہ اپنے ہی ہاتھوں مسخ کر لیتا تھا۔

اس نے آئندہ کے لیے اپنے دل سے عہد کر لیا۔ کہ وہ کبھی بلو کی یاد سے یوں مرعوب نہیں ہوگا۔ بلو ذہن میں در آئی بھی تو وہ اسے سختی سے اکھاڑ پھینکے گا۔ یہ اس کی انتہائی بزدلی تھی۔ اور آئندہ وہ ایسی حماقت کا کبھی بھی مرتکب نہ ہوگا۔

اس عہد پر وہ واقعی سختی سے کاربند ہو گیا۔ اور آئندہ وہ ایسی حماقت کا کبھی بھی

نہ ہوگا۔

اس عہد پر وہ واقعی سختی سے کاربند ہو گیا۔ اس نے سلمیٰ کی جی بھر کر ناز برداریاں کیں۔ اس کا ہر ہر طرح سے خیال رکھا۔ اور خیال بھی اس طرح رکھا۔ کہ سلمیٰ کو اپنی ذات پر فخر سا محسوس ہونے لگا۔

یوں وقت گزرتا چلا گیا۔ وہ یورپ سے واپس آ گئے۔ خالہ کی خوشیوں کا ٹھکانہ نہیں تھا۔ مدتوں بعد اس گھر میں ایکا ایکی بہار آنے کو تھی۔ سلمیٰ تو جیسے ان کی ہتھیلی کا چھالا بنی ہوئی تھی۔

مصروفیتیں اپنے عروج پر تھیں۔ سلمیٰ اور فرید اپنے نئے مہمان کی آمد کا انتظار شوق اور محبت سے کر رہے تھے۔ تیاریاں ابھی سے شروع تھیں۔ ننھی منی چیزیں خریدی جا رہی تھیں۔ گھر خوشیوں کا گہوارہ تھا۔ کوئی دکھ کوئی غم نہ تھا۔ زندگی رواں دواں تھی۔

کہ اچانک اس صبح گولڈ مور کے درخت کے نیچے گیٹ کے پیچھے وہ نوزائیدہ بچی ملی۔ جسے فتو مالی نے دیکھا تھا۔ اور بچی کی ماں کے تعاقب میں سڑک پر وہ کتنی ہی دور بھاگا تھا بچی کی ماں تو ہاتھ نہ آ سکی تھی۔ ہاں کالی شال اس کے ہاتھ آ گئی تھی۔

اور بچی کو دیکھ کر فرید جیسے تباہی کے دہانے پر آن کھڑا ہوا تھا۔ وہ بلا ارادہ گیٹ سے باہر نکل گیا تھا۔ کہ اپنے ڈوبتے جذبات کو فتو سے چھپانے کا یہی طریقہ تھا۔

—— ٭ ——

مے سلمیٰ کو بھی یہی بتایا تھا۔ کہ سرکار اس عورت کے تعاقب میں گئے ہیں۔

فتو

دور موڑ والی کوٹھی کی گارڈ نینا کی باڑھ پھاند کر بھاگ گئی تھی۔

لیکن فرید اس عورت کی تلاش میں نہیں نکلا تھا۔ خود کو کھو دینے کے لیے کوٹھی سے آیا تھا۔ اس کی آنکھوں میں نوزائیدہ بچے کا عکس لہرا رہا تھا۔ اور کانوں میں بلو کے آلود الفاظ گونج رہے تھے۔

"میں تم سے ایسا بدلہ لوں گی۔"

اُف! اس نے تو اس دھمکی کو مایوسی کا ردعمل سمجھ کر ذہن سے جھٹک دیا تھا۔ بلو کا اس نے اک بے حقیقت ذرہ سمجھا تھا۔ لیکن آج اس پر یہ حقیقت کھل گئی۔ کہ ذرے کے سینے میں کتنی جہاں سوز توانائی پوشیدہ ہے۔ آج وہ ہیروشیما پر ٹوٹنے والے ہزاروں آفتابوں کے قہر کا اندازہ کر سکتا تھا۔ ذرے کی حقیقت اس پر آشکار ہو چکی تھی۔ اس کے سینے میں چھپی جہاں سوز توانائی کا اندازہ ہو گیا تھا۔

راستے کا تعین کیے بغیر وہ سڑک پر چلتا گیا۔ لمبی سڑک کے اختتامی موڑ پر کسی لڑکی کے بوجھل ہارن سے وہ چونکا۔ شاید وہ رحمت کے ہاں جا رہا تھا۔ رحمت جس نے اس کے مرنے کی من گھڑت کہانی اسے سنائی تھی۔ وہ الٹے پاؤں لوٹا۔ اس کی آنکھوں میں خون اتر آیا تھا۔ رمضانی۔ رمضانی۔ اس کمینے ذلیل انسان کا گلا گھونٹ کر ہی اسے چین آئیگا۔

لیکن اسے یاد آیا۔ رمضانی پچھلے ہفتے سے چھٹی پر اپنے گاؤں گیا ہوا ہے۔

اف! فرید کا ذہن پارے کی طرح تھرک رہا تھا۔ کبھی ایک خیال آتا۔ کبھی دوسرا

رُوپوشی سے لے کر خودکشی تک اس پر سوچ کے کئی سانحے گزر گئے۔ خزاں آشنا زرد سوکھے پتے کی طرح لرزتا وہ پچھلی طرف سے اپنی کوٹھی میں داخل ہوا۔ اور لائبریری کا پچھلا دروازہ کھول کر اندر آ گیا۔

یہ اس کا اپنا گھر تھا۔ لیکن اجنبی لگ رہا تھا۔ کرسی پر گر کر اس نے سامنے سبز کپڑا لگی میز پر اپنے بازو پر پھیلا دیے۔ اس کا دل چیخنے کو چاہ رہا تھا۔ احتجاج کرنے کو چاہ رہا تھا۔ احتجاج کس سے؟

اپنی تقدیر سے۔ جو معمولی سی لغزش کی اسے اتنی کڑی سزا دے رہی تھی۔

فرید سوچوں میں گم تھا۔ اس کا اپنا آپ جیسے پگھلتے سیسے میں ڈوبتا چلا جا رہا تھا۔

ادھر سلمیٰ اپنی خواب گاہ میں بے چینی سے فرید کا انتظار کر رہی تھی۔ وہ خلافِ معمول آج اس کے بیدار ہونے سے پہلے ہی کمرے سے نکل گیا تھا۔ اس پر یہ افتاد کہ کوئی نوزائیدہ بچی کو ان کے در پر پھینک گیا تھا۔

چند دنوں کی معصوم سی خوبصورت بچی۔ کیا ماں اتنی بے رحم بھی ہو سکتی ہے۔ نہیں ماں بے رحم نہیں ہو سکتی۔ یہ تو اک آفاقی جذبہ ہے۔ اس کے اپنے وجود میں اس کا ان دیکھا بچہ کروٹیں لے رہا تھا۔ ہر کروٹ پیار اور محبت کا اک نیا باب کھول رہی تھی۔ اپنے بچے سے اسے تو ابھی سے اتنا پیار ہو گیا تھا۔ کہ اس کا تصور اس کے خیال ہی سے بہکتا رہتا تھا۔ ممتا اتنی بے رحم نہیں ہو سکتی۔ نہیں ہو سکتی۔ سلمیٰ نے اپنا سر نفی کے انداز میں ہلاتے ہوئے سوچا۔

تو پھر! اس بچی کو ماں یہاں ڈال کر کیوں بھاگ گئی۔

کیا غربت نے ممتا کے لہو کی قربانی مانگی تھی؟

یہ خیال بھی سلمیٰ نے جھٹک دیا۔ فتو کے کمند حصے پر پڑی کالی گرم شال اس خیال کی تردید کو کافی تھی۔ ممتا تو چیتھڑوں میں بھی لذت آرام دیتی ہے۔

تو پھر۔ پھر۔ کیا ممتا نے کوئی ایسا وار سہا ہے ایسا زخم کھایا ہے کہ اس کی
اذیت نے اس پر وحشت اور خونخواری طاری کر دی ہے۔ اس طرح کہ ممتا اندھی انتقا
کارروائی سے اپنے زخم ہی پھاڑ ڈالنے پر آمادہ ہو گئی ہے۔
یہ خیال قابلِ غور تھا۔ لیکن وہ عورت بچی کو ان کے در پر کیوں ڈال گئی۔ انتقامی کارو
کا نقطۂ آغاز ان کا در ہی کیوں بنا؟
اک لمحہ کو برا ہی تڑپا دینے والا خیال سلمیٰ کے ذہن میں کلبلایا۔
لمحہ بھی کتنی ہولناک شے ہے۔ اس سے قیامت خیز دھماکے جنم لے لیتے ہیں۔ طوفا
پھوٹ پڑتے ہیں۔ تباہی کے راستے نکل آتے ہیں۔
سلمیٰ سر تا پا کانپ گئی۔ اسے اپنا وجود، اپنی ازدواجی زندگی، اپنی چھوٹی چھوٹی
خوشیاں اس دھماکے کی نذر ہوتی محسوس ہوئیں۔
لیکن نہیں۔ ایسا نہیں ہو سکتا! فرید کو وہ کسی ایسے فعل سے وابستہ ہونے کا
بھی نہ کر سکتی تھی۔
شادی سے پہلے اور شادی کے بعد اس نے وقت کی جو مٹھاس چکھی تھی۔ وہ
تلخی اور ترشی میں تبدیل نہ کر سکتی تھی۔ فرید اس کے خیالات کے تقدس اور عقیدت
معراج تھا۔ لمحہ سے طوفان جنم لیتے ہیں۔ تو اسی لمحے سے خوشیاں بھی تو پھوٹتی ہیں
وہ تو لمحے سے پھوٹتی خوشیوں ہی کی ضامن تھی۔
مضطرب، بے چین اور منتشر ذہن لیے وہ فرید کا انتظار کرنے لگی۔ اپنی ڈھا
آپ بندھائی۔ اس بچی اور فرید کے درمیان اس نے اتنی اونچی دیوار اٹھا دی۔ کہ
کا دوسرے پر سایہ پڑنے کا امکان ہی نہ رہا۔
ادھر نوکروں کے کوارٹروں میں بچی زیرِ موضوع تھی۔ آج سب کو اپنا کام کاج
ہوا تھا۔ فتو کی اہمیت آج بہت بڑھ گئی تھی۔ لطف لینے کو ہر کوئی اس سے نئے

سے بچی کے متعلق سوال کر رہا تھا۔ اور فتو بھی اپنے آپ کو کسی کولمبس سے کم نہیں سمجھ
رہا تھا۔ کولمبس نے تو محض زمین کا ایک ٹکڑا دریافت کیا تھا۔
اس نے تو ایک بچی۔ ایک پری کائنات۔ ایک دنیا۔ ایک راز ڈھونڈ نکالا تھا
کندھے پر بچی کی ماں کی کالی شال ڈالے وہ یوں باتیں کر رہا تھا۔ جیسے ایک دم نوکروں
کی صف میں ممتاز ہو گیا ہو۔
شال سے اٹکا ہوا سونے کا چھوٹا سا بندہ اس نے سب کی نظر بچا کر جیب
میں ڈال لیا تھا۔ بندہ غالباً شال کی کڑھائی کے تاگے میں اٹکا ہوا تھا۔ اور چادر کھینچنے
سے ساتھ ہی اٹک گیا تھا۔ چند ساعت پہلے اسے کڑھائی کے پھولوں میں اٹکا یہ بندہ
نظر آیا تھا۔ جسے چپکے سے اس نے جیب میں اس خیال سے ڈال لیا تھا۔ کہ کہیں اس کے
حصے بخرے ہی نہ ہو جائیں۔ یا مالک کو پتہ چل جائے تو ہاتھ سے جاتا رہے۔
خالہ نماز و تسبیح سے فارغ ہو کر کمرے سے باہر نکلیں۔ تو خانساماں کی لڑکی گاما
برآمدے ہی میں مل گئی۔ اور ایک سانس میں ہی بچی کے متعلق جو جو معلومات اسے حاصل
ہوئی تھیں کہہ ڈالیں۔
"بچی ــــ؟" خالہ نے حیرت سے پوچھا۔
"ہاں خالہ۔" گاما اجھے سانسوں سے بولی "ایسی خوبصورت ہے کہ کیا بتاؤں
مالن کہتی ہے اسے میں پالوں گی۔ سچ خالہ بڑی ہی خوبصورت ہے۔"
"کہاں ہے۔"
"کوارٹروں میں"
"صاحب اور بیگم کو بتایا"
"صاحب تو اس عورت کو پکڑنے گئے ہیں۔ بیگم صاحبہ کو بتایا ہے۔"
"تو پھر۔"

پندرہ برس کی گاماں بھلا کیا جواب دیتی۔ خالہ حیرت زدہ سی کھڑی سوچتی رہی۔ پھر اس کے تیز تیز قدم کوارٹروں کی طرف اٹھنے لگے۔ اس کے ذہن میں بھی کئی ہولناک خیال متصادم تھے۔ کسی نوزائیدہ بچے کو یوں پھینک کر بھاگ نکلنا کسی اچھی بات کا پیش خیمہ تو نہ تھا۔ کیا خبر کیا سے کیا ہو جائے۔ کسی نے یہ بوجھ اس کی اصل جگہ لا پھینکا ہے۔ یا بدنامی کے لیے یہ راہ اختیار کی ہے۔ فرید کی بظاہر تو کسی سے دشمنی نہ تھی۔ کچھ والدین کا اثر و رسوخ، کچھ اپنا منکسر انہ مزاج۔ وہ تو دشمنوں کا بھی دوست تھا۔

پھر — یہ پھر! خالہ کے ذہن میں بھی مختلف مظاہر و اشکال میں ڈھل رہا تھا۔

فتو نے خالہ کو بھی ساری داستان من و عن سنا ڈالی۔

"یہ کس وقت کی بات ہے" خالہ نے متفکرانہ انداز میں پوچھا۔

"ٹھیک وقت کا تو علم نہیں۔ پو پھٹ رہی تھی۔ کچھ اندھا اندھا سا اجالا تھا۔"

"عورت کو تم شناخت کر سکتے ہو" خالہ نے کسی ماہر وکیل کی طرح پوچھا۔ پھر جلد سے سوال اس طریق سے کیا "عورت تھی یا لڑکی"

"بس جی" فتو بڑے ماہرانہ طریق سے مسکرایا "لڑکی ہی تھی۔ بھلی سی۔ عمر کچھ زیادہ نہ تھی"

"تم نے اسے پہلے کہیں دیکھا ہے —"

"جی نہیں —"

"یقین سے کہہ سکتے ہو"

"جی بالکل —"

"ہوں" خالہ چپ ہو گئی۔ اس کی سوچیں جلد از جلد رخ پلٹ رہی تھیں۔ عورت بچی کو پھینک کر بھاگ جانا اس امر کی دلالت کرتا تھا۔ کہ وہ اب واپس اسے لینے کبھی نہ آئے گی۔ لیکن پھر وہی سوال تھا۔ کہ وہ اسے یہاں پھینک کیوں گئی۔

خالہ کا من اس کا جواب دے رہا تھا۔ فرید کی شرافت پر شک و شبہے کی گنجائش نہ بھی سہی۔ پھر بھی جوانی پھسلتی ہوتی ہے۔ بچی کی خوبصورت شکل کو ٹکٹکی باندھ کر دیکھتے ہوئے خالہ خدوخال کی نسبتیں ڈھونڈ رہی تھی۔

کچھ دیر وہاں پوچھ گچھ کرنے کے بعد خالہ پلٹنے لگی "بچی بھوکی بھی تو ہو گی۔ اسے قطرہ قطرہ دودھ پلاتی رہنا"

"ذرا سا پلایا ہے ابھی۔ رونے لگی تھی بیچاری" دھوبن نے کہا "شیشہ بازار سے منگوا لیں گے"

"ہوں" خالہ پلٹ آئی۔ فتو سے اس نے اس عورت کی شناخت کا دوبارہ سہ بارہ کہا "دھیان رکھنا۔ شاید کہیں نظر آئے۔ تم نے غلطی کی۔ اس کے پیچھے تمہیں بھی کوٹھی کا احاطہ پھلانگ جانا چاہیئے تھا"

فتو سر جھکا کر کچھ سوچنے لگا۔

خالہ سوچوں میں ڈوبی کوٹھی کی طرف لائبریری کا دروازہ کھلا دیکھ کر ادھر ہی آ گئی۔ کوٹھی کے اندرونی حصے تک پہنچنے کا یہ آسان ترین راستہ تھا۔

فرید اس وقت بھی لائبریری ہی میں تھا۔ گو اب وہ بڑی حد تک اپنے جذبات پر قابو پا چکا تھا۔ لیکن خالہ کو دیکھتے ہی اس کے اعصاب یوں تن گئے۔ جیسے ٹیکہ لگنے سے پہلے سرنج کو دیکھ کر مریض کے تن جاتے ہیں۔ اس نے سلیپروں کے اندر پیر سکوڑ لیے۔ اور ان کی مٹھیاں خود بخود بند ہو گئیں۔

کمرے میں روشنی روشن نہیں تھی۔ پھر بھی خالہ نے خزاں رسیدہ پتے کی زردی اور کپکپاہٹ پہلی نظر ہی میں محسوس کر لی۔

"وہ بچی —" خالہ نے کچھ کہنا چاہا۔

"لڑکی ہے —" فرید کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

"ہاں۔"

فرید کے سارے وجود میں سنسناہٹ ہونے لگی۔ لیکن جلد ہی سنبھالا لیا۔ آواز میں استحکام کی کیفیت پیدا کرتے ہوئے بولا۔ "عجیب ہی قصہ ہے۔ خدا جانے کون اسے یوں پھینک گیا۔" اس کی آواز خود اسے ہی اجنبی محسوس ہوئی۔ وہ چپ ہو گیا۔

خالہ نے گہری نظروں سے فرید کی جانب دیکھا۔ فرید نے نگاہیں دوسری جانب پھیر لیں۔

"کوئی اولاد کو یوں ہی نہیں پھینک جاتا فرید۔" خالہ کے دبے دبے لہجے نے فرید کے دماغ پر وزنی ہتھوڑے برسائے۔ اس کا دل پھڑکنے لگا۔ خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے اس نے اپنا سر جھکا لیا۔

کچھ دیر خاموشی کا تسلط رہا۔ پھر خالہ کمرے سے نکلتے ہوئے بولی "شک صحت کی علامت نہیں ہوتا فرید بیٹے۔ سلمیٰ یوں بھی امید سے ہے۔"

خالہ کمرے سے نکل گئی۔ فرید سٹ پٹا کر رہ گیا۔ خالہ کیا کہہ گئی تھی۔ اس کے مختصر سے جملے کی اس نے کئی کئی تشریحیں کر ڈالیں۔ اس جملے میں سرزنش تھی۔ انتباہ تھا تو کیا خالہ حقیقت کو پا چکی تھی؟

وہ وہیں بیٹھا رہا۔ اس کے سامنے میز پر فائلیں، کاغذ اور رجسٹر پڑے تھے۔ انہیں گھورتے ہوئے وہ سوچوں میں ڈوب گیا۔ اور جب نصف گھنٹے بعد اس کی تلاش میں سلمیٰ ادھر آ نکلی۔ تو اس نے خالہ کے انتباہ سے استفادہ کرتے ہوئے سلمیٰ پر اپنی پریشانی مطلقاً ظاہر نہ ہونے دی۔ اسے یہی احساس دلایا۔ کہ کام میں خسارے نے اسے پریشان کر رکھا ہے۔

پہلا طوفانی لمحہ تو خوبصورتی سے ٹل گیا تھا۔ لیکن آئندہ!!

—— + ——

شہر سے کوئی دس کوس پر قصبہ مونا والی آباد تھا۔ قصبے کی آبادی پندرہ ہزار کے لگ بھگ تھی۔ سہولت کی نہ سہی، ضرورت کی ہر چیز یہاں میسر تھی۔ قصبے کے لوگ عام طور پر خوش حال تھے۔ ایک مخصوص طبقہ یہاں بھی زندگی کی بنیادی سہولتوں سے محروم کس مپرسی کی حالت میں زندگی بسر کر رہا تھا۔ لیکن مجموعی طور پر قصبے کے مکین زندگی سے بڑے خوش گوار انداز میں نپٹ رہے تھے۔

عام آبادی سے قدرے ہٹ کر کھلے فراخ میدانوں کے سینے پر وہ محل نما عمارت تھی جسے عرف عام میں بڑی حویلی کہا جاتا تھا۔ قصبے کے گرد و پیش پھیلی ہوئی ہریالی اور سونا اگلتی زمینوں کا تقریباً تین چوتھائی اس خاندان کا تھا۔ جو اس حویلی میں مکین تھا۔ کہ رسیدہ لوگ اس حویلی میں ناچتی بہاروں کے گواہ تھے۔ یہ حویلی خوشیوں کا گہوارہ تھے۔ یہاں غم کے سایے بھی نہ منڈلاتے تھے۔ لیکن پچھلے سال جب مسرتیں بام عروج پر تھیں۔ حمید عالم جو اس حویلی کا مالک تھا۔ گھوڑے سے گر کر ہلاک ہو گیا۔ اس کی سات ماہ کی نئی بیاہی دلہن مہ جبین پہ قیامت ٹوٹ پڑی۔

حمید عالم کی موت کے بعد حویلی کی تاریخ کا نیا باب شروع ہو گیا۔ بظاہر فضا پر سکون ہو گئی۔ لیکن اندر ہی اندر سازشوں کا جال بچھنے لگا۔

آفتاب عالم، حمید عالم کا حقیقی بھائی نہ تھا۔ سوتیلا بھی نہیں تھا۔ اک غریب رشتہ دار کا بیٹا تھا۔ جس کے مرنے کے بعد حمید عالم کے باپ نے اپنے سایۂ عاطفت میں لے لیا تھا۔ حمید عالم کو ہمیشہ آفتاب کو بھائی بنائے رکھنے کی تلقین کی تھی۔

لیکن آفتاب کی سرشت اپنی ہی تھی۔ اسے ذرے سے آفتاب بنا دیا گیا تھا جائیداد میں کچھ حصہ قانونی طور پر بھی اسے ملا تھا۔ لیکن اس کی طبیعت کی سیری نہ ہوتی تھی۔ چند مفاد پرستوں کے ہتھے چڑھا ہوا تھا۔ آوارہ گردی اور بے راہ روی کو اپنائے تھا۔ حمید عالم کے مرنے کے بعد میدان صاف نظر آیا۔ لاکھوں کی جائیداد تھی۔ زمینیں تھیں۔ بنک بیلنس تھا۔ مہ جبین نوعمر تھی۔ اسے دھوکہ دے کر ہر چیز پر قابض ہونے کی سوچنے لگا۔ کئی ترکیبیں اس کے شر پسند ذہن میں تھیں۔

مہ جبین سے شادی کر کے وہ بآسانی سب کچھ ہتھیا سکتا تھا۔ لیکن یہ مرحلہ اتنا آسان بھی نہیں تھا۔ مہ جبین ایسی کوئی بات سننے تک کی روادار نہ تھی۔

حمید عالم اس کا محبوب اس سے بچھڑ چکا تھا۔ لیکن اس کی یادوں کے دیئے جلائے وہ اندھیروں میں اپنا رستہ ٹٹولنے کی ہمت رکھتی تھی۔ حمید عالم کی یاد اس کے وجود میں ڈھل رہی تھی۔ اس ہونے والے بچے کے سہارے وہ اپنی زندگی گزار دینے کا عزم کر چکی تھی۔

اور یہ ہونے والا بچہ ہی آفتاب کی راہ کا کانٹا تھا۔ اس نے اس بچے کو راہ سے ہٹانے کا مصمم ارادہ کر لیا تھا۔ اس کے بعد مہ جبین کو قابو کیا جا سکتا تھا۔

بظاہر وہ مہ جبین کا سب سے زیادہ ہمدرد اور غم گسار تھا۔ لیکن در پردہ شیطانی منصوبے بنا کر اسے لوٹ لینا چاہتا تھا۔

مہ جبین اپنے دکھوں کو سینے سے لگائے وقت گزار رہی تھی۔ حویلی کی فضا اس کے غم سے متاثر تھی۔ سوگوار سی خاموشی در و دیوار پر مسلط رہتی تھی۔ آفتاب اس کی دلجوئی کرنے کی ہر امکانی کوشش کرتا۔ دیکھنے والے اس کے خلوص، غم گساری سے بے حد متاثر تھے۔ کوئی اتنا سا شبہ بھی نہ کر سکتا تھا۔ کہ آفتاب مہ جبین کو گزند پہنچانے کا کوئی ارادہ رکھتا ہے۔ خود مہ جبین بھی از خود رفتہ تھی۔ شدتِ غم نے نڈھال کر

رکھا تھا۔ پہروں حمید عالم کی قبر کے ساتھ لگی بیٹھی رہتی۔ قبرستان کا ازلی سناٹا ہوتا اور وہ ہوتی۔ اب تو اس نے کسی کنیز یا خدمت گار کو بھی ساتھ لانا چھوڑ دیا تھا۔ اس سناٹے اور جامد خاموشی سے وہ مانوس ہو چکی تھی۔ جائیداد کی دیکھ بھال روپے پیسے کا حساب کتاب اور زمینوں کی جانچ پڑتال سبھی آفتاب کے ہاتھ میں تھی۔ شیطانی ہوس آفتاب کو اکسا رہی تھی۔ اور وہ معصوم مہ جبین کی بربادی کے منصوبے بنا رہا تھا۔

مہ جبین کی بڑی ہی خواہش تھی۔ کہ اس کا ہونے والا بچہ لڑکا ہو۔ اس نے ابھی سے فیصلہ کر لیا تھا۔ کہ اگر لڑکا ہوا۔ تو وہ اس کا نام حمید عالم رکھے گی۔ زندگی میں حمید عالم کو پھر سے دیکھنے کی تمنا شدید تر سی تھی۔ جب بچہ بڑا ہو گا۔ تو حمید عالم ہو گا۔ اس احساس کے ساتھ ہی اس میں زندہ رہنے کی امنگ بڑھ جاتی۔

اس نے کتنی ہی منتیں مانی تھیں۔ کتنی دعائیں کی تھیں۔ لیکن وہ ازلی بدنصیب تھی۔ منتوں کا اثر ہونا ہوتا۔ یا دعاؤں کی قبولیت اس کے مقدر کا حصہ ہوتی۔ تو حمید عالم شباب میں یوں روٹھ ہی کیوں جاتا۔

مہ جبین کے لڑکی پیدا ہوئی۔ لڑکی۔ جس کی اسے قطعاً خواہش نہ تھی۔ اس کی پیدائش پر وہ پھوٹ پھوٹ کر روئی۔ دیکھنے والے بھی اس کے غم میں شریک تھے۔ آج حمید عالم کی یاد نے پھر سے زخموں کو چھیڑا تھا۔ لیکن مہ جبین کا تو دکھ اور ہی تھا۔ اسے تو یوں لگ رہا تھا۔ جیسے حمید عالم کو دوبارہ دیکھنے کی خواہش اور آس ہمیشہ ہمیشہ کے لیے تاریکیوں میں ڈوب گئی۔

دو تین دن تو وہ بچی کی طرف بالکل ہی ملتفت نہ ہوئی۔ لیکن ممتا بڑی ظالم شے ہے اس کا کوئی دین ہے نہ ایمان۔ مہ جبین کا پیار امنڈنے لگا۔ اور بچی اس کی آنکھوں کا نور بن گئی۔

آفتاب نے بچی کی پیدائش پر بھرپور خوشی کا اظہار کیا۔ حویلی کو دلہن کی طرح سجایا گیا

راگ رنگ کی محفل منعقد ہوئی۔ غرباء میں خیرات بانٹی گئی۔ اور قصبے کے ہسپتال میں بچی کے نام پر ایک نیا کمرہ بنوانے کا اعلان کیا۔

مہ جبین کو زندگی کی ہوا سے کچھ سروکار تو نہ تھی۔ لیکن آفتاب جس طرح خوشیوں کے رنگ نچھاور کر رہا تھا۔ وہ متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔ حمید عالم کے مرنے کے بعد سے اب تک حویلی کے در و دیوار پر جو جامد سناٹے مسلط تھے۔ اب ٹوٹ رہے تھے۔ نوکر چاکر کو جیسے اک نئی زندگی پا رہے تھے۔ وہ کام میں اب نئے سرے سے مستعدی دکھانے لگے تھے۔

یوں لگتا تھا۔ جیسے حویلی کی روٹھی بہاریں پھر سے لوٹ آنے کو مہک رہی ہیں۔ لیکن خدا جانے انتہا ابتدا کو لوٹ آنے پر ہی کیوں کمربستہ رہتی ہے۔ خوشیوں مسرتوں اور گہما گہمیوں کا عروج تھا۔ کہ مہ جبین کو اپنے بھائی کے اکلوتے بیٹے کی بیماری کی اطلاع پا جانا ضروری تھا۔ وہ اپنے خاندانی ڈرائیور کے ساتھ جانے کو تیار ہو گئی۔ بچی کی ملازمہ بھی ساتھ لی۔ اور موٹر میں روانہ ہو گئی۔

موٹر ابھی سنسان سڑک کے دس میل بھی طے نہ کر پائی تھی۔ کہ سڑک کے بیچوں بیچ بندھے رسے نے راہ روک لی۔ ڈرائیور اتر کر راستہ دیکھنے ہی لگا تھا۔ کہ جھاڑیوں سے دو نقاب پوش نکلے۔ ایک نے ڈرائیور کو پہلے وار ہی میں بیہوش کر دیا۔ اور دوسرے نے ملازمہ کو۔ پھر گاڑی الٹ دی گئی۔

یہ حادثہ اتفاقی نہیں تھا۔ آفتاب اور اس کے معتمد نوکر گامے کی ذہنی سازش کا نتیجہ تھا۔ حادثے کی خبر سے مونا والی کے مکین ہراساں ہو گئے۔ اور جب مہ جبین کو بے ہوشی کی حالت میں حویلی لایا گیا۔ تو چھوٹے بڑے بلا امتیاز حویلی پر ٹوٹ پڑے۔

حویلی پر آج دوسری بار قیامت ٹوٹ پڑی تھی۔ حمید عالم کی آخری نشانی کے مٹنے سبھی کو دکھ تھا۔ بچی حادثے کی نذر ہو گئی تھی۔ آفتاب کی راہ کا کانٹا نکل گیا تھا لیکن

سوگوار بنا ہوا تھا۔ گامے نے پھجو اور فضلے جیسے بدمعاشوں سے پانچ ہزار میں یہ معاملہ طے کیا تھا۔ پیسے میں بڑی طاقت ہے۔ ننھی سی جان کو ختم کرنا کیا مشکل تھا۔ پھجو اور فضلے نے پانچ ہزار کو بھی بہت جان کر فی الفور حامی بھر لی تھی۔ اور اس وقت جب مونا والی کا بچہ بچہ سوگوار تھا۔ حویلی کے در و دیوار خون آلود خاموشی میں ڈوب رہے تھے۔ گامے نے پانچ ہزار روپیہ آفتاب سے لے کر پھجو اور فضلے کو دے رہا تھا۔ جنہوں نے بچی کو ٹھکانے لگا کر حمید کے پہلو میں اک ننھی سی قبر کا اضافہ کر دیا تھا۔

مہ جبین کی حالت مخدوش تھی۔ شہر سے کئی ڈاکٹروں کو بلایا گیا۔ آفتاب کی راہ کا پتھر ہٹ چکا تھا۔ اس لیے مہ جبین کے علاج معالجے میں کسر اٹھا نہ رکھی۔ لوگ اس کی غم گساری سے متاثر تھے۔ لیکن چند صاحب نظر معاملے کی تہہ میں ہلچل دیکھ رہے تھے۔ بچی کو چپ چاپ دفن کر دینا۔ اور حادثے کی اطلاع پولیس میں نہ دینا آخر کیا معنی رکھتا تھا۔

لیکن آفتاب عالم جیسے آدمی سے ٹکرانے کی جرأت کس میں تھی۔ ضرورت بھی کیا تھی۔ حادثہ یقینی تھا۔ ڈاکوؤں نے حملہ کیا تھا۔ اس بات کے تو ملازمہ اور ڈرائیور بھی شاہد تھے۔ یہ معاملہ شاید ابھر ہی آتا۔ لیکن مہ جبین کی حالت نے سب کی تشویش بڑھا دی۔ وہ تین دن کی بے ہوشی کے بعد جب ہوش میں آئی۔ تو ہوش سے قطعاً بیگانہ تھی۔ وہ کسی کو پہچان ہی نہ سکتی تھی۔ چوٹ دماغ کے اس حساس حصے پر آئی تھی جس کا یادداشت سے تعلق ہوتا ہے۔

چند دن اور گزر گئے۔ مہ جبین یوں تھی۔ جیسے اجنبیوں میں گھری ہو۔ بمشکل تمام اپنے ذاتی نوکروں کے نام یاد آئے۔ آفتاب کا نام بھی کئی کئی بار دہرانے کے بعد زبان پر آیا۔ لیکن بے گانگی اپنی جگہ رہی۔

اتنا ہی ہونا تھا آفتاب کے لیے تسکین کا باعث تھا۔ لیکن مہ جبین آفتاب کے ضمیر

کا تازیانہ بن گئی۔

اسے دورے پڑنے لگے۔ بیٹھے بیٹھے چیخنے لگتی۔ اٹھ اٹھ کر دوڑتی۔ اور پھر ہا
ملتے آنکھیں پھاڑے ادھر ادھر یوں دیکھنے لگتی۔ جیسے کوئی انمول شے کھو گئی ہو
اس کی حالت ایسی دل ہلا دینے والی ہوتی۔ کہ کوئی آنکھ تر ہوئے بغیر نہ رہی۔ وہ سب کچھ
چکی تھی۔ لیکن اس کے اندر ممتا تڑپ بلک رہی تھی۔ ان داخلی کیفیات کا اظہار یا دش
ہی سے ممکن تھا۔ لیکن سب کچھ بھول کر یہ داخلی جذبے اندر ہی اندر تڑپ رہے تھے
یہ تڑپ دوروں کی صورت میں اظہار پاتی تھی۔

انسانی ضمیر بھی کچھ عجیب سی شے ہے۔ چاہے تو منوں بوجھ تلے خاموش پڑا
اور چاہے تو ذرا سی کنکری سے بھی تلملا اٹھے۔

آفتاب نے دولت کی اندھی ہوس میں اتنا سنگین قدم اٹھایا تھا۔ اس کے ضمیر نے
کی تھی۔ نہ صدا نکالی تھی۔

لیکن مہ جبین کے دوروں نے اسے جھنجھوڑ ڈالا تھا۔ اس کا ضمیر چیخ اٹھا تھا۔ اس
اندر کا انسان بیدار ہو گیا تھا۔ اک لمحے نے اس کی سوچ کی راہیں ہی بدل ڈالی تھیں۔ ا
ظلم کا احساس ناگ بن کر ڈسنے لگا تھا۔

اس کی حالت دگرگوں ہو گئی۔ ضمیر کی پکڑ بڑی ہوتی ہے۔ انسان اپنے آپ سے
لگتا ہے۔ اپنے آپ سے ہی لرزاں ہونے لگتا ہے۔

لوگوں نے آفتاب کے غم و اندوہ کا اندازہ دیکھا تو ٹھنڈی آہیں بھر کر رہ گئے وہ
جس نے چند قیافوں کی نشان دہی کی تھی۔ خود ہی شرمسار نظر آنے لگی۔ آفتاب کا راز
گاما تھا۔ اس کی بدلی ہوئی حالت سے زیادہ متاثر وہی تھا۔ مالک کی ہمت بندھانے
اس نے بڑے ہی جتن کیے۔

لیکن آفتاب کی نظروں نے تو وہ راہیں ہی اوجھل ہو گئی تھیں۔ جن پر اب تک

تھا۔ اک افسوس۔ اک پچھتاوہ دل کو برمے کی طرح چھیدتا رہتا۔ رات رات بھر وہ
دیوانوں کی طرح حویلی کے طویل برآمدوں اور غلام گردشوں میں آوارہ روح کی طرح پھرتا
رہتا۔ اپنے قاتل ہونے کے احساس سے وہ بے موت مرا جا رہا تھا۔

مہ جبین کی حالت سدھرنے ہی میں نہ آ رہی تھی۔ دعاؤں کا اثر تھا نہ دواؤں کا۔ آفتاب
نے سارے جتن کر ڈالے تھے۔ ڈاکٹروں کو دکھایا تھا۔ حکیموں سے رجوع کیا تھا۔ پیروں
فقیروں کے آستانے ٹٹولے تھے۔ لیکن مہ جبین کی گم گشتہ دنیا لوٹ نہ سکی تھی۔ کبھی
رات کے پچھلے پہر، کبھی دوپہر کے ڈھلنے، کبھی طلوعِ آفتاب کے ساتھ اور کبھی ڈوبتے
سورج کے آخری لمحوں میں مہ جبین کی درد بھری چیخ و پکار سے حویلی کے در و دیوار کے
ساتھ آفتاب کا دل بھی ڈوب ڈوب جاتا۔

جب مہ جبین بظاہر ہوش میں ہوتی۔ تو وہ اسے بچی کے بارے میں بہت کچھ کہتا۔ حادثے
کے متعلق بتاتا۔ کسی نہ کسی طرح وہ اسے تغافل کے کہر سے نکالنا چاہتا۔ لیکن مہ جبین
کوری کوری نظروں سے اسے دیکھتی رہتی۔ اس کی کوئی بچی تھی۔ وہ ماننے پر آمادہ نہ ہوتی
اسے کوئی حادثہ پیش آیا تھا۔ وہ تسلیم نہ کرتی۔

آفتاب کی دنیا ہی بدل چکی تھی۔ جس دل میں ہمہ وقت بے اندازہ دولت پانے کی
ہوس رہتی تھی۔ اب صرف ایک ہی لگن تھی۔ مہ جبین کے فتحیاب ہو جانے کی لگن! وہ
اپنا اعترافِ گناہ مہ جبین کے سامنے کرنا چاہتا تھا۔ اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرنا چاہتا
تھا لیکن وہ مہ جبین اب کہاں تھی۔ جس کی بربادی اس کے ہاتھوں ہوئی تھی۔ اب اس
مہ جبین کے سامنے اعترافِ جرم کرنے سے روح کی تسکین اور ضمیر کا اطمینان کہاں
مل سکتا تھا۔ علاج معالجہ بے سود تھا۔ پھر بھی جاری رہا۔ آفتاب نے چند ماہرِ نفسیات
سے بھی رجوع کیا۔ تینوں ماہرین کی رائے ایک ہی تھی۔

مہ جبین کو بچی کی موت سے ناقابلِ بیان صدمہ پہنچا تھا۔ ایک ہی صورت میں علاج

ممکن تھا۔ کہ اس کی گود میں نوزائیدہ بچی ڈال کر اسے ہر لمحہ یہ احساس دلایا جائے کہ ان کی بچی
مری نہیں تھی۔ اک طویل عمل کے بعد ممکن تھا۔ کہ مہ جبین کی کھوئی ہوئی یادداشت لوٹ آئے
یہ عمل صبر آزما تھا لیکن اس سے تینوں ماہرین کسی اچھے نتیجے کے متوقع
آفتاب نے یہ عمل کرنے کی بھی حامی بھر لی۔ لیکن نوزائیدہ بچی کہاں سے لاتا۔ اس
کچھ بھی تھا۔ وہ اس کے لیے پوری کوشش کرنے کو تیار تھا۔ اس نے ملنے جلنے والوں
سے کہا۔ ہسپتالوں میں اطلاع بھجوائی۔ تھانوں میں، یتیم خانوں میں جانے کی ٹھانی
کہیں نہ کہیں سے تو کوئی بے سہارا بچی مل ہی جائے گی۔ اسی امید پر اس نے اپنی کوششیں
جاری رکھیں۔

پچھلا

پہر ڈھل رہا تھا۔ کوٹھی کے بیرونی چمن میں کرسیوں پر خالہ اور سلمیٰ بیٹھی تھیں۔ فریدہ ابھی ابھی اٹھ کر گیا تھا۔ چائے پی جا چکی تھی۔ سانولی چائے کے خالی برتن سمیٹ رہی تھی۔

"کیا حال ہے اس کا؟" سلمیٰ نے سلائیاں بنتے ہوئے پوچھا۔

"کس کا جی۔" سانولی نے گردن موڑ کر پوچھا۔

"وہی۔ بچی۔ جو کل سے اس گھر کی مہمان ہے۔" سلمیٰ نے طنز کیا۔

"ٹھیک ہے جی۔"

"کس کے پاس ہے۔"

"جمو ہی کے پاس۔"

"دودھ وغیرہ پی رہی ہے۔"

"جی۔ شیشے سے پی لیتی ہے۔"

"کوئی بھی نہیں آیا نا اسے لینے۔"

"جی نہیں۔"

"کون آئے گا بیٹی" خالہ نے پہلی بار سلمیٰ اور سانولی کی گفتگو میں حصہ لیا۔

"تو پھر اس کا کیا کریں گے خالہ۔" سلمیٰ نے خالہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

کیا بتاؤں؟"

"میں نے تو پہلے ہی کہا تھا۔ کہ پولیس کے حوالے کر دیتے ہیں۔"

"نہ نہ بیٹی۔"

"کیوں؟"

"پولیس والے خدا جانے اس کا کیا حشر کریں۔ خدا کا خوف کھانا چاہیئے۔"

"خدا کا خوف اس کی ماں نے نہ کھایا۔ تو ہم کیا کھائیں۔"

"ہوں۔"

"آخر اسے ٹھکانے تو لگانا ہی ہے۔ ارد گرد کے لوگوں کو بھی خبر ہو گئی ہے۔ سامنے والی کوٹھی میں جو بیگم اقبال ہیں نا دو بار آ کر پوچھ چکی ہیں کہ اسے کوئی لینے آیا یا نہیں اگر نہیں آیا تو پولیس کو اطلاع دو۔"

"لوگ تو پوچھیں گے ہی۔"

"لیکن خالہ یہ مفت کی بدنامی ہم کیوں مول لیں۔ لوگ خدا جانے کیا سے بنائیں گے۔"

"بنائیں گے تو بنایا کریں۔"

"یہ اچھی بات ہوئی۔"

"تو جیسے چاہو کرو بیٹی۔"

"مجھے تو کچھ سمجھ نہیں آتا۔ یہی سوچتی ہوں۔ کہ پولیس کے حوالے کر دوں۔"

"فریدہ نے کیا کہا۔"

"کچھ بھی تو نہیں۔" وہ تو اپنے کاموں میں الجھے ہیں۔ رات میں نے اتنا ہی پوچھا۔ اب اس بچی کا کیا کریں۔ تو الجھ پڑے۔"

"کیوں؟"

"کہنے لگے مجھے اپنی مصیبت کیا کم پڑی ہوئی ہے۔ مجھے نہیں پتہ کیا کرو۔ جہنم میں بھیجو یا کہیں اور ——— میں نہیں بنا سکتا۔ میں تو چپ ہی ہو گئی۔"

"ہوں؟"

"خالہ خاموشی سے خلا میں گھورنے لگی۔ سانولی رتن اٹھا کر لے گئی۔ اور سلمیٰ کے ہاتھ چھوٹے چھوٹے موزے بننے میں زیادہ مستعدی دکھانے لگے۔

"پولیس کے حوالے نہیں کرنا چاہتیں۔ تو یتیم خانے میں بھجوا دیتے ہیں خالہ۔" سلمیٰ کے ذہن پر جیسے بچی بہت بڑا بوجھ تھی۔ اسے وہ کہیں نہ کہیں اتار پھینکنا چاہتی تھی۔

خالہ کی نظروں نے بتا دیا۔ کہ وہ اس بات سے بھی متفق نہیں ہیں۔ سلمیٰ قدرے جھلا گئی۔ تلخ سی آواز میں بولی۔ "آپ ہی بتائیے نا۔ کیا کرنا چاہیئے۔"

"جو جو کہتی ہے بچی کو پال لے گی۔"

"تو یہ کیجئے۔ جو کے کیڑے مکوڑے کیا پہلے ہی کم ہیں۔"

"دل کی بات ہے نا۔ اگر وہ یہ کارِ ثواب کرنا چاہتی ہے۔ تو ہرج ہی کیا ہے۔ بیٹی کی ذات ہے۔"

خالہ نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ "گناہ اس کا تو نہیں۔ ماں کا ہے جو اسے یوں پھینک گئی ہے ———"

"قصور کسی کا اور درد سر ہمارا۔" سلمیٰ نے مسکرا کر کہا۔

"سچ کہتی ہو۔ میں تو اس کی پیاری پیاری صورت پر ریجھ گئی ہوں۔ اللہ کی شان۔ ہائے! خدا جانے، کس کا خون ہے۔ کس خاندان کی نشانی ہے۔ شکل و صورت تو دیکھو۔"

"صورت شکل کو چاٹنا ہوتا ہے کیا۔ ماں بھی تو شکل و صورت والی ہی ہو گی۔ یہ گل کھلایا۔ بچی کے ضمیر میں بھی تو اسی کا حصہ ہو گا۔ مجھے تو اس خیال سے ہی لڑکی سے کراہت آنے لگتی ہے۔"

"توبہ کرو بیٹی۔ بچی تو فرشتوں کی طرح معصوم ہے۔ اس بیچاری کا کیا قصور۔

"ہرج بھی کیا ہے۔"

"میں پسند نہیں کرتی۔"

"کیوں؟"

"بس۔ بلا وجہ ہی کہہ لیں۔"

"تو پھر میں کیا کہہ سکتی ہوں۔ تم گھر کی مالک و مختار ہو۔"

خالہ وہاں سے اٹھ کر اندر چلی دی۔ سلمیٰ بھی اپنی اون سلائیاں سمیٹ کر اٹھنے کا مسئلہ اس کے ذہن پر سوار تھا۔ اس نے رات اس کے بارے میں کھل کر فریدہ کرنے کی ٹھان لی۔

فرید نے تو جیسے اپنے آپ کو حالات کے حوالے کر دیا تھا۔ کل کا دن اس نے پریشانی میں کاٹا تھا۔ کچھ وہی جانتا تھا۔ لیکن چوٹیں سہہ سہہ کر وہ چوٹوں کا عادی چلا تھا۔ کچھ اپنے دل کو سمجھایا تھا۔ کچھ دماغ پر زور دیا تھا۔ بلو انتقامی آگ میں انتہائی قدم بھی اٹھا چکی تھی۔ بچی اس کے دَر پر پھینک گئی تھی۔ لیکن مغلوب ہو جانا اپنی موجودہ جنت کی سی رعنائیوں اور بہاروں والی ازدواجی زندگی کو کر لیتا تھا۔ فرید کو اپنی اس دنیا سے پیار تھا۔ وہ اسے کسی قیمت پر تباہ نہیں دینا چاہتا تھا۔ اس نے سلمیٰ کے سامنے اعترافِ جرم کر لینے کا بھی سوچا تھا میں جو قباحت نظر آئی تھی۔ وہ عورت کی شکی طبیعت تھی۔ ہو سکتا ہے سلمیٰ بھی معاف نہ کر سکے۔ اسی لیے اس نے اپنے آپ کو حالات کے رحم و کرم پر چھ

لیکن حالات سے یوں سبک سر ہو کر نباہ کر لینے کے باوجود یوں لگتا تھا کے اندر کی کوئی کل ٹوٹ گئی ہے۔ جن ازدواجی خوشیوں اور فردوسی بہاروں

اس نے حالات سے سمجھوتہ کرنے کا عزم کیا ہے۔ ان پر غیر محسوس طریق سے اوس پڑ گئی ہے۔ امنگ کی جوت جو زندگی کو جلا بخشتی ہے۔ بجھتی جا رہی ہے۔

اسے یوں لگتا جیسے اس کا اپنا آپ دو واضح ٹکڑوں میں منقسم ہو گیا ہے۔ وہ اپنے آپ سے باہر ہو کر کوئی الگ ہستی بن گیا ہے۔ خول کے اندر وہ کچھ اور تھا۔ اور خول سے باہر کچھ اور۔ وہ اور فرید یقیناً اب ایک ہی شخصیت نہ رہے تھے۔ فرید وہ تھا جو سلمیٰ کا محبوب شوہر تھا۔ جو اس کے ہونے والے بچے کا باپ بننے والا تھا جس کی ازدواجی زندگی قابلِ رشک تھی۔ جو مشین کی طرح ہر کام کر سکتا تھا ہنس سکتا تھا مسکرا سکتا تھا۔ اور سلمیٰ کی چھوٹی چھوٹی خوشیوں کے لیے بڑی سے بڑی قربانی دے سکتا تھا۔ حتیٰ کہ اس نوزائیدہ بچی کو بھی نظر انداز کر سکتا تھا۔ جو اسی کا خون تھی۔ لیکن وہ — وہ — اس فرید سے قطعاً مختلف تھا۔

رات کھانے کی میز پر ہی سلمیٰ نے پھر بچی کا قصہ چھیڑ دیا۔ فرید کھانے میں ضرورت سے زیادہ ہی انہماک ظاہر کر رہا تھا۔ لیکن خالہ کی دوربین نگاہیں اس انہماک میں علم تو بھی اور عدم دلچسپی کو دیکھ رہی تھیں۔ کل صبح سے اب تک خالہ اس کا گہری نظروں سے جائزہ لے رہی تھی۔ اور کل صبح بچی کے یوں پھینکے جانے کے متعلق سن کر جو شکوک اس کے ذہن میں فرید کی جانب سے اُبھرے تھے۔ اس سلسلے جائزے نے انہیں بہت تقویت پہنچائی تھی۔ وہ نہیں جانتی تھی۔ سلمیٰ کا اس بارے میں کیا خیال ہے لیکن بچی کو گھر سے جلد از جلد نکالنے کے بارے میں سلمیٰ کے فیصلے سے اس نے یہی اخذ کیا تھا۔ کہ شک کی بنیادیں اس کے دل میں بھی جگہ پا رہی ہیں۔

اب خالہ کے ذہن میں سوال یہ تھا۔ کہ بچی کو اگر حوالۂ پولیس نہ کیا جائے۔ تو کیا کیا جائے؟ اگر وہ واقعی فرید کے گناہ کا ثمر ہے۔ تو کیا اسے یوں دربدر ہونے دینا چاہیے۔ نہیں۔ ہرگز نہیں۔ خالہ حمیدہ کے اندر سے کوئی چیز پکار اٹھتی۔ یہ بچی اسی

خاندان کی ہے۔ فرید کا خون ہے۔ اسے بے شک خاندانی وقار کا حصہ نہ ملے لیکن
اس خاندان کے زیرِ سایہ جینے کا حق تو ملنا ہی چاہیئے۔ پھر لڑکی تھی۔ لڑکا ہوتی تو
جہاں کہیں بھی ہوتی۔ پلی جاتی۔ اب تو در پردہ یہ اس خاندان کی عزت تھی۔ اور
کو اس خاندان کی عزت یقیناً ہر صورت میں عزیز تھی۔ اسی لیے اس نے فیصلہ کر
کہ سلمیٰ نے اگر بچی جمو کی آغوش میں پلنے کی اجازت نہ دی۔ تو وہ خود اس بچی کو اپنے
عاطفت میں لے لے گی۔

چنانچہ جب کھانے پر سلمیٰ نے بچی کا موضوع چھیڑا۔ تو جہاں فرید زیادہ انہماک
کھانا کھانے لگا۔ وہاں خالہ نے کھانے سے ہاتھ روک لیا۔

"سلمیٰ بیٹی۔ لڑکی کے متعلق تم ایسی فکر مند کیوں ہو۔"

سلمیٰ اس سوال کا کوئی جواب نہ دے سکی۔ فرید کے حلق میں جیسے نوالہ اٹک گیا

"جمو بال بچوں والی ہے۔ وہ اگر بچی کو گود لینا چاہتی ہے تو تمہیں اعتراض نہیں
چاہیئے۔"

"مجھے اعتراض کس بات کا۔ لیکن وہ کہاں پال سکے گی۔ ابھی اس کی گود کا بچہ
بھر کا بھی نہیں ہوا۔"

"ٹھیک ہے۔ تو پھر اس بچی کو میں پالوں گی۔" خالہ نے اک نظر فرید کی طرف دیکھا

"جی ——؟" سلمیٰ حیران ہو کر اسے دیکھنے لگی۔ پھر کھلکھلا کر ہنس پڑی۔
کے سر سے جیسے خالہ نے منوں بوجھ اچک لیا۔ وہ بچی سے بیگانہ بنا ہوا تھا
کے خون میں اندر ہی اندر ابال بھی اٹھ رہے تھے۔ اس بچی کو وہ پولیس کے حوالے
تھا۔ نہ یتیم خانے میں بھیجنے کی حامی بھر سکتا تھا۔ خالہ نے اس کے لبوں کی ان کہی
اچک لی تھی۔ وہ عقیدت و احترام سے خالہ کو دیکھنے لگا۔ تشکر کی لہریں اس کی
اداس آنکھوں میں ڈولنے لگی تھیں۔

"ہنسنے کی تو کوئی بات نہیں۔ میں اسے پالوں گی۔ ہرج ہی کیا ہے۔ نیکی کی ساری
عمر تو فیق ہوتی نہیں۔ شاید اسی کارِ خیر سے عاقبت سنور جائے۔ بہر حال اب بچی
کا ذکر ہی چھوڑ دو۔ اللہ پالنے والا ہے۔"

"لیکن ——" سلمیٰ نے کچھ کہنے کو لب ہلائے۔

"بی بی۔" میں نے کہا نا تم اب اس کا ذکر ہی چھوڑ دو۔" خالہ نے اس کی بات اچک
لی۔ فرید بڑا ہی مضطرب نظر آ رہا تھا۔

"کیوں جی۔ سنا آپ نے ——" سلمیٰ نے فرید کی جانب دیکھا۔

"جی۔ جی ہاں۔ خالہ کی خوشی ——" فرید نیپکن سے منہ صاف کرتے ہوئے بولا۔
"میرا کیا؟ ذمہ داری لے رہی ہیں آپ خالہ۔ لوگوں کی باتوں کا جواب بھی آپ
ہی دیا کیجئے گا۔ اور اگر پولیس کو کہیں خبر ہو گئی۔ تو خود ہی اس معاملے سے
نپٹئے گا۔" سلمیٰ نے ہنستے ہوئے کہا۔

"دیکھا جائیگا۔" خالہ نے اطمینان سے جواب دیا۔ اور میز سے اٹھ کھڑی ہوئی۔
بیٹھا نہیں لیجئے گا۔ سلمیٰ نے پدنگ کا پیالہ خالہ کی طرف بڑھایا۔ لیکن وہ سر
کے منفی اشارے کے ساتھ بیسن کی طرف ہاتھ دھونے چلی گئی۔

—— ٭ ——

مالی کے دوسرا بچہ بھی مرا ہوا پیدا ہوا۔ خالہ اور سلمیٰ نے اسے کہا بھی تھا کہ اس

فتو دفعہ بیوی کو گاؤں نہ بھیجو۔ پہلا کیس خراب ہو چکا ہے۔ دوسری بار پھر
خدشہ ہے۔ گاؤں میں طبی سہولتیں کہاں ہوں گی۔ وہ تو شاید مان جاتا۔ لیکن پرانے
خیالوں کی ماں کو یہ بات سمجھانا اس کے بس میں نہیں تھا۔

"چل چل چپ رہ۔ بھلا گاؤں میں عورتیں بچے جنتی نہیں ہیں۔ شہر والے خدا
نہیں ہوتے۔ زندگی ہوئی تو خیر صلا۔ نہ ہوئی۔ تو کون ہے جو ایک پل بھی بڑھا دے
تیرا مطلب ہے جو چار پیسے جمع کیے ہیں۔ ڈاکٹروں کے منہ میں ڈال دے۔"

اور یونہی الٹی سیدھی ہانکتے وہ بہو کو ہانک لے گئی تھی۔ خود جیراں کا دل بھی شہر
جانے کو نہیں چاہتا تھا۔ ایک تو فتو سے دوری۔ اس پر جانے کیس کیسا ہو۔ جلد
جاتے وہ گھونگھٹ میں آنسو بہا رہی تھی۔ ہسپتال میں بچہ جننے کی آرزو دل ہی میں
رہ گئی تھی۔

سلمیٰ نے اسے ہسپتال میں داخل کروانے ہی کا تو کہا تھا۔ پچھلے سال وہ ساتھ والی
کوٹھی کی بیگم صاحبہ کے ہاں جب ہسپتال میں بچی پیدا ہوئی تھی۔ تو پانچ دن وہ ہسپتال
تھی۔ ان کی نوکرانی بیمار ہو گئی تھی۔ جیراں فارغ ہی فارغ تھی۔ بیگم صاحبہ نے بلا وہ بھیجا
گئی تھی۔ کس ٹھاٹھ سے بیگم نے بچی جنی تھی ہسپتال میں۔ اجلا اجلا سفید بستر۔ نرسیں
ڈاکٹر، دوائیاں، انجکشن۔ ناز و انداز۔

اور جب سلمیٰ نے اسے کہا تھا "جیراں اس دفعہ کہیں یہیں کروانا۔ گاؤں نہ جانا۔

تمہیں ہسپتال داخل کروا دوں گی۔"

تو اسے اس تصور ہی سے کتنا لطف آیا تھا۔ اس نرم نرم اجلے اجلے بیڈ پر وہ تصور
ہی تصور میں کتنی بار لیٹی تھی۔ بیڈ کے قریب سٹینڈ پر گلوکوز کی الٹی لٹکی بوتل سے نالی
کے ذریعے قطرہ قطرہ اپنے بازو میں منتقل ہوتے کتنی بار محسوس کیا تھا۔ اور بیڈ کے پاس
بچے کے چھوٹے سے بھالوں لگے کاٹ میں کتنی بار اسے خوبصورت بچہ نظر آیا تھا۔

لیکن ساس خدا جانے کتنی بڑی حساب دان تھی۔ نواں مہینہ ابھی شروع ہی ہوا تھا۔
کہ جھٹ آن وارد ہوئی تھی۔ اور سلمیٰ کے سمجھانے کے باوجود۔ خالہ کے کہنے کے باوجود
اور دبے دبے لفظوں میں فتو کی خواہش کے اظہار کے باوجود وہ بہو کو گاؤں لے گئی

جیراں کو درد شروع ہوئے تو گاؤں کی وہی پرانی دائی آن پہنچی۔ میلے کچیلے کپڑے۔
گندے گندے ہاتھ۔ چپکی آنکھیں۔ جیراں کو اس عورت سے گھن سی آئی۔ اس کی نظروں
میں سفید براق لباسوں والی نرسیں گھوم گئیں۔ خوشبو کے ہلکوروں کی طرح آتی جاتی
ڈاکٹریں یاد آ گئیں۔ درد زہ کے ساتھ ساتھ ذہنی کوفت بھی بڑھتی گئی۔ کچھ اندرونی
کمزوری تھی۔ کچھ پہلے کیس کی خرابی۔ اس بار بھی جیراں کی حالت خراب ہو گئی۔

کچے پسار سے ملحقہ کوٹھڑی میں بان کی کھری چارپائی پر پڑی جیراں آنے والے
بچے کی خوشی بھول گئی۔ ہسپتال اور اس کی سہولتوں کا خیال بھی ذہن سے نکل گیا۔ میلے
کچیلے کپڑوں والی دائی سے نفرت اور کراہت کا احساس بھی نہ رہا۔ وہ تھی اور دم بدم
اٹھنے والی اذیت دہ دردیں۔

شام تک جیراں کی حالت مخدوش ہو چکی تھی۔ گاؤں بھر کی بیاہی عورتیں دالان اور
کوٹھڑی میں جمع تھیں۔ ہر ایک کے تجربے سے استفادہ کرنے کی کوشش کی جا رہی
تھی۔ حکیم جی سے کئی پڑیاں لا کر اسے کھلائی جا چکی تھیں۔ پیر جی سے تعویذ لا کر اس کے
پھیلتے سکڑتے پیٹ پر باندھا گیا تھا۔ لیکن افاقہ نہ ہوا۔ جیراں کی آنکھوں میں زندگی کی روشنی

مہم پڑ رہی تھی۔ چہرہ اُتر گیا تھا۔ اور ہونٹ دانتوں تلے آ آ کر کئی جگہ سے کٹ چکے تھے۔

شام ڈھل گئی۔ دیے کی ٹمٹماتی لو میں دائی نے جیراں کا چہرہ دیکھا تو گھبرا گئی۔ سلمیٰ دوڑ کر اپنے گھر سے لالٹین اٹھا لائی۔ جیراں پر اب غنودگی کے دورے پڑ رہے تھے۔ اب تو ساس کو بھی ہاتھ پاؤں پڑ گئے۔

"کیا کریں اب" اس نے گھبرا کر دائی سے پوچھا۔

"خدا کو یاد کرو بی بی۔" دائی نے کہا۔

"فتو کو بلا بھیجوں۔"

"بلا لو۔"

"شہر ہی لے جائیں اسے کسی ڈاکٹر کے پاس۔"

"شہر لے جانے تک رہ گئی تو۔"

"ہائے ہائے۔" ساس نے سینے پر دوہتڑ مارا۔ ساس نے واویلا شروع کیا۔ ہمسائیاں بھی اس کا ساتھ دینے لگیں۔ اک افراتفری سی مچ گئی۔ جما کمہار اپنے طور پر ہی شہر چلا گیا۔ فتو کو خبر تو کرنا ہی تھی۔

فتو صبح سویرے یہاں پہنچا۔ یہ بھی اچھا ہی ہوا جو جیراں مردہ بچی کو اس وقت تک جنم دے چکی تھی۔ ورنہ فتو اس کی حالت دیکھتا۔ تو جانے ماں کے ساتھ کیسی گزر کر بیٹھتا۔ اب تو ماں مُردہ پوتی کے لیے آنسو بہا رہی تھی۔ فتو فقط ملامت ہی کر پایا ماں کو۔

جیراں نیم مردہ ہو رہی تھی۔ سارا دن وہ بہکی بہکی حرکتیں کرتی رہی۔ رات زور کا بخار ہو گیا۔ ہذیان بکنے لگی۔ ہذیانی کیفیت میں بھی وہی ہسپتال، ڈاکٹر، نرسیں اور میلی کچیلی دائی کا تقابل تھا۔ چند دن اسی حالت میں گزر گئے۔ بخار تھا۔ کہ ٹوٹنے کا نام ہی نہ لے رہا تھا۔ فتو نے صلاح کی۔ کہ اسے شہر لے جائے۔ ماں اب بھلا کس منہ سے مخالفت

کرتی۔ تلخ تجربے سے دوسری بار دوچار ہو چکی تھی۔ اس لیے خود ہی اسے شہر ڈاکٹر کے پاس لے چلنے کو آمادہ ہو گئی۔

فتو نے جلد جلد انتظام کیا۔ دو تین گاؤں کے ساتھی ساتھ ہوئے اور وہ جیراں کو شہر لے آیا۔ سلمیٰ نے جب اس کی روئداد سنی تو اسے ترس بھی آیا۔ لیکن گاؤں کی حماقت کی حد تک سادہ لوحی پر غصہ بھی آیا۔ اچھی بھلی صحت مند عورت کو روئی کی طرح دھنک کر رکھ دیا تھا۔ کم بختوں نے۔

سلمیٰ نے ہسپتال اپنی دوست ڈاکٹر مبشرہ کو فون کیا۔ اور اپنی گاڑی میں جیراں کو ہسپتال بھجوا دیا۔ جیراں کی خوابیدہ امنگ جاگ اٹھی۔ ہسپتال کا جنرل وارڈ ہی تھا پھر بھی یہاں صبح و شام ہی اور تھے۔ ڈاکٹر مبشرہ کی شخصیت مریضوں کے لیے ابرِ رحمت تو تھی ہی۔ اس پر سلمیٰ کی وجہ سے کچھ زیادہ ہی التفات تھا۔ جیراں چند ہی دنوں میں اچھی بھلی ہو گئی۔ بخار اتر گیا۔ اور اچھی خوراک اور دواؤں کا اثر ظاہر ہونے لگا۔ ہسپتال میں داخل ہونے کا نفسیاتی اثر بھی تھا۔ بہرحال وہ بہت جلد تندرست نظر آنے لگی۔

لیکن تندرستی کے ساتھ ہی اپنی سونی گود کا احساس ابھرنے لگا تھا۔ اس کی پیاسی ممتا بلکنے لگی تھی۔ وہ اکثر رونے لگتی۔ ڈاکٹر نے بڑے ہی مشفقانہ انداز میں اسے تسلی دی۔ لیکن جیراں اپنی ممتا کے ہاتھوں مجبور تھی۔

جس دن وہ ہسپتال سے ڈسچارج ہوئی۔ تو اس کی اداسی بہت بڑھ گئی تھی۔ اس کے ساتھ والے بستر پر پڑی عورت نے خوبصورت سے لڑکے کو جنم دیا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے بچہ جنا ہی نہ ہو۔ بچے کی خوشی نشے کی طرح اس پر چھائی تھی۔ لیکن ایک وہ تھی۔ کہ اتنے دکھ جھیل کر بھی خالی اور اجڑی گود لیے جا رہی تھی۔

پہلی دفعہ تو اسے اتنا غم نہیں ہوا تھا۔ لیکن اس دفعہ تو بچی کا غم جان کا روگ ہی بن رہا تھا۔ ڈاکٹر نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "فکر نہ کرو۔ اس دفعہ تمہارا کیس میں خود کروں گی لیکن

ابھی تمہیں آرام کی ضرورت ہے۔ دوائیاں کھاتی رہنا۔ بچہ بھی ہو جائے گا فکر نہ کرو۔"
ڈاکٹر کی مسکراہٹ کے جواب میں اس کی آنکھیں بھر بھر آئی تھیں۔
فتو اسے اپنے کوارٹر میں لے آیا۔ سلمیٰ اور خالہ سے لے کر گھر سے چھوٹے سے چھوٹے نوکر تک سبھی اس کی احوال پرسی کو آئے۔ لیکن اس کے دل کا روگ اپنی جگہ تھا کسی بات سے بھی تو تسلی نہ ہوتی تھی۔ فتو نے بھی اس کی دلجوئی میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔ رات گئے تک اسے باتوں سے بہلاتا رہتا۔ تسلیاں دیتا اور مستقبل کے متعلق بڑی سہانی امیدیں دلاتا۔ اس نے وہ کالی شال نکال کر جیراں کو دکھائی۔ جو اسے ملی تھی۔
"دیکھو کتنی خوبصورت ہے اور بالکل نئی بھی۔ ہاں وہ بندہ تو تمہیں دکھایا ہی نہیں جو اس شال کے ساتھ اٹکا ہوا ملا تھا۔"
فتو نے اپنا لوہے کا ٹرنک جس میں تالا پڑا تھا۔ کھولا۔ اور کپڑوں کی تہوں میں سے ہوا وہ چھوٹا سا بندہ نکال کر جیراں کے ہاتھ پر رکھ دیا۔
"دیکھو، لاجواب چیز ہے۔ اس کے ساتھ کا دوسرا بھی بنوا دوں گا۔ پھر پہننا۔"
شال اور بندہ پا کر بھی جیراں کو خاص خوشی نہ ہوئی۔ ہاں اس کے ذہن میں بچی کا خیال جاگنے لگا۔
"وہ لڑکی کہاں ہے؟" اس نے تجسس سے پوچھا۔
"یہیں۔"
"یہیں؟ کہاں؟"
"جمو کے پاس ہے ابھی تو۔ ویسے صاحب کی خالہ نے گود لینے کا ارادہ کیا ہے لیکن مشکل ہی ہے۔ وہ پچھلے کئی دنوں سے بیمار ہیں۔ بچے کو پالنا کوئی آسان کام ہی ہے۔ جمو ہی کے پاس رہے گی میرے خیال میں۔"
"اچھا۔"

"پرائے بچے کو پالنا جان جوکھوں کا کام ہے۔ جمو نے ہمدردی تو بڑی جتائی تھی لیکن مہینے ڈیڑھ ہی میں شوق پورا ہو گیا۔"
جیراں کی آنکھیں کسی انجانی امید سے چمک اٹھیں۔ اب اٹھتے بیٹھتے اسے بچی ہی کا خیال رہتا تھا۔ دن نکلتے ہی وہ جمو کے کوارٹر میں چلی جاتی اور اس پیاری سی بچی سے دل بہلانے لگتی۔ جمو نے تو بچی کا حلیہ ہی خراب کر دیا تھا۔ منہ دھلاتی تھی۔ نہ کرتا دھو کر پہناتی تھی۔ ٹوٹی ہوئی کھٹولی پر گندے مندے کپڑوں میں لپیٹے رکھتی۔ لیکن جب سے جیراں نے اس میں دلچسپی لینا شروع کی تھی۔ بچی نکھری سی آئی تھی۔ آخر جیراں نے اپنی دبی دبی خواہش کا اظہار فتو سے کر ہی دیا۔
"ہم نے کیا کرنا ہے اسے۔ خدا دے گا۔ تو اپنی اولاد کو کھلائیں گے۔"
"خدا جب دے گا دیکھیں گے۔ میں تو اس بچی کو ضرور گود لوں گی۔"
"باؤلی ہو گئی ہے۔ جانتی نہیں۔" فتو نے معنی خیز انداز میں کہا۔ اور پھر چپکے سے اس کے کان میں سرگوشی کی۔ "حرامی ہے حرامی۔"
"تو کیا ہوا!" جیراں نے کندھے لاپروائی سے جھٹکے۔
کئی دن بحث و تکرار میں گزر گئے۔ ادھر جمو کا گود والا بچہ دانتوں پہ آ رہا تھا۔ دو سالہ لڑکی کو بھی بخار آنے لگا۔ اس بچی کا جس کا نام اس نے کلثوم رکھا تھا۔ اور پیار سے ثومی کہنا شروع کیا تھا۔ نگہداشت مشکل ہی نہیں ناممکن ہو گئی۔ ادھر خالہ حمیدہ کو بھی بخار کھانسی نے ناتواں کر دیا۔ بچی ایک بار پھر مسئلہ بن گئی۔ لیکن اس دفعہ مسئلہ الجھا نہیں جیراں نے بچی کے لیے آغوش محبت وا کر دی۔ فتو بھی مجبور ہو گیا۔ کچھ جیراں کی خوشی اور کچھ بچی کی معصوم صورت۔ اگر اپنی بچی جیتی رہتی۔ تو اسے بھی تو پالنا پڑتا۔ فتو نے اپنے آپ کو بچی کے لیے ذہنی طور پر آمادہ کر لیا۔
یوں کلثوم جو اب گول مٹول ثومی تھی۔ جیراں کی آغوش میں آ گئی۔

کو ڈاکٹر نے مکمل طور پر احتیاط برتنے کا کہا تھا۔ فتو کے پاس رہ کر شا

جیراں کوئی بھول چوک ہو جاتی اس لیے ماں اسے اپنے ساتھ گاؤں لے
گئی۔ جیراں کی دلی خواہش تو شہر ہی میں رہنے کی تھی۔ ثومی کو پا کر بچے کی خواہش بھی پو
ہو گئی تھی۔ اس لیے وہ اتنی جلد اور بچہ جننے کے لیے تیار نہ تھی۔ لیکن وہ اپنی ساس
کے سامنے کچھ کہنے کی ہمت و جرأت ہی نہ رکھتی تھی۔ خود فتو بھی شاید ماں سے ڈرتا
اسے یہیں کوارٹر میں اپنے پاس رکھنے کا اس نے زور ہی نہیں دیا۔ اس کی تسلی کو دھیرے
اتنی ہی سرگوشی کی۔

"میں تیرے پاس جلدی جلدی آیا کروں گا۔ شہر سے لال اور ڈھنی اور چاندی کے بنا
لاؤں گا۔ اور کچھ پیسے جمع ہو گئے۔ تو دوسرا بندہ بھی بنوا کر لاؤں گا۔"

اور ڈھنی، چوڑیوں اور بندوں کی جاذبیت مسلم سہی پھر بھی فتو کی قربت کا سحر ان
زیادہ ہی تھا۔ جیراں کی آنکھیں جل تھل ہو گئیں۔ وہ بچی کو لے کر ساس کے ہمراہ گاؤں آ گئی
اور فرید کے دل و دماغ پر مسلسل پڑنے والے ہتھوڑوں کی ضربیں قدرے کم ہو گئیں
جب سے اس نے بچی کو گیٹ کے قریب پڑے دیکھا تھا اس کی دنیا ہی بدل گئی تھی
اک خوف، اک وسوسہ، اک دھڑکا اس پر مسلط رہتا۔ گو اس نے ظاہر داری کا پردہ
مہارت سے تان رکھا تھا۔ لیکن اس پردے کے اندر جو کچھ ہو رہا تھا۔ وہ روح کو
کرنے کو کافی تھا۔

سلمیٰ اس کی محبوب بیوی تھی۔ اس کے رنج اس کی خوشیاں اس کے اپنے تھے۔

کا ضرورت سے زیادہ ہی خیال رکھتا تھا۔ اس نے اپنے پیار میں شدت کا نیا رنگ بھر لیا
تھا۔ قہقہے لگانا اس نے معمول بنا لیا تھا۔ سلمیٰ کی ہر زیادتی پر بھی سر تسلیم خم کر لینے کو عادت
بنا لیا تھا۔

لیکن ان ساری باتوں کے باوجود وہ سلمیٰ سے دور تھا۔ جب رات وہ اس کے قریب
لیٹتا۔ محبت کی سحر انگیز خلوتوں کے بعد جب سلمیٰ پر غنودگی طاری ہو جاتی اور وہ اس کے قریب
بہت قریب اس کے سینے میں منہ چھپا کر بے خبری کی نیند سو جاتی۔ تو فرید کھلی آنکھوں سے
چھت کو گھورتا رہتا۔

گھنٹے گزر جاتے۔ پہر ڈھل جاتے۔ اس کی سوچیں الجھتی جاتیں۔ کبھی یہ دھڑکا
لگ جاتا۔ کہ کسی دن بلوا چانک آ دھمکے گی۔ اور سارا راز سلمیٰ پر فاش کر دے گی۔

وہ سوچتا رہتا اور سوچتا چلا جاتا۔ اس لمحے کے تصور سے وہ کانپ کانپ اٹھتا۔
سلمیٰ سے ندامت اور خفت کا احساس مار ڈالتا۔

تو کیا؟ کیا اسے سب کچھ سلمیٰ سے خود ہی نہیں کہہ دینا چاہیئے؟ ایک دفعہ اعتراف گناہ
کی جرأت کر کے کیوں نہ لمحے لمحے کی موت سے چھٹکارا حاصل کر لیا جائے۔ وہ پہلو میں
لیٹی سلمیٰ کا چہرہ دیکھتے اقرار گناہ کی مشق کرنے کی کوشش کرتا۔

لیکن۔ وہ تو ازلی بزدل تھا۔ ایسا کرنے کی اس میں جرأت ہی نہ تھی۔ وہ اپنی آگ
میں اک تواتر سے جل رہا تھا۔

کبھی اسے اس ناکردہ گناہ مظلوم بچی کا خیال تڑپاتا۔ باپ کے گھر میں وہ نوکروں
کے رحم و کرم پر تھی۔ وہ اس کے لیے کچھ بھی تو نہ کر سکتا تھا۔ اپنا بے پناہ دولت اور لامحدود
وسائل کے باوجود وہ اس بچی کو وہ سہولتیں نہ دے سکتا تھا۔ جو اسے ملنا چاہیئے تھیں
واقعی بلو نے اس سے ایسا بدلہ لیا تھا۔ کہ بے دست و پا کر کے رکھ دیا تھا۔ اس کی
زبان پر تالے تھے۔ لیکن محسوس کرنے کا ہر آلہ کچھ زیادہ ہی شدت سے کام کرنے

لگا تھا کٹے ہوئے پروں والے پرندے کی طرح اس کی روح اندر ہی اندر پھڑپھڑاتی رہتی۔

چند ماہ بعد سلمیٰ کے ہاں بچہ ہونے کی امید تھی۔

یہ بچہ ــــ اور یہ بچی۔

دونوں قدرت کے ایک ہی سے اصول کے تحت دنیا میں آئے تھے۔ لیکن ایک اور دوسرے میں صدیوں کا فاصلہ تھا۔

کبھی کبھی فرید پر سوچ کا دورہ پڑتا۔ تو اسے اپنے ہونے والے بچے سے نفرت سی محسوس ہونے لگتی۔ اس کا جی چاہتا اسے پیدا ہونے سے پہلے ہی مار ڈالے لیکن اس پر بھی اوس پڑ جاتی۔ اس آنے والے بچے کا کیا قصور تھا۔ قصوروار وہ خود تھا۔ اپنی خود غرضی سے دوسروں کا جینا دوبھر کر رہا تھا۔ آنے والے بچے سے بھرپور نفرت کا اظہار بھی تو اس ننھی سی روح کی حق تلفی کی تلافی نہ تھی۔ جو اب جمو کی بجائے جیراں کی آغوش میں آ گئی تھی۔

فرید نے اس دن کے بعد اس بچی کو نہیں دیکھا تھا لیکن ادھر ادھر سے کوئی نہ کوئی بات اس کے کان میں پڑ جاتی۔ جس سے وہ بچی کے متعلق کچھ نہ کچھ جان جاتا۔

اس دوپہر خالہ بستر پر دراز تھی۔ اس کی طبیعت دن بدن خراب ہو رہی تھی۔ اس کی احوال پرسی کے لیے اس کے کمرے میں جانے والا تھا۔ کہ باتوں کی آواز سے ٹھٹک گیا۔ شاید خالہ، رحمت کی بیوی صغرا سے باتیں کر رہی تھی۔

"کیا صورت شکل نکل رہی ہے۔"

"خدا کی قدرت۔ خوب صحت مند ہو رہی ہے۔"

"اب تو دیکھ دیکھ کر ہنستی بھی ہے۔"

"نام کلثوم ہی ہوگا۔"

"جی۔ ثومی ثومی سب کہتے ہیں۔ اور اب تو مردار کو ثومی کہہ کر بلاؤ تو فوراً دیکھ

لگتی ہے۔"

"پل ہی جائے گی نا۔"

"خدا پالنے والا ہے بی بی۔ ورنہ وہ (گالی دے کر) تو اسے پھینک ہی گئی تھی۔ ہائے ہائے لاکھ گناہگار سہی۔ ماں کا کلیجہ تو تھا۔ ڈائن ہوگی۔ وہ جو اسے یوں پھینک گئی۔"

"جیراں ماں بن کر ہی پالے گی اسے۔"

"نیکی کا کام ہے۔"

فرید یہ باتیں سن کر واپس لوٹ آیا۔ اس کے علم میں آ گیا کہ بچی کا نام کلثوم رکھا گیا ہے۔ اور اسے جیراں نے پالنے کا بیڑہ اٹھایا ہے۔

سلمیٰ کے ساتھ ثومی کے متعلق اس نے کبھی کوئی بات نہیں کی تھی۔ وہ تو ہمیشہ اسی بات سے خائف رہتا تھا۔ کہ سلمیٰ اس کا تذکرہ شروع نہ کر دے۔ اور جب بھی وہ اس کے متعلق کچھ کہتی۔ اس کی حالت اس مریض کی سی ہو جاتی۔ جس کے ٹیکا لگنے والا ہو۔ اور جو ٹیکے کی سرنج ڈاکٹر کے ہاتھ میں دیکھ کر اپنے اعصاب میں تناؤ محسوس کر رہا ہو۔ اسے خود اپنی آواز پر بھی اس حالت میں اعتماد نہ رہتا۔ وہ سلمیٰ کی باتیں صرف ہوں ہاں کر کے ہی ٹال دیتا۔ اس کے بارے میں کسی قسم کا اظہار خیال کرنے کی اس میں جرأت ہی نہ رہتی۔

اس دوپہر خالہ اور سلمیٰ ہی باتیں کر رہی تھیں۔ خالہ آجکل کھلی ہوا میں کمرے سے باہر آئی تھی۔ برآمدے کے قریب ہی کرسی ڈالے وہ گلاب کے پودوں کے قریب بیٹھی تھی۔ سلمیٰ اپنا پھولا ہوا پیٹ اک نزاکت سے سنبھالے ادھر آئی تھی۔ اور کرسی گھسیٹ کر اس کے قریب بیٹھ گئی تھی۔

فرید ستون کے قریب کھڑا لان میں ایستادہ سفیدے کے درختوں کو دیکھتے نہ جانے کتنی بلندیوں اور کتنی پستیوں میں بھٹک رہا تھا۔

خالہ اور سلمیٰ دونوں باتیں کر رہی تھیں۔ وہ بے حیائی کے عالم میں سن رہا تھا۔ لیکن جب ثومی کا ذکر چلا تو بظاہر لاپرواہ فریدہ ہمہ تن گوش ہو گیا۔ یقیناً وہ چوروں کی طرح بزدل تھا۔

چوروں کی طرح ــــ جو اندھیرے کے غلاف میں بڑے سے بڑا قدم اٹھا کر بھی ذرا سے کھٹکے سے گھبرا جاتے ہیں۔

"فتو نے جیراں کو گاؤں بھیج دیا ہے۔"

"اچھا ہی کیا۔ یہاں رہتی تو ان جاہلوں سے احتیاط۔ کہاں ممکن تھی۔"

"بیچاری کے دو کیس خراب ہوئے ہیں۔"

"اب تو اسے سال دو سال بچہ نہیں پیدا کرنا چاہیئے۔"

"بالکل۔ نہیں کرنا چاہیئے۔ بچے کا شغل چاہیئے تھا وہ مل گیا۔"

"ہائے خالہ دیکھا آپ نے اس بچی کو۔ کتنی خوبصورت ہے۔ اور موٹی کتنی ہو رہی ہے۔ کہیئے گناہ حسین ہوتا ہے۔ یہ بات سچ ہی ہے۔"

"ہوں۔"

فریدہ جان گیا۔ کہ بچی جیراں کے ساتھ یہاں سے چلی گئی ہے۔ اطمینان تو اب شاید اس کی تقدیر سے روٹھ ہی گیا تھا۔ لیکن اس احساس سے کہ بچی یہاں نہیں ہے۔ اسے کچھ فراغت سی ملی۔

دن گزرتے چلے گئے۔ تالو میں بوند بوند ٹپکنے والے پانی کی اذیت ماند پڑتی گئی۔ فریدہ اپنے کاموں میں الجھ گیا۔ خالہ بیماری کے سامنے ہتھیار ڈال کر اللہ کو پیاری ہو گئی۔ اور سلمیٰ کی آغوش مسرت میں فریدہ پھول بن کر مہکنے لگی۔

فریدہ کی پیدائش پر جی بھر کر خوشیاں منائی گئیں۔ فریدہ نے مسرتوں کا اظہار ضرورت سے بڑھ کر ہی کیا۔ لیکن اس کے اندر ہی اندر سوز سے کچھ پگھلتا رہا۔ کوئی ٹوٹی کل بے

کرتا رہی۔ کوئی انجانا سا درد کسک بن کر تڑپاتا رہا۔

جیراں ساس کے پاس گئی۔ تو وہیں کی ہو رہی۔ ساس کی طبیعت خراب رہنے لگی تھی۔ جیراں کا اس کے پاس رہنا ضروری تھا۔ کچھ وہ بچی سے بھی مانوس ہو گئی تھی۔ بچی اک کھلونا تھا جس سے وہ بہلی رہتی تھی۔

یوں بچی گاؤں میں پلتی رہی۔ ایک دو تین اور پھر چار سال گزر گئے۔

پانچویں سال جیراں کی ساس زیادہ ہی بیمار ہو گئی۔ اور پھر سال بھر موت و حیات کی کشمکش میں مبتلا رہنے کے بعد عدم کو سدھار گئی۔

جیراں کی سونی گود پھر ہری نہ ہو سکی تھی۔ گاؤں کی دائی سے دو تین بار علاج کروایا۔ لیکن کوئی امید نہ بندھی۔ ثومی پانچ چھ سال کی ہو چکی تھی۔ یہی اب اس کا سہارا تھی۔

ماں کے مرنے کے بعد فتو، جیراں اور ثومی کو اپنے پاس شہر رکھنے پر مجبور تھا۔ گاؤں والا چھوٹا سا کمرہ بند کر کے والان میں ایک کرایہ دار کو چھوڑ وہ جیراں اور بچی کو لے کر شہر آ گیا۔

ــــ ٭ ــــ

"ثومی"

"کیوں ماں"

"بیگم صاحب کو جھک کر سلام کرنا۔ ماتھے پر یوں ہاتھ رکھ کر ——— سمجھیں"

جیراں ثومی کے بال تیل میں چپڑتے ہوئے بولی۔ اس کے ہاتھ میں لکڑی کی کنگھی جس سے ثومی کے بال سنوارنے کو تھی۔

"اچھا ماں"

"بدتمیزی نہ کرنا۔ بیگم صاحب جو کچھ پوچھیں۔ اچھی طرح سے جواب دینا۔ سمجھیں نا ———"

"ہاں ماں۔"

"ان کی بیٹی بھی تیرے برابر کی ہے۔"

"اچھا۔"

"ہاں۔ تجھ سے چھوٹا اچھوٹی ہے۔"

"میں اس سے کھیلا کروں گی ماں۔"

"تیرا ابا کہتا تھا۔ وہ سکول میں پڑھتی ہے۔"

"میں بھی سکول پڑھوں گی۔"

"ہاں ہاں کیوں نہیں۔ اب ہم شہر میں رہیں گے۔ میں اپنی بیٹی کو سکول پڑھ پڑھ کر میری بیٹی ماسٹرنی بن جائے گی۔ ہیں نا۔"

ثومی کے شب دیجور کی طرح سیاہ بالوں میں لکڑی کی کنگھی پھیرتے ہوئے جیراں نے جواب دیا۔

وہ دونوں کل شام گاؤں سے فتو کے ہمراہ شہر آئی تھیں۔ جیراں کو تو جیسے کسی قید خانے سے نجات ملی تھی۔ گو گاؤں والے خاصے بڑے مکان سے یہاں ایک کمرے کے کوارٹر میں آئی تھی۔ لیکن اسے رہائی کا احساس ہو رہا تھا۔ یہ چھوٹا سا کمرہ بھی جنت کا کوئی حسین گوشہ لگ رہا تھا۔ یہاں وہ اپنے فتو کے ساتھ رہے گی۔ صبح و شام اس کی سنگت میں بیتیں گے۔ اب رات کے کسی پچھلے پہر میں اس کی آنکھوں سے کوئی وسوسے نیند نہیں اچک لیں گے۔ دن کو وہ فتو کے لیے وقت پر کھانا بنایا کرے گی۔ اس کے کپڑے دھویا کرے گی۔ کتنا حسن تھا اس مصروف اور بھرپور زندگی میں۔ جیراں کا انگ انگ مسکرا رہا تھا۔ اس کے ہاتھوں میں چاندی اور ہاتھی دانت کی چوڑیاں اپنے آپ ہی بج رہی تھیں۔ اس کے ناک میں سونے کی کیل سانس کے اتار چڑھاؤ کے ساتھ کچھ زیادہ ہی چمکنے لگی تھی۔ صبح اس نے گاؤں سے لائے ہوئے باجرے کی میٹھی روٹی کتنی پریت سے فتو کے لیے پکائی تھی۔ اور جب فتو نے اس روٹی سے بھی میٹھی نظروں سے اسے دیکھ کر روٹی کی تعریف کی تھی۔ تو وہ کتنی خوش ہوئی تھی۔ اب تو ایسی میٹھی نظروں سے کترانا اس کی روزمرہ زندگی کا معمول بن جائے گا۔

صبح ہی صبح جیراں نے کوارٹر صاف ستھرا کر لیا تھا۔ ثومی نے بھی اس کا ہاتھ بٹایا تھا۔ چھ برس کی بچی اب خوب کام کاج میں اس کا ہاتھ بٹاتی تھی۔ آٹا تو ایسا اچھا گوندھتی تھی۔ کہ جیراں بھی نہ گوندھ سکتی تھی۔ چھوٹے بڑے برتن بھی دھو لیتی تھی اور جھاڑو بھی خاصے لگا لیتی تھی۔ گھریلو کاموں کے علاوہ اس نے گاؤں کی مسجد میں قرآن شریف بھی پڑھ لیا تھا۔ کچھ کلمے بھی اسے زبانی یاد تھے۔ جیراں رہنے والی تو گاؤں کی تھی۔ لیکن شہری زندگی سے بڑی مرعوب تھی۔ وہ اپنی دیہاتی کینچلی بدلنے کی بڑی متمنی تھی۔ وہ سال بھر پہلے بھی

فتو کے پاس رہ گئی تھی۔ کوٹھیوں میں رہتی بیگمات اس نے دیکھی ہوئی تھیں۔ شہری طرز رہائش اسے پسند تھا۔ گو وہ بیگمات کی سی زندگی کا خواب تو نہ دیکھ سکتی تھی۔ تاہم اپنے طرز لباس میں اور طرز رہائش میں کچھ نہ کچھ تو ضرور سمو سکتی تھی۔ اب تو اس پر پابندی لگا دینے والی ساس بھی عدم کو سدھار ہی چکی تھی۔ اور وہ خود گاؤں کی دقیانوسی فضا کو بھی چھوڑ کر یہاں آ چکی تھی۔ اب تو وہ چھینٹ کی گھیر دار شلواریں نہ پہنے گی۔ تھل تھل کرتے کھلے کرتے بھی نہیں۔ اور چھینٹ کی گوٹ لگی چادر کی جگہ بھی سائے دوپٹے اوڑھا کرے گی۔ فتو کو بھی تو شہری لباس پسند تھے۔ رات ہی تو کہہ رہا تھا۔

"جیراں تیرے لیے اب دوسرے کپڑے بنواؤں گا۔ ثومی کے لیے بھی فراک سلواؤں گا۔ اس کے بال بھی کٹواؤں گا۔ ابھی سے چٹیا کی کیا ضرورت ہے۔ صاحب کی بچی کو دیکھا کتنی خوبصورت لگتی ہے۔ جب کٹے بالوں میں لال لال فیتہ لگاتی ہے۔"

ثومی کے گھنے کالے بالوں میں کنگھی کرتے ہوئے جیراں فتو کی بات پر دل ہی دل میں مسکرا رہی تھی۔ ثومی کے بال خاصے بڑھ چکے تھے۔ موٹی سی بالشت بھر چوٹی ہوتی تھی۔ جس میں لال پراندہ پڑا رہتا تھا۔ لیکن یہ چوٹی اور پراندہ اب نہیں ہوگا۔ اب ثومی کے گھنے کٹے ہوئے بالوں میں وہ بھی فیتہ باندھا کرے گی۔

جیراں نے ثومی کے تیل سے چکنے بالوں کو کھلا ہی چھوڑ دیا۔

"چلو اٹھو" جیراں نے ثومی کے ماتھے پر لگا تیل اپنی چادر کے آنچل سے پونچھا۔

"چوٹی نہیں بناؤ گی۔"

"نہیں۔"

"کیوں ماں۔"

"اس طرح اچھی لگتی ہے تو۔ بیگم صاحب کو ہم سلام کرنے جا رہے ہیں نا۔"

"بیگم صاحبہ کون ہیں ماں۔"

"اس گھر کی مالکن۔"

ثومی کے بال سنوارنے کے بعد جیراں نے اپنے بالوں پر اوپر اوپر سے کنگھی پھیری پھر چھوٹے سے گول آئینے میں اپنے چہرے کا جائزہ لیا۔ آنکھوں میں گھر کا پسا سرمہ لگایا۔ اور ہونٹوں پر وندا سے کی رنگت کو زبان پھیر کر شوخی کا رنگ دیا۔

"چل ثومی۔" جیراں نے ثومی کا ہاتھ پکڑا اور کمرے سے باہر نکل آئی۔ رحمت کی بیوی صغرا اپنے کمرے کے سامنے تار پر کپڑے دھو دھو کر ڈال رہی تھی۔ ثومی کو دیکھ کر بولی:

"ماشاء اللہ کتنی بڑی ہو گئی ہے۔ شکل بھی کیا نکالی ہے۔ کتنے برس کی ہوئی ہے"

"چھ کی۔"

"ابھی کل کی بات لگتی ہے۔ چھ برس بھی گزر گئے۔"

"ہاں تو۔"

"کہاں جا رہی ہو۔"

"بیگم صاحبہ کو سلام"

"ابھی گئی نہیں۔ کل کی آئی ہوئی ہو۔"

"رات کمرہ ہی ٹھیک ٹھاک کرتے رہے۔ اب فارغ ہوئی ہوں۔"

جیراں ثومی کا ہاتھ پکڑے چل دی۔ ثومی کے ڈھیلے ڈھالے چھینٹ کے فراک نما کرتے کو جیراں بار بار تنقیدی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ کھلے پائنچوں کی نیلی پھول دار شلوار بھی اس نے کئی بار دیکھی۔ اس کے پاؤں میں پڑے پلاسٹک کے گہرے گلابی چپل بھی اس نے دو ایک بار اپنے آنچل سے پونچھے۔ صابن سے دھونے کے باوجود پرانے چپلوں پر نیا پن نہیں آیا تھا۔ ثومی کے لیے چمڑے کے بوٹ خریدنے کا اس نے دل میں تہیہ کر لیا۔

سلمیٰ چپس کے چمکتے برآمدے کے آخری گوشے میں کین کی خوبصورت کرسی پر بیٹھی تھی۔ میز پر مشین رکھی تھی۔ اور کچھ نیلے پیلے کپڑے تخت پر بکھرے تھے۔ دیوار کے ساتھ لگے فرش پر خوبصورت جھالر والا کپڑا پڑا تھا۔ اور دو گاؤ تکیے بھی رکھے تھے۔

سلمیٰ غالباً کوئی کپڑا سی رہی تھی۔ اس نے ہلکے فیروزی رنگ کا خوبصورت تراش کا لباس پہن رکھا تھا۔ سیاہ لمبے بالوں کو جوڑے میں باندھ رکھا تھا۔ ہلکے ہلکے میک اپ نے اس کے خوبصورت چہرے کو تازگی اور نکھار بخش رکھا تھا۔ اس کے ہاتھوں میں مہین طلائی چوڑیاں چمک رہی تھیں۔

مشین کے گھماؤ کے ساتھ اس کے ہاتھ کی نازک چوڑیاں بڑے ترنم سے چھنک رہی تھیں۔

"سلام بیگم صاحب جی۔" جیراں نے سلمیٰ کے قریب آتے ہوئے مودبانہ طریق سے سر جھکا کر کہا۔

"سلام بیگم صاحب جی۔" ثومی نے اپنا پیازی پیازی ہاتھ ماتھے تک لے جا کر کہا اور پھر ماں کی طرف یوں دیکھا جیسے پوچھ رہی ہو۔ "ٹھیک کہا ہے نا میں نے۔"

سلمیٰ کا ہاتھ مشین پر رک گیا۔ اس نے گردن کو قدرے خم دے کر دونوں کی طرف دیکھا اور یقیناً پہلی نظر میں وہ انہیں پہچان نہ سکی۔

نظروں کا انجانا پن جیراں نے محسوس کر لیا۔ فرش پر بیٹھتے ہوئے مسکرائی۔ "میں جیراں ہوں بیگم صاحب جی۔ مالی کی بیوی۔"

"او۔ اچھا۔ اچھا۔ تو۔ تو جیراں ہے۔ گاؤں سے آ گئی۔"

"جی۔ کل شام آئی تھی۔"

"یہ۔ بچی۔ وہی ہے۔" سلمیٰ نے شوق اور استعجاب سے ثومی کو دیکھا۔

"جی بیگم صاحب جی۔" جیراں نے اپنے قریب اکڑوں بیٹھی ثومی کو مسکراتے ہوئے

"اتنی بڑی ہو گئی۔"

"جی۔"

"کیا نام ہے اس کا۔"

"کلثوم جی۔ ویسے ثومی ثومی کہتے ہیں۔"

"بڑا اچھا نام ہے۔"

سلمیٰ نے ثومی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ثومی اپنی سیاہ خوبصورت جھالر ایسی گھنی پلکوں کو اٹھاتے گراتے سلمیٰ کو دیکھ رہی تھی۔ اس کے گلابی گالوں پر پلکوں کے لرزاں سایے بڑے ہی جاذب نظر تھے۔ سلمیٰ بھی ایک ٹک اسے دیکھ رہی تھی۔

"کتنی پیاری ہے یہ لڑکی۔" سلمیٰ بڑبڑائی۔ جیراں خوش ہو گئی۔

"چھوٹی بی بی کہاں ہیں۔ بیگم صاحب جی۔" اس نے مرعوب سی آواز میں کہا۔

"یہیں تھی ابھی۔"

"سکول سے آ گئیں۔"

"آج چھٹی ہے اسے۔"

سلمیٰ اس سے تکلفاً باتیں کرنے لگی۔ وہ نیازمندی سے سر جھکا کر جواب دینے لگی۔

"پھر تیرے کچھ نہیں ہوا۔" سلمیٰ نے مسکرا کر پوچھا۔ جیراں نے مایوسی سے سر ہلا کر ساری کتھا سنا ڈالی۔

"فکر نہ کر یہاں کسی ڈاکٹر سے علاج کروانا۔ ہو جائے گا۔"

جیراں نے عقیدت سے سلمیٰ کو دیکھ کر سر جھکا لیا۔ کچھ دیر اور ٹھہر کر جیراں اٹھی۔ ثومی بھی ساتھ اٹھ کھڑی ہوئی۔ سلام کر کے وہ جانے ہی کو تھی کہ تخت کے ساتھ والے کمرے کے دروازے سے فریدہ برآمدے میں آ گیا۔

اس نے نیلے رنگ کا سوٹ پہن رکھا تھا۔ جیراں نے جلدی سے گھونگھٹ کھینچ لیا۔

لیکن ایک ہی نظر میں وہ صاحب کو پہچان گئی تھی۔ گزران سالوں کی تہیں صاحب کے چہرے پر پوری طرح جم چکی تھیں۔ پھر سے اسے پہچان لینا مشکل نہ تھا۔

"سلام صاحب جی" اس نے دبی زبان سے کہا۔

"سلام صاحب جی" ثومی نے ماں کی تقلید کی۔

"سلام۔" فرید جواب رسمی طریقے سے دے کر سلمیٰ کی طرف مڑا۔ اس کے ہاتھ میں اس کنٹریکٹ کے کاغذات تھے جو آج ہی ایک غیر ملکی فرم سے ہوا تھا۔ وہ سلمیٰ کو یہ خوش خبری ہی سنانے آیا تھا۔

"آپ نے پہچانا اسے۔" سلمیٰ نے اس کے کچھ کہنے سے پہلے ہی کہا۔

"کسے؟" فرید نے سلمیٰ کی نظروں کا تعاقب کیا۔ اس کی نظریں قدرے رخ موڑے کھڑی جیراں پر پڑیں۔

"فقو مالی کی بیوی جیراں ہے۔ اور یہ وہی لڑکی۔" سلمیٰ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "کتنی بڑی ہو گئی ہے۔"

"وہی لڑکی۔" فرید کی ساری ہستی چکرا گئی۔

"اے ہے۔ بھول گئے آپ۔" سلمیٰ نے فرید کو یاد دلانے کے لیے اشارۃً اس واقعے کا ذکر کیا۔ سرگوشی کے انداز میں اسے بتانے لگی۔

فرید تخت پر ٹک گیا۔ اس کی نظریں ثومی پر تھیں۔ کنٹریکٹ کی ساری خوشی ہوا ہو گئی تھی۔ اس کی آنکھوں میں چھینٹ کے گلابی اور نیلے کپڑے پلاسٹک کے گلابی چپلوں میں خلط ملط ہو کر گھوم رہے تھے۔ اندر کی ٹوٹی پھوٹی کل، جو جوڑ توڑ کر کام چلا رہی تھی نئے سرے سے بیکار ہوتی محسوس ہوئی۔

"مجھے بھی اسے دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی۔ خدا بخشے خالہ سچ ہی کہتی تھیں۔ پالنے والا خدا ہے۔ پل ہی جائے گی۔ دیکھیے نا۔ کتنی بڑی ہو گئی ہے۔ اپنی فریدہ سے کچھ ہی بڑی ہے۔ لیکن مجھے تو قد کاٹھ میں اس سے بڑی ہی لگتی ہے۔"

"ہوں" فرید کا حلق سوکھ چکا تھا۔ اور آنکھوں میں وہی صحراؤں کی دھول اُمنڈ رہی تھی۔

جیراں ثومی کا ہاتھ تھام کر واپس جانے کو مڑی ہی تھی۔ کہ برآمدے کے دوسرے سرے سے فریدہ بھاگتی ہوئی ادھر ہی آ گئی۔ سفید اور گلابی گھیر دار پھولا پھولا۔ خوبصورت فراک۔ سفید جرابیں۔ گلابی بوٹ۔ گلابی ربن سیاہ۔ ترشے ہوئے گھنگھریالے بالوں میں گھرا سرخ و سپید چہرہ، وہ یوں لگ رہی تھی۔ جیسے آغاز بہار کا تازہ تازہ کھلا ہوا پھول ہو۔

"ڈیڈی" فریدہ اچھلتی کودتی آئی اور فریدہ کی ٹانگوں سے لپٹ گئی۔

"چھوٹی بی بی" جیراں نے ادھ کھلے گھونگھٹ سے بچی کو دیکھ کر پیار سے ہاتھ پھیلا دیے۔ فریدہ اس سے کترائے ہوئے کچھ اور آگے ہو گئی۔ فرید کا بازو اس نے پکڑ رکھا تھا۔ ثومی نے بھی فریدہ کو دیکھا۔ اپنی ہم عمر لڑکی کو دیکھ کر وہ خوش نہ ہوئی۔ لیکن بچی کا انداز اور لباس دیکھ کر کچھ مرعوب سی ہو کر رہ گئی۔

فرید کے لیے یہ لمحہ قیامت کا لمحہ تھا۔ فریدہ خدا جانے کیا کہہ رہی تھی۔ اور سلمیٰ کس کے بارے میں گفت و گو کر رہی تھی۔ اسے کچھ احساس نہ تھا۔ اسے تو یوں لگ رہا تھا۔ جیسے

فرید تخت پر ٹک گیا۔ اس کی نظریں ثومی پر تھیں۔ کنٹریکٹ کی ساری خوشی ہوا ہو گئی تھی۔ اس کی آنکھوں میں چھینٹ کے گلابی اور نیلے کپڑے پلاسٹک کے گلابی چپلوں میں خلط ملط ہو کر گھوم رہے تھے۔ اندر کی ٹوٹی پھوٹی کل، جو جوڑ توڑ کر کام چلا رہی تھی نئے سرے سے بیکار ہوتی محسوس ہوئی۔

"مجھے بھی اسے دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی۔ خدا بخشے خالہ سچ ہی کہتی تھیں۔ پالنے والا خدا ہے۔ پل ہی جائے گی۔ دیکھیے نا۔ کتنی بڑی ہو گئی ہے۔ اپنی فریدہ سے کچھ

چکی کے دو پاٹوں میں آکر وہ پس رہا ہو۔

"سلام صاحب جی" اور "ڈیڈی" ان آوازوں کی تکرار سے کانوں میں ملونا نوں کی پھنکار کی گونج تھی۔ اور نگاہوں میں چھینٹ کے گلابی اور نیلے کپڑے گاڑھے گلابی پلاسٹک کے سلیپر اور خوبصورت تراش کا ہلکے گلابی اور سفید رنگ کے امتزاج کا خلط ملط ہو رہا تھا۔ فریدہ اور ثومی۔ فریدہ اور ثومی یہی دو وجود ٹکرا رہے تھے۔

"یہ کون ہے ممی"۔ فریدہ سلمیٰ کے پاس آکر بولی۔ اس کا اشارہ ثومی کی طرف تھا۔

"مالی کی بیٹی ہے۔" فرید نے سلمیٰ کا جواب سنا۔

"فتو مالی کی۔" فریدہ کی آواز بھی کانوں سے ٹکرائی۔

"ہاں۔" سلمیٰ کا وثوق فرید کے لیے چیلنج تھا۔

فرید نے آنکھیں بند کرلیں۔ بعض اوقات ہم آنکھوں سے بھی تو سنتے ہیں۔ آنکھیں بند کرلیں۔ تو یوں لگتا ہے۔ جیسے کچھ بھی نہیں۔ کچھ بھی نہیں سن رہے۔

کانوں کے سننے سے آنکھوں کا سننا کتنا وحشت خیز، کتنا تباہ کن اور کتنا لیوا ہوتا ہے۔!

فرید اس جانگسل تجربے سے گزر رہا تھا۔ گھبرا کر اس نے اسی لیے تو آنکھیں کر لی تھیں۔ تاکہ کچھ نہ ـــ سن سکے۔

کچھ ـــ نہ ـــ سن ـــ سکے۔

اس گھر میں پھر آگئی تھی۔ ثومی۔ جیسے فرید بھولا تھا بے شک نہیں تھا لیکن جس کا خیال چھ سال کی دبیز تہوں تلے دب کر کچھ خواب سا ہو چکا تھا۔

فرید کے وسوسے اور دھڑکے سب سو چکے تھے۔ بلو پھر کبھی یہاں نہیں آئی تھی۔ کبھی بھی نہیں۔ فرید کے لیے یہ بات وجہ تسکین تھی۔ ثومی گاؤں چلی گئی تھی۔ اور بلو روپوش ہو چکی تھی۔ فرید کے ذہن کے سب بوجھ خود بخود اٹھ گئے تھے۔ اس کی زندگی نارمل ہو چکی تھی۔ کبھی کبھی فریدہ کو دیکھ کر اسے ثومی کا خیال آجاتا تھا۔ وہ لاشعوری طور پر دونوں کا موازنہ کرنے لگتا تھا۔ لیکن جو کچھ بھی تھا۔ اس خیال میں اب درد، خوف اور وسوسے کی وہ شدت نہ رہی تھی۔

خیال آتا اور خیال ہی کی طرح گزر جاتا۔

دکھ، ندامت اور پچھتاوے کا ہلکا سا احساس اور بس۔

لیکن۔ آج ثومی پھر اس گھر میں زندہ حقیقت بن کر آگئی تھی۔ ثومی۔ جس کا اپنا وجود تھا۔ جو ایک اکائی تھی۔ جو اپنی ذات میں کل تھی۔

سانحے گزر جائیں۔ حادثے رونما ہو جائیں۔ وقت کا چکر اپنی مخصوص ادا سے چلتا ہی رہتا ہے۔ وقت کے پاؤں میں زنجیر نہیں ڈالی جا سکتی۔ اس کا توازن نہیں بگاڑا جا سکتا۔ اس کی راہ میں روڑے نہیں اٹکائے جا سکتے۔ صدیوں کے فاصلے ماپتا ہوا یہ چکر گھستا پٹتا بھی نہیں۔ گزرتا ہے اور گزرے چلا جاتا ہے۔

ثومی فرید کے محل نما گھر کے پیچھے نوکروں کے کچے پکے کوارٹر میں فتو مالی کی بیٹی
سے رہ رہی تھی۔ اس درد کی شدت اس کرب کی اذیت کو فرید کے سوا اور کون جان
تھا۔ جو ثومی کی وجہ سے تھی۔ ثومی تو ایسا کوڈ ورڈ تھی۔ جس کے معنے صرف فرید
معلوم تھے۔ ان معنی کی ہلاکت خیزی سے صرف وہ ہی آگاہ تھا۔ ورنہ سب کے
وہ فتو کی لیے پاگل تھی۔

اور فرید کے لیے یہی بات درد کا نقطہ تھی۔ کرب کا خط تھی۔ دن گزرتے گئے
ثومی نئے ماحول سے جلد ہی مانوس ہو گئی۔

فریدہ اس کی ہم عمر تھی۔ اس کا دل اس کے ساتھ کھیلنے کو مچلنے لگا۔ پہلے پہلے
وہ اس سے بڑی مرعوب ہوئی۔ ملتی تو سہمی سہمی رہتی۔ اس کے لباس اس کے
اس کی دوسری چیزیں دیکھ دیکھ کر اس نے فریدہ کو اپنے سے کوئی الگ تھلگ
ہی سمجھ لیا تھا۔ جیراں بھی ایسا سمجھنے میں معاون تھی۔ اس نے ثومی پر فریدہ کی حیثیت
اور درجے کی وضاحت ایک بار نہیں بار بار کر دی تھی۔ کچھ سلمیٰ کے سرد رویے نے
ثومی نا سمجھ ہوتے ہوئے بھی ایک ایسے جذبے کو سمجھ گئی۔ جسے صرف محسوس
سکتا ہے۔ بیان نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن رفتہ رفتہ دونوں ایک دوسرے سے
ہو گئیں۔ دونوں عمر کے اس حصے سے گزر رہی تھیں۔ جہاں دنیاداری کے بنا
ظاہری اصولوں کے پنپنے کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی۔

دونوں پہروں اکٹھے کھیلتیں۔ کبھی گھنے درختوں تلے۔ کبھی شاداب کیاری
گرد۔ کبھی اونچی اونچی چھتوں تلے۔ کبھی ارغوانی قالینوں پر۔

فریدہ کی ثومی میں دل چسپی کے پیش نظر سلمیٰ نے ثومی پر فریدہ کے کئی کام
دیے تھے۔ کوٹھی میں تو وہ ہر وقت رہتی ہی تھی۔ فریدہ کے جوتے پالش کرنے
کے کھلونے ترتیب سے رکھنے اور اس کے کمرے کی چھوٹی موٹی چیزیں سنبھالنے

کام اس نے ثومی سے لینا شروع کر دیا تھا۔

ثومی بھی یہ کام خوشی خوشی کرتی۔ اچھی اچھی چیزوں کو چھونے، انہیں اٹھائے رکھنے سے
اسے دلی مسرت ملتی۔

فرید اسے دیکھتا تو دل ہی دل میں کڑھتا۔ پیچ و تاب کھاتا۔ جی مسوس کر رہ جاتا لیکن
کر کچھ بھی نہ سکتا۔ جرم کے احساس نے اسے بزدل بنا دیا تھا۔ وہ چور تھا۔ اس کا دل چور تھا
اس کا ذہن چور تھا۔ اسی لیے تو ذرا سے کھٹکے سے بھی دہل جاتا۔ ثومی کو پیار کرنے کی تڑپ
دل میں پیدا تو ہوتی لیکن افشائے راز کے ایسا کبھی نہ کر سکتا۔ وہ تو ثومی کو نظر بھر کر دیکھتا
بھی نہ تھا۔ مبادا نظریں وہ بات کہہ دیں۔ جو اس کے دل کی گہرائیوں میں دفن تھی۔

وقت گزرتا جا رہا تھا۔ فرید کے ذہن پر چرکے لگتے رہتے۔ کبھی کبھی تو ان چرکوں سے
وہ بلبلا اٹھتا۔

اس دن وہ کسی کام سے پچھلی طرف جا نکلا۔ ثومی گوبر کی بھری پرات اٹھائے اپنے
کوارٹر کی طرف جا رہی تھی۔ اس کے ننھے ننھے ہاتھ گوبر سے لت پت تھے۔ وزن زیادہ
ہونے کی وجہ سے اس کی گردن ادھر ادھر ڈول رہی تھی۔ جیراں اس سے بڑی پرات اٹھائے
اس کے پیچھے پیچھے تھی۔

فرید کے پاؤں جیسے زمین میں گڑ گئے۔ اس کا دل مسلا گیا۔ ایسے ایسے کئی واقعات
فرید کے ذہن پر خراشیں ڈالتے چلے گئے۔

اس دن جب ثومی فریدہ کے جوتے پالش کر رہی تھی۔ سلمیٰ نے پالش زیادہ تھوپ
دینے پر اسے دھتکار کے انداز میں ڈانٹا تھا۔ تو فرید کا خون جوش مارنے لگا تھا لیکن وہی
پرانا خوف۔ یہ جوش نہ سلمیٰ کو باز رکھ سکا۔ نہ ثومی کے سر پر دست شفقت پھیر سکا۔
یہ جوش اندر ہی اندر دھیما پڑتا چلا گیا۔

جیراں ثومی کو سکول داخل کروانے کے لیے بضد تھی۔ وہ چاہتی تھی۔ ثومی پڑھ لکھ کر

استانی بنے۔ فتو اس کا ہم خیال نہیں تھا۔ ایک مالی کی بیٹی کے لیے پڑھنے لکھنے کی کیا ضرورت تھی۔ لیکن جب اڑوس پڑوس والوں نے بھی جیراں کے خیال کی تائید کی۔ تو وہ اسے سکول داخل کروانے پر راضی ہو گیا۔

ثومی بڑی ہی ذہین بچی تھی۔ فریدہ کو پڑھتے لکھتے دیکھتی۔ تو اس کا جی بھی فریدہ کی طرح پڑھنے کو چاہتا۔ فریدہ کی زبانی سن سن کر ہی اس نے انگریزی کی کئی نظمیں یاد کر لی تھیں۔ کئی لفظ بھی ازبر تھے۔ گنتی بھی آ گئی تھی۔

فریدہ انگلش طرز کے سکول میں پڑھنے جاتی تھی۔ ثومی کو ایک عام پرائمری سکول میں داخل کروا دیا گیا۔ پہلے تو اس نے ضد کی۔ "فریدہ کے سکول میں پڑھوں گی۔" لیکن جب جیراں نے اسے سمجھایا۔ کہ وہاں نوکروں کے بچے نہیں پڑھتے۔ تو وہ ذہن میں الجھن لے کر چپ ہو گئی۔

فریدہ نے ثومی کے سکول داخل ہونے کا سنا تو اس نے اطمینان کا سانس لیا۔ ثومی پڑھ لکھ کر اپنے پاؤں پر کھڑی ہو جائے گی۔ یہی بات باعثِ تسکین تھی۔

وہ گرمیوں کی گرم ترین دوپہر تھی۔ جون کے اوائل دن تھے۔ نیلا آسمان تپ رہا ہو رہا تھا۔ زمین آگ اگل رہی تھی۔ فرید کچہری سے زمینوں کے بکھیڑے نپٹیٹ کر واپس گھر آ رہا تھا۔ طویل اور سنسان سڑک بھٹی کی طرح تپ رہی تھی۔ موٹر تیزی سے وہ گھر لوٹ رہا تھا۔ اچانک سڑک پر دائیں ہاتھ اسے ثومی نظر آئی۔ بلا کی اس گرمی میں وہ اپنا وجود گھسیٹتی پسینے میں لت پت چلی جا رہی تھی۔

فریدہ کو سکول سے لاتے اور لے جانے کے لیے گاڑی جاتی تھی۔ لیکن ثومی آتی جاتی تھی۔ فرید کا دل ایک لمحہ کو تو جیسے پھٹ پڑا۔ گناہ گار وہ تھا۔ اور سزا بھگت رہی تھی۔ ایک لکھ پتی باپ کی بیٹی یوں پل رہی تھی۔ بچی کی محرومی پر اس کا دل کٹ گیا۔

ثومی کے قریب جا کر اس نے گاڑی روک لی۔

"صاحب جی سلام" ثومی نے فرید کو دیکھتے ہی کہا۔

"ثومی" فرید نہیں اس کی روح چیخ اٹھی۔

ثومی حیرت زدہ سی اسے دیکھنے لگی۔ صاحب نے اسے ڈانٹ کر پکارا تھا۔ یا پیار سے آواز دی تھی۔ وہ کچھ بھی تو نہ سمجھ پائی۔ چلچلاتی دھوپ میں پسینے میں شرابور وہیں ساکت سی کھڑی رہ گئی۔

فرید تڑپ کر گاڑی سے باہر نکلا۔ ثومی کے کچھ سمجھنے سے پہلے ہی اسے بازو سے پکڑا اور گاڑی کی اگلی سیٹ پر لا بٹھایا۔

"صاحب جی۔" ثومی ڈر گئی۔

"ثومی" فرید نے اپنی جگہ پر بیٹھتے ہی اسے اپنے بازوؤں میں سمیٹ کر سینے سے لگا لیا۔

"میری بچی۔ میری بچی!" — بڑبڑاتے ہوئے وہ دیوانہ وار اسے اپنے سینے میں سمونے لگا۔ اپنے پیاسے ہونٹ اس کی پیشانی پر رکھ دیے۔ اور اس کی سسکتی بلکتی محبت افشائے راز کے ڈر سے بے نیاز ہو کر یوں بہہ نکلی۔ جیسے بند ٹوٹ جانے پر پانی۔

چھ سال میں آج پہلی بار اس نے اپنی بچی کو چھوا تھا۔ اسے سینے سے لگایا تھا اس پر محبت کے پھول نچھاور کیے تھے۔ اس کے اندر کی سلگنے والی آگ کسی حد تک ٹھنڈی ہو گئی تھی۔ کاش۔ کاش وہ ثومی کو اس کا اصل مقام دے سکتا۔ کاش! کاش۔ ثومی کو سینے سے لگائے وہ دکھ سے یہ بات سوچنے لگا۔ مجبوری کا افسوس کراس کے حلق میں اترنے لگی۔ اسے اپنا سانس گھٹتا ہوا محسوس ہوا۔

"میری بچی۔ قصوروار میں ہوں۔ لیکن سزا تو بھگت رہی ہے۔ میں کیا کروں۔ میں کیا کروں۔ یا خدا۔ تو ہی نجات کی راہ دکھا دے۔ میں نے اپنے گناہ کی کڑی سزا بھگتی ہے کب تک؟ اور کب تک یوں جلتا رہوں گا؟ بلو۔ بلو۔ تم نے کتنا

زبردست بدلہ لیا مجھ سے ـــــ کس آگ میں دھکیل دیا مجھے ـ کاش وقت پیچھے لوٹ سکتا ـ میں اپنے گناہوں کی تلافی تمہیں اپنا کر کر سکتا ـ لیکن اب اُف میں کیا کروں ـ میں اس معصوم بچی کے لیے کیا کروں ـ اس بے گناہ کے لیے کیا کروں۔"

وہ ثومی کو دیوانہ وار لپٹائے بڑبڑا رہا تھا۔

ثومی اس ایکا ایکی یلغار ـ اس اچانک حملے سے بوکھلا گئی تھی ـ کچھ گرمی، کچھ جوش التفات ـ اس کا تو دم گھٹنے لگا تھا ـ معصوم بچی فرید کے جذبات کو کیا سمجھتی حیران ضرور تھی ـ لیکن عقلی دلائل دینے اور سمجھنے کے قابل نہ تھی ـ ہاں اسے فرید کے اس التفات سے بڑا ہی لطف آیا تھا ـ اس کے ہاتھوں کا لمس اس کے سینے کی گرمی اس کے ہر ہڈی کا ابلتا پیار اسے بیحد اچھا لگا تھا ـ ان لمحوں کی ابدیت کے لیے اس کے اندر کی کوئی چیز مچل اٹھی تھی ـ فرید کی دیوانگی کو ہوش آیا ـ تو اس نے ثومی کے گرد بازو کا حلقہ ڈھیلا کر دیا ـ اور پھر یہ بازو بے جان سے ہو کر گر گئے ـ اس نے سیٹ کی پشت پر سر ٹکا کر آنکھیں بند کر لیں۔

وہ کئی لمحے یونہی پڑا رہا ـ ثومی اپنی بڑی بڑی آنکھیں کھولے اسے حیرت زدہ دیکھتی رہی ـ سڑک پر سے کوئی ٹرک شور مچاتا رہا تو فرید اپنی دنیا میں پھر لوٹ آیا ـ اس نے آنکھیں کھولیں ـ گہرے گہرے سانس لیے اور سٹیئرنگ پر ہاتھ رکھ دیے ـ

شام اس نے پہلی بار دبے دبے لفظوں میں سلمیٰ سے ثومی کے لیے رعایت مانگی۔

"فریدہ کے لیے گاڑی روز جاتی آتی ہے ـ ثومی کو بھی اس کے ساتھ بھیج دیا کرو ـ اسکول تو راستے میں پڑتا ہے ـ گرمی بھی کتنی ہے آجکل ـ"

لیکن سلمیٰ کو فرید کی سفارش اچھی نہ لگی ـ "نوکروں کو اتنا سر چڑھانے کی ضرورت نہیں جی ـ آج ثومی کو گاڑی میں بھیجیں گے ـ تو کل رحمت کے بچے جمو کے لاڈلے سبھی گاڑی میں سوار ہوں گے ـ ہونہہ ـ"

فرید چپ ہو گیا تھا ـ اسے رحمت کے بچوں یا جمو کے لاڈلوں سے کیا سروکار ـ بات تو ثومی کی تھی ـ ثومی ـ

جس کا فریدہ ہی کی طرح گاڑی پر پورا پورا حق تھا ـ لیکن ـــ

فرید کے ذہن پر چرکے ہی چرکے پڑ رہے تھے ـ یہ چرکے ثومی کو یوں والہانہ پیار کرنے کے بعد کچھ اور کٹیلے ہو گئے تھے ـ ثومی شاید اس التفات اور پیار کی متوقع رہنے لگی تھی ـ اس دن جب فریدہ، فرید کا ہاتھ پکڑے بازار گئی یا خرید نے کو جانے کے لیے مچل رہی تھی ـ ثومی کو جانے کیا سوجھی بھاگ کر آئی اور فرید کا دوسرا ہاتھ پکڑ کر بالکل فریدہ کے سے انداز میں جھول گئی ـ

عین اسی وقت سلمیٰ اپنا چرمی بیگ سنبھالے ساڑھی کا پلو درست کرتے سامنے والے کمرے سے نکل کر آئی ـ فرید کا سارا جسم ٹھنڈی ٹھنڈی کپکپاہٹ سے جھٹکے کھانے لگا ـ سلمیٰ کی پیشانی پر بل پڑ گئے ـ

"آپ نے اسے بہت سر چڑھا رکھا ہے ـ" اس نے منہ بنا کر کہا ـ اور پھر کندھے سے پکڑ کر ثومی کو پیچھے ہٹا دیا ـ "حد کے اندر رہا کرو ـ"

ثومی فرید کا ہاتھ چھٹ جانے سے تڑپ اٹھی ـ لیکن سلمیٰ کے انداز سے سہم کر پیچھے ہٹ گئی ـ اس کی خوبصورت آنکھوں میں آنسو آ گئے ـ

فرید نے ان آنسوؤں کو محسوس کیا ـ کوئی شے اس کے حلق میں اٹکنے لگی ـ لیکن چپ چاپ پورچ میں کھڑی گاڑی کی طرف چل دیا ـ اک لمحہ کو تو اسے فریدہ سے نفرت محسوس ہوئی ـ اس کا جی چاہا ـ کہ اسے بھی جھٹک کر اپنے پہلو سے ہٹا دے ـ

"ممی" فریدہ نے ماں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ـ "ثومی کو بھی ساتھ لے چلتے ہیں۔"

"زیادہ باتیں نہیں کرو ـ تم نے اسے بہت منہ لگا رکھا ہے ـ میں تمہارا اس سے کھیلنا بند کر دوں گی ـ"

فرید ہونٹ کاٹتے ہوئے گاڑی چلانے لگا۔ اس کی نظروں میں ثومی کی جل تھل آنکھیں تھیں۔ اور وہ سوچ رہا تھا کہ ایسے ایسے وار وہ کب تک برداشت کرتا رہے گا۔

لمحے لمحے کی ذہنی اذیت تھی

اور

وہ تھا۔

مجرم تھا۔ سزا بھگتنا ہی تھی۔

—— ۰ ——

"یہ میرے کیے کی سزا ہے۔"

"سرکار آپ نے تو اپنی زندگی کو روگ ہی لگا لیا ہے۔"

"خدا کی لاٹھی بے آواز ہوتی ہے۔"

"آپ لاکھ بار توبہ کر چکے ہیں۔ بخدا کچھ تو سنبھلیے۔ خدانخواستہ آپ کو کچھ ہو گیا تو اس خاندان کا کیا بنے گا۔ آپ کو تو بیگم صاحبہ کی خاطر ہی ہمت سے کام لینا چاہیئے۔"

"بھابی کی خاطر ہی تو جی رہا ہوں گامے۔ ورنہ اب تک تو اس زندگی کو ختم ہی کر لیا ہوتا۔"

"ان کے دورے بھی تو ٹھیک نہیں ہوتے۔ یوں تو اچھی بھلی لگتی ہیں لیکن جب دورہ پڑ جاتا ہے تو الاماں۔"

"ان کی ایک ایک چیخ میرے جگر کے پار ہو جاتی ہے گامے۔ میں اس واقعے کو بھلانا چاہوں تو بھی نہیں بھلا سکتا۔ مہ جبین کے دورے اس واقعے کو تازہ رکھتے ہیں میں تو یہی سمجھتا ہوں کہ قدرت کی طرف سے مجھے سزا مل رہی ہے۔ میں نے دولت کی خاطر اس کی معصوم بچی کو موت کے گھاٹ اتارا۔ اُف! میں کتنا ظالم تھا۔ کتنا سنگ دل۔"

"سرکار۔ بیتی باتوں کو یوں نہ دہرایا کرو۔ آپ کی صحت کتنی گر گئی ہے۔ آپ نے جو کچھ کیا تھا۔ وقتی لغزش تھی۔ اس کا مداوا کرنے کی بھی تو آپ نے پوری پوری کوشش کی ہے۔ مجھے بہلانے کی کوشش نہ کرو گامے۔ میں اس بچی کا قاتل ہوں۔ اسے میرے ایماء پر قتل کیا گیا تھا۔ اُف! بیوہ مہ جبین کی ایک ہی ایک بچی۔ بتاؤ کیا مداوا کیا ہے میں نے اس کا۔ کیونکہ مداوا کر سکتا ہوں گامے۔ کیونکہ۔"

آفتاب عالم اپنے بستر پر اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس کی ذہنی حالت کچھ مخدوش سی تھی۔ برسوں سے ایک آگ سینے میں دہائے بیٹھا تھا۔ اس کا معتمد خادم گاما اس کی دلجوئی کو نہ ہوتا۔ تو شاید اب تک وہ اپنے بھیانک جرم کے بدلے اپنی جان دے چکا ہوتا۔ اس واقعے کو کئی برس گزر چکے تھے۔ لیکن یہ واقعہ آج بھی تازہ تھا۔ مہ جبین کی حالت ویسے کی ویسی تھی۔ آفتاب نے علاج معالجے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی تھی۔ ماہر نفسیات کی ایما پر نوزائیدہ بچے بھی مہ جبین کی آغوش میں ڈالے تھے۔ لیکن وہ تو بچوں کی گود میں لیتے ہی پٹخ دیتی۔ مامتا اپنی درد کی لہروں کو خوب پہچانتی ہے۔ یتیم پاگل مہ جبین پرائے بچوں کی بو پہچان جاتی تھی۔

آج بھی مونا دالی کے ایک معزز گھرانے میں پیدا ہونے والے خوبصورت بچے کو حویلی لایا گیا تھا۔ بچہ انتہائی خوبصورت تھا۔ پندرہ بیس دن کا بچہ خوب تندرست تھا۔ گامے کا خیال تھا۔ کہ مہ جبین کی بچی شائستہ اس بچے سے مشابہ تھی۔ اسے اس کامیابی کی سو فیصد امید تھی۔ کہ مہ جبین اس بچے کو شائستہ سمجھ کر ضرور پیار کرے گی۔ بچہ اس کی گود میں آفتاب نے ہی ڈالا۔ "بھابی شائستہ کو دیکھو۔ کتنی جلدی ہو گئی ہے۔"

مہ جبین نے بے صبری سے بچہ آفتاب کے ہاتھوں سے جھپٹ لیا تھا۔ اس کی آنکھوں میں پہچان کی چمک ابھری تھی۔ گامے اور آفتاب نے متوقع کامیابی سے مسرور ہو کر ایک دوسرے کو دیکھا تھا۔ لیکن مہ جبین نے بچے کو بازوؤں میں سینے سے لگاتے ہی جھٹکا سا کھایا۔ بچے کو سونگھا اور پھر بیدردی سے پٹخ دیا۔ وہ تو گامے نے جلدی سے بچے کو تھام لیا تھا۔ ورنہ فرش پہ گر کر بچے کی پسلی ضرور ایک ہو جاتی۔"

"بھابی۔ بھابی۔ خدا کے لیے ہوش میں آؤ۔ تمہیں کیا ہو گیا ہے۔ تم

ٹھیک ہو گی۔" آفتاب عالم نے بے بسی سے کہا۔

"کیوں۔ مجھے کیا ہوا ہے۔ میں تیار ہوں کیا۔ مجھے تو کوئی تکلیف نہیں۔" مہ جبین نے پھٹی پھٹی نظروں سے آفتاب عالم کی طرف دیکھا۔

"تم شائستہ کو پہچانتی کیوں نہیں ہو۔"

"کون شائستہ؟"

"تمہاری بچی۔"

"میری بچی؟"

"ہاں۔ ہاں تمہاری بچی۔ وہ کار کے حادثے میں مری نہیں تھی۔ زندہ تھی۔ دیکھو یہ دیکھو۔ کتنی پیاری ہے وہ۔"

گامے نے بچے کو پھر مہ جبین کے سامنے کر دیا۔

"نہیں۔ نہیں۔ نہیں۔" مہ جبین اسے دیکھ کر چیخی۔

"یہ شائستہ ہے بھابی۔ تمہاری پیاری بیٹی۔"

"نہیں۔ نہیں۔ نہیں۔ میری کوئی بچی نہیں۔ میری کوئی بچی نہیں۔ تم جھوٹ کہتے ہو۔ تم جھوٹ کہتے ہو۔"

"بھابی۔ پھر تم کیا تلاش کرتی پھرتی ہو۔ تمہاری نگاہیں کسے ڈھونڈتی ہیں۔ تم اٹھ اٹھ کر کسے پانے کی کوشش کرتی ہو۔" آفتاب کی بے بسی دیدنی تھی۔ مہ جبین کو یاد کرانے کی کوشش میں اس کی آنکھیں بھیگ رہی تھیں۔ "بھابی تم شائستہ کی ماں ہو بھابی۔"

"نہیں۔ نہیں۔" وہ دکھ سے چیخی۔ "میں مہ جبین ہوں۔ میں مہ جبین ہوں۔" اور پھر "میں مہ جبین ہوں۔ میں مہ جبین ہوں" کی رٹ لگاتے لگاتے وہ چیخنے لگی۔ اس نے آنکھیں بند کر رکھی تھیں۔ اور کانوں پہ ہاتھ رکھے مسلسل چیخ رہی تھی۔ اس کی

پیشانی پر پسینے کی بوندیں چمک رہی تھیں۔

چیخوں کی آواز سن کر اس کی ذاتی ملازمہ اماں بی تیز تیز قدم اٹھانے کی کوشش میں لڑکھڑاتی اندر بھاگی آتی۔ دو چار ملازم بھی دوڑے۔

مہ جبین کو دورہ پڑ گیا تھا۔ آج دورہ اتنا شدید تھا۔ کہ اماں بی سے بھی وہ سنبھالے نہ جا رہی تھی۔

اس کی دل دوز چیخوں کے سب عادی ہو چکے تھے۔ لیکن آفتاب کے لیے ان کی ہر چیخ نئی تھی۔ اس سے زیادہ دیر تک یہ سب کچھ برداشت نہ ہو سکا۔ گامے نے بچہ دوسرے ملازم کو دے کر اس کے گھر پہنچانے کا کہا۔ اور آفتاب کو سہارا دے کر اس کے کمرے میں لے آیا۔ جہاں وہ بستر پر نڈھال ہو کر گر پڑا۔

اور جب تک مہ جبین کی چیخیں فضا میں گونجتی رہیں۔ وہ کانوں پر ہاتھ رکھے تکیے پر سر دیئے بے سدھ سا پڑا رہا۔

گامے کو اس کی مخدوش حالت سے تشویش ہو رہی تھی۔ برسوں گزر جانے پر بھی یہ سانحہ تازے کا تازہ تھا۔ لیکن وہ آفتاب کا نمک خوار تھا۔ مالک کی ہمت بندھانا اس کا فرض تھا۔ مونا والی کے اس معزز خاندان سے اسے دلی عقیدت تھی اور جب سے آفتاب کی زندگی نے پلٹا کھایا تھا۔ اس کی عقیدت میں محبت کا رنگ بھی شامل ہو گیا تھا۔ آفتاب کے جرم میں وہ بھی شریکِ کار تھا۔ اسی نے دولت کی خدمات حاصل کی تھی۔ اسی نے بچی کو مروانے کا منصوبہ بنایا تھا۔ یہ سب کچھ پیسے کے لالچ میں کیا۔ لیکن آفتاب کی زندگی کے ایکا ایکی پلٹے نے اس کی سوچوں کے زاویے بدل دیے تھے۔ آفتاب کا احترام وہ پہلے پیسے کے لالچ میں کرتا تھا۔ لیکن اب تو وہ اس کا بندۂ بے دام بن گیا تھا۔

اسی کے سہارے تو آفتاب زندگی سے نبرد آزما تھا۔ مہ جبین کی وجہ سے اس

ذہنی قیامتیں ٹوٹتی تھیں۔ اس کے اندر آگ بھڑکتی تھی۔ لیکن گامے اسے تسکین دیتا تھا۔ اسے زندہ رہنے پر آمادہ کرتا تھا۔

مہ جبین کی چیختے چیختے آواز بیٹھ گئی۔ چیخیں پہلے مدھم ہوئیں اور پھر خاموشی میں ڈوب گئیں۔ وہ بے دم ہو کر بستر میں گر چکی تھی۔ اماں بی اس کا سر زانو پر رکھے اپنے شفیق ہاتھوں سے اس کی کنپٹیاں سہلا رہی تھی۔ وہ غنودگی میں ڈوبی جا رہی تھی۔ دورہ ختم ہو چکا تھا یہ روز کا معمول تھا۔ مہ جبین دورے کے بعد گھنٹہ دو گھنٹہ غنودگی میں ڈوبی رہتی۔ پھر بیدار ہو جاتی۔ تو اسے کچھ بھی یاد نہ رہتا۔ وہ اچھی بھلی دکھائی دیتی۔ باتیں کرتی ہنستی بولتی۔ اماں بی سے تو گھنٹوں باتوں میں مشغول رہتی۔ لیکن یہ سب باتیں حال کی ہوتیں۔ ماضی سے ان کا ربط ہونا نہ تعلق۔ برسوں کی خدمت گزاری سے اماں بی اس کے روگ کو جان چکی تھی۔ اس لیے کبھی اشارۃً، کنایۃً بھی اس نے ماضی کی طرف اشارہ نہیں کیا تھا۔ اس کے بس میں ہوتا تو یہ بچوں کو گود میں ڈالنے کا تجربہ بھی کبھی نہ کرنے دیتی۔ لیکن دورہ صرف بچوں کے گود میں ڈالنے ہی سے تو نہ پڑتا تھا۔ بیٹھے بیٹھے کوئی داخلی جذبہ تڑپ اٹھتا۔ کبھی خارجی عنصر متحرک ہوتے۔ دن میں ایک آدھ بار تو یہ دورہ ضرور ہی پڑ جاتا تھا۔ اور اماں بی کے سارے بہلاوے، ساری کاوشیں دھری کی دھری رہ جاتیں۔

یونہی شب و روز کا چکر چلتا رہا۔ حویلی کی رونقیں پھر پلٹ کر نہ آتیں۔ اک جامد سا سکوت در و دیوار پر طاری رہتا۔ موت کی سی خاموشی کا تسلط ہوتا۔ زندگی کی گہما گہمی کا یہاں کوئی دخل نہ تھا۔ مونا والی کا ہر فرد اس خاندان پر ٹوٹی آفت سے آگاہ تھا۔

مہ جبین اور آفتاب دونوں ہی قابلِ رحم تھے۔ مونا والی کے ساکنان کی دلی ہمدردیاں ان دونوں کے ساتھ تھیں۔ لیکن کوئی بھی ان کے لیے کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ برس پہ برس بیت رہے تھے۔

—— ؎ ——

برس پہ برس بیت رہے تھے۔ فتو مالی کے لگائے ہوئے پودے تناور درخت بن چکے تھے۔ اور گولڈ مور کے درخت کے نیچے سے اٹھائی ہوئی چند یوم کی بچی حسن و جوانی کا شاداب پیکر بن چکی تھی۔ خوبصورت تو وہ تھی۔ لیکن اس خوبصورتی میں جو جوانی نے نکھار بھرا تھا۔ وہ قیامت تھا۔ دل کش قد و قامت والی ثومی یوں لگتا تھا۔ جیسے کانچ کی بنی ہو۔ جسم کے متوازن خطوط کشش انگیز ابھار اور مسحور کن قوسیں۔ ثومی دست قدرت کا شاہکار تھی۔ کاٹن کے سادہ سے کپڑوں میں بھی اس کا طلسماتی حسن نگاہوں کو خیرہ کر دیتا تھا۔

فریدہ بھی اس کی ہم عمر تھی۔ خدوخال اس کے بھی متناسب تھے۔ جسم بھی خوبصورت تھا لیکن اس میں وہ بات نہ تھی۔ جو ثومی میں تھی۔ اچھا لباس اور اعلیٰ قسم کا میک اپ بھی اسے ثومی سے نمایاں نہ کر سکتا تھا۔ اکثر گھر میں مہمان آتے یا وہ ثومی کو اپنے ساتھ کہیں لے کر جاتی۔ تو لوگ ثومی ہی سے متاثر اور مرعوب ہوتے۔ ہر چند کہ اس کی حیثیت فریدہ کے سامنے خادمہ کی ہوتی۔ فریدہ کے دل میں حسد کے جذبات اکثر سر اٹھانے لگتے۔

ثومی اور فریدہ کی بچپن میں جو دوستی تھی اب اس پہ کہر سی پڑ چکی تھی۔ نامحسوس طریقے سے فریدہ نے اپنی حیثیت اسے جتلا دی تھی۔ اور ثومی وقت کے ساتھ ساتھ اپنے اور فریدہ کے درمیان اٹھی ہوئی حد فاصل کو محسوس کر چکی تھی۔

دونوں پڑھ چکی تھیں۔ فریدہ نے کامرس سے میٹرک کیا۔ اور ثومی نے گورنمنٹ سکول سے۔ ثومی سنجیدہ ذہین، حساس اور غیور طبع لڑکی تھی۔ اسے اپنا مستقبل بنانا تھا

بڑی بڑی رکاوٹوں اور نامساعد حالات کے باوجود اس نے لگن سے تعلیم حاصل کی اس کے برعکس فریدہ سے بہت زیادہ تھے۔ لیکن جو جشن فریدہ کے پاس ہونے کی خوشی میں منائے گئے۔ وہ ثومی کی تقدیر کا حصہ نہ تھے۔

ثومی کی اس کامیابی کی سب سے زیادہ جسے خوشی ہوئی وہ فرید تھا۔ اتنے گمبھیر سالوں میں پہلی بار وہ ثومی کی طرف سے اس خوشی کا احساس کر رہا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے پے در پے شکستوں کے بعد اس نے عظیم فتح پائی ہو۔ اس خوشی کا وہ برملا اظہار نہ کر سکا۔ اس کی یہ خوشی فریدہ کی خوشی سمجھی گئی۔ لیکن جو کچھ بھی تھا وہ بے طرح خوش تھا۔

ثومی کی کامیابی پر جشن نہیں منائے گئے۔ جشن منانے کا سوال ہی کیا تھا۔ فتو کی مالی حیثیت ہی کیا تھی۔ لیکن دلی خوشی کا اظہار بھی تو نہ کیا گیا۔ ثومی بھی حالات کی خوگر ہو کر چپ تھی۔ اک سنجیدگی اس پہ مسلط تھی۔

وہ شروع ہی سے سنجیدہ نہ تھی۔ بچپن میں تو کافی شوخ ہوا کرتی تھی۔ جیراں کے لاڈ پیار نے بھی اسے شرارتی بنا دیا تھا۔ آئے دن اس کی شرارتوں کی شکایتیں اڑوس پڑوس کے کوارٹروں سے آتی رہتیں۔ جیراں پھر بھی اسے کچھ نہ کہتی۔

لیکن جب سے جیراں کے اپنے بچے ہونا شروع ہو گئے تھے۔ اس کی نظر التفات ثومی پر نہیں رہی تھی۔ وہ پیار و محبت جس کی اساس پہ ثومی کی زندگی کی اٹھانیں تھیں۔ یکسر ختم ہو گیا تھا۔ فتو بھی اپنی اولاد میں گم ہو گیا تھا۔ دونوں میاں بیوی ثومی سے کچھ کہتے تو نہ تھے۔ ہاں ذہنی طور پر اسے اک بوجھ ضرور سمجھنے لگے تھے۔ وہ تو فرید نے لاپروا اعانت کی تھی۔ جو ثومی اپنی تعلیم بھی جاری رکھ سکی۔ ورنہ اس راہ میں بھی کئی رخنے پڑے۔ کئی بار یہ سلسلہ منقطع ہوا۔

ثومی ابھی شعور کو بھی نہ پہنچی تھی۔ کہ جیراں کے دو تین بچوں نے اس کی حق تلفی کر کے اسے سوچوں کا عادی بنا دیا۔ وہ بچپن میں اپنا تقابل فریدہ کو سمجھتی تھی۔ اس کی سی

سہیلیوں کے لیے کئی بار جیراں کے سامنے ضد کی تھی۔ اس کے سے فراک پہننے کو مچلا کرتی تھی۔ اس کے کمرے میں گھس کر کبھی اس کا کوٹ پہن لیا کرتی۔ کبھی جوتے پاؤں میں اڑس کر اٹھلا اٹھلا کر چلتی۔ اس کے کھاؤنوں کو اپنی ملکیت سمجھا کرتی۔ اس کے برش سے اپنے بالوں کو سنوارا کرتی۔ لیکن جوں جوں اس کی سوچیں سلجھتی گئیں۔ وہ ان چیزوں سے دور ہوتی گئی۔ کچھ فریدہ کے رویے نے اور کچھ سلمیٰ کی ڈانٹ ڈپٹ نے اسے اس کے مقام کا احساس دلایا۔ لیکن سنجیدگی کا پوری طرح تسلط اس پر اس وقت ہوا۔ جب وہ شعور کو پہنچی۔ اور ادھر ادھر سے اپنے متعلق عجیب سی کہانی سننے میں آئی۔ یہ کہانی جسے اس کا ناسمجھ دماغ پوری طرح سمجھنے سے قاصر تھا ایک دن اس نے جیراں سے پوچھ ہی لیا۔

اور جب جیراں نے اس کہانی کی تصدیق کر دی۔ تو اس کے دل کی ہر دھڑکن پر جیسے صدیوں کی جمی برف کی سی ٹھنڈک بیٹھ گئی۔ جامد و ساکت نظروں سے وہ جیراں کو دیکھتی رہ گئی۔

جیراں کو اس مظلوم روح پر بے طرح ترس آیا۔ اسے گلے سے لگا کر پیار کرتے ہوئے بولی، "ہم نے تو تجھے بیٹی ہی کی طرح پالا ہے۔ جتنے لاڈ تیرے دیکھے اتنے تو ہاجرہ اور رابعہ کے بھی نہیں دیکھے اور تو اور اصغر ایک ہی ایک ہے۔ تو اس سے بھی لاڈلی تھی۔"

لیکن ثومی کی دھڑکنوں پر جمی صدیوں کی برف پگھل نہ سکی۔ اسے یہ تو پتہ تھا کہ وہ ان کی سگی بیٹی نہیں۔ لیکن یہ تو خدا جانے اسے بچپن کے کس حصے میں پتہ چل چکا تھا۔ اور یہ بات معمول کے مطابق تھی۔ لیکن جو کہانی اٹھتے بیٹھتے اڑتے اڑتے اس کے کانوں تک شعور کی حدوں میں آ جانے پر پہنچی تھی۔ اس کا اسے دکھ ہوا۔

"میری ماں مجھے یوں پھینک گئی۔" اس نے جیراں سے الگ ہوتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں۔"

"وہ کیسی تھی۔"

"فنو کہتا ہے بڑی اچھی شکل کی تھی۔"

"کتنی ظالم تھی وہ۔"

"ہائے ہائے خدا جانے اس پہ کیا بیتی۔ کس نے اس پر ظلم کیا۔ جو وہ اپنا جگر کاٹ کر یہاں پھینک گئی۔"

"پھر کبھی نہیں آئی مجھے دیکھنے۔"

"نہیں۔"

ثومی کے دل میں اپنی ان دیکھی ماں کے خلاف نفرت کا لاوہ ابل پڑا۔ اس کی آنکھوں سے چنگاریاں نکلنے لگیں۔ اس نے بے تکی سی باتیں اس عورت کے لیے کہہ ڈالیں۔ جو اس کی نام نہاد ماں تھی۔ جیراں کو روحانی سی خوشی ہوئی۔ اسے اپنا آپ اس عورت سے بہت اونچا محسوس ہوا۔

جوشِ محبت میں آ کر اس نے ثومی کو اس کی ماں کا وہ بندہ بھی دکھایا۔ جو کالی شال میں اٹک کر رہ گیا تھا۔ اور جس کی وضع کا دوسرا بندہ بنوانے کے لیے فنو نے کئی بار پیسے جمع کیے تھے۔ لیکن ایک بندہ نہ بن سکا تھا۔ کسی نہ کسی ضرورت نے ان پیسوں کو نگل کر فنو کی تپتی ہوئی خواہش کا گلا گھونٹ دیا تھا۔ جیراں کے کانوں میں اس کرزتے بندے کا تصور محض تصور ہی رہ گیا تھا۔ اور اب تو تین بچوں نے جنم لے کر اس کی آمدنی پر صرف ضروریات ہی نے اتنا بوجھ ڈالا تھا۔ کہ بندہ بنوانے کا بھول کر بھی خیال نہ آیا تھا۔

ثومی کتنی ہی دیر اس بے جان بندے کو دیکھتی رہی۔ کتنی جان دار کہانی اس بندے نے کہہ ڈالی۔ ثومی کے تصور میں اس چہرے کے مبہم سے خدوخال ابھرنے ڈوبنے لگے۔ جس پر یہ بندہ کبھی سجا ہو گا۔

ثومی گھٹ کر رہ گئی۔ اس کی شوخیاں مفقود ہو گئیں۔ اس کی ہنسی جامد ہو گئی طبیعت

کا یہ تغیر حیران نے محسوس کیا۔ لیکن بال بچوں اور فکرِ روزگار میں الجھی وہ ثومی کے لیے کچھ بھی تو نہ کر سکی۔

ثومی نے اپنی تمام تر توجہ پڑھائی کی طرف مبذول کر دی۔ اپنی ماں کا خیال اب اس کے ذہن کا ایک مستقل حصہ بن چکا تھا۔ جوں جوں اس کی عمر بڑھتی گئی۔ یہ خیال بھی رنگ بدلتا رہا۔ کبھی اسے اپنی ماں پر بے پناہ پیار آنے لگا۔ اور کبھی اس کے خون کی ایک ایک بوند آگ کا انگارہ بن گئی۔ اس کا جی چاہتا۔ کہیں سے اس بدکار آوارہ اور بدچلن عورت کو ڈھونڈ نکالے اور اپنے خون کی ساری آگ اس پر الٹ کر اسے بھسم کر ڈالے۔

وہ فتو سے اکثر اپنی ماں کے متعلق پوچھتی۔ اس کا حلیہ ذہن نشین کرنے کی کوشش کرتا۔ فتو کو بس اس کا ہلکا سا عکس ہی یاد تھا۔ پورے طرح کیا بتاتا۔ لیکن اس کی باتیں سن سن کر ثومی کے ذہن نے جو بُت تراشا تھا۔ وہ حسین تو تھا۔ لیکن بدکرداری کے داغوں سے سیاہ پڑ چکا تھا۔

وقت کا چکر چلتا رہا۔ یہ چکر چلتا ہی رہتا ہے۔ کبھی نہیں رکتا۔ کبھی بھی نہیں رکتا۔ ازل سے ابد تک چلتا رہے گا۔ اس کے پاؤں میں زنجیر ڈالی جا سکتی ہے۔ نہ راہ میں کوئی رکاوٹ مانع ہو سکتی ہے۔ خوشیوں کے چراغ اور غموں کے مدفن سبھی اس چکر کی لپیٹ میں آ جاتے ہیں۔ یہ دوسری بات ہے۔ کہ بعض خوشیاں دائمی ہوتی ہیں۔ اور بعض غم ازلی۔ وقت کا چکر انہیں لپیٹ میں تو لے لیتا ہے۔ لیکن ان کے تاثر سے مزاحم نہیں ہوتا۔

سلمیٰ اور فریدہ کی اپنی خوشیاں تھیں۔ ثومی اور فرید کے اپنے غم۔ وقت کا چکر چل رہا تھا خارجی دنیا کے ناطے بندھے تھے۔ داخلی دنیا تو ہر ایک کی اپنی تھی۔ فرید کے من میں جو تیاں ٹوٹا کرتی تھیں۔ اس سے سلمیٰ آگاہ تھی نہ فریدہ۔ ثومی کو پتہ تھا۔ نہ کسی اور کو۔

یہی حال ثومی کا تھا۔ اس کے اندر کی دنیا جس جس طرح طوفان آشنا تھی۔ کسے علم تھا کون جانتا تھا۔

میٹرک کے بعد فریدہ نے کالج میں داخلہ لے لیا۔ ثومی کی خواہش بھی تھی۔ اور ضرورت بھی لیکن حیران اور فتو نے مخالفت کی "اس سے زیادہ پڑھائی کی ضرورت نہیں۔"

"میں اپنے پاؤں پر کھڑا ہونا چاہتی ہوں بابا۔" ثومی نے فتو سے لجاجت آمیز لہجے میں کہا۔ لیکن فتو اس بات کی حامی نہ بھر سکا۔ ثومی پریشان ہو گئی۔ کالج کی پڑھائی اور اس کے اخراجات بھلا فتو سے کہاں اٹھائے جا سکتے تھے۔

ثومی دن رات سوچوں میں ڈوبی رہنے لگی۔ ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔ اپنی عزیز ترین سہیلی نگہت سے بھی مشورہ کیا۔ لیکن کچھ سجھائی نہ دیا۔ نگہت خود کونسی مالدار تھی۔ جو اس کی مدد کر سکتی۔ دوسرے دسویں کے بعد اس کی شادی ہونے والی تھی۔ کالج کی تعلیم سے اسے دلچسپی نہ تھی۔

"کہیں نوکری کر لو ثومی" اس نے مشورہ دیا۔

ثومی نے اس کے متعلق بھی سوچا۔ زیادہ سے زیادہ وہ کسی سکول ہی میں نوکری کر سکتی تھی نا۔ لیکن بغیر تربیت کے آجکل سکول کی نوکری بھی ملنا مشکل تھی۔ اس نے اس سلسلہ میں بھی جدوجہد کی۔ لیکن آخرکار اسے یہ فیصلہ کرنا پڑا۔ کہ ٹریننگ لے لو۔ فتو سے اب کچھ کہنا سننا بیکار تھا۔

ثومی نے سلمیٰ اور فریدہ سے اس سلسلہ میں مدد چاہی۔ سلمیٰ سے تو اسے توقع کم ہی تھی لیکن اس کی امید کی شمع فرید کی جانب سے روشن تھی۔ فرید کی نگاہوں میں اس نے ہمیشہ اک نرم سی شفقت آمیز روشنی پائی تھی۔ اپنی بیتی زندگی کے راستوں پر نظر ڈالتی۔ تو اسے اک محبت بھری رہبر صدا کا اپنے گرد پیش احساس ہوتا۔ یہ بے آواز صدا دانستہ بخود فرید سے منسوب کر لینے پر مجبور تھی۔ فرید نے کبھی عملی محبت کا اظہار نہیں کیا تھا۔ لیکن پھر بھی اس کی نظروں میں چھلک جانے والی شفقت کو بیتے سالوں میں کئی بار شدت سے محسوس کیا تھا۔

بچپن کے اس واقعے کو وہ کسی حد تک بھول چکی تھی۔ جب فرید نے اسے تپتی دوپہر میں گاڑی میں بٹھا کر پیار کیا تھا۔ لیکن اس واقعے کی مٹھاس اس کے ذہن میں چپک گئی تھی۔ اس مٹھاس کا احساس جب بھی فرید اس کی طرف پیار سے دیکھتا اسے ہونے لگتا۔

کچھ یہی مبہم مبہم سے ہیولے تھے۔ جن کے سہارے اس نے سلمیٰ اور فرید سے یہ رعایت مانگنے کی سوچی۔

شام ہو رہی تھی۔ فریدہ اور اس کے دونوں چھوٹے بھائی فرید کے دوست احتشام کے ہاں گئے ہوئے تھے۔ سلمیٰ اور فرید ابھی چمن ہی میں بیٹھے تھے۔ ثومی ان کے پاس گئی اور اپنا عندیہ ظاہر کر دیا۔

"دیکھیں گے۔" سلمیٰ نے لاپرواہی سے جواب دیا۔

"صاحب جی" ثومی فرید کی طرف دیکھتے ہوئے گڑگڑائی۔ "مجھے نرسنگ میں داخلہ دلوا دیجئے۔ خواہ ٹیچر ٹریننگ کے لیے بھجوا دیجئے۔ میں آپ کی تمام عمر احسان مند رہوں گی۔ میں اپنے پیروں پر کھڑا ہونا چاہتی ہوں۔ میری اتنی مدد ضرور کر دیجئے۔ خدا واسطے کا کام سمجھ کر میری مدد کیجئے۔"

ثومی کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔ اور فرید کی جو حالت تھی وہ شام کے دھندلکے نہ ہوتے یا سلمیٰ ہی نظر بھر کر اس کا چہرہ دیکھ لیتی۔ تو آج برسوں کا راز اس کرب سے جو فرید کے چہرے پر پھیلا ہوا تھا۔ افشا ہو ہی جاتا۔

ثومی پھر گڑگڑائی۔

فرید نے جرأت مندی سے اس کی طرف دیکھا۔ اور سلمیٰ سے صلاح کرنے کی ضرورت نہ سمجھ کر ایک دم بولا۔

"بہت اچھا۔ تم فکر نہ کرو۔ میں تمہیں داخلہ دلوا دوں گا۔ تمہارا سارا خرچہ میں دوں گا۔"

"اللہ!" ثومی نے فرطِ انبساط سے مغلوب ہوتے ہوئے کہا۔ اس کے منہ سے اور کچھ

نہ نکل سکا۔ وہ فرید کا شکریہ بھی ادا نہ کر سکی۔ اس کی طرف دیکھتی رہ گئی۔ آج اس کی آنکھوں میں خدا جانے بے چین کر دینے والی کون سی کیفیت تھی۔ ثومی نے محسوس تو کی۔ لیکن سمجھ نہ سکی۔

فرید نے ثومی کو ایس وی میں داخلہ دلا دیا۔ اس نے ہوسٹل کا خرچ اس کی فیس اور دیگر اخراجات اس نے فراخ دلی سے ادا کیے۔

سلمیٰ نے کچھ کہنا چاہا بھی تو اس نے یہ کہہ کر اس کا منہ بند کر دیا۔ "اتنی ذہین بچی کو نہ پڑھانا ظلم ہوگا۔ نیکی کا کام ہے بیگم۔"

نیکی کے کام میں سلمیٰ کیا مداخلت کرتی۔ فرید نے ثومی کے لیے چھ جوڑے کپڑے بھی بنوا دیے۔ بستر بھی بنوا دیا۔ چھوٹی موٹی ضرورت کی ہر چیز اسے خرید کر دی۔ سلمیٰ کو پیسے کی کیا پروا تھی۔ دو چار سو خرچ بھی ہو گئے تو کیا۔ ہاں جس لگن سے فرید ثومی کی چیزوں کی تیاری کر رہا تھا۔ اس سے وہ ضرور الجھ رہی تھی۔ جو کچھ بھی تھا۔ وقت گزرتا گیا۔

ثومی نے بخیر و خوبی اپنی ٹریننگ مکمل کر لی۔

اور ــــ فرید کو یوں لگا۔ جیسے اس نے اپنے ضمیر پہ پڑے ہوئے بے پناہ بوجھ کو اتار سا کر لیا ہے۔

ــــ ٭ ــــ

کا نتیجہ توقع سے کہیں بڑھ کر اچھا رہا۔ سبھی نے اسے مبارک باد دی۔

شومی اب تو جیراں بھی خوش تھی۔ اور فتو بھی۔ ثومی نوکری کر کے فتو کا بوجھ سنبھالے گی۔ یہ خوشی کی بات تھی۔ سات بچوں کے بعد آٹھویں کی آمد آمد تھی۔ خرچ اٹھ ہی رہا تھا۔ ثومی کی تنخواہ سے کئی اخراجات پورے ہو سکتے تھے۔

فرید کی وساطت سے ثومی نے کئی سکولوں میں نوکری کے لیے درخواست دے دی۔ فرید اب ہر کام بڑی جرأت سے سرانجام دے رہا تھا۔ اسے پچھتاوہ آ رہا تھا۔ کہ اس نے اس نے اک بے جا سے خوف کی نذر کر کے ثومی کی حق تلفی کی۔ جب وہ رحمت کے لڑکے کو فوج میں نوکر کروا سکتا تھا۔ جمو کے بیٹے کو مل کی ملازمت دلا سکتا تھا۔ خانساماں چھوکرے کو ڈرائیونگ کا داخلہ دلا سکتا تھا۔ تو ثومی کی مدد کیوں نہیں کر سکتا تھا۔ اپنے اس نے خواہ مخواہ کا ہوا کھڑا کر رکھا تھا۔ اس کے چور من نے اپنے لیے ڈراوے بھی خود ہی تخلیق کر رکھے تھے۔ ورنہ کسی کو کیا پتہ ہو سکتا تھا۔ کہ ثومی کو ڈور ڈو ہے۔

چوٹ اک تواتر سے پڑتی رہے تو اذیت کا احساس اس مسلسل فعل سے بدل جاتا ہے۔ اس نے سترہ اٹھارہ برس اک جانکاہ وسوسے کی نذر کیے تھے۔ مسلسل چوٹ کھا کر اپنے گناہ کی سزا بھگتی تھی۔ اس نے ثومی کو کس کس رنگ میں دیکھا تھا۔ گرد اٹھاتے کیچڑ میں لت پت دیکھا تھا۔ چلچلاتی دھوپ اور کڑکتے جاڑے میں نامکمل سے لباس میں سکول آتے جاتے دیکھا تھا۔ فریدہ کی اترنیں پہنتے دیکھا تھا۔ سلمیٰ کی متنفر نگاہوں کا نشانہ بنتے دیکھا تھا۔ اپنے گھر کا بچا کھچا جھوٹا کھانا کھاتے دیکھا تھا۔ فتو مالی کے گھر

بچوں کی خدمت گزاری کرتے دیکھا تھا۔ فریدہ اور سلمیٰ کے مالکانہ حقوق کی چکی میں پستے دیکھا تھا۔ اور یوں دیکھنے کا ایک ایک لمحہ تپتی سلاخ بن کر اس کے ذہن کو داغ کر گزرتا رہا تھا۔

لیکن اب سترہ اٹھارہ برس گزر جانے پر اس کی سوچوں نے پلٹا کھایا تھا۔ ثومی کو بے شک وہ بیٹی کی حیثیت سے قبول نہ کر سکتا تھا۔ لیکن اس کی زندگی بنانے میں معاون بن سکتا تھا۔ اس نے ثومی کو ایس وی کی ٹریننگ دلائی۔ اور اب اس کی نوکری کا بندوبست کر رہا تھا۔

ان باتوں سے فرید کو جتنی خوشی ہوتی اتنی ہی سلمیٰ کو کوفت ہو رہی تھی۔ اس کا زاویۂ نگاہ کچھ اور تھا۔ ڈھلتی عمر کی عورت کی بدظنی کچھ سوا ہی ہو جاتی ہے۔ لاشعوری طور پر وہ اپنی جاتی جوانی سے متاسف ہوتی ہے۔ اٹھتی جوانی اس دور میں نگاہوں میں کچھ زیادہ ہی کھٹکتی ہے۔ ثومی پہلے ہی سلمیٰ کی نظروں کا بار تھی۔ اس پر فرید کی اس میں ایسی دلچسپی۔ اس کی چھٹی حس نے خطرے کا سگنل دکھا دیا۔ فرید کی وفاداری پر شک کی گنجائش نہ تھی۔ پھر بھی اس لڑکی کی قیامت خیز جوانی اور بہاں سوز حسن کو دیکھ کر ایمان متزلزل ہونا کیا بڑی بات تھی۔

ثومی فرید کے تاثرات جانتی تھی۔ نہ سلمیٰ کے ذہن میں پرورش پانے والے خیالات سے آگاہ تھی۔ وہ تو اپنا ہر کام ایمان داری سے کر رہی تھی۔ فتو مالی کے بچوں سے اسے محبت تھی۔ تاہم فرض سمجھ کر ان سے نپٹ رہی تھی۔ فتو مالی کے ہاں ہی وہ پلی بڑھی تھی۔ ان سے انسیت ضرور تھی۔ لیکن جب سے اسے احساس ہوا تھا۔ کہ وہ ان میں سے نہیں ہے زحمت کی ڈوریاں خود بخود ہی کٹ گئی تھیں۔ لیکن جیراں کی محنت اور فتو کی شفقت کا صلہ اس نے دینا ہی تھا۔ اسی لیے اس کے کالے کلوٹے کیڑے مکوڑوں کی طرح رینگتے بچوں کو کھانا پکا کر دینا۔ نہلا دھلا کر سنوارنا بنانا۔ کپڑے دھونا اور ان کے دیگر کام کرنا اس نے اپنے ذمہ لے لیا تھا۔

ہوسٹل میں اس ماحول سے الگ تھلگ رہ کر اس کے خیالات بہت حد تک بدل چکے

سا فریم لگا لیا تھا۔ سب سے علیحدہ اپنے وجود کو کوئی الگ ہی شے متصور کرنے لگی تھی۔ کالی شالی، سونے کا بُندہ اور مالی کے کہنے کے مطابق خوش شکل عورت۔ جب یہ تینوں چیزیں اس کے ذہن میں گھومتیں۔ تو اس گھاؤ میں اسے اپنا پیکر چکر کھاتا ہوا محسوس ہوتا یہ پیکر کبھی عالی شان کوٹھی پر جا ٹھہرتا۔ کبھی ٹوٹی پھوٹی شکستہ دیواروں پر۔ وہ گناہ کی تخلیق تھی۔ گناہ دولت کی سرشاری سے بھی جنم لیتا ہے۔ اور جوانی کے بہکنے سے بھی ہو سکتا ہے۔ اس کا نام نہاد باپ دولت کے نشے میں سرشار ہو۔ اور اس نے اک غریب لڑکی کی عزت کا سودا روپلی سکوں سے کیا ہو۔ یہ بھی ہو سکتا ہے۔ کہ دونوں ہی ایک حیثیت کے ہوں۔ قدم لغزش کھا کر گناہ کی وادی میں لے گئے ہوں۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ دونوں قربت کی آگ سے جل اٹھے ہوں۔ مالی حیثیت دونوں کی اچھی نہ ہو۔ وہ ایسی ایسی باتیں اکثر سوچتی رہتی۔ ان سوچوں ہی سے اس نے اپنے گرد اک انوکھا سا فریم لگا لیا تھا۔ اس فریم کے اندر صرف اس کی ہستی تھی۔ اور بس۔ کسی کو دم مارنے کی مجال نہ تھی۔ حالاں کہ وہ اپنے گرد منڈلانے والے بے رنگ پتنگوں کو دیکھ رہی تھی۔

رحمت کا بڑا لڑکا فوج میں سپاہی تھا۔ وہ جب بھی گھر آتا۔ ثومی کے لیے اس کی نظروں میں عجیب سی مٹھاس ہوتی۔ اور خانساماں کا لڑکا صدیق جو ان دنوں ٹیکسی ڈرائیور تھا۔ اس کی محبت میں ٹھنڈی آہیں بھرتا رہتا تھا۔ پچھلی کوٹھی میں رہنے والا نوجوان لڑکا جس کے بال بڑھے ہوئے تھے۔ اور قلمیں چہرے کے تناسب سے کہیں بڑی تھیں۔ اور جو اپنے اس حلیے سے سولھویں صدی کا پرتگیزی بحری قزاق دکھائی دیتا تھا۔ اس کی راہ تکا کرتا تھا۔

رحمت کے لڑکے سے تو خوف کھاتی تھی نہ پچھلی کوٹھی والے نوجوانوں سے۔ صدیق کی بے باکی سے خائف ضرور تھی۔ صدیق کی جرأت کی وجہ جیراں بھی تھی۔ جس نے اپنے طور سے ثومی کا رشتہ اس کے لیے موزوں کر لیا تھا۔ صدیق ہی کی ایما پر جیراں نے ثومی کے ایس وی کے داخلے پر شور مچایا تھا۔ اور آگے پڑھنے کی مخالفت کی تھی۔

ثومی کوارٹر میں ہوتی تو صدیق جیراں سے باتیں کرنے کے بہانے آ جاتا۔ صبح صبح کام پر جانے سے پہلے تو اس نے یہاں آنا معمول ہی بنا لیا تھا۔ ثومی کے ماتھے پر اسے دیکھتے ہی بل پڑ جاتے۔ اس کا گھورنا ہنسنا پر اپنائیت جتلانا اسے سخت ناگوار گزرتا۔ اور اس کی کسی بھی بات کا جواب نہ دیتی۔ صدیق اسے حسن کی ادا جان کر خوش ہوتا۔

بات یہ نہیں تھی۔ کہ ثومی کی جوانی جنس مخالف کے لیے کشش محسوس نہ کرتی تھی۔ یا اسے محبت کی دلفریبی اور سحر کاری سے انکار تھا۔ ہر جوان لڑکی کی طرح اس کا دل بھی گدگدایا کرتا تھا۔ جاگتی آنکھوں میں حسین خوابوں کا عکس لرزا کرتا تھا۔ بھاری بھاری ہاتھوں کا جانفزا لمس اس نے کئی بار محسوس کیا تھا۔ گھمبیر آواز میں محبت کا اعتراف اس کے کانوں میں بھی کئی بار گونجا تھا۔ لیکن ان بھاری ہاتھوں کے جانفزا لمس اور گھمبیر آواز میں محبت کا اعتراف کرنے والا کون تھا۔ وہ خود بھی نہ جانتی تھی۔

یہ یقیناً صدیق نہیں تھا۔ نہ ہی رحمت کا فوجی بیٹا تھا اور نہ ہی پچھلی کوٹھی والا ترنگیزی بحری قزاق۔ یہ کوئی اور ہی تھا۔ کوئی اور۔ جس کی شکل و صورت سے وہ شناسا تھی۔ نہ اس کی شخصیت سے متعارف۔ پھر بھی جو کوئی بھی تھا۔ اس کی ہستی کے گرد اگرد منڈھے فریم کو چور چور کر کے اس تک آ پہنچتا تھا۔

ثومی کے انگ انگ میں انتظار کی کیفیت ٹوٹتی رہتی تھی۔ وہ اسے نظر نہیں آتا تھا۔ سڑکوں پر، گھر میں۔ فرید کی کوٹھی میں کہیں بھی نظر نہیں آتا تھا۔ فرید کے ہاں بڑی بڑی دعوتوں میں بھی اس نے اسے نہیں دیکھا تھا۔ فتو کے چھوٹے سے کوارٹر میں بھی وہ نہیں تھا۔ پھر بھی وہ اسے سب جگہ محسوس کرتی تھی۔ "اپنے قریب، بہت قریب۔"

دن یونہی گزر رہے تھے۔ کبھی گھٹا ٹوپ اندھیرا اور کبھی قوس قزح کا بکھرا رنگ۔ ثومی کے شب و روز یونہی گزرتے چلے جا رہے تھے۔

اس دن سہ پہر ڈھل رہی تھی۔ آج موسم کچھ بے کیف سا تھا۔ ثومی کو ابھی تک کہیں سے

اپنی درخواستوں کا جواب نہیں ملا تھا۔ معمول کے کاموں سے نپٹ کر وہ فریدہ کے کپڑے استری کر کے ابھی ابھی باغ میں آئی تھی۔ کوٹھی کے ارد گرد پھیلا ہوا یہ وسیع سرسبز باغ کئی کنالوں پر محیط تھا۔ ثومی کا فارغ وقت کسی درخت سے ٹیک لگائے کوئی کتاب پڑھتے یا کالی شال طلائی بندے اور خوش شکل عورت کے چکر یاد ان دیکھے ہاتھوں کے بھاری لمس اور گمبھیر آواز کے تصور میں گزرتا تھا۔ اکثر یہاں بیٹھے بیٹھے وہ گرد و پیش کو بھول جاتی۔ اور اسے ڈھونڈتے ڈھونڈتے جیراں کی بیٹیاں یا بیٹے وہاں آ پہنچتے۔

اس دن بھی وہ گھنے درخت تلے بچھی سبز گھاس پر نیم دراز تھی۔ اس کے ہاتھ میں پکڑی کتاب الٹی پڑی تھی۔ اور وہ گھاس کا تنکا منہ میں ڈالے خیالوں میں گم تھی۔ اس نے فریدہ کے بنا کر دیے ہوئے کاٹن کے کپڑے پہن رکھے تھے۔ اس کے شب دیجور کو لہکاتے سیاہ بال ادھ کھلے اس کی پشت سے لڑھک کر گھاس پر پڑے یوں لگ رہے تھے۔ جیسے کالے ناگوں کے گچھے بکھرے پڑے ہیں۔

"ثومی" پشت سے آواز آئی۔ اس نے جھٹ سے پلٹ کر دیکھا۔ صدیق کھڑا مسکرا رہا تھا۔

"کیوں؟" ثومی ایک دم اٹھ کھڑی ہوئی۔

"ثومی" وہ بڑے پیار سے اسے دیکھتے ہوئے بولا۔

"کیوں، کیا کہنا چاہتے ہو؟ یہاں کیوں آئے ہو۔" ثومی نے ایک ہی سانس میں سوال کر ڈالے۔ صدیق آہستہ آہستہ درخت کے تنے کے سہارے اس کے عین سامنے آ کھڑا ہوا۔ اس کی آنکھیں بھیانک سی چمک لیے ہوئے تھیں۔

"ثومی! میں تجھ سے محبت کرتا ہوں۔" وہ بڑے غیر مہذب انداز میں مسکراتے ہوئے

"بکواس بند کرو۔" ثومی کا چہرہ سرخ انگارہ ہو گیا۔ "شرم نہیں آتی ایسی باتیں کرتے ہوئے"

"شرم کی کیا بات ثومی" اس نے اپنی ٹوپی انگلیاں گھسیڑتے ہوئے بالوں کو کھجلایا۔

"میں اک مدت سے یہ بات تجھے بتانے کی سوچ رہا تھا۔ کبھی موقعہ ملتا۔ تو بات زبان پر نہ آتی۔ اور کبھی بات کہنا شروع کرتا تو موقعہ نکل جاتا۔ آج۔ آج میں نے دل کی بات کہہ ہی ڈالی۔ تم۔ میری جان ہو۔"

"بکو نہیں۔" ثومی کے تن بدن میں جیسے آگ لگ گئی۔ لیکن صدیق تو آج اپنے جذبات کی تسکین کے درپے تھا۔ ہاتھ بڑھا کر ثومی کا بازو تھام لیا۔ ایک ہی جھٹکے سے ثومی نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔

"دیکھو جی۔" صدیق کے کرخت چہرے پر سختی ابھر آئی۔ "یہ ناز نخرے دیکھتے بہت ہو گئی۔ آج نہیں تو کل۔ آخر تو میرے قبضے میں آئے گی ہی نا۔ جیراں چاچی تیرا رشتہ مجھی سے طے کرے گی۔ اتنا اکڑنے کی ضرورت نہیں۔" صدیق نے پھر ہاتھ اس کی طرف بڑھایا۔ ثومی تڑپ کر پیچھے ہٹی۔ صدیق آگے بڑھا۔ ایک ہی جست میں اس نے ثومی کو اپنے اکھڑ بازوؤں میں جکڑ لیا۔

"ذلیل کمینے۔ چھوڑ دے مجھے۔ چھوڑ دے۔" ثومی بن جل کی مچھلی کی طرح تڑپی۔

"پہلے اقرار کر کہ تو میری ہے۔" صدیق نے اپنا چہرہ اس کے چہرے کے قریب کرتے ہوئے سرگوشی کی۔

"ثومی چیخی۔ تو صدیق نے اس کے منہ پہ ہاتھ رکھ دیا۔

"چھوڑ دے۔ مجھے چھوڑ دو۔ کمینے۔ ذلیل۔" ثومی رہائی پانے کی جدوجہد میں تڑپتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

"نہیں چھوڑوں گا۔" صدیق نے اک قہقہہ لگایا۔ لیکن یہ قہقہہ ادھورا ہی رہ گیا۔ ثومی اس کے بازوؤں سے چھٹ کر پرے گری۔ اور وہ گردن پر پڑے مکے کی وجہ سے لڑکھڑا گیا۔

ثومی اور صدیق کی نظر ایک ساتھ ہی مکہ مارنے والے پر پڑی۔ وہ فرید تھا۔

وہ غصے سے کانپ رہا تھا۔ اس کی مٹھیاں بھنچی تھیں۔ اور آنکھوں میں اک غیرت مندانہ
کی غیرت کی آگ ابل رہی تھی۔ صدیق کے سنبھلنے سے پہلے ہی اس نے دو چار اور مکے اس کے
مارے۔ پھر لاتوں سے پیٹ ڈالا۔ ثومی ڈر کر گھبرا کر سہم کر اس کے ساتھ نہ چمٹ جاتی
تو شاید وہ صدیق کو جان ہی سے مار ڈالتا۔

ثومی کو فرید کے ساتھ لپٹتا دیکھ کر صدیق جان بچا کر بھاگ گیا۔

"ثومی۔ میری بچی۔" فرید نے والہانہ انداز میں ثومی کو بازوؤں میں بھر کر چھاتی سے لگا
لیا۔ اس کی یہ حرکت کچھ ایسی برقی سی تھی۔ کہ ثومی اس کے سینے میں جیسے سما ہی گئی۔ لیکن
دوسرے ہی لمحے فرید کے الفاظ اس کے کانوں کی گونج بن گئے۔ دور بچپن کی وادیوں کی
اڑتی دھول میں بھی کچھ یہی گونج سنائی دی۔

اس نے اپنا سر قدرے اٹھا کر فرید کی آنکھوں میں حیرت سے دیکھا۔ اس حیرت میں
اک سوال تھا؟

سوال ——؟ جو فرید سمجھ تو گیا۔ لیکن جواب نہ دے سکا۔ اس نے ثومی سے
نظریں چرا لیں۔ اپنی گرفت سے اسے آزاد کر دیا۔

ثومی اب تک مبہوت سی آنکھوں کی حیرت سے اپنا سوال دہرا رہی تھی۔ فرید کو
احساس ہوا۔ کہ اسے ایسا نہیں کرنا چاہیئے تھا۔ ثومی کے سوال کا جواب وہ نہیں دے
سکتا تھا۔

اس نے ثومی کی سوالیہ نظروں سے بچنے کے لیے قدرے رخ پھیر لیا۔ اور پھر آہستہ
سے بولا:

"تم اکیلی ایسی جگہوں پہ نہ آیا کرو۔ میں نئی کیاریوں کو دیکھنے ادھر نہ آتا۔ تو۔ تو
خبیث —— چلو —— جاؤ —— آئندہ ان اکیلی جگہوں پہ نہ آنا۔" ثومی اپنی بڑی بڑی آنکھوں
میں اپنا سوال سمیٹے آہستہ آہستہ قدم اٹھاتے وہاں سے چلی گئی۔ "ثومی —— میری

بچی!" یہ دو الفاظ اس کے کانوں میں رس ٹپکا رہے تھے۔ فرید دونوں ہاتھوں سے
اپنا کلیجہ پکڑے اسے دیکھتا رہا۔

آج سے فرید سے فرسنی آلام کا نیا دور شروع ہو گیا تھا۔ وہ تو اس بات سے خوش
تھا۔ کہ ثومی پڑھ لکھ کر اپنے پاؤں پر کھڑی ہو رہی ہے۔ اتنا تو اس نے سوچا ہی نہ تھا۔ کہ وہ
جوان بھی ہے اور خوبصورت بھی۔ اور دنیا بھیڑیوں سے بھری پڑی ہے۔

اس رات وہ اک لمحہ بھی نہیں سویا۔ بستر پر مضطربانہ کروٹیں بدلتا رہا۔ اور جب سلمیٰ سو
گئی۔ تو وہ اٹھ کر باہر چلا گیا۔ جہاں چمن میں ٹہلتے اس نے سگریٹ پہ سگریٹ پھونک ڈالے
جہاں گھاس کے فرش پر وہ رب عزوجل کے سامنے سجدہ ریز ہو کر بے تاب ہو ہو کر رویا۔
گڑگڑا گڑگڑا کر اپنے گناہ کی معافی مانگی۔ وہ اپنے کیے کی سزا کافی سے زیادہ بھگت چکا
تھا۔ اس سے زیادہ ستم سہنے کی تو اس میں ہمت تھی نہ طاقت ——

وہ کیا کرے؟ وہ کیا کرے؟ بھیگی آنکھوں اور رندھے گلے سے وہ آسمان کو دیکھتے
ہوئے بڑبڑا رہا تھا۔ اب ثومی کے حال سے زیادہ اس کے مستقبل کی فکر اس کے ذہن پر
مسلط تھی۔ ہیرا یوں سر عام پڑا رہا۔ تو کسی نہ کسی لٹیرے کی نظر اس پر پڑ ہی جائے گی۔

نہیں۔ نہیں۔ وہ اس ہیرے کی حفاظت کرے گا۔ وہ ثومی کو ملو نہیں بننے دے گا۔
نہیں بننے دے گا۔

لیکن سوال پھر یہی تھا۔ کہ وہ کیا کرے؟

کیا سلمیٰ کو ثومی کے متعلق بتا دے؟

یا —— یا —— اس سے آگے اس کی سوچ کی راہیں معدوم تھیں۔

—— ۴ ——

آج موسم کل سے بھی زیادہ بے کیف تھا۔ رُت بدل رہی تھی۔ آسمان پر بھورے بھورے بادل منتشر رہتے تھے۔ لیکن پانی نہیں پڑتا تھا۔ خشک ہوائیں چلتی تھیں۔ جی سے دھول فضا میں بکھر جاتی۔ اور موسم کی بے کیفی میں اضافہ ہو جاتا۔

کل کے واقعے سے پریشان بھی تھی اور متاثر بھی۔ اس کے ذہن میں بھی دھول ہی دھول اڑ رہی تھی۔ صدیق کو تو فرید نے خوب سبق دیا تھا۔ کل مکوں اور لاتوں سے بھرا بھرا تھا۔ اور رات کمرے میں بلا کر بھی جو گت بنائی تھی۔ اس کا ردِ عمل یہی تھا۔ کہ آج وہ جیراں کو سلام کرنے کے بہانے ثومی کو دیکھنے ان کے کوارٹر میں نہیں آیا تھا۔ اور صبح جب وہ فرید کے بلانے پر اپنے گھر سے نکل کر ادھر آ رہی تھی۔ تو صدیق اپنی ٹیکسی لیے باہر نکل رہا تھا۔ ثومی پر اس نے اک خشمناک نگاہ ڈال کر منہ پھیر لیا تھا۔ آج آشارے سے سلام کر کے مسکرانا بھی اسے بھول گیا تھا۔

ثومی کو فرید نے صدیق کی دست درازی سے بچایا تھا۔ وہ بڑا کینہ پرور تھا۔ وہ جانتی تھی۔ اس کی خشمناک نگاہوں نے بھی اس کی کینہ پروری کی تائید کی تھی۔ لیکن اب ثومی کو اس سے قطعاً خوف نہیں آ رہا تھا۔ اسے یوں لگ رہا تھا۔ جیسے وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے محفوظ ہو گئی ہے۔ فرید کی بانہوں کا لمس کل چند لمحوں کا تھا۔ لیکن ثومی کو یوں لگ رہا تھا۔ یہ بانہیں نہیں ایک مستقل حصار ہیں۔ جو اسے ہر خطرے سے محفوظ کر سکتے ہیں۔

ثومی کل سے فرید ہی کے متعلق سوچ رہی تھی۔ فرید جس نے اسے اپنے بازوؤں میں لپیٹ کر اپنے سینے کی پگھلتی حرارت میں سمو لیا تھا۔ جس نے ثومی ۔ میری بچی ۔ "کچھ ا

طرح کہا تھا۔ کہ ثومی کو ان الفاظ میں کوئی انجانی سی مہک اب تک محسوس ہو رہی تھی۔

کیا فرید کا فعل محض شرافت کا دوسرا نام ہے۔ یا اس فعل کے در پردہ غیرت کی للکار تھی یہ سوچتے ہوئے ثومی اپنے آپ سے بار بار یہ سوال کر رہی تھی۔ کہ فرید محض ایک شریف انسان تھا۔ یا اک غیرت مند۔ غیرت مند کے ساتھ جو لفظ وہ چسپاں کرنا چاہتی تھی۔ اس کے پاس اس کی کوئی سند نہ تھی۔ لیکن دل۔ دل اور دل کے تقاضے تو کچھ اور ہی ہوتے ہیں۔

ادھر فرید کو کل کے واقعے نے نڈھال کر دیا تھا۔ رات بھر بے چین رہنے کی وجہ سے طبیعت بے محل تھی۔ وہ دفتر بھی نہ گیا۔ ٹیلیفون پر سیکرٹری کو ضروری ہدایات دے کر بستر میں ہی پڑا رہا۔ صبح سلمیٰ اور فریدہ کے اصرار کے باوجود اس نے ناشتہ بھی نہیں کیا۔

ڈاکٹر کو بلاؤں۔ سلمیٰ کچھ پریشان سی ہو گئی تھی۔

فرید نے نفی میں سر کو ہلا دیا۔ اس کے روگ کو بھلا ڈاکٹر کہاں جان پاتا۔ سائنس ترقی کی انتہا کو چھو رہی ہے۔ سینہ کھول کر دل تبدیل کرنا معمولی کام بن چکا ہے۔ لیکن دل کی دنیا تک انسان کی رسائی اب تک نہیں ہو سکی۔ کوئی ایسا آلہ ایجاد نہیں ہو سکا جو دل پر گزرنے والی قیامتوں کو آئینے کی طرح دکھا سکے۔ سلمیٰ آہستہ آہستہ اس کا سر دبانے لگی۔ فرید کو سکون نہیں ملا۔ ملائمت سے اس نے اپنے ماتھے سے اس کے ہاتھ ہٹا دیئے۔

"مجھے نیند آ رہی ہے سلمیٰ ۔" اس نے آہستگی سے کہا۔ سلمیٰ کی قربت سے اسے خوف سا آ رہا تھا۔ اس نے تو سلمیٰ سے سب کچھ کہہ دینے کا سوچا تھا۔ لیکن بزدلی نے زبان پر تالے ڈال دیئے تھے۔ ندامت سے سر اتنا جھک گیا تھا۔ کہ اٹھانے کی ہمت ہی نہ رہی تھی۔ جرم کرنا آسان ہے لیکن اعترافِ جرم سہل نہیں۔ اس کے لیے تو فولادی ارادے کی ضرورت ہوتی ہے۔

سلمیٰ اٹھ کر باہر آ گئی۔ لان میں بچی۔ ککو خوب اودھم مچا رہے تھے۔ سلمیٰ انہی کی طرف آ گئی۔

"آج چھٹی کا یہ مطلب تو نہیں۔ کہ سارا وقت یونہی کھیل میں گنوا دو۔ چلو چل کر کتابیں لے کر بیٹھو۔"

"ممی! آپ پڑھائیں گی۔" جمی گیند پھینک اس کے قریب آ گیا۔

"چلو تم کتابیں لے کر قریب بیٹھو۔" سلمیٰ نے کہا۔

"آپ سبق بتاتی نہیں ہیں۔ ہم کیا کریں۔ فریدہ باجی بھی نہیں پڑھاتیں۔" گگو نے شاکی لہجے میں کہا۔

"تمہارے لیے کسی استاد کا بندوبست کرنا ہی پڑے گا۔" سلمیٰ بولی۔

"میں پڑھا دیا کروں گی بیگم صاحبہ۔" ثومی گلوں کے درمیان سلمیٰ کی پشت پر بیٹھی عجزیہ انداز میں بولی۔ سلمیٰ نے گھوم کر اسے دیکھا۔

"ہاں ممی۔ ہم ثومی باجی سے پڑھا کریں گے۔" دونوں بچے ثومی کے پاس آ گئے۔

"ضرور۔ ضرور۔ میں فارغ ہی ہوتی ہوں نا۔ آپ کو پڑھا دیا کروں گی۔" ثومی نے خدمات پیش کیں۔

سلمیٰ نے اس کی طرف غور سے دیکھا۔ نوکروں میں پل بڑھ کر بھی اس لڑکی نے اپنے شائستہ اطوار سیکھ لیے تھے۔ جب سے ہوسٹل سے واپس آئی تھی۔ کپڑے لتے کا بھی خیال رکھتی تھی۔ گو فریدہ کی طرح اس کے پاس جدید فیشن کے لباس تو نہ تھے۔ تاہم صاف سے سوتی کپڑے صاف ستھرے پہنتی تھی۔ اس سادگی میں بھی بلا کی پروقار نظر آتی تھی۔ گلوں میں گھری ہلکے گلابی کپڑوں میں وہ مہکتا ہوا پھول لگ رہی تھی۔ بال کتنے چمکیلے اور نفیس تھے۔ چہرے پر کتنی شگفتگی تھی۔ جھونپڑوں میں رہنے کے باوجود محلوں کی مکین لگتی تھی۔

جمی اور گگو نے ثومی کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ لیا۔ وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ سلمیٰ اک ٹک اسے تکے جا رہی تھی۔

"آپ اجازت دیں تو انہیں میں روز پڑھایا کروں بیگم صاحبہ۔"

"اجازت کی کیا بات ہے۔ بیکار ہی ہو آجکل۔ پڑھا دیا کرو۔ جب تمہیں نوکری مل گئی۔ تو ہم کسی اور استانی کا بندوبست کر لیں گے۔"

سلمیٰ کا لہجہ اتنا کاروباری اور سپاٹ تھا۔ کہ ثومی کو دکھ سا ہوا۔ سلمیٰ کا رویہ اس کے ساتھ ہمیشہ ہی سرد مہری کا ہوتا تھا۔ اور اندر ہی اندر دکھ کا احساس ثومی نے ہمیشہ ہی کیا تھا۔

ماں کی اجازت ثومی کو اندرون خانہ گھسیٹنے لگے۔

"شور نہیں مچاؤ۔" سلمیٰ نے انہیں ڈانٹا۔ "تمہارے ڈیڈی کی طبیعت ٹھیک نہیں۔ وہ سو رہے ہیں۔ اس لیے شور نہیں مچانا۔"

ثومی فرید کی طبیعت کی ناسازی کا سن کر خدا جانے کیوں بے چین سی ہو گئی۔ اس نے سلمیٰ سے اس کے متعلق تفصیل سے پوچھنا چاہا۔ لیکن سرد مہری نے جرأت نہ دلائی اس کا کتنا جی چاہا۔ کہ فرید کے بیڈ روم میں جا کر اس کی احوال پرسی کرے۔ اس کا سر سہلائے اس کے پاؤں دبائے۔ لیکن خواہشیں گھٹ نہ جائیں۔ تو ان میں تندی اور شدت کا احساس بھی نہ ہو۔

شام فریدہ اپنی سہیلیوں کے ساتھ پکچر پر گئی۔ سلمیٰ کو ہسپتال اپنے کسی عزیز کی احوال پرسی کے لیے جانا پڑا۔

ثومی دونوں بچوں کو گھنٹہ بھر پڑھا کر ان کے کمرے سے نکلی۔ دونوں بچے اس سے پہلے ہی مانوس تھے۔ فریدہ تو بڑا ایسے دبے رہتی تھی۔ لیکن دونوں بچے ابھی اپنی اور اس کی حیثیت کی حد بندی سے آشنا نہ تھے۔ خلوص اور محبت کی کشش واضح طور پر محسوس کر سکتے تھے۔ اس لیے ثومی سے مانوس تھے۔

فریدہ اور سلمیٰ گھر پہ نہیں تھیں۔ ثومی فرید کے کمرے کے قریب سے گزری تو بے اختیار اس کا جی چاہا۔ کہ اندر جا کر فرید کی احوال پرسی کرے۔ لیکن وہ اپنی کم ہمتی کے ہاتھوں ایسا نہ کر سکی۔ کیا عجب فرید آج اسے منہ ہی نہ لگائے۔ ایسے ایسے کئی تجربے اس کی عمر کے سوکھے پھیکے سالوں پر پھیلے تھے۔

وہ سوچتے ہوئے آگے بڑھ گئی۔ بیرونی برآمدے کی طرف آئی لیکن برآمدے کی پہلی سیڑھی پر قدم رکھا ہی تھا۔ کہ بیرونی گیٹ سے اندر آنے والی کریم کلر کی ویگن پورچ میں آ کر رک گئی۔ ثومی رک کر اسی طرف دیکھنے لگی۔ گاڑی کا دروازہ کھلا اور ایک اونچے قد کا خوب رو نوجوان باہر نکلا۔ گاڑی بند کرتے ہوئے اس نے ثومی کو دیکھا۔ اور پھر دوسرے لمحے گاڑی بند کر کے اس کی طرف آ گیا۔ ہاتھ کے اشارے سر کی جنبش اور ہونٹوں کے خفیف سے تبسم سے اس نے ثومی کو سلام کیا۔

ثومی اس عنایت سے گھبرا گئی۔ وہ پیچھے لوٹ جانے کو تھی۔ کہ وہ بولا۔ "سنیئے۔" ثومی رک کر اس کی طرف دیکھنے لگی۔

"مجھے آپ کے والد صاحب سے ملنا ہے۔" وہ شائستگی سے بولا۔

"جی۔" "میرے۔ والد۔" ثومی پر گھبراہٹ کا دورہ سا پڑا۔ حیران نظروں سے اجنبی کو دیکھتے ہوئے رک رک کر بولی۔

نوجوان کو اپنے الفاظ کی غلطی کا احساس ہو گیا۔ جلدی سے بولا۔ "اوہ۔ معاف کیجئے گا۔ مجھے فرید صاحب سے ملنا ہے۔"

"وہ میرے والد۔۔۔ نہیں۔ فریدہ کے ڈیڈی ہیں۔" ثومی نے انتہائی معصومیت سے کہا۔ اس کے چہرے پر بے چارگی کے دھندلکے پھیل گئے۔ اور آنکھوں میں زخم خوردہ کا احساس تڑپ اٹھا۔

نوجوان نے اس کی جانب دیکھا۔ جھجک کر نظریں ہٹا لیں۔ لیکن پھر نگاہیں اس کی خوبصورت کشادہ آنکھوں کی زخم خوردہ تڑپ پر جما دیں۔

لمحے گزر جاتے ہیں تو بھول جاتے ہیں لیکن بعض لمحے اپنی اہمیت منوانے کے منتظر رہتے ہیں۔ دونوں کی نگاہیں ملتے والا لمحہ شاید صدیوں سے منتظر تھا۔ خاموشی سے

گئی۔ اور نوجوان نے سر جھکا لیا۔ اس کے بعد جتنے لمحے بھی گزرے وہ رقص کناں تھے۔

"فرید صاحب گھر پر ہی ہیں نا" نوجوان قدرے سنبھل کر بولا۔

"جی۔" ثومی کے حواس اب تک متاثر تھے۔

"اطلاع کر دیجئے۔ میں نے ان سے ملنا ہے۔" نوجوان نے گھمبیر آواز میں کہا۔

اس آواز سے ثومی چونک گئی۔ یوں لگا جیسے یہ آواز بارہا سنی ہو۔

"تکلیف دہی کے لیے معذرت خواہ ہوں۔" نوجوان بولا۔ "کوئی ملازم بھی تو نظر نہیں آ رہا۔ آپ ہی انہیں مطلع کر دیجئے۔"

"جی۔ اچھا۔ اچھا جی۔" ثومی پلٹی۔ لیکن چند قدم اٹھائے تھے کہ نوجوان کو ڈرائنگ روم میں بٹھانے کا خیال آیا۔

"آپ ڈرائنگ روم میں بیٹھیے۔ میں انہیں اطلاع دیتی ہوں۔" ثومی نے آہستگی سے کہا۔

نوجوان نے سر اثبات میں قدرے خم کیا۔ اور ثومی سے دو قدم پیچھے چلتا ڈرائنگ روم میں آ گیا۔

"شکریہ" اس نے ثومی کی طرف دیکھ کر کہا۔

"میں ابھی آتی" کہہ کر وہ کمرے سے نکل گئی۔

فرید اپنے کمرے ہی میں تھا۔ ثومی کا دل اندر جانے سے قبل بے ہنگم طریق سے دھڑک رہا تھا۔

"آ جاؤ۔" اس کی اجازت طلب کرنے پر فرید نے لیٹے لیٹے جواب دیا۔

ثومی نے محبت سے فرید کو دیکھا۔ ایسی محبت جس میں اک تابعدار بیٹی کی عقیدت کا رنگ نمایاں تھا۔

"کیوں؟" فرید نے اس کے سراپا پر نظر ڈال کر گہری سانس لی۔

"کوئی صاحب آپ سے ملنے آئے ہیں۔" ثومی اس کی احوال پرسی کو کچھ بھی نہ سمجھا۔

"کون ہے۔"

"جی پتہ نہیں۔"

"نام نہیں پوچھا۔"

"جی نہیں۔"

"کہاں ہیں وہ۔"

"ڈرائنگ روم میں بٹھایا ہے۔"

"نام تو پوچھ لیا ہوتا۔"

"خیال نہ رہا تھا جی۔" اب پوچھ آؤں۔"

"نام کے ساتھ کام بھی پوچھ لینا۔" میری طبیعت ٹھیک نہیں۔" فرید کے تاثر چہرے پر اب بھی تشویش و تفکر کے سایے رینگ رہے تھے۔

"آپ کو بخار ہے صاحب جی۔" ثومی نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

فرید نے آنکھیں بند کر کے سختی سے میچ لیں۔ اس کے ماتھے پر ننھی ننھی شکنیں آئیں۔ یوں جیسے ثومی کی بات سے اسے انتہائی اذیت پہنچی ہو۔

ثومی حیران سی اسے دیکھنے لگی۔ لیکن فرید نے اسے مبتلائے تجسس نہیں رکھا آنکھیں کھول دیں۔ کروٹ بدل کر اس کی طرف رخ کیا۔ اور مسکرانے کی کوشش میں

"تمہارے فکر نے نڈھال کر دیا ہے۔ صندلی نے پہلے بھی کبھی ایسی جرأت کی تھی۔"

"جی نہیں۔" ثومی سہم کر بولی۔ فرید کی بات سے ایک بار پھر اس کے ذہن میں لگا۔ فرید۔ فرید کون ہے؟ اس کے ذہن میں یہ سوال چیخ اٹھا۔ اس چیخ کی گونج شاید فرید نے بھی سن لی۔ ثومی کی نگاہوں میں کل والا سوال پھر پھیل رہا تھا۔

سوال! جس کا جواب تو اس کے پاس تھا لیکن جواب دینے سے وہ قاصر تھا۔

"جاؤ۔ پوچھ کر آؤ کون ہے۔" فرید کا لہجہ ایک دم بدل گیا اور ثومی کے قدم پلٹ گئے۔ وہ دھیرے دھیرے قدم اٹھاتی ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی۔

اسے دیکھتے ہی نوجوان مؤدبانہ اٹھ کھڑا ہوا۔ ثومی کا چہرہ اب پہلے سے زیادہ پریشان نظر آ رہا تھا۔ کھوئی کھوئی سی اس سے نام اور کام پوچھنے لگی۔

"میں ڈاکٹر کلیم ہوں۔ فرید صاحب کی ساتھ والی کوٹھی، سنا ہے کرائے کے لیے خالی ہے۔ میں اسی سلسلے میں ان سے ملنا چاہتا تھا۔"

ثومی نے فرید کو پیغام دے دیا۔ فرید نے کلیم کو اپنے کمرے ہی میں بلا بھیجا۔

"چلیے صاحب۔" نوجوان نے بے تکلفی سے کہا۔ اور اس کے دو قدم پیچھے مہذب انداز سے چلنے لگا۔ ثومی کمرے سے نکلی۔ طویل برآمدے کے آخری سرے پر فرید کا کمرہ تھا وہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی نوجوان کے آگے آگے چل رہی تھی۔ نوجوان کے بھاری بھاری قدموں کی چاپ اسے کسی طلسماتی نغمے کی طرح لگ رہی تھی۔ اسے فرید کی باتوں سے جو پریشانی ہوئی تھی ختم ہو گئی تھی۔

رات اس کے خواب بڑے ہی روپہلے تھے۔ لمحے کے چرکے میں بڑی ہی لذت آمیز کسک ہو رہی تھی۔ وہ نوجوان کے متعلق سوچ رہی تھی۔ اس کو محسوس کر رہی تھی۔ اس کی آواز سن رہی تھی۔ آج پہلی بار اس کوارٹر کے تاریک سے گوشے میں پڑی چارپائی پر سونے میں لطف آیا تھا۔ موسم کی بے کیفی یک لخت ختم ہو گئی تھی۔ اور چاروں اور نغمہ بار ہواؤں کے جھولنے کا احساس ہو رہا تھا۔ صبح تک وہ اس اجنبی کے بارے میں اتنی بار سوچ چکی تھی کہ وہ اجنبی نہیں لگ رہا تھا اسے یوں لگ رہا تھا۔ جیسے وہ اجنبی اس کی ہستی کے گرد اگرد بندھے زمیں کو توڑتا اس تک آ پہنچا تھا۔ یہ وہی تھا جس کا لمس وہ اکثر محسوس کرتی تھی۔ جس کی گمبھیر آواز وہ اکثر سنتی تھی۔ اجنبی آ گیا تھا۔ اجنبی! جس کا اسے مدتوں سے انتظار تھا۔

ڈاکٹر

کلیم اٹھائیس تیس برس کا وجیہہ، باوقار اور خوب رُو نوجوان تھا۔ حال ہی میں اس کا تبادلہ اس شہر میں ہوا تھا۔ ایک دوست کی وساطت سے فرید کے ساتھ والی خالی کوٹھی کا پتہ چلا۔ تو وہ اس سلسلہ میں مزید گفت و شنید کے لیے فرید سے ملنے چلا آیا۔

کلیم کو اپنے پیشے سے والہانہ لگاؤ تھا۔ تین چار سال باہر گزار کر اپنی علمی تشنگی بجھائی۔ خدمتِ خلق کا جذبہ دل میں تڑپ بن کر رہتا تھا۔ اپنے ملک کے غریب عوام کی خدمت کی لگن اس کے دل میں بدرجۂ اتم تھی۔ اس نے ہمیشہ اس پیشے کے وقار اور عظمت کو پیسے پر ترجیح دی تھی۔ خاندانی اثاثہ کافی تھا۔ اس لیے اسے دولت کی ہوس نے کبھی نہیں گھیرا تھا۔ بیوہ ماں کا ایک ہی ایک بیٹا تھا۔ ماں کو ہر ماں کی طرح اس کے سہرے کے پھول دیکھنے کی جلدی تھی۔ لیکن اب تک وہ اپنے پیشے میں کچھ اس طرح جذب تھا۔ کہ ماں کی خواہش پورا نہ ہو سکی تھی۔ اچھے اچھے گھروں کی خوبصورت لڑکیاں۔ ہم پیشہ لڑکیاں۔ ملاقاتی لڑکیاں مریض لڑکیاں ایسی ایسی کئی لڑکیاں ماں کی نظروں میں تھیں۔ لیکن کلیم نے اس سلسلے میں سے کبھی سنجیدگی سے بات ہی نہیں کی تھی۔

کلیم کو طب کے ساتھ ساتھ علم نفسیات سے بھی دلچسپی تھی۔ وہ اس کا مطالعہ کرتا رہتا تھا۔ اب تو وہ اس نتیجے پر پہنچ چکا تھا۔ کہ اچھا ڈاکٹر بننے کے لیے نفسیات کا مطالعہ اشد ضروری ہے۔ اس علم کو جانے بغیر اس کے خیال میں ڈاکٹری کی وقیع تعلیم ادھوری تھی۔ وہ جب کسی مریض کو دیکھتا۔ تو اس کا نفسیاتی تجزیہ بھی کرتا۔ اس طرح سے پیچیدہ

سے پیچیدہ ناقابلِ فہم بیماریوں کا بھی سراغ اسے مل جاتا۔ صحیح تشخیص سے علاج بھی صحیح ہوتا۔ یوں کلیم دستِ شفا والا ڈاکٹر مشہور ہو گیا تھا۔

پہلی ہی ملاقات میں فرید کلیم سے بڑا مرعوب و متاثر ہوا۔ اس کا مہذب اندازِ نشست و برخاست، شائستہ گفت گو اور دل کش شکل و صورت دوسروں کو متاثر کرنے کو کافی تھے۔ کرائے کی کوٹھی کی بات ہوئی۔ تو فرید نے بخوشی کوٹھی اسے دینا منظور کر لی۔

"شکریہ" کلیم اپنا ایک بہت بڑا مسئلہ حل ہوتے دیکھ کر بولا۔

"مجھے خوشی ہوگی۔ کہ آپ ہمارے ہمسائے بنیں گے۔"

"میں ایک بات کی وضاحت ضروری سمجھتا ہوں۔ تاکہ بعد میں کوئی اعتراض پیدا نہ ہو۔"

"فرمائیے۔" فرید تکیے کے سہارے بیٹھتے ہوئے بولا۔

"میں کوٹھی کے بیرونی حصے میں اپنا کلینک کھولوں گا۔" کلیم نے کہا۔

"کوئی ہرج نہیں۔" فرید نے اپنی کنپٹیوں کے سفید بالوں کو سہلاتے ہوئے کہا۔

"جی! یہ میں پہلے عرض کر دینا ضروری سمجھتا تھا۔ مریض آئیں گے۔ جائیں گے۔ اگر آپ پسند نہ کریں۔ تو۔"

"ایسی ناپسندیدگی کی کوئی وجہ نہیں۔"

"شکریہ۔ بہت بہت شکریہ" کلیم نے کہا۔ اور پھر کرائے کے متعلق بات چیت ہونے لگی۔ تفصیلات طے کرنے کے بعد کلیم اٹھا۔

"بیٹھو برخوردار۔ کچھ چائے پانی۔"

"جی شکریہ۔" کلیم نے معذرت کے انداز میں کہا۔ "مجھے بہت سے کام کرنا ہیں۔"

"فیملی بھی ساتھ ہوگی۔"

"مختصر سی فیملی ہے" کلیم مسکرایا۔ "ایک میں اور ایک میری امی۔ بس۔"

فرید نے مسکرا کر اسے دیکھا۔

کلیم کو بھی فرید کی شخصیت نے متاثر کیا۔ کچھ اس کی ناسازیٔ طبع کی بھی بات چیت ہوئی تھی۔ کلیم نے اس کی باتوں کے پسِ پردہ کچھ الجھاؤ سے محسوس کر لیے تھے۔

فرید نے بھی ہنس کر کہا تھا۔ "ڈاکٹر صاحب ایک مریض تو آپ کو ہر وقت ہی تنگ کیا کرے گا۔"

"آپ کی خدمت میرا فرض ہوگی فرید صاحب۔" کلیم نے بھی شائستگی سے جواب دیا تھا۔

کلیم نے ذہنی سکون اور جسمانی آرام کے لیے دو ایک دوائیاں بھی اس کے لیے تجویز کر دیں۔ تو وہ بڑی اپنائیت سے بولا۔ "دیکھا جائیگا ڈاکٹر صاحب اب تو آپ ہمارے قریب ہی رہیں گے۔ جب ضرورت پڑی بلا لیا۔ یا خود چلے گئے۔"

"جی ضرور۔ ضرور۔" کلیم اجازت لے کر چلا گیا۔

رات وہ پھر آیا۔ فریدہ بھی گھر پر تھی اور سلمیٰ بھی۔ نئے کرایہ دار سے غائبانہ تعارف فرید کرا ہی چکا تھا۔ سلمیٰ بھی اس خوش پوش نوجوان سے متاثر ہوئی۔ فریدہ بھی اس سے ملی۔ وہ بھی تپاک سے پیش آیا۔

فرید تو کلیم سے سرسری گفت گو کر پایا تھا۔ لیکن سلمیٰ عورت تھی۔ اپنی فطرت سے مجبور تھی۔ بیٹھے بیٹھے اس پر کئی سوال داغ دیے۔

"کہاں کے رہنے والے ہو۔ کب میڈیکل کیا۔ کہاں کہاں نوکری کی۔ بہن بھائی کتنے ہیں ماں باپ کیا کرتے تھے۔"

"امی آپ کیا ڈاکٹر صاحب کو بور کر رہی ہیں۔" فریدہ نے مسکرا کر ماں کو ٹوکا تھا۔

"نہیں۔ نہیں۔ ایسی تو کوئی بات نہیں۔" کلیم نے بڑی شائستہ سی مسکراہٹ سے فریدہ کو دیکھ کر کہا۔ "ہماری امی کی بھی یہی عادت ہے۔ میں ایسی باتوں سے مانوس ہوں۔"

"شادی وادی ہو گئی۔" سلمیٰ نے تجسس سے پوچھا۔

"جی نہیں۔ ابھی یہ شرف حاصل نہیں ہوا۔" کلیم نے نگاہیں جھکا کر شوخی سے

سلمیٰ کو یک گونا مسرت ہوئی۔ اور فریدہ کو بھی جیسے ہر طرف خوشبو ہی خوشبو پھیلی محسوس ہوئی۔

"آپ پڑھتی ہیں۔" کلیم نے فریدہ کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

"جی۔ تھرڈ ایر میں ہوں۔"

"آرٹس۔"

"جی"

"آپ کا پسندیدہ مضمون کونسا ہے۔"

"سائنس کا جی۔"

"بہت خوب۔ بڑا دلچسپ مضمون ہے۔ میں خود اس مضمون کا طالب علم ہوں۔" فریدہ کو ڈاکٹر کا بے تکلفانہ اندازِ گفت کو بیحد اچھا لگا۔

کچھ دیر ادھر ادھر کی باتیں ہوا کیں۔ سلمیٰ اور فرید نے بھی فریدہ اور کلیم کی باتوں میں حصہ لیا۔ فریدہ کچھ بن بن کر، کچھ تکلف میں تصنع کا رنگ بھر بھر کر باتیں کر رہی تھی۔ کلیم کی باتیں قل قل کرتا پہاڑی چشمہ تھیں۔ صاف شفاف، نکھرا ستھرا۔ لہجہ۔ تصنع تھا نہ تکلف۔ اس کی دل آویز شخصیت اس لہجے سے مسحور کن ہو جاتی تھی۔

وہ فرید سے کوٹھی کی صفائی وغیرہ کے متعلق بات کرنے آیا تھا۔ اسے دیکھنا بھی تھا شام تو سرسری گفت و گو ہوئی تھی۔

کلیم نے فرید سے چابی مانگی۔ "صبح دیکھ لیتے۔"

"صبح مصروفیت ہوتی ہے۔ صرف ایک نظر دیکھنا ہے۔ قلعی وغیرہ تو آپ نے کرانا ہو چکی ہے۔"

"ہاں۔ وہ تو ہم کرایہ دار کے خالی کرتے ہی کروا دیتے ہیں۔" سلمیٰ نے کہا۔ "رنگ روغن قلعی۔ ہر طرح کوٹھی ٹھیک ٹھاک ہے۔ ویسے کل میں جھاڑو پونچھ کروا دوں گی۔"

"شکریہ۔" کلیم نے قدرے سر کو خم کرتے ہوئے کہا۔ فریدہ کو اس کے سر کا یوں جھکاؤ

بہت ہی اچھا لگا۔

سلمیٰ اور فریدہ کلیم کے ساتھ کوٹھی دکھانے گئیں۔ جب وہ تینوں کوٹھی کے اندرونی راستے سے بجری کی سڑک پر ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ تو ثومی کی نگاہیں ان کا تعاقب کر رہی تھیں۔ کلیم کا اونچا قد نمایاں تھا۔ اور درختوں کے اندھیرے سایوں میں بھی وہ چلتا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔

سلمیٰ نے ایک ایک کمرہ کھول کر کلیم کو دکھایا۔ فریدہ کو کوٹھی سے دلچسپی نہ تھی کلیم کے ساتھ چلتے ہوئے اسے اچھا لگ رہا تھا۔ کلیم کی باتیں بھی بڑی دلچسپ تھیں۔ وہ خشک مزاج یقیناً نہیں تھا۔ پھولوں کی سی شگفتہ طبیعت والا نوجوان تھا۔

کلیم کو جیسی جگہ مطلوب تھی۔ یہ کوٹھی بالکل ایسی ہی تھی۔ بیرونی حصہ کلینک کے لئے استعمال ہو سکتا تھا۔ اور پچھلے تین کمرے رہائش کے لیے کافی تھے۔

"تین کمرے رہائش کے لیے کم نہ ہوں گے۔" فریدہ نے کہا۔ "کم از کم چار تو ہونا چاہئیں۔"

"تین چھوڑ دو بھی کافی تھے۔" کلیم نے مسکرا کر کہا۔ "اور دو نہ ہوتے تو ایک میں بھی گزر ہو جاتی۔ اماں اور میں دو ہی فرد تو ہیں۔ بیوی بچوں کا جھمیلا تو ہے نہیں۔"

"ہاں ہاں ٹھیک کہہ رہے ہیں آپ۔" سلمیٰ نے کہا۔ "بیوی ہوتی تو البتہ مسئلہ تھا۔"

"شکر ہے نہیں۔ ورنہ۔ اچھی بھلی جگہ مل گئی ہے۔ محترمہ ناپسند فرما دیتیں۔" کلیم نے شوخی سے فریدہ کی طرف دیکھ کر کہا۔ اور فریدہ نہ جانے کیا سمجھ کر جھینپ گئی۔

رات سب نے زبردستی کلیم کو کھانے پر روک لیا۔ ککو جمی تو پہلی ملاقات میں ہی اس کے دوست بن گئے۔ ایسی بے تکلفی سے اس سے ملے اور باتیں کیں۔ جیسے برسوں کی جان پہچان ہو۔

"انہیں زیادہ لفٹ نہ دیں۔" فریدہ نے کلیم سے کہا۔

"کیوں؟" کلیم جمی کے بال سہلاتے ہوئے بولا۔

"تنگ کیا کریں گے آپ کو۔ چوبیس گھنٹے ادھر ہی گھسے رہا کریں گے۔"

"میں ادھر آنے والوں کا خوش دلی سے خیر مقدم کیا کروں گا۔" فریدہ کو یوں لگا جیسے کلیم نے یہ جملہ اس کے لیے استعمال کیا ہے۔

فریدہ، سلمیٰ اور فریدہ کا شکریہ ادا کرنے کے بعد کلیم نے اپنے ننھے دوستوں سے ہاتھ ملایا۔

"کل ملاقات ہو گی۔" وہ ان سے جھک کر کہنے لگا۔

بچے خوشی سے جھوم گئے۔

"کل صبح میں سامان بھجوا دوں گا۔ شاید خود نہ آسکوں۔ بہرحال امی آجائیں گی۔" کلیم نے چلتے چلتے کہا۔

"فکر نہ کرو یہاں۔ ہمارے ہاں نوکروں کی فوج کس دن کے لیے ہے۔" فریدہ نے بے تکلفی سے کہا۔

"بیگم کل ذرا آپ کی امی کا ہاتھ بٹائیے گا۔"

"کیوں نہیں۔" سلمیٰ خوشی سے بولی۔

کلیم ان لوگوں کے خلوص اور تپاک سے بڑا متاثر ہوا۔ "اچھے ہمسایے رحمت کے سایے۔" اس نے یہ جملہ اپنی امی سے اکثر سنا تھا۔ آج اس جملے کی حقیقت اس کی سمجھ میں آگئی تھی۔ وہ خوش تھا۔ اہل خانہ بھی خوش تھے۔ خوشی کا اظہار چہکتی گفتگو سے بخوبی ہوتا تھا۔

جب وہ سب کو سلام کر کے بچوں کو ہاتھ کے اشارے سے گاڑی میں بیٹھتے ہوئے ہلہلہ کر کے خوشی کا اظہار کر رہا تھا۔ اور فریدہ نگاہِ شوق کو سمیٹ سمیٹ کر اس کی جانب تکے جا رہی تھی۔ ثومی عشق پیچاں کی گھنی بیلوں کے پیچھے کھڑی اسے دیکھ رہی تھی تیز برقی روشنی میں اس کا خوبصورت پیکر نگاہوں میں جذب کر رہی تھی۔

"گھر تو ٹھیک ٹھاک ہو گیا۔ اب تو آپ فارغ ہی ہیں۔"

"امی تو فارغ ہی فارغ ہیں۔ میرا کلینک کا کام ابھی باقی ہے۔ ابھی آٹھ دس دن اور لگ جائیں گے۔ بہرحال بہت بہت شکریہ۔ آپ نے امی اور میرا جس طرح ہاتھ بٹایا۔ میں آپ کے خلوص کی ——"

"اوہو۔ ایسی تکلفاتی باتیں۔ کلیم صاحب میں تو سمجھ رہی ہوں۔ جیسے میرے قریبی عزیز اس گھر میں آن بسے ہوں۔"

"سلمیٰ بہن اس نوازش کا شکریہ۔ میں یہی دعا کرتی ہوں۔ جہاں بھی جگہ ملے نیک ہمسائے ہی ملیں۔ پردیس کا معاملہ ہوتا ہے۔ یہاں تو آپ ہی ہمارے عزیز ہیں۔ بہن بھائی ہیں۔ آپ نے اتنے دن کھانا بھجوانے کی بھی تکلیف کی۔ اب سب ٹھیک ہو گیا ہے۔ باورچی خانہ بھی ٹھیک کر لیا ہے نتھو نے۔ بس اب تکلیف نہ کیجئے گا۔ کھانا بھجوانے کی۔"

"ویسے بڑی زیادتی ہے۔ مسلسل آٹھ دن ہم آپ کے مہمان رہے۔"

"مجھے تو اس بات سے بڑی ہی خوشی ہوتی۔ آپ خواہ مخواہ کتنے تکلف کر رہے ہیں۔ کھانے کی کیا بات ہے۔ انسان تو خلوص کا بھوکا ہوتا ہے۔"

کلیم کے چھوٹے سے ڈرائنگ روم میں سلمیٰ اور اس کی کھچڑی بالوں سفید چہرے اور بھاری جسم والی امی بیٹھی تھیں۔ آٹھ دنوں میں دونوں ایک دوسرے کے بہت قریب آ گئی تھیں۔ کلیم کی امی بھی خوش خلق، خدا ترس اور نیک سیرت خاتون تھیں۔ سلمیٰ نے بھی ان کی آؤ بھگت میں جس ظرف کا مظاہرہ کیا تھا۔ وہ قابلِ قدر تھا۔ آٹھ دن سے دونوں وقت

کا کھانا اور چائے بھجوا رہی تھی۔ کلیم اور اس کی امی نے بار بار منع بھی کیا تھا لیکن وہ نہ مانی تھی گھر درست کرنے میں بھی کلیم کی ماں کا ہاتھ بٹایا تھا۔ ڈرائنگ روم کی سیٹنگ تو خود فریدہ نے کی تھی۔ کلیم کے سونے کا کمرہ بھی اسی نے ترتیب دیا تھا۔ آٹھ دن میں وہ کئی پھیرے یہاں مار چکی تھی۔ کلیم کے ساتھ اس نے کافی وقت گزارا تھا۔ کلیم کھل کر باتیں کرنے۔ چھوٹے چھوٹے چٹکلوں سے ہنسنے ہنسانے والا خوش باش نوجوان تھا۔ فریدہ نے اس کی قربت میں پسندیدگی کی کئی منزلیں طے کر لی تھیں۔

کلیم کی ماں کو بھی فریدہ بہت پسند آئی۔ اتنی فیشن ایبل ہونے کے باوجود وہ گھر داری کا سلیقہ جانتی تھی۔ دل ہی دل میں انہوں نے فریدہ کو اک خاص انداز میں نوازا۔ اور دل ہی دل میں سلمیٰ نے کلیم کو پسند کر کے فریدہ کا مستقبل اس عظیم نوجوان سے وابستہ کرنے کا سوچ لیا۔ اس کے خلوص۔ اس کی نوازشوں کے پس پردہ یہی خواہش تھی۔ وہ کلیم اور اس کی ماں کو اچھے سے اچھا تاثر دینا چاہتی تھی۔

بات یہ نہ تھی۔ کہ فریدہ کے لیے رشتوں کی کمی تھی۔ امیر باپ کی خوبصورت بیٹی کے لیے رشتہ ملنا مسئلہ نہیں ہوا کرتا۔ لیکن سلمیٰ کی چھان بین والی طبیعت نے ابھی تک کسی کو نہیں نوازا تھا۔ قیصر اسے پسند تھا۔ لیکن اس کی اکڑ خانی اسے گوارا نہ تھی۔ فاروق اچھا لڑکا تھا۔ کچھ عرصہ تک ایکسین ہونے والا تھا لیکن اس کی چھ سات بہنوں سے سلمیٰ خائف تھی۔ اپنی الہڑ البیلی بیٹی کے مزاج سے آشنا تھی۔ چھ سات تو ایک طرف ایک دو نندیں بھی گوارا کرنے والی نہ تھیں۔ یوسف مالدار تو تھا لیکن تعلیم معمولی تھی۔

اب کلیم کو دیکھا۔ تو سلمیٰ کو یوں لگا۔ جیسے فریدہ کے لیے جس لڑکے کی وہ خواہاں تھی۔ وہ کلیم ہی ہے۔ خوب صورت، خوب سیرت۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ اور خاندانی اعتبار سے بھی باوقار، یوں بھی صاحب حیثیت۔ خالی خولی تنخواہ پر گزر کرنے والا ڈاکٹر ہی نہ تھا۔

کلیم ماں کی آنکھوں میں مچلتی خواہش دیکھ رہا تھا۔ فریدہ جب بھی آتی۔ اماں کی نگاہوں میں جیسے تارے چمکنے لگے۔ بڑے پیار سے اسے پاس بٹھاتیں۔ وہ باتیں کرتی۔ تو ایک ٹک اس کا چہرہ دیکھتی رہتیں۔ گو اپنی خواہش کو ابھی انہوں نے الفاظ کی زبان تو نہ دی تھی۔ لیکن کلیم بچہ تو نہ تھا۔ اماں کا سلمیٰ سے بھی ایسا گٹھ جوڑ اس سلسلے کی کڑی لگ رہا تھا۔

سلمیٰ کلیم کی امی سے باتیں کر رہی تھی۔ اور کلیم کلینک کا کچھ سامان خریدنے جانے کو تیار ہو کر کھڑا تھا۔ کن انکھیوں سے اماں کا بشاش چہرہ دیکھ دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔ دونوں کو باتوں میں مصروف دیکھ کر اس نے جانے کو قدم اٹھایا۔

"رات کا کھانا ہمارے ہاں کھائیں گے آپ دونوں۔" سلمیٰ نے اس کے جانے سے پہلے کہا۔

"لاحول ولا۔" کلیم ہنسا۔ "ابھی کھانا باقی ہے۔"

"نہیں! بس اتنا ہی بہت ہے۔" کلیم امی نے جلدی سے کہا۔

"آپ تو بار بار کہہ کر شرمندہ کرتی ہیں۔ آج رات کھانا ہمارے ہاں ہوگا۔ میں نے کچھ اور دوستوں کو بھی مدعو کیا ہے۔ آپ کی ملاقات بھی ہو جائے گی۔ کلیم کے نئے دوست بھی بن جائیں گے۔ اس نئے علاقے میں آپ کو راہ و رسم تو پیدا کرنا ہی ہوگا نا ــــ؟" سلمیٰ نے محبت اور اپنائیت سے کہا۔ کلیم کی امی تو اس کے احسان تلے جیسے دبی جا رہی تھیں۔ سلمیٰ کی دعوت کلیم بھی نہ رد کر سکتا تھا۔ مسکرا کر رہ گیا۔ اب اسے یہاں ہی رہنا تھا۔ واقعی لوگوں سے راہ و رسم پیدا کرنا ہی تھی۔ یہ دعوت موزوں ہوتا تھی۔

سلمیٰ ماں بیٹے کو رات کی دعوت کے متعلق دوبارہ سہ بارہ تاکید کر کے اٹھ آئی۔ کلیم بھی اپنے کام پر چلا گیا۔ اور اماں اٹھ کر چھوٹی موٹی چیزیں سنبھالنے لگی۔

سلمیٰ نے دعوت کا شاندار انتظام کیا تھا۔ اپنی چند دوستوں اور فریدہ کے دو چار ملنے والوں کو بھی مدعو کیا تھا۔ خانساماں کے علاوہ اس نے ثومی کو بھی مدد کے لیے بلا لیا تھا۔ دن بھر وہ دونوں کے ساتھ باورچی خانے میں مصروف رہی تھی۔

ثومی نے بھی کلیم کے متعلق سن لیا تھا۔ وہ اور اس کی اماں آج مہمان خصوصی تھے۔ کلیم کو یہاں آئے آٹھ دن ہو چکے تھے۔ صبح و شام وہ کئی بار اس طرف آیا تھا۔ لیکن ثومی سے پھر اس کا ٹکراؤ نہیں ہوا تھا۔ دونوں کوٹھیوں کے درمیان گارڈ نیا کی گھنی باڑ تھی جسے پچھلی طرف سے تھوڑا سا کاٹ کر راستہ بنا دیا گیا تھا۔ بجری کی چھوٹی سی سڑک دونوں کوٹھیوں کو اندرونی طرف سے ملاتی تھی۔ اسی راستے کلیم کئی بار ادھر آیا تھا۔ اور ثومی نے گنے درختوں کی اوٹ سے تقریباً ہر بار اسے دیکھا تھا۔ نظروں کی تشنگی ہر بار ہوس ناک حد تک بڑھی تھی۔ باؤلی لڑکی اپنے تصورات میں برسوں سے پرورش پانے والے پیکر کو زندہ و جاوید دیکھ کر سمجھ نہ پا رہی تھی۔ کہ اسے کیا کرنا ہے۔ یا تقدیر نے اس کے لیے کیا تجویز کر رکھا ہے۔

ثومی کباب بڑے اچھے بناتی تھی۔ ترکیب اس نے سلمیٰ ہی سے سیکھی تھی۔ لیکن اب تو شاگرد استاد سے سبقت لے گیا ہے۔ سلمیٰ نے تو اس سے مفاد پرستی کے طور پر کام لیا تھا۔ لیکن یہ بات ثومی کے حق میں یوں اچھی ثابت ہوئی تھی۔ کہ بڑے گھروں کے طور طریق بخوبی سمجھ گئی تھی۔ رنگا رنگ کھانے بھی پکا لیتی تھی۔ اور کمروں کی زیبائش اور آرائش کا سلیقہ بھی آ گیا تھا۔ آج بھی کباب ثومی نے بنائے۔

کھانے کی میز سجانے کا کام بھی سلمیٰ نے ثومی کو سونپا تھا۔ گیارہ مہمان تھے۔ باقی گھر کے افراد ــــ سلمیٰ نے ساری باتیں ثومی کو سمجھا دی تھیں۔

جوں جوں شام ڈھل رہی تھی۔ ثومی کا دل بے تابی سے دھڑک رہا تھا۔ وہ جان تمنا جسے دیکھ کر اس کی خوابیدہ امنگیں جاگ اٹھی تھیں آج آ رہا تھا۔

وہ اپنا اور کلیم کا مقام جانتی تھی۔ چاند کو چھونا چکوری کے بس میں نہیں۔ لیکن پھر بھی چکوری پورے چمکتے چاند کو دیکھ کر پاگل ہو جاتی ہے۔ اس تک پہنچنے کے لیے بال و پر توڑ لیتی ہے۔ یہی حال ثومی کا تھا۔

فریدہ آج بڑے اہتمام سے تیار ہوئی تھی۔ گہرے نارنجی رنگ کے خوبصورت کپڑے کا جدید طرز کا لباس۔ مرصع زیور۔ ہلکا پھلکا میک اپ، بالوں کا دلفریب انداز۔ چہرے پر خوشیوں کا تاثر۔ وہ بڑی خوبصورت، دلکش اور سمارٹ لگ رہی تھی۔ اسے اس رنگ میں دیکھ کر ثومی کو آج پہلی بار حسد سا آیا۔

اور جب اس نے ثومی سے کہا۔ "کیسی لگ رہی ہوں میں۔"

تو ثومی کا دل چاہا اس کے بے داغ سپید چہرے پر سیاہی مل دے۔ اس کے بالوں کو الٹ پلٹ کر دے۔ اور اس کے خوبصورت لباس کو مسل ڈالے لیکن معاشرت مانع تھے۔ مسکرانا بھی پڑا۔ اور پری دل سے بولی:

"بہت اچھی لگ رہی ہیں۔"

"آج میں چاہتی ہوں۔ اتنی اچھی لگوں اتنی اچھی لگوں۔ کہ ——" فریدہ فرط انبساط سے جھوم جھوم کر بولی۔

"کہ ——؟" ثومی نے اپنی پوری آنکھیں کھول کر اسے دیکھا۔

"کہ لوگ دل ہار جائیں۔" فریدہ کھلکھلا کر ہنس دی۔ اس کی آنکھوں میں نشہ چھا رہا تھا۔ ثومی اس کی بے تاب خوشیوں کی وجہ سمجھ گئی۔ کسی انجانے سے دکھی جذبے نے اس کی روح کو تڑپا دیا۔

وہ کھانے کی میز سجاتے ہوئے بھی فریدہ ہی کے متعلق سوچ رہی تھی۔ اس کی خوشیوں کا سراغ اسے مل چکا تھا۔ لیکن اپنے آپ کو دھوکہ دینے کی پوری کوشش کر رہی تھی۔

"ایسا نہیں ہے۔" وہ بڑی سچائی سے اپنے آپ سے جھوٹ بول رہی تھی۔

اس نے میز پر ترتیب سے برتن لگائے۔ نیپکن رکھے۔ پانی کے لیے گلاس سجائے۔ سلمیٰ دو تین بار اٹھ کر آئی۔ اور کمرے کا جائزہ لے کر اطمینان کیا۔

ڈرائنگ روم سے مہمانوں کی ہنسی مذاق کی باتیں اور کبھی کبھی بلند ہونے والے شگفتہ قہقہے ثومی کی توجہ اپنی طرف مبذول کر لیتے تھے۔ کلیم کی آواز وہ اتنے مہمانوں میں بھی الگ محسوس کر رہی تھی۔

سلمیٰ کے واپس ڈرائنگ روم میں جانے پر پردہ ذرا سا سرک گیا۔ ثومی کی نظر ادھر پڑی۔ تو اس کے کام کرتے ہاتھ رک گئے۔ اور وہ بت بنی اس رہزنِ دین و ایمان کی طرف دیکھتی رہ گئی۔ جو سامنے ہی صوفے پر بالکل شہزادوں کے سے وقار سے بیٹھا تھا۔ سرمئی سوٹ میں اس کا مردانہ حسن اتنا پُروقار تھا۔ کہ نظر نہ ٹھہرتی تھی۔ اس سے ہٹ کر دائیں ہاتھ صوفے پر شاید فریدہ تھی۔ اس کا صرف کندھا نظر آ رہا تھا۔ اور وہ شاید اسی سے باتیں کر رہا تھا۔ کیونکہ وہ قدرے ادھر ہی کو جھکا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔

فریدہ سے اب تک اس نے بار بار رشک ضرور محسوس کیا تھا۔ لیکن آج وہ اس سے حسد محسوس کرنے لگی تھی۔ اس کی طرح زندگی کی سہولتیں پانے کی اس نے کئی بار تمنا کی تھی۔ اس کے کمرے میں جب بھی جاتی۔ ایسے کمرے کا تصور اس کو بے تاب کر دیتا۔ وہ کتنی کتنی دیر اس کے کپڑوں کی الماری کھولے حسرت سے دیکھتی رہتی۔ کتنی کتنی دیر اس کے ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑی زیبائش و آرائش کی قیمتی چیزوں کو نہارا کرتی۔ اسے فریدہ سے رشک محسوس ہوتا۔ کاش! میں بھی فریدہ کی طرح ہوتی۔ یہ خیال اسے ہزاروں نہیں لاکھوں مرتبہ آیا تھا۔ لیکن آج ——— آج وہ فریدہ سے حاسد تھی۔ کھانا لگ گیا۔

سلمیٰ نے سب سے پہلے کلیم کی امی سے کہا۔ پھر دیگر مہمان بھی اٹھے اور کھانے

کے کمرے میں آ گئے۔ بیگم شفیق کے بلند قہقہے اب بھی بلند ہو رہے تھے۔

فرید علی احمد سے کسی کاروباری مسئلے پر بات کر رہا تھا۔ سہیل ناصرہ کی دلچسپ باتوں میں کھویا تھا۔ اور سلمیٰ کلیم کی امی کے ساتھ ساتھ اندر آ رہی تھی۔

سب سے آخر میں کمرے میں داخل ہونے والوں میں کلیم اور فریدہ تھے۔

"ادھر آ جائیے۔" فریدہ نے کلیم کے لیے راستہ بنایا۔ سب مہمان میز کے گرد گھیرا ڈال چکے تھے۔ پلیٹوں اور چمچوں کی کھنک، کھانے سے اٹھنے والی لذت آمیز مہک نے گھل مل کر فضا میں رسیلا سا ارتعاش پیدا کر دیا تھا۔ تیز برقی روشنی میں کمرے کی سجاوٹ اور مہمانوں کے قیمتی لباسوں کی جگمگاہٹ دیدہ زیب تھی۔

ثومی سب سے ہٹ کر پانی کے بھرے جگ میز پر رکھ رہی تھی۔ اس کی پشت تھی۔ کلیم نے اسے دیکھا نہیں۔

"یہ لیجئے۔" فریدہ نے خالی پلیٹ اٹھا کر اس کے ہاتھ میں تھما دی۔

"شکریہ" کلیم نے پلیٹ لیتے ہوئے کہا۔ فریدہ ڈونگا اٹھا کر اسے دینے کو تھی کہ اس نے مسکرا کر اس کا ہاتھ روک دیا۔

"میں اپنی مدد آپ کرنا جانتا ہوں۔ آپ تکلف نہ کیجئے۔"

"تکلف کیسا؟" فریدہ مسکرائی۔ "آپ مہمان خصوصی ہیں — نا — آپ کی خدمت میرا فرض۔"

"اوہو۔ اتنا سر نہ چڑھائیے۔" کلیم نے ہنس کر کہا۔ اور آگے بڑھ کر اپنی پسند کی چیزیں پلیٹ میں ڈال لیں۔ وہ خیر سے ذرا پیچھے ہٹ گیا۔ اسی اثنا میں ثومی نے رخ پھیرا۔ کلیم کی نظر اس پر پڑ گئی۔

"اوہ — آپ — آداب عرض۔" اس نے بڑی گرم جوشی سے سر کے اشارے سے آداب کیا۔ "مزاج بخیر۔"

ثومی گھبرا گئی۔ اس کے دائیں ہاتھ ہی تو سلمیٰ کھڑی تھی۔ فریدہ کلیم کی پشت پر تھا۔

"آئیے نا۔ آپ بھی کھانا کھائیے۔" کلیم نے اسے گم صم کھڑے دیکھ کر کہا۔

گھبراہٹ میں ثومی کی بوجھل نوکیلی پلکوں کی جھالریں کئی بار اٹھیں اور گریں۔ اس نے بچ کر نکل جانا چاہا۔ لیکن کلیم ایک خالی پلیٹ اس کے لیے لے آیا۔

"شروع کیجئے۔" کلیم نے پلیٹ اس کی طرف بڑھا دی۔

لیکن پلیٹ ثومی کی بجائے سلمیٰ نے پکڑ لی۔ "جاؤ باورچی خانے میں جا کر بیٹھو۔ باقی کھانا ٹھنڈا نہ ہو جائے۔"

سلمیٰ کا لہجہ اتنا تلخ اور ایسا توہین آمیز تھا۔ کہ ثومی کے چہرے پر ایک دم زردی کھنڈ گئی۔ ندامت کے احساس سے اس کی جبین نم ہو گئی۔ اور اس کی پلکوں کی جھالریں اڑ گئیں۔ یہ سب کچھ ایک ثانیے میں ہو گیا۔ ثومی تیزی سے کمرے سے نکل گئی۔

فرید نے یہ سارا واقعہ دیکھا۔ اس کا نوالہ حلق میں اٹکنے لگا۔ بھری محفل میں ثومی کی یہ سبکی اس کے دل میں تیر کی طرح لگی۔ ثومی کے چہرے کی اڑی رنگت اور جبین پر پھیلی نمی کو اس نے بے طرح محسوس کیا۔ کلیم بھی کچھ بجھ سا گیا۔ سلمیٰ کا رویہ اسے اچھا نہ لگا۔ وہ فریدہ کے اصرار اور بار بار ڈشیں پیش کرنے پر بھی کوئی چیز رغبت سے نہ کھا سکا۔ اس نے دیکھا تھا۔ کہ فرید نے کھانا ختم کیے بغیر ہی اپنی پلیٹ واپس رکھ دی تھی۔

کھانے کے بعد سب ڈرائنگ روم میں آ گئے۔ زندہ دلوں کی محفل تھی۔ ہنسی کی پھوار مسلسل برس رہی تھی۔ لیکن فرید اس محفل سے بہت دور جا چکا تھا۔ وہ سگریٹ پر سگریٹ پھونک رہا تھا۔ اس کی روح میں تیرتی افسردگی اس کی آنکھوں سے امنڈ رہی تھی۔

بشاش اب کلیم بھی نہ تھا۔ وہ چپ چاپ سا بیٹھا تھا۔ شاید اس کی خاموشی محسوس کر لی جاتی۔

"صاحب آپ کا ٹیلیفون ہے۔" اس کے نوکر نتھو نے اس کے قریب آ کر کہا۔

"کہاں سے آیا ہے۔"

"ہسپتال سے۔"

"کون بول رہا ہے۔"

"مسٹر مریم۔"

"اوہ۔ اچھا۔" وہ جلدی سے اٹھا۔ مہمانوں سے یوں اٹھ جانے کی معذرت کی

"جلد واپس آئیے گا۔" فریدہ اس کے ساتھ ساتھ دروازے تک آ گئی۔

وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا اندرونی راستے سے گھر گیا۔ مسٹر مریم آج داخل ہونے والے مریض کمرہ نمبر ۱۰ کے متعلق کچھ ضروری معلومات حاصل کرنا چاہتی تھی۔ مریض کی حالت مخدوش تھی۔

کلیم نے ساری بات وضاحت سے سنی اور پھر ضروری ہدایات دے دیں۔

"میری ضرورت پڑے تو فوراً بلا لینا۔" اس نے ٹیلیفون بند کرتے ہوئے کہا۔

کتنی ہی دیر وہ ٹیلیفون پر ہاتھ رکھے کھڑا سوچتا رہا۔ وہ اب واپس فرید کے ہاں نہ جانا چاہتا تھا۔ تنہائی کے لیے اس کی روح ہمک رہی تھی۔ اس خوبصورت کانچ کی نازک لڑکی کے چکنا چور دل کا خیال تڑپا رہا تھا۔ اس کی کتنی سبکی ہوئی تھی۔ وہ یقیناً اس گھر کی خادمہ تھی۔ کاش اسے پہلے سے علم ہوتا۔ اور وہ یوں اسے پلیٹ پیش کر کے اس کی سبکی کا باعث نہ بنتا۔ لڑکی کی بھیگی آنکھوں اور چہرے کی اڑی رنگت سے متاسف کر رہی تھی۔

لیکن آداب محفل کے خلاف تھا۔ کہ وہ اب مہمانوں میں نہ جائے۔ اسی کے لیے تو اس خوبصورت محفل کا اہتمام ہوا تھا۔

سست سست قدم اٹھاتا۔ جلتا سگریٹ انگلیوں میں دبائے وہ پھر فرید کے ہاں جانے لگا۔

پچھلی طرف باورچی خانے سے نوکروں کی باتوں کی آوازیں برتنوں کے اٹھانے رکھنے کے درمیان سنائی دے رہی تھیں۔

کلیم کا جی چاہا۔ باورچی خانے میں جا کر اس لڑکی سے معذرت کرے۔ اس کی غلط فہمی کی بنا پر تو اس بیچاری کی اتنی سبکی ہوئی تھی۔ کلیم اپنے ضمیر پر بوجھ سا محسوس کر رہا تھا۔

باورچی خانے میں یوں جانا موزوں نہ تھا۔ کلیم ذہن سے اس لڑکی کا خیال ہٹانے کی کوشش میں بڑے بڑے قدم اٹھاتا ڈرائنگ روم کی طرف جانے لگا۔

لیکن برآمدے کے پہلے ستون کے قریب اس کے قدم رک گئے۔ برقی روشنی یہاں اندھیروں میں گھل گئی تھی۔ کچھ درختوں کی آڑ۔ کچھ بیلوں کا سایہ۔ بڑی ہی مدھم سی لو پھیلی ہوئی تھی۔ اس ملگجے اندھیرے میں اس نے دیکھا۔ ستون کا سہارا لیے کوئی بے خود سا کھڑا ہے۔ اس کے قدموں کی چاپ بھی تو بے خودی کا سحر نہ توڑ سکی۔ وہ ستون کے قریب گیا۔ پہلی ہی نظر میں اسے پہچان لینا مشکل نہ تھا۔

وہ ثومی تھی۔ آنکھیں بند کیے دونوں ہاتھ پیچھے باندھے ستون کے سہارے اس طرح کھڑی تھی۔ کہ اس کے دکھے دکھے سانسوں کا زیر و بم اس کے سینے سے محسوس ہوتا۔ تو وہ پتھر کا تراشا ہوا بت محسوس ہوتی۔

کلیم نے غور سے اسے دیکھا۔ غور سے۔ بالکل قریب کھڑے ہو کر۔ اس خاموش مظلوم حسن نے اسے از خود رفتہ سا کر دیا۔ بلا ارادہ اس نے اپنی انگلی کی پور سے اس کا کندھا چھوا۔ ثومی نے آنکھیں کھول دیں۔

بحر بیکراں کی سی وسعتیں لیے ہوئے صاف و شفاف آنکھیں، جن کی تہہ میں کرب کے طوفان سمٹے ہوئے تھے۔ اک لمحہ کو تو وہ یقین ہی نہ کر سکی۔ کہ وہ کلیم ہی ہے۔ حیرت زدہ سی اسے دیکھتی رہی۔

"آپ۔" کلیم نے کچھ کہنے کو لب کھولے۔

ثومی سرتاپا کانپ گئی۔ گھبرا کر اس نے کلیم کی طرف دیکھا۔ تڑپ کر پیچھے ہٹی اور پیچھے۔ اور پیچھے، حتیٰ کہ عشق پیچاں کی بیلوں تک پیچھے ہٹ گئی۔

"سنیئے تو۔" کلیم نے قدم بڑھایا۔

لیکن اس کے قریب پہنچنے سے پہلے ہی وہ تیزی سے وہاں سے چل دی۔ اور گ بیلوں کے سایوں میں روپوش ہو گئی۔

کلیم کئی لمحے وہیں کھڑا رہا۔

جب وہ ڈرائنگ روم میں داخل ہوا۔ تو محفل اپنے جوبن پر تھی۔ سہیل اپنی پُر آواز میں کوئی مرصع غزل سنا رہا تھا۔ اس کی آواز کے سحر سے سب ہی دم بخود تھے

"آپ نے اتنی دیر لگا دی۔" اس سحر کو توڑ کر فریدہ کی آواز سرگوشی کے انداز میں اس کی آواز میں شکوہ بھی تھا۔

کلیم نے صرف اس کی طرف دیکھا۔ اور پھر دروازے کے قریب ہی خالی کر بیٹھ کر سہیل کی آواز کے جادو میں ڈوب گیا۔

رات ثومی پر بھاری تھی۔ اس کا دم گھٹ رہا تھا۔ اس کا دل بیٹھ رہا تھا۔ اس کا جی سہما ہوا تھا۔

کلیم کو اس نے جس دن پہلی مرتبہ دیکھا تھا اسے یہی محسوس ہوا تھا۔ جیسے وہ کوئی انجان نہیں۔ وہ وہی ہے جس کے متعلق وہ رات کے کئی پہروں میں اپنی ٹوٹتی نیند میں سوچا کرتی ہے۔ جو کہیں نظر نہ آنے پر بھی اسے اکثر محسوس ہوتا رہا ہے۔ جس کے انتظار میں وہ زندگی کی تلخیوں کو بھی ہنسی خوشی سمیٹے جا رہی ہے۔ مالی کی اس کال کوٹھڑی سے وہی اسے نکالنے والا ہے۔ اس کا ہاتھ پکڑ کر فردوسی نغموں کی لے پر رقص کرنے والا وہی ہے۔ اک ان دیکھی زندگی کا خواب اسی کے دم سے شرمندۂ تعبیر ہونے والا ہے۔

اس کا ماضی داغ آلود تھا۔ اس کا حال خوش گوار نہیں تھا۔ لیکن اک تابناک مستقبل کے تخیل میں وہ ہمیشہ گم رہی تھی۔ اس تابناکی میں اسے جس اجنبی چہرے کا ہمیشہ احساس ہوتا تھا۔ وہ کلیم کے سوا اور کوئی نہ تھا۔

وہ کلیم کی شکل و صورت سے مرعوب ہو کر اس پر نہ مرمٹی تھی۔ نہ ہی اس کے خوبصورت لباس سے اس کی امارت کا اندازہ کر کے مفتون ہوئی تھی۔ اگر حسن اور دولت ہی اس کی توجہ کا مرکز ہوتے تو اب تک وہ سینکڑوں کلیم دیکھ چکی ہوتی۔ فریدہ کے ہاں حسن کے پیکر بھی آتے تھے۔ اور دولت کے دیوتا بھی۔ لیکن آج تک اس کی نگاہ کسی پر ٹھہری تھی نہ الجھی۔ اس نے خوبصورت آدمیوں کو تحسین کی نظروں سے دیکھا تھا۔ اس نے دولت مند شخصیتوں سے متاثر ہونے کے جذبات بھی دل میں پائے تھے۔ لیکن اس کی حالت ایسی

کبھی نہ ہوئی تھی۔ جو حکیم کو دیکھ کر ہوئی تھی۔ دن رات اپنی ہی لگن میں مگن رہنے لگی تھی۔ گو اس کے بعد آٹھ دن تک وہ کسی وقت دور ہی دور سے کلیم کو دیکھ پائی تھی۔ کہیں سے بھی اسے پتہ نہ چلا تھا۔ کہ کلیم بھی اسے دیکھنے، اس سے ملنے کے لیے اسی کی طرح مضطرب و بیقرار ہے۔ لیکن کچھ غیر حقیقی مفروضے۔ کچھ دلچسپ دھوکے ایسی حالت میں انسان کا مخلص دوست کی طرح ساتھ دیتے ہیں۔ ثومی ان ہی بہلاووں کے سہارے شب و روز گزار رہی تھی۔

جس دن کلیم کی فریدہ کے ہاں باقاعدہ دعوت تھی۔ اس دن ثومی کی حالت دیدنی تھی۔ آج اس کا جی بھی اچھا لباس پہننے کو مچل اٹھا تھا۔ اس نے جب سے ہوش سنبھالا تھا۔ فریدہ کی اترنیں پہن رہی تھی۔ یہ اترنیں ضرورت تھیں۔ اسے پہننا پڑتیں۔ دل سے اس نے کبھی ان اترنوں کو قبول نہیں کیا تھا۔ اسے ان اترنوں سے ہمیشہ گھن آئی تھی۔ سب کی توہین اور ذلت کا احساس ہوا تھا۔ گو وہ اپنے جذبات کا ان خطوط پر تجزیہ تو نہ کر سکتی تھی۔ پھر بھی اسے فریدہ کی اترنیں پہن کر کبھی اچھا نہیں لگا۔ اسے اپنے اندر کوئی شے مجروح ہوتی محسوس ہوتی تھی۔

لیکن آج اس کا جی اچھا لباس پہننے کو مچل رہا تھا۔ کاٹن کے وہ کپڑے جو الیس دی کے داخلہ پر فریدہ اور سلمیٰ نے اسے بنا کر دیے تھے۔ احتیاط سے پہننے کے باوجود اس قابل نہ لگتے تھے۔ کہ انہیں آج کی یادگار رات پہنا جائے۔

فریدہ کا دیا ہوا ایک خوبصورت رنگ کا سوٹ جو پائنچے کے قریب استری سے جل گیا تھا۔ جیراں کے صندوق میں رکھا تھا۔ ثومی کو آج اس سوٹ کا خیال آیا۔

"ماں یہ کپڑے میں پہن لوں۔" اس نے پوچھا۔

"کیوں؟" جیراں نے جواب دیا۔ "تو تو ناک منہ چڑھاتی ہے۔ چھوٹی بی بی کے کپڑوں پر آج کیا بات ہو گئی۔"

"بس کچھ ہو ہی گئی۔" ثومی نے کپڑے کھڑی چارپائی پر پھیلا دیئے۔

"رہنے دے انہیں۔ میں رابعہ کو ٹھیک کروا دوں گی۔"

"کروا دینا۔ لیکن آج تو میں پہنوں گی۔"

"آج کیا بات ہے۔"

"کوٹھی میں دعوت ہے نا۔"

"دعوتیں روز ہی ہوتی ہیں۔"

"آج بہت بڑی دعوت ہے ماں۔" بیگم صاحبہ نے خاص طور پر کہا ہے۔ کہ اچھے کپڑے پہن کر آنا۔

"اچھے کپڑے پہن کر آنا۔" جیراں نے منہ بنایا۔ "تو ہی تو بڑی مہمان ہو گی نا وہاں"

جیراں کے الفاظ سے ثومی کے جذبات کو ٹھیس لگی۔ واقعی وہ تو یوں تیاری کر رہی تھی۔ جیسے اس دعوت میں اس کی شرکت کسی معتبر مہمان کی طرح ہے۔ پھر بھی۔ وہ تیار ہو رہی تھی۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ اس کی وقعت اک خادمہ سے کبھی زیادہ نہیں ہوئی۔

اس نے کوئلوں کی استری گرم کی۔ اور سوٹ کو اس طرح کھینچ کھینچ کر استری کیا۔ کہ بالکل نیا معلوم ہونے لگا۔ پائنچے کے قریب استری سے جلی جگہ پر اس نے اس طرح پیوند لگایا۔ کہ معلوم ہی نہ ہوتا تھا۔

نہا دھو کر اس نے کپڑے پہنے۔ ٹوٹے ہوئے آئینے میں اپنے دو دو نظر آنے والے چہرے کو دیکھا۔ بال بناتے بھی اس نے کتنی ہی دیر لگا دی۔ جیراں کو جواں لڑکی کا یوں بننا سنورنا ایک آنکھ نہ بھایا۔ کوٹھی میں ہمیشہ مخلوط دعوتیں ہوا کرتی تھیں۔ آج بھی عورتیں مرد اکٹھے ہی آ رہے تھے۔ ثومی کا بناؤ سنگار جو صرف صاف کپڑے اور بال بنانے تک ہی محدود تھا۔ جیراں کو گراں گزر رہا تھا۔ لیکن وہ اسے کچھ کہہ بھی تو نہ سکی۔ ثومی کی شخصیت سے وہ بہت حد تک مرعوب تھی۔ ثومی نے بھی جب سے سنا تھا۔

کہ وہ جیراں کی بیٹی نہیں۔ اس کی طرف سے اپنے اوپر کوئی ناجائز پابندی قبول نہ کی تھی۔ اپنے طور طریق سے ہی جتلا دیا تھا کہ قریب رہتے ہوئے بھی ان میں ایک حد فاصل ہے۔ چمکتے سبز رنگ کے سوٹ پر اسے دوپٹہ سپید ہی اوڑھنا پڑا۔ کیونکہ فریدہ کے اس سوٹ کے ساتھ دوپٹہ نہیں آیا تھا۔ اور اس رنگ کا دوپٹہ اس کے پاس ہونے کا سوال ہی نہ تھا۔ کپڑے پہن، بال بنا کر وہ بھی کوٹھی کی طرف چل دی۔ اس کی چال میں ایک متانہ لغزش تھی۔

وہ سیدھی فریدہ کے کمرے میں گئی۔ جہاں وہ پوری زیبائش اور آرائش سے تیار ہو رہی تھی۔

"اوہو۔ تو نے بڑی سج دھج نکالی ثومی۔" اس نے ثومی کی طرف دیکھ کر کہا۔ لیکن ثومی فریدہ کو دیکھ کر بجھ سی گئی۔ کیا شاندار لباس تھا اس کا۔ بالوں کا انداز کتنا پیارا تھا۔ گلے میں کتنے خوبصورت گلوبند تھا۔ ہاتھ میں اسی گلوبند کی ساخت کی انگوٹھی اور کلائی پر اسی کی طرح جڑاؤ چوڑی بھی تھی۔

فریدہ آج بھی خوش کس قدر تھی۔ اس کا انگ انگ مسکرا رہا تھا۔ بات بات پر قہقہہ لگا رہی تھی۔ کتنی ہی بار تو اس نے کلیم کا نام لیا تھا۔

ثومی سوچ میں ڈوب گئی۔ وہ فریدہ کی خوشیوں کا سراغ ڈھونڈنے لگی۔ سراغ اتنا واضح تھا۔ کہ ڈھونڈنے کی ضرورت ہی نہ تھی۔ لیکن ثومی دل کو فریب دینے کی کوشش میں تھی۔

یہ فریب رات کھانے کے کمرے میں چکنا چور ہو گیا۔ سلمیٰ نے بھری محفل میں اسے اس کی حیثیت کا احساس دلا دیا۔ اس کی جگہ باورچی خانہ تھی۔ اُف۔ ثومی کی دنیا چکرا گئی۔ سلمیٰ سے اکثر ڈانٹ پڑی تھی۔ برا بھلا بھی سنا تھا۔ لیکن آج رات اس کا لہجہ جتنا تلخ۔ جتنا سرد اور توہین آمیز تھا۔ ثومی کی قوت برداشت سے باہر تھا۔

اس کا دل جیسے پھٹ جانے کو تھا۔ اس کی روح بغاوت پر آمادہ تھی۔ اس نے اس کوٹھی سے نکل کر بھاگنا چاہا تھا۔ اس فضا سے اس ماحول سے دور بھاگ نکلنا چاہا تھا۔

اور وہ اپنے ذہن کے باغیانہ فعل کے متعلق سوچ رہی تھی۔ ستون کے ساتھ لگا آنکھیں بند کیے گہرے گہرے دکھی سانس لیتے ہوئے سوچ رہی تھی۔ کہ کلیم کو اس نے اپنے قریب بہت قریب کھڑے پایا۔

وہ کہاں سے آ گیا تھا۔ کیوں آ گیا تھا۔ وہ ساری رات سوچتی رہی تھی۔ ساری رات اس کا دم گھٹتا آ رہا تھا۔ اس کا دل بیٹھتا رہا تھا۔ اس کا جی سہم سہم کر سمٹتا رہا تھا۔ کیا اسے انسانی ہمدردی اس تک کھینچ لائی تھی؟

یا — وہ بھی برسوں سے اس کی تلاش میں مارا مارا پھر رہا تھا۔ اور آج رات اچانک اسے آن ملا تھا؟

ثومی کسی بات پر بھی تو یقین نہ کر سکی۔ کاش وہ اسے سامنے پا کر اس قدر گھبرا نہ جاتی۔ اس کی بات سن لیتی۔ اس نے شاید اسے رکنے کو کہا بھی تھا۔

ثومی کو اس کی بات نہ سننے کا افسوس ہو رہا تھا۔

یوں ہی کروٹیں بدلتے، اونگھتے جاگتے۔ خوبصورت و حسین خواب دیکھتے رات بیت گئی۔ لیکن صبح جب وہ اپنے کوارٹر کے کونے میں پڑی جھلنگا سی چارپائی پر پوری طرح بیدار ہوئی۔ تو رات کا تلخ واقعہ اسے یاد آ گیا۔ اس نے اپنے چاروں طرف نظر دوڑائی۔ بند بند سا کمرہ۔ جس کی دیواریں اندر ہی آگ جلانے سے دھوئیں سے کالی ہو رہی تھیں۔ کمرے میں ایک طرف بندھی رسی پر اس کے نام نہاد بھائی بہنوں کے میلے کچیلے نئے پرانے کپڑے لٹک رہے تھے۔

جیراں اپنے پھولے ہوئے پیٹ تلے سال بھر کا بچہ دبائے خراٹے لے رہی

تھی۔ فتو دوسری چارپائی پہ دو تین لونڈوں کو لیے سو رہا تھا۔ اور تین بچے زمین پہ پرانا کمبل ڈالے، چیتھڑا سا لحاف اوڑھے سو رہے تھے۔ سلور کے کالے کالے برتن دیوار کے ساتھ پڑے تھے۔

جھونپڑوں میں رہ کر محلوں کے خواب دیکھنے والی ثومی کو اپنے گرد و پیش پر نظر ڈال کر دکھ ہوا۔ اس کا بستر بھی فرید کی عنایت تھا۔ ورنہ دو سال پہلے وہ بھی انہیں چیتھڑوں میں سویا کرتی تھی۔ کتنا گھٹا ہوا ماحول تھا۔ کتنی کوفت دینے والی فضا تھی۔

دکھ کے گھمبیر احساس کے ساتھ وہ بستر سے اٹھی۔ ابھی دن پوری طرح بیدار نہیں ہوا تھا۔ وہ باہر کی کھلی فضا میں نکل کر لمبے لمبے سانس لینے لگی۔ صدیق نل پہ بیٹھا ہاتھ منہ دھو رہا تھا۔ اسے دیکھ کر اس نے نفرت سے منہ پھیر لیا۔ اور کواڑ کے پچھلی طرف آ کر بیٹھنے لگی۔

"کاش! اسے جلد کہیں نوکری مل جائے۔" اس خواہش کے پس پردہ اس گھٹے ہوئے ماحول سے فرار کی تمنا تھی۔

ماحول! جس سے وہ اب تک مطابقت نہ کر سکی تھی۔

—— ٭ ——

کلیم اپنے کلینک کی وجہ سے کئی دن مصروف رہا۔ لیکن اس مصروفیت کے باوجود وہ فرید صاحب سے ملنے کا وقت ضرور نکال لیتا۔ کبھی اس کی خرابیٔ طبع بہانہ بنتی اور کبھی گپ شپ لگانے کی غرض ہوتی۔ چند ہی دنوں میں اس خاندان کے افراد کے ساتھ وہ یوں گھل مل گیا تھا۔ جیسے برسوں کا ساتھ ہو۔

سلمیٰ بھی اس سے بڑی اپنائیت سے پیش آتی۔ اس کی اماں بھی ان لوگوں سے بڑی مرعوب تھی۔ سلمیٰ تو اس کی بے حد عزت کرنے لگی تھی۔ اماں تو ان لوگوں کی دن رات تعریفیں کرتے نہ تھکتی تھیں۔

فریدہ بھی کلیم سے خاصی بے تکلف ہو گئی تھی۔ بیڈمنٹن اور کیرم کا اچھا کھلاڑی ہونے کی وجہ سے فریدہ کو کلیم سے قریب تر رہنے کا موقع مل رہا تھا۔ کبھی بیڈمنٹن اور کبھی کیرم۔ تقریب بہر ملاقات تھی۔

کلیم خوش تھا۔ کلینک کو ٹھیک ٹھاک کرنے میں فریدہ بھی اس کا ہاتھ بٹا رہی تھی۔ فرنیچر آیا۔ بورڈ بنے۔ آلات خریدے گئے۔ فریدہ نے اس سارے کام میں کسی نہ کسی طور حصہ ضرور لیا۔

ان مصروف اور مسرور دنوں میں یہ بات نہ تھی۔ کہ کلیم کو ثومی کا خیال ہی نہ آیا رہین ستم ہائے روزگار کے باوجود وہ اس کے خیال سے غافل نہیں تھا۔

لیکن یہ خیال کچھ ایسا شدید اور جذبات انگیز بھی نہ تھا۔ ثومی کو اس نے پہلے دن دیکھا تھا۔ وہ رات گئے تک اس کے دل و دماغ پہ چھائی رہی تھی۔ لمحے کے قاتل

کی کسک بھی اس نے محسوس تو کی لیکن اسے زیادہ اہمیت نہ دی۔ حسن جس رنگ میں ہو اس کے جمالیاتی ذوق کی تسکین کا باعث تھا۔ لیکن اس تسکین سے وہ کوئی سنجیدہ نتائج اخذ کرنے کا قائل نہ تھا۔ پہلی نظر میں محبت ہو جانے کا وہ سرے سے قائل ہی نہ تھا بقول اس کے یہ بیماری نوعمر لونڈوں کو ہو سکتی تھی۔ اس کی ٹھہری ہوئی پختہ عمر میں اس کا قطعاً امکان نہ تھا۔

لیکن اس رات دعوت میں ثومی کو قریب سے دیکھ کر اسے گو ناخوشی ہوئی تھی۔ اسے یوں لگا تھا۔ جیسے اب تک ساری محفل بے رنگ و بے کیف تھی۔ اس کے وجود کے احساس سے محفل رنگ و بو کا بپھرا ہوا طوفان بگنے لگی تھی۔ اس کے سادہ سے حسن کی پرکاری سے وہ مبہوت ہو گیا تھا۔ ایک ہی نظر میں وہ اسے محفل کی جان بنی سنوری عورتوں سے منفرد اور ممتاز نظر آئی تھی۔

محبت کے دیوتا کے حضور وہ اب بھی سرنگوں نہ ہوا تھا۔ اچھی چیزوں کو وہ ہمیشہ بہ نظرِ تحسین دیکھنے کا عادی تھا۔ ثومی بھی نگاہوں کو بھلی لگی تھی۔ اس سے باتیں کرنے کو اس کا جی چاہا تھا۔ اسی لیے اس نے پلیٹ اٹھا کر اسے دینا چاہی تھی۔ باتیں شروع کرے تو کچھ تو کرتا تھا۔

لیکن سلمیٰ نے جس طرح ثومی کو مخاطب کر کے کہا تھا "جاؤ باورچی خانے میں جا کر بیٹھو۔ باقی کھانا ٹھنڈا نہ ہو جائے" کلیم کو اس کی اس گھر میں حیثیت معلوم ہو گئی تھی یہ جاننے کے باوجود کہ وہ اس گھر کی ملازمہ کے سوا اور کوئی شے نہیں۔ اسے اس کی بیکسی سے دکھ ہوا تھا۔ اس کا جی اس محفل سے اچاٹ ہو گیا تھا۔ اچانک فون کا کہنے نہ آ جاتا۔ تو یقیناً نگاہوں میں رینگتا ہوا یہ دکھ بہت سے لوگ محسوس کر لیتے۔

اور۔ پھر۔ اتفاقاً ہی اسی رات اس نے ثومی کو ستون کے سہارے بے سدھ اور بے خود کھڑے دیکھ لیا تھا۔ اس نے ثومی سے کچھ کہنا چاہا تھا لیکن وہ تو ایسی

حواس باختہ تھی۔ کہ اسے دیکھ کر خوف زدہ ہو کر بھاگ گئی تھی۔

اس سے کچھ نہ کہہ سکنے کا اسے ملال تھا۔ رات کئی بار اس کی آنکھ کھلی تھی۔ اسے ثومی کے پھیکے پھیکے چہرے اور عرقِ ندامت سے بھیگی بھیگی جبیں نے بے چین کر دیا تھا۔

لیکن اس بے چینی کو بھی وہ محبت کا نام دینے کو تیار نہ تھا۔ اک کانچ ایسے بدن کی لڑکی کا نازک دل ٹوٹنے سے دل گرفتہ ہونا یقیناً محبت کا فعل نہیں تھا۔ یہ تو انسانی ہمدردی تھی۔

لیکن جوں جوں دن گزر رہے تھے۔ ثومی اس کے خیالوں میں سمائی جا رہی تھی۔ وہ کوئی کام کر رہا ہوتا۔ کسی دوست سے مصروفِ تکلم ہوتا۔ کسی مریض کو دیکھ رہا ہوتا۔ فریدہ سے بیڈمنٹن کھیل رہا ہوتا۔ یا کیرم کی بازی لگاتا تو اسے اچانک محسوس ہوتا۔ کہ وہ ثومی کے متعلق کسی نہ کسی رخ سے ضرور سوچ رہا ہے۔

اسے اپنے آپ پر جھنجھلاہٹ ہوتی۔ اپنی حماقت پر جھلا اٹھتا۔ لیکن لاشعور میں یہ مسلسل کھیل جاری رہتا۔ اور کلیم کے اعصاب پر اک کیف آمیز الجھن مسلط رہتی۔ اس دن بھی وہ فریدہ کے ساتھ بیڈمنٹن کھیل رہا تھا۔ لان کے سرے پر ایک درخت کے نیچے ثومی کتاب لیے بیٹھی تھی۔

جب تک وہ بیٹھی رہی۔ وہ پورے انہماک اور دلچسپی سے کھیلتا رہتا۔ لیکن جونہی وہ اٹھ گئی۔ اس کے بازوؤں کی سکت جیسے جواب دے گئی۔ جھنجھلا کر اس نے پوری توجہ کھیل کی طرف مبذول کر دی۔ فریدہ کی طرف دھیان دیا۔ لیکن کوئی حربہ کارگر نہ ہوا۔ مجبوراً فریدہ ہی کو کھیل ختم کرنا پڑا۔

کچھ ایسا ہی اتفاق اس شام چائے پر ہوا۔ لان میں چائے پی جا رہی تھی وہ اس کی اماں فریدہ اور سلمیٰ کے ساتھ ہلکی پھلکی باتیں کرتے پی رہے تھے۔ کلیم ثومی کو ارد گرد محسوس کر رہا تھا۔ وہی چائے کی ٹرے لائی تھی۔ چائے رکھ کر وہ روش کے قریب

رکھے مرمریں بنچ پر جا بیٹھی تھی۔ پھر وہاں سے اٹھ کر برآمدے کی سیڑھیوں پر رکھے گملوں کے قریب کھڑی ہو گئی تھی۔ کلیم کو یوں لگ رہا تھا۔ جیسے اس کے اندر کی کرا شے اس کا خاموش تعاقب کر رہی ہے۔

لیکن جب وہ برآمدہ طے کر کے پچھلی طرف گھوم گئی۔ تو کلیم کو کچھ خلا سا محسوس ہوا۔ وہ بھی معذرت کر کے اٹھ بیٹھا۔

فریدہ نے اصرار بھی کیا۔ لیکن کلینک میں بیٹھی سسٹر ٹوبنا سے کوئی ضروری کام اسے عین اسی وقت یاد آ گیا تھا۔ وہ سسٹر ٹوبنا کے پاس آیا نہ کہیں اور گیا۔ اپنے چمن میں خاموشی سے کتنی ہی دیر ٹہلتا رہا۔ یہ سب کیا تھا؟ اس کی ذات کے اندر کیا بن بن کر بگڑ رہا تھا۔ کیا بھگدڑ مچی تھی۔ کیا خلفشار تھی؟

وہ سوچتے سوچتے گھبرا گیا۔ اس نے اپنے آپ کو اس خوبصورت لڑکی سے دور رکھنے کا تہیہ کر لیا۔ وہ تو اس سے خائف نظر آنے لگا تھا۔ بے شک وہ توبہ شکن حسین تھی۔ لیکن اس کی حیثیت اس گھر میں ملازمہ کی تھی۔ اک ملازمہ سے عشق لڑانے کا تصور ہی مضحکہ خیز تھا۔ پھر اس کی اپنی پوزیشن اپنا بدتر پیشہ اور عمر کے سلجھے ہوئے درد کا بھی احساس تھا۔ اپنے اندر کے بچپنے کو کوستے ہوئے اس نے ثومی کے خلاف باقاعدہ ذہنی محاذ قائم کرنے کا عہد کر لیا۔

لیکن قدرت کی ستم ظریفی دیکھئے۔ اماں نے اپنے چھوٹے موٹے کاموں کے لیے اس لڑکی ہی کا انتخاب کیا۔ اسے مشین چلانا آتی تھی۔ اماں نے اک عرصہ سے چادروں اور تکیہ کے غلافوں کے لیے کپڑا خرید رکھا تھا۔ لیکن اب خود یہ کام نہ کر پاتی تھیں۔ سلمیٰ سے کسی درزن کا پوچھا۔ تو ثومی پاس ہی کھڑی تھی۔ مؤدبانہ عرض کر دیا۔ "میں سی دوں گی۔" اماں نے دوسرے دن ہی اسے بلا بھیجا۔

ثومی نے بڑی صفائی سے چادریں سی دیں۔ غلاف بھی بنائے۔ صبح سے دوپہر

ہو گئی۔ وہ مشین پر جھکی کام کرتی رہی۔ اماں نے دوپہر کا کھانا بھی دے دیا تھا۔ وہ وہیں کام کرتی رہی تھی۔

اور جب کلیم ہسپتال سے اس عہد کے ساتھ گھر آیا تھا۔ کہ آج وہ ثومی کو قطعاً نظر انداز کرے گا۔ تو پچھلے صحن میں چوبی تخت کے اوپر مشین پر جھکی ثومی اک محویت سے اپنے کام میں مشغول تھی۔ اسے دیکھتے ہی اس کو اپنا عہد بھول گیا۔ اور وہ سحر زدہ سا اس کی حسین و معصوم صورت دیکھتا رہ گیا۔

اور اماں کی آواز پر جب یہ سحر ٹوٹا تو وہ سٹ پٹا گیا۔ کھانے کے کمرے میں اماں اس کی منتظر تھیں۔ وہ جب ان کے بالمقابل کرسی پر بیٹھا۔ تو اپنے ذہنی عہد کو عملی جامہ پہنانے کے لیے تیار تھا۔ ماتھے پر قدرے شکنیں ڈالتے ہوئے اس نے اماں سے پوچھا۔

"باہر وہ کیا سی رہی ہے؟"

"بستر کی چادریں۔ اور تکیہ کے غلاف بڑے دنوں سے رکھے تھے۔"

"کسی درزی سے سلوا لیے ہوتے۔ خواہ مخواہ خراب کروائیں گی۔"

"نہیں بیٹا۔ سیانی لڑکی ہے۔ بہت اچھا سی لیتی ہے۔"

"یہ ہے کون؟"

کلیم اپنے سوال پر آپ ہی گھبرا گیا۔ لیکن سیدھی سادی اماں کو باریک بینیاں کہاں آتی تھی۔ لقمہ توڑتے ہوئے جواب دیا۔ "فریدہ صاحب کے گھر نہیں دیکھا اسے تم نے؟"

"ان کی رشتہ دار ہے کیا؟"

"نہیں ان کے مالی کی لڑکی ہے شاید۔ میں نے سلمیٰ سے کسی درزن کا پوچھا۔ تو یہ کہنے لگی میں سی دوں گی۔ غریب لڑکی ہے دو چار مزدوری کے بن جائیں گے۔ میں نے سلوا لیں۔"

اماں غریب لڑکی کی حمایت میں خدا جانے اور کیا کہہ رہی تھیں۔ کلیم کھانا کھاتے ہوئے مالی اور اس کی تخلیق کے متعلق ہی سوچ رہا تھا۔

ماں نے تو واقعی اک پھول کی تخلیق کی تھی۔

کھانا کھانے کے دوران مشین کی گھر رگھر رثومی کے وجود کا احساس کلیم کو دلاتی رہی۔ وہ اپنے آپ سے الجھ گیا۔ اپنی حماقت پر غصہ آنے لگا۔ جھنجھلا کر بولا "اب تو بس کروائیے گھر رگھر۔ کل صبح باقی سلوا لیجئے گا۔ اسے کہیئے۔ باقی کام صبح آ کر کرلے۔"

اماں کو اس کی الجھن کی کچھ سمجھ نہ آئی۔ بھلا غصہ میں آنے کی کیا بات تھی۔ کلیم اٹھ کر اپنے کمرے میں چلا گیا۔ دوپہر آرام کرنا تھا۔ اماں نے ثومی کو بقایا کام کل کرنے کا کہہ کر مشین اٹھوا دی۔

ثومی بھی تھک گئی تھی۔ وہ تخت سے اتری۔ سارا کپڑا تہہ کر کے رکھا۔ دوپٹہ سنبھالا۔ ڈرائنگ روم سے گزری۔ بیرونی برآمدے میں آئی اور پھر اپنے گھر جانے والی اندرونی سڑک پر چل دی۔

کلیم اپنے کمرے کی کھڑکی کا پٹ نیم وا کیے اسے اس وقت تک دیکھتا رہا جب تک وہ نظر آتی رہی۔ لیکن اپنی چوری پر وہ آپ ہی سٹپٹا گیا۔ اسے کیا ہوتا جا رہا تھا۔ کیسی حماقتیں سرزد ہو رہی تھیں اس سے۔ کوٹ کرسی پر اتار کر پھینکتے ہوئے اس نے ٹائی کی گرہ سختی سے کھینچ کر گلے سے اتارتے ہوئے سوچا۔

بدتمیز لڑکی! اس نے بڑبڑاتے ہوئے کہا۔

محبت کا وار تسلیم کرنے کو وہ اب بھی تیار نہ تھا۔

—— ٭ ——

کلیم

فرید کے پاس بیٹھا تھا۔ دعوت کی رات سے فرید کی طبیعت مضمحل تھی۔ کلیم اسے اعصابی تقویت اور ذہنی سکون کے لیے دوائیاں دے رہا تھا۔ فرید کے اندر جو آگ سلگ رہی تھی۔ وہ ابھی تک معالج نے محسوس نہ کی تھی۔ جب بھی فرید کی بڑھتی پریشانی کے متعلق کلیم نے کوئی استفسار کیا۔ فرید نے تو رات کاروباری پریشانیوں کی آڑ میں اپنا آپ چھپا لیا۔

آج فرید قدرے بشاش تھا۔ ڈرائنگ روم میں ایک صوفے پر وہ کلیم کے ساتھ بیٹھا حالاتِ حاضرہ پہ بات چیت کر رہا تھا۔

"آج کیا بات ہے فرید صاحب۔ معلوم ہوتا ہے کاروباری الجھنیں کچھ ختم ہو گئیں۔" کسی بات پر فرید نے خوش گوار سا قہقہہ لگایا۔ تو کلیم نے اسے چھیڑا۔

"ہاں۔ ہاں۔" فرید کچھ بوکھلایا۔ لیکن دوسرے ہی لمحے وہ سنبھل گیا۔ کلیم کچھ اور کہنے کو تھا۔ کہ پشت کے دروازے پر کچھ آہٹ ہوئی۔

کلیم اور فرید نے بیک وقت گردن گھما کر ادھر دیکھا۔ ثومی دروازے میں کھڑی تھی۔ وہ کچھ جھجک رہی تھی۔

"آ جاؤ۔ آ جاؤ۔" فرید نے بے ساختہ کہا۔ "آ جاؤ۔ اپنے ڈاکٹر صاحب ہی ہیں۔"

کلیم نے ادھر دیکھا نہیں۔ لیکن قدموں کی بے آہٹ چاپ اسے دل کی دھڑکن کے ساتھ ہم آہنگ ہوتی محسوس ہوئی۔

"مبارک ہو بھئی ـــ تمہیں نوکری مل گئی۔" فرید نے ثومی سے خوشی کے بھرپور

لہجے میں کہا۔

"جی" ثومی کی آواز بے چین سی خوشی کی مظہر تھی۔

"فی الحال پرائیویٹ سکول ہی میں جگہ ملی ہے۔" فرید نے ایک لفافہ اس کے ہاتھ میں دیتے ہوئے کہا۔

ثومی نے لفافہ لیتے ہوئے جھکی ہوئی نظریں اٹھائیں۔ فرید کے دائیں ہاتھ کلیم بیٹھا سگریٹ کے مرغولوں کے پیچھے سے اسے نیم وا نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ ثومی کی نگاہیں جھک گئیں۔ اس کا دل بے تابو ہو گیا۔ اور ٹانگیں کچھ کانپ سی گئیں۔ کلیم سے سامنا کرنے کی اس میں سکت ہی نہ رہی تھی۔

فی الحال پانچویں جماعت کو پڑھانا ہوگا۔" فرید نے اس سے کہا۔

"جی ۔ اچھا جی" ثومی کی آواز بمشکل نکل پائی۔

"پڑھا لو گی۔" فرید شوق سے پوچھ رہا تھا۔

"جی"۔

"پڑھ لو یہ چھٹی"۔

ثومی نے چھٹی لفافہ کھول کر نکالی۔ ماڈرن سکول میں اس کی تقرری کا لکھا تھا۔ ایک سو پندرہ روپے ماہوار کی یہ نوکری ثومی کے لیے ہفت اقلیم کی طرح تھی۔

کلیم نے پھر مرغولوں کی آڑ میں سے اپنے سے چند فٹ کے فاصلے پر کھڑی اس بسمل بدن کو دیکھا۔ جو انگریزی میں لکھی چھٹی پڑھ رہی تھی۔

مالی کی بیٹی ـــ انگریزی میں لکھی چھٹی پڑھ رہی تھی۔ کلیم کو اس بات سے حیرت بھی ہو رہی تھی۔ اور روح کے اندر پھوٹنے والی خوشی کا احساس بھی ہو رہا تھا۔ ثومی ان پڑھ نہ تھی۔ کلیم نے اک گہرے سکون اور خوشی کا احساس کیا۔ لیکن دوسرے لمحے وہ اپنی ذات سے الگ ہو گیا۔ مالی کی لڑکی پڑھی لکھی تھی۔ تو اسے کیا؟ اس

کا پڑھے لکھے ہونے پر خوشی محسوس کرنے کی کیا ضرورت ہے؟"

لیکن الجھاؤ کے باوجود خوشی کے سرچشمے جو ذات کے اندر سے پھوٹتے ہیں کسی طور قابلِ گرفت نہیں ہوتے۔

"سوموار سے سکول جانا ہوگا۔" فرید نے ثومی کی طرف دیکھا۔ "خوش ہونا اب تو۔"

"جی۔ بہت۔"

"کسی گورنمنٹ ادارے میں بھی جگہ مل جائے گی۔ جب تک تم یہاں کام کرو۔ میں پوری کوشش کر رہا ہوں۔ کچھ نہ ہونے سے اتنا ہی کافی ہے۔"

"جی ہاں۔"

"یہ سکول جانتی ہو کہاں ہے۔"

"جی۔ میں ایک دفعہ گئی تھی وہاں۔"

"سرور شہید روڈ سے جو سڑک نکلتی ہے نادائیں پہلو۔"

"جی! مجھے پتہ ہے۔"

"بس روٹ ہے وہ۔ میں تمہیں پاس بنوا دوں گا۔"

"جی۔ شکریہ۔"

"کپڑے وغیرہ بنوانے ہوں گے۔ شام آنا میں تمہیں پیسے دوں گا۔"

ثومی کو شاید اپنی کمزوری کا یہ برملا اظہار کلیم کے سامنے اچھا نہ لگا۔ اس نے گھبرائی ہوئی نگاہ کلیم پر ڈالی۔ اس نگاہ میں مجروح تاثر تھا۔

"جاؤ اب۔ مالی بابا کو یہ خبر سناؤ۔ خوش ہوگا وہ۔ جیراں تو روز پوچھتی تھی مجھ سے۔"

ثومی کا دل ایک بار پھر دھڑک گیا۔ نگاہوں میں بے چینی لہرائی۔ اس کا دل چاہا۔ کلیم سے کہہ دے مالی اور جیراں میرے ماں باپ نہیں ہیں۔ انہوں نے تو صرف مجھے پالا ہے۔ لیکن ایسی بات کہنے کا جواز ہی کیا تھا۔ بعض اوقات انسان کبھی احمقانہ باتیں کہہ دینے کے درپے

ہوتا ہے۔

ثومی دھیرے سے پلٹی۔ اور نرم قالین پر بے جوتے پاؤں رکھتی۔ ڈرائنگ روم کے صدر دروازے سے نکل کر برآمدے میں آ گئی۔

کلیم کی نظریں اس کے گلابی پیروں سے الجھتی رہیں۔ فرید بھی اسے جاتے ہوئے دیکھ کر مطمئن و مسرور نظر آ رہا تھا۔

"شکر ہے اس کا کام بن گیا۔" فرید نے سگریٹ ڈبیہ سے نکالتے ہوئے گہرا پھیپھڑا سانس لیا۔ کلیم نے یونہی سی نظروں سے فرید کو دیکھا۔ فرید کی خدا ترس اور نیک طبیعت سے وہ بڑا مرعوب ہوا۔ اک مالی کی بیٹی کے نوکری پانے پر وہ کتنا خوش تھا؟ یقیناً وہ اپنے نوکروں سے بھی محبت رکھتا تھا۔ اور ان کی فلاح و بہبود کے لیے کوشاں رہنے والا انسان تھا۔ کلیم کے دل میں فرید کی عزت کچھ اور بڑھ گئی۔ اس دور میں کوئی سرمایہ دار غریبوں کے سر پر یوں ہاتھ رکھے کچھ انہونی سی بات لگتی تھی۔

ثومی کے جانے کے بعد پھر کلیم کو یوں لگا۔ جیسے وہ لڑکی کمرے سے نہ گئی ہو۔ بہار کی رعنائیوں نے کروٹ بدل لی ہو۔ اس احساس پر وہ بھنا سا گیا۔ آخر یہ معمولی سی لڑکی بات بے بات کیوں اس کے اعصاب پر سوار ہو جاتی تھی۔ مانا کہ حسین تھی۔ لیکن تھی تو مالی کی لڑکی۔ اس کا اور کلیم کا کیا میل ایک صاحب حیثیت معزز اور باوقار ڈاکٹر اور معمولی ملازم کی خوبصورت بیٹی۔ ترازو کے دونوں پلڑے برابر ہونے چاہئیں۔ یہاں تو معاملہ بالکل الٹ تھا۔ مضحکہ خیز تھا۔ لیکن ان ساری سوچوں کی تہوں کے نیچے جو چیز کسل مندی سے کروٹیں لے رہی تھی۔ وہ اپنی حقیقت، اپنے وجود اور اپنی ہستی ہمہ وقت تسلیم کروا لیتی تھی۔ ورنہ اور کیا بات تھی۔ کہ وہ کسی نہ کسی طور اس کے متعلق سوچتا ہی رہتا۔ کبھی کانچ ایسے نازک بدن کی دلفریب قوسیں اور جاں گداز ابھار ذہن میں ہوتے تو کبھی بحر بیکراں کی سی وسعتیں سمیٹے صاف و شفاف آنکھیں جن کی تہہ میں کرب کے

طوفان تھے۔ ذہن کا احاطہ کیے رہتیں۔ وہ شکست تسلیم کرنے کو تیار نہ تھا۔ یہ دوسری بات ہے کہ وہ مات لمحے کے پہلے وار ہی میں کھا چکا تھا۔

"یہ لڑکی کون ہے۔؟" اس سوال کے پس پردہ جو جذبہ کارفرما تھا۔ یا تجسس اور جستجو کی جو تشنگی تھی۔ اسے تو فرید نے محسوس نہ کیا۔ ہاں اس سوال سے وہ کچھ چونک ضرور گیا۔ قدرے گھبراہٹ بھی طاری ہوئی۔ اسے یوں لگا۔ جیسے کلیم کی دوربیں نظروں نے اس کے اندر جھانک لیا ہے۔

"یہ ثومی ہے۔" فرید نے آہستگی سے کہا۔

"ثومی تو اس کا نام ہے۔" کلیم نے سگریٹ کی راکھ جھاڑتے ہوئے کہا۔ "مالی کی بیٹی ہے۔"

"ہا — ں — ہا — ں — مالی — کی بیٹی ہے —" فرید نے اپنی ہکلاہٹ سگریٹ کے لمبے لمبے کشوں میں چھپانے کی کوشش کی۔

کلیم کو فرید کی طرف دھیان دینے کی کہاں فرصت تھی۔ اس نے تو یونہی سوال کر دیا تھا یونہی — شاید کوئی تشنہ جذبہ تھا۔ کوئی بے بنیاد خواہش تھی۔ وہ اس جواب کا بھی آرزومند نہیں تھا۔ جو فرید کی طرف سے ملا تھا۔ وہ تو — وہ تو — شاید یہ سننے کی بے بنیاد خواہش رکھتا تھا۔ کہ فرید کہہ دے ثومی مالی کی بیٹی نہیں۔ ہمارے قریبی عزیزوں میں ہے۔ کتنی فضول کیسی عبث خواہش تھی اس کی۔ فرید کے جواب سے اسے ذہنی کوفت بھی ہوئی تھی۔

لیکن جب اس نے اس کوفت کو محسوس کر کے سوچا تو پھر اپنے آپ پر غصہ آیا "کیا وہ اس لڑکی سے محبت کرنے لگا ہے؟" اس نے یہ سوال اپنے آپ سے کہا۔

"ہاں ہاں" اثبات میں اس کا رواں رواں پکار اٹھا۔

"نہیں — نہیں — ایسا نہیں ہو سکتا۔" اس نے پوری قوت سے اس پکار کی مدافعت کی۔

مالی کی لڑکی سے محبت کا کیا سوال ـــ لیکن لیکن ـــ

وہ اس فرضی انتشار سے خاصہ پریشان ہو گیا۔ وہ تو خوش قسمتی سے سلمیٰ اور بیگم افضال اندر آ گئیں۔ ورنہ جانے اس کی پریشانی کا راز فریدہ پر کھل ہی جاتا۔

سلمیٰ اور بیگم افضال کی آمد کو فریدہ نے بھی غنیمت جانا۔

ورنہ اسے ڈر تھا۔ کہ

کہیں کلیم ثومی کے بارے میں کچھ اور نہ پوچھ بیٹھے۔

ـــ ۲ ـــ

کپڑے استری کرنا تھے۔ اماں نے ثومی کو بلا بھیجا۔ چھوٹے موٹے کام وہ جس خوش اسلوبی سے انجام دیتی تھی۔ اماں کا آدھا بوجھ بٹ گیا تھا کلیم کو تو ثومی سے بقول اماں خواہ مخواہ کی چڑ تھی۔ انہوں نے اب یہی سوچا تھا۔ کہ اس کی غیر حاضری میں ثومی سے کام لے لیا کریں۔ یوں بھی تنہائی میں اکتا جاتی تھیں۔ ثومی کے ساتھ اگلی پچھلی باتیں بھی کر لیتیں اور کام بھی لیتیں۔ وقت اچھا گزرتا۔ اور کلیم کو بھی اعتراض کا موقع نہ ملتا۔

اب ثومی نے دو چار دنوں سے سکول جانا شروع کر دیا تھا۔ مصروفیت بڑھ گئی تھی۔ لیکن وہ کسی نہ کسی طرح کچھ وقت اماں کے کام میں ہاتھ بٹانے کو نکال ہی لیتی تھی۔ آج بھی کپڑے استری کرنے آئی تھی۔ دوپہر کے سائے ڈھل رہے تھے کلیم آج ہسپتال سے تا حال لوٹا نہیں تھا۔ اماں اپنے پلنگ پر لیٹی تھی۔ اور ایک کونے میں استری کے کپڑے لیے ثومی اپنے کام میں مشغول تھی۔ درمیانے سے میز پہ برقی استری رکھی تھی۔ ایک طرف پانی لگا کر کپڑے رکھے تھے۔ اور دوسری طرف استری کیے ہوئے۔

اماں باتیں کرتے کرتے اونگھ گئی تھیں۔ ثومی خاموشی سے اپنا کام کر رہی تھی۔ دو ساٹن کی سلواریں۔ تین قمیضیں اور ایک دوپٹہ استری کر لیا تھا۔ ابھی تین چار کپڑے باقی تھے۔ ان کپڑوں میں کلیم کی بوسکی کی قمیض بھی تھی۔ جسے اماں نے گھر پہ ہی دھلوا کر استری کروانے کو اسے دیا تھا۔ دھوبی کئی دنوں سے آیا ہی نہیں تھا۔

ورنہ کلیم کے کپڑے تو دھوبی ہی سے دھلتے تھے۔

ثومی نے قمیض میز پر پھیلائی۔ تو اس کی حالت کچھ عجیب سی ہونے لگی۔ قمیض کو چھونے سے خدا جانے کیوں کلیم کی قربت کا احساس ہونے لگا تھا۔ کچھ شرمائی کچھ گھبرائی۔ قمیص کو چھوتے ہوئے ذہن میں رنگا رنگ دائروں کا رقص ہونے لگا۔ خیالات بہکنے لگے۔ مستانہ اور خوشبودار ہواؤں کا احساس ہونے لگا۔ اس نے کئی بار قمیص کو دونوں ہاتھوں میں بھینچ لیا۔ اور کئی بار گھبرا کر پرے ہٹا دیا۔

کئی لمحوں کی جنونی سی کیفیت کے بعد اس نے میز پر قمیض پھیلا کر بڑے پیار سے استری کرنا شروع کی۔ کتنا لطف آ رہا تھا اسے اس کام میں یوں لگ رہی تھی جیسے داسی دیوتا کے چرنوں میں خدمت کا نذرانہ پیش کر رہی ہے۔ اماں اونگھتے اونگھتے گہری نیند سو گئیں۔ ان کے خراٹے ثومی کے کانوں میں پڑے۔ اپنے حسین تصورات کے تانے توڑ کر اس نے مڑ کر دیکھا۔ اس کے لبوں پر اماں کے عمر کے وقت بے وقت سو جانے کے بے رحم تقاضوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

گردن موڑ کر پھر وہ استری کرنے کو تھی۔ کہ اس کا ہاتھ استری پر رکھا رہ گیا۔ اندرونی کمرے میں کھلنے والے دروازے میں کلیم کھڑا تھا۔ اس کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ اب نہیں آیا۔ اس کی نظروں کا انہماک ثومی کے دیکھنے پر جس بری طرح ٹوٹا۔ اور وہ جس طرح گھبراہٹ سے دوچار ہوا۔ یہ اس کی ذہنی چوری کے غماز تھے۔

ثومی نگاہوں کے طلسم میں اس طرح الجھی کہ احساس ہی نہ رہا۔ کہ گرم گرم استری قمیص پر رکھی ہوئی ہے۔

"اماں سو گئیں۔" کلیم نے آہستگی سے پوچھا۔ وہ اپنی کیفیت چھپانے کو باتیں کرنا چاہتا تھا۔

"جی۔" ثومی نے اپنی بڑی بڑی ساحرانہ آنکھوں سے کلیم کی طرف دیکھا۔

وہ دو قدم آگے بڑھ گیا۔

"تم نے سکول جانا شروع کر دیا ہے۔" کلیم نے سیاہ چشمہ ہاتھ میں گھماتے ہوئے پوچھا۔

"جی۔" وہ سر جھکاتے ہوئے بولی۔

"پھر اماں کے کاموں کے لیے وقت کیسے نکال لیتی ہو۔" کلیم نے اس کی طرف دیکھے بغیر کہا۔

وہ بڑے ہی دل نواز طریق سے مسکرائی۔ اور رخ استری کی جانب پھیر لیا۔

"آ — اوہ —" اس کے لبوں سے بے ساختہ آواز نکلی۔ دوسرے لمحے اس نے گھبراہٹ سے پھٹ جانے والی نگاہوں سے کلیم کو دیکھا۔ اس کا رنگ اڑ گیا تھا۔ اور چہرے پر خوف و ہراس کے سایے ڈول گئے تھے۔

"کیا ہوا؟" کلیم اس کے قریب آ گیا۔

"یہ — یہ — قمیض —" ثومی کے ماتھے پر پسینے کی بوندیں چمک اٹھیں وہ اپنے دونوں ہاتھوں کو جھٹک جھٹک کر مسل رہی تھی۔

کلیم کی نظر قمیص پر پڑی۔ استری ایک ہی جگہ پڑے رہنے سے قمیض پر جلنے کا داغ پڑ چکا تھا۔ ظاہر ہے کہ قمیض بیکار ہو گئی تھی۔ نقصان تو تھا ہی۔ لیکن نقصان ہوا جس کا فرد اسے تھا۔ اسے کہہ بھی کیا سکتا تھا۔ کہنا مناسب بھی تو نہ تھا۔ وہ تو خود ہی ہراساں ہو رہی تھی۔ خوف سے بدن پر کپکپی طاری تھی۔ نگاہیں پھٹ رہی تھیں۔ اور رنگ فق تھا۔

کلیم کی نگاہیں قمیص سے ہٹیں۔ تو ثومی کے چہرے پر آن رکیں۔ سہمی ہوئی یہ لڑکی تو کھلا ہوا چیلنج تھی۔ کلیم کی مدافعتی قوتیں اور خود ساختہ محاذ ٹوٹ پھوٹ گئے

"کوئی بات نہیں۔" اس نے قمیض سمیٹ کر اٹھا لی۔ پھر اس کی فطری شوخی عود

کر آئی مسکراتے ہوئے ثومی کو دیکھا۔ تم نے شاید مجھے بھی کوئی فرید صاحب سمجھا ہے۔ غریب آدمی ہوں۔ اتنا زیادہ نقصان کر دیا۔

"جی۔ جی۔ میں" ثومی کی پلکیں لرزنے لگیں۔

"چلو جو کچھ ہوا ٹھیک ہوا" اس نے کہا۔ اور پھر سرگوشی کے انداز میں بولا۔ "اماں سے نہیں کہنا۔ ورنہ شامت آجائے گی" ثومی نادم ہو کر جیسے زمین میں گڑی جا رہی تھی۔

"اماں کے کپڑے احتیاط سے کرواستری۔ اور ہاں آئندہ میرے کپڑوں پر نظر عنایت نہ ہی کرنا تو اچھا ہوگا۔" کلیم خوش دلی سے کہتے ہوئے قمیص کو گول مول کر کے کمرے سے چلا گیا۔

ثومی سہمی ہوئی نگاہوں میں عقیدت کا رنگ لیے اسے جاتے دیکھتی رہی۔ رات آج کا واقعہ ثومی کی آنکھوں میں رنگا رنگ خواب بن کر اترتا رہا۔ کس فراخ دلی سے کلیم نے اس کا قصور معاف کر ڈالا تھا۔ چاہتا تو جھڑک سکتا تھا۔ بُرا بھلا کہہ سکتا تھا لیکن اس نے ایسی کوئی بات بھی تو نہیں کی۔ وہ تو مسکرا رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں تو شوخی کی چمک تھی۔ اس نے کیوں کچھ نہ کہا۔ کیوں نہ ڈانٹا۔ کیوں نہ کوسا۔ کیوں نہ ہرجانہ لینے کی دھمکی دی۔ امیروں کا تو یہ قاعدہ ہے۔ نقصان کا ہرجانہ لے لیتے ہیں۔ نہ لیں تو ڈانٹ تو ضرور ہی دیتے ہیں۔ اس لیے سلمیٰ سے بارہا سننے کو سنے یاد آ رہے تھے۔

کلیم ان سے کتنا منفرد اور کتنا عظیم تھا۔

رات کلیم کی آنکھوں میں بھی آج کا ہی واقعہ بکھر رہا تھا۔ اس نے اتنا نقصان بڑی فراخدلی سے برداشت کر لیا تھا۔ وہ بستر پر لیٹا تھا۔ مڑی تڑی بوسکی کی قمیص اس نے سینے پر کھلی تھی۔ کئی بار وہ جلی ہوئی جگہ کو پھیلا کر دیکھ چکا تھا۔

"کم بخت نے جلائی بھی عین دل کی جگہ پر سے ہے۔" وہ ہر بار جلے ہوئے داغ

کو دیکھ کر مسکراتے ہوئے سوچ رہا تھا۔ یہ سوچیں بڑھتی پھیلتی جا رہی تھیں لیکن آج ان سوچوں سے وہ پریشان ہو رہا تھا۔ نہ الجھ رہا تھا۔ بلکہ یہ سوچیں اپنی انفرادیت کے باعث دلچسپ اور خوش گوار تھیں۔ آج اس کی ذات اس کی شخصیت — آئینے کی طرح شفاف ہو کر نظروں کو دعوتِ نظارہ دے رہی تھی۔ وہ اپنے آپ کو اچھی طرح جان گیا تھا۔ اسے محسوس ہو رہا تھا۔ کہ اب تک وہ اپنی ذات کو دھوکہ دیتا رہا ہے ثومی کو وہ شدت سے چاہنے لگا ہے۔ وہ اس کے حواس پر پوری طرح سے چھائی ہوئی ہے۔ اس کے دل میں اتر چکی ہے۔ اس کی روح میں بسی ہوئی ہے۔ یہ سارے انکشاف اسے آج ہوئے تھے۔

رات وہ خواب میں رنگ برنگے پھول دیکھتا رہا۔ مہک میں یکتا۔ شکل میں انوکھے حسن میں لاجواب۔ چھوٹے بڑے پھول خوابوں کو مہکاتے رہے۔ صبح جب نتھو اس کے لیے چائے کی پیالی لے کر آیا۔ تو وہ غنودگی میں تھا۔ اور یوں سانس لے رہا تھا جیسے کوئی انوکھی مہک سونگھ رہا ہو۔

"صاحب چائے" نتھو نے چائے میز رکھتے ہوئے کہا۔

"وہ — پھول — پھول۔" کلیم بڑبڑایا۔

"جی صاحب۔ چائے لایا ہوں صاحب۔" نتھو جھکتے ہوئے بولا۔

"اوہ — اچھا۔ چائے لائے ہو۔" کلیم بیدار ہوتے ہوئے بولا۔

"آپ کچھ لوگوں کا کہہ رہے تھے صاحب جی۔ میں نے مالی سے پھولوں کا کہہ رکھا ہے۔ آج گلدانوں میں تازہ پھول سجاؤں گا۔ فرید صاحب کے ہاں بڑے بڑے خوبصورت پھول ہیں۔ مالی لا دے گا۔"

"واقعی۔ فرید صاحب کے ہاں بڑے بڑے خوبصورت پھول ہیں۔" کلیم شوخ نظروں سے نتھو کو دیکھ کر بولا۔ نتھو بدھو سا تھا۔ اس شوخ نگاہی کو سمجھ نہ

"جی صاحب؟" نتھو نے کلیم کو دیکھا۔

"کچھ نہیں۔ جاؤ کام کرو۔" کلیم نے بستر میں اٹھتے ہوئے پیالی اٹھالی۔

"اچھا صاحب۔" نتھو جانے کو مڑا۔

"ناشتہ آج ذرا پہلے تیار کرنا۔ مجھے ساڑھے سات ہسپتال پہنچنا ہے" نے کہا۔

"بہتر جناب" وہ کمرے سے نکل گیا۔

کلیم گھونٹ گھونٹ چائے حلق میں اتارتے ہوئے رات کے بیتے لمحوں کو سوچنے لگا۔ وہ جانتا تھا۔ مالی کی نسبت سے ثومی اسے پھول کے روپ میں نظر آتی رہی ہے۔ ثومی۔ کانچ ایسے نازک بدن کی حسین لڑکی۔ مالی کی دختر۔ اس کا سکون لوٹ لے گئی تھی۔ اس نے اس جابر حسن کے سامنے آج ہتھیار ڈال دیے تھے۔

اس دن شیو کرتے وقت وہ آئینے میں اپنی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھ رہا تھا "کہو میاں کلیم۔ کیا خیال ہے۔ یہ لڑکی تو پیچھا چھوڑنے سے رہی کمال تو یہ ہے۔ کہ وہ پیچھا کرتی بھی نہیں اور پیچھا چھوڑتی بھی نہیں۔ اچھی طرح سوچ لو ڈاکٹر صاحب۔ وہ مالی کی بیٹی ہے مالی کی۔ ایک ادنیٰ ملازم کی بیٹی۔ وہ حسن میں لاثانی سہی، کشش و دجاذبیت میں یکتا سہی۔ لیکن ہے مالی کی بیٹی۔ سمجھے کلیم میاں۔ مالی۔ جس کا خاندان ہے نہ حسب و نسب کے ساتھ کوئی شان وابستہ ہے۔ جو تمہارا ہم پلہ نہیں۔ ہم مذاق نہیں۔ تم ڈاکٹر ہو۔ ایک باوقار خاندان کے فرد ہو۔ مالی استحکام رکھتے ہو۔ عزت والے ہو۔ اس لڑکی کی طرف کھنچے چلے جانا بہت آسان ہے۔ لیکن اسے کھینچ کر اپنے برابر کر لینا بہت مشکل۔ کیا اس لڑکی کی خاطر تم لوگوں کی طنز بھری باتیں سن لوگے زمانے کی تحقیر بھری نظروں کا مقابلہ کر سکو گے۔"

شیو کرتے کرتے اس کا ہاتھ رک گیا۔ ٹھوڑی کے قریب ذرا سا کٹ لگ جانے

سے لال لال خون رس آیا تھا۔

کلیم نے گردن میں پڑے تولیے کے کنارے سے خون پونچھا۔ پھر آئینے پر اس کی نظریں اپنی نظروں سے ٹکرا گئیں۔ "کیا اس لڑکی کی خاطر سب کچھ گوارا کرنے کی ہمت رکھتے ہو کلیم میاں۔"

"یقیناً" ۔ "یقیناً" ۔ یہ اس کی روح کی آواز تھی۔ دل کا فیصلہ تھا۔

کلیم کے لبوں پر بڑی ہی دلفریب اور دلنواز مسکراہٹ بکھر گئی۔ آنکھوں میں نشہ سا اترنے لگا۔ دل پر ہاتھ رکھتے ہوئے شوخی سے بڑبڑایا۔ "واہ میاں بڑے بڑے بیباک، بڑے نڈر ہو۔ استاد جذباتی فیصلے کر تو آسانی سے لیے جاتے ہیں۔ جب ان سے نباہ کرنا پڑتا ہے۔ تو دن میں تارے نظر آنے لگتے ہیں تارے ــــ کو اس بات کے لیے تیار رہنا۔"

"بالکل۔ قطعاً" ۔ "یہ دل کا فیصلہ تھا۔

"چلو۔ مان گئے تمہاری بات ۔" کلیم نے پھر دل پر ہاتھ رکھا "ہم بھی تمہارے فیصلے پر سرنگوں کرتے ہیں۔"

اس نے واقعی سر جھکا دیا۔ ہاتھ کھلے چھوڑ دیے اور پھر مسکراتے ہوئے اپنے آپ سے گویا ہوا "جو ہوگا دیکھا جائے گا۔ ثومی ہم ہار مان گئے تجھ سے ــــ تم جو کچھ بھی ہو۔ دل میں سما جانے کے قابل ہو۔"

شیو کر کے وہ گنگناتا ہوا غسلخانے میں گھس گیا۔

ــــ

روز بس سے سکول آتی جاتی تھی۔ فرید نے اسے بس کا پاس بنوا دیا تھا۔ بس

ثومی کوٹھی کے پچھلے احاطہ سے ملنے والی سڑک پر رکتی تھی۔ بڑے سکون

واطمینان سے اس نے اپنی نئی زندگی کا آغاز کیا تھا۔ برسوں کے مسلط اندھیرے

اب چھٹنے کے قریب آ گئے تھے۔ اس نے اپنے بے رنگ خوابوں کی خوبصورت تعبیر

کے کئی منصوبے بنا ڈالے تھے۔ کوٹھڑی سے ملحقہ کوٹھڑی نما کمرہ فرید نے ازراہ عنایت

اسے سلمیٰ سے دلوا دیا تھا۔ اس کمرے کا دروازہ پچھلے احاطے کی طرف کھلتا تھا۔ فی الحال

اس میں ثومی کا ٹوٹا پھوٹا صندوق اور ایک چارپائی ہی تھی۔ تربیتی کورس پر جانے سے

پہلے جو کپڑے فرید نے بنوا کر دیے تھے۔ اور جو بستر اس نے سلمیٰ سے کہہ کر بنوا دیا تھا۔

اس کی کل کائنات تھے۔ لیکن اس کمرے کو سجانے کا خیال ثومی کو ہر وقت رہتا تھا۔

اپنی تنخواہ سے تھوڑی تھوڑی رقم کاٹ کر وہ اس کمرے کو اس قابل ضرور بنا دینا چاہتی

تھی۔ کہ کسی شریف انسان کے رہنے کی جگہ سمجھی جا سکے۔ اپنی کم مائیگی کا احساس اسے

ہمیشہ رہا تھا۔ جب سے کلیم جیسے انسان کے لیے دل کے پٹ وا ہوئے تھے۔ یہ

احساس بری طرح ڈسنے لگا تھا۔ لاشعوری طور پر وہ اپنے آپ کو اس سطح سے اوپر

اٹھا کر کلیم تک لانے کی خواہش مند تھی۔

کلیم کی اماں اس سے جو کام بھی لیتی۔ معاوضہ ضرور دیتی۔ گو یہ معاوضہ ثومی نے کبھی بھی

نہ لیا۔ ہمیشہ مخلصانہ خدمت کے لیے تیار رہی۔ لیکن جیراں اسے بتائے بغیر اماں

سے مزدوری کی رقم وصول کر لیتی۔

ثومی کے شب و روز بس گزر رہے تھے۔ سکول جانے آنے سے اس کے دکھ

رکھاؤ میں خاصہ فرق آ گیا تھا۔ ٹھہری ہوئی طبیعت تو شروع ہی سے تھی۔ رکھ رکھاؤ نے

چار چاند لگا دیئے۔ اسے دیکھ کر گمان بھی نہ ہوتا تھا۔ کہ وہ اک ادنیٰ حیثیت کے مالی

کی لڑکی ہے۔

اس دن بس میں بڑی بھیڑ تھی۔ قریب ہی کسی جگہ میلہ لگا تھا۔ اس لیے لوگوں کی

تعداد ایکا ایکی بڑھ گئی تھی۔ دو بسیں بھیڑ زیادہ ہونے کی وجہ سے نکل گئیں۔ تیسری پر ثومی

ہمت کر کے سوار ہو گئی۔ سکول سے نکلے اسے گھنٹہ بھر ہو چکا تھا۔ وہ گھر وقت پر پہنچنے

کی عادی تھی۔ آج دیر ہو جانے سے وہ پریشان ہو رہی تھی۔

بس میں کھڑے ہونے کی بمشکل جگہ مل سکی۔ کھڑکی کے شیشے پر اپنا سارا بوجھ ڈالے

وہ اپنی دو کتابیں سینے سے لگائے کھڑی تھی۔ بس کے پچھلے حصہ میں جگہ کے لیے لڑائی

ہو رہی تھی۔ دو دیہاتی لمبی لمبی چھڑیاں لیے اس طرح کھڑے تھے۔ کہ چھڑیوں کے اگلے

پچھلے حصے مسافروں کے منہ پر لگ رہے تھے۔ لڑائی اسی بات پر ہو رہی تھی۔ اچانک

ایک مسافر نے دوسرے کو دھکا دیا۔ وہ خود تو گالی گلوچ بکنے لگے۔ لیکن ادھر چھڑی

اس شیشے سے جا لگی۔ جس کے سہارے ثومی کھڑی تھی۔ شیشہ ٹوٹ گیا۔ اور ثومی کے

سنبھل کر کھڑے ہونے سے پہلے اس کے بائیں ہاتھ میں کئی کرچیاں چبھ گئیں۔ اور لال

لال خون بہنے لگا۔

ہائے وائے ہوئی۔ سیٹ پر بیٹھی عورت کے بچے کو بھی شیشے کی کرچی لگی۔ کنڈکٹر

آیا۔ لوگوں نے چھڑی والوں کو لعن طعن کی۔ کسی نے ثومی سے اظہار ہمدردی کرتے ہوئے

دیہاتیوں کو گالیاں دیں۔ خوب شور مچا۔ بس رک گئی۔ چھڑی برداروں کو نیچے اتار

دیا گیا۔

ثومی نے اپنے ململ کے دوپٹے میں اپنے خون آلود ہاتھ کو لپیٹ لیا۔ گھر تھوڑی

ہی دور رہ گیا تھا۔ درد کو کمال ضبط و ہمت سے برداشت کیا۔ لوگوں کی ہمدردیوں کو اس نے شکریے کے ساتھ لوٹا دیا۔

خون رس رس کر سفید دوپٹے کو داغ داغ کر رہا تھا۔ ثومی گھر پہنچ کر ہی زخم دیکھنا چاہتی تھی۔ اس لیے دوپٹے کو ہاتھ پر لپیٹے گئی۔

اتفاق ہی کی بات ہے۔ کہ جب ثومی کوٹھی کے احاطے میں داخل ہوئی۔ تو فریدہ برآمدے کی سیڑھیاں اتر کر آ رہی تھی۔ رسمی علیک سلیک کے بعد ثومی آگے بڑھی۔ تو فریدہ کی نظر اس کے ہاتھ پر لپیٹے ہوئے دوپٹے پر پڑی۔ جو لال لال دھبوں سے داغدار تھا۔

"ہاتھ کو کیا ہوا۔" اس نے آگے بڑھ کر پوچھا۔

"زخمی ہو گیا۔" ثومی بولی۔

"کیسے ۔۔۔؟" فریدہ نگاہ زخم سے اس کا ہاتھ دیکھنے لگی۔

"بس میں شیشہ ٹوٹ کر لگ گیا۔"

"زیادہ ہی زخم آیا ہے؟"

"پتہ نہیں۔ جا کر دیکھتی ہوں۔"

"دوپٹہ تو خون خون ہو رہا ہے۔"

ثومی مسکراتے ہوئے قدم اٹھانے لگی۔

"کھولو تو ذرا۔" فریدہ نے اسے روکتے ہوئے کہا۔

"گھر جا کر کھولوں گی۔"

"اے پگلی! زخم زیادہ ہوا تو۔۔۔"

"پٹی باندھ لوں گی۔"

"خود ہی؟"

"ہاں۔"

"ڈاکٹر صاحب سے پٹی کروا لو نا۔"

"نہیں۔ میں خود ہی کر لوں گی۔"

"پگلی ۔۔۔ گھر میں ڈاکٹر موجود۔ اور پٹی خود کر لے گی۔ آمین تجھے ڈاکٹر صاحب کے پاس لے چلوں۔ وہ ہسپتال سے آ چکے ہیں۔"

"نہیں فریدہ بی بی۔"

"پاگل نہ بنو۔ آؤ۔ دیکھو تو کتنا خون نکل گیا۔"

فریدہ کا جی خود ڈاکٹر کے پاس جانے کو چاہ رہا تھا۔ کئی دنوں سے ڈاکٹر سے مل بیٹھنے کا موقع نہ ملا تھا۔ وہ روز ہی ملتا تھا۔ لیکن یہ نہ ملنا کچھ اکھڑا اکھڑا سا ہوتا۔ فریدہ ثومی کے بہانے ڈاکٹر کے پاس اسی وقت جانا چاہتی تھی۔

ثومی اس زخم کو کوئی اہمیت دینے کو تیار نہ تھا۔ لیکن فریدہ اسے ہاتھ سے پکڑ کر تقریباً گھسیٹتے ہوئے اسے کلینک کی طرف لے گئی۔

کلینک بند تھا۔ وہ ڈرائنگ روم کی طرف بڑھی۔ دروازے پر بڑے پیار سے تھپکی دی۔ حالاں کہ اس نے کمرے میں کلیم کو دیکھ لیا تھا۔

"کون؟" کلیم کی آواز آئی۔ فریدہ مسکرائی۔ اور ثومی کا دل دھڑک گیا۔

"مریض۔" فریدہ نے شوخی سے ثومی کو دیکھ کر کہا۔

ثومی کا دل اچھل کر جیسے حلق میں آ گیا۔

دروازہ کھول کر کلیم نے فریدہ کو دیکھا۔ اور پھر اس کی نظر ثومی پر پڑی۔

فریدہ کھلکھلا کر ہنس دی۔ "آپ سمجھے ہوں گے۔ کوئی فیس والا مریض آیا ہے۔ لیکن یہاں مفت کے بیمار ہیں صاحب۔"

فریدہ کی ذو معنی بات کلیم نے سمجھ کر بھی نا سمجھی کا سہارا لیا۔ "مفت نہیں، ڈبل فیس لوں گا آپ سے۔"

"نہیں بابا۔ میں تھوڑی بیمار ہوں۔"

"تو اور ۔۔۔"

"یہ ثومی ۔۔۔ ہاتھ زخمی کر آئی۔"

"کیسے؟"

کلیم کے اس لفظ کے عجلت میں ادا کرنے میں گھبراہٹ کا جو پہلو تھا۔ وہ فریدہ نے تو محسوس کیا یا نہیں۔ ثومی کی روح کے تار اس سے ضرور جھنجھنا اٹھے۔

"آئیے۔" اس نے فریدہ کی بجائے ثومی کو دیکھا۔

آگے آگے فریدہ اور پیچھے ثومی کمرے میں داخل ہوئیں۔

"کیسے زخمی ہوا ہاتھ۔" کلیم نے پوچھا۔

"بس کا شیشہ ٹوٹ کر لگا۔" ثومی کی بجائے فریدہ نے جواب دیا۔

"اوہو۔" کلیم خون آلود دوپٹے کو دیکھ کر بولا۔ ثومی سر جھکا کر کھڑی ہو گئی۔

"بیٹھئے" اس نے قدرے توقف کے بعد کہا۔

فریدہ صوفے پر بیٹھ گئی۔ لیکن ثومی کھڑی رہی۔

کلیم نے اسے دوبارہ بیٹھنے کو نہیں کہا۔ ثومی اپنی حیثیت سے آگے بڑھ گئی تھی۔ اس بات سے کلیم کو کچھ ذہنی بے چینی سی ہوئی۔

اس نے نفو کو کلینک کھولنے کے لیے پکارا۔ جب وہ آیا تو کلیم نے فوراً پانی کلینک میں پہنچانے کا کہا۔

فریدہ کی باتوں کی آواز سن کر ساتھ والے کمرے سے اماں بھی آ گئیں۔ دونوں نے بزرگ خاتون کو مؤدبانہ سلام کیا۔

ثومی کا زخمی ہاتھ دیکھ کر اماں نے بھی افسوس ظاہر کیا۔ اور پھر احتیاط سے بس چڑھنے اترنے کی تلقین کی۔ اماں فریدہ کے قریب صوفے پر بیٹھ کر بڑی محبت

اس سے باتیں کرنے لگیں۔

"آئیے۔" کلیم نے ثومی سے کہا۔

ثومی گھبرائی۔

"آئیے آئیے ۔۔۔" کہتے ہوئے کلیم درمیانی دروازے سے دوسرے کمرے میں چلا گیا۔

"جاؤ پٹی کروا لو۔ کہیں زخم زیادہ ہی نہ آ گیا ہو۔" اماں نے حلیمی سے کہا۔

ثومی جھجکتے ہوئے دروازے کی طرف بڑھی۔ فریدہ نے بھی اٹھ کر ڈاکٹر کے پیچھے جانا چاہا۔ لیکن اماں نے اسے باتوں میں لگا لیا۔ فریدہ کو فرماں برداری کے اظہار کے لیے رکنا پڑا۔

دوسرے دروازے سے ثومی کلینک میں داخل ہوئی۔ کلیم پٹی کی چیزیں نکال رہا تھا۔ کاٹن پٹی اور دوائی نکال کر اس نے میز پر رکھ دی۔

ثومی دروازے ہی میں کھڑی رہی۔

کلیم نے اس کی طرف دیکھا۔ "آ بھی جاؤ۔" اس نے جھجکتی گھبراتی ثومی سے کہا۔

ثومی بے آواز قدموں سے اندر آ گئی۔

"بیٹھ جاؤ" کلیم نے میز کے قریب رکھی کرسی کی طرف اشارہ کیا۔ ثومی تو ثومی خود اس کی اپنی حالت بھی عجیب سی ہو رہی تھی۔ وہ ثومی کو چھونے سے کچھ ڈر سا رہا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے پہلے ہی لمس سے اس کا راز افشا ہو جائے گا۔

راز! ۔۔۔ جو وہ ابھی اپنے آپ سے بھی پوشیدہ رکھنا چاہتا تھا۔

ثومی کرسی پر بیٹھ گئی۔ کلیم نے سگریٹ سلگا لیا۔ ذہنی ہلچل کو سگریٹ کے دھوئیں میں اڑانا قدرے آسان تھا۔ ثومی سر جھکائے بیٹھی تھی۔ اور وہ بند بند آنکھوں سے دھوئیں کی آڑ میں سے اسے وارفتگی کے عالم میں تکے جا رہا تھا۔

وقت کے دل کی دھڑکنیں جیسے تھم گئی تھیں۔

خاموشی صبر آزما تھی۔

کئی لمحے بے جان بے سکت گزر گئے۔

ثومی کا دل گھبراہٹ کے مارے اچھل اچھل کر رہ گیا تھا۔ ہاتھوں میں سنسناہٹ ہونے لگی تھی۔ بڑی ہمت و جرأت سے اس نے سر اٹھایا۔ نظریں جھکی ہوئی تھیں۔ دو فٹ کے فاصلے پر کلیم میز کے ساتھ لگا کھڑا تھا۔ اس کے چمکیلے بوٹوں پر خاکی کلر پتلون کے پائنچے ثومی دیکھ رہی تھی۔

وہ کھڑا کیا کر رہا تھا اسے قطعاً علم نہ تھا۔ غالباً کچھ پڑھ رہا تھا۔ یا ورق گردانی کر رہا تھا۔ ثومی نے نگاہیں دھیرے دھیرے اٹھائیں۔ پتلون سے ہوتی ہوئی نظریں سپید قمیص کے کھلے گریبان تک آئیں۔ پھر ایک دم اس نے کلیم کی طرف دیکھا۔

کلیم عالم وارفتگی میں اسے ہی دیکھنے میں محو تھا۔

نظروں کے ٹکراؤ سے وہ سٹ پٹا گیا۔ ایک دم جلتا ہوا سگریٹ ایش ٹرے میں ڈال کر وہ اپنے قدموں پر گھوم گیا۔ اور قدم بڑھا کر کھڑکی کے سامنے کھڑا ہو گیا۔

ثومی اس کی پشت کو دیکھنے لگی۔ کئی لمحے اور گزر گئے۔

ثومی تنہائی میں کلیم کے ساتھ اتنی دیر اس جگہ گھبرانے لگی تھی۔ حالانکہ فاصلہ لمحوں کا تھا پھر بھی اسے یوں لگ رہا تھا جیسے یہاں آئے اسے اک زمانہ بیت گیا ہے۔

"پٹی کر دیجئے۔ ڈاکٹر صاحب ——" بالآخر سکوت کو ثومی ہی نے توڑا۔ اسے ڈاکٹر کی ذہنی کیفیت سے آگہی تھی۔ نہ اس کے جذبات کا علم۔ اک جوان مرد اسے خواہ مخواہ ایک ایسا یوں بٹھائے رکھا —— یہ اسے گوارا نہ تھا۔

کلیم شائستگی سے مڑا۔ "نتھو پانی لے آئے تو —— کئے دیتا ہوں۔" کلیم نے اپنی نظروں سے اسے دیکھا۔ کہ ثومی کی روح کے تار ایک بار پھر جھن جھنا اٹھے۔

نتھو پانی لے آیا۔ کلیم نے پیالہ لے لیا۔ میز پر پیالہ رکھتے ہوئے اس نے نتھو کو سر کے اشارے سے جانے کا کہا۔

کچھ کہے بغیر کلیم نے ثومی کا ہاتھ پکڑنے کو اپنا ہاتھ بڑھا دیا۔ ثومی خون آلود دوپٹہ ہاتھ سے ہٹانے لگی۔

دو ایک جگہ تو معمولی خراشیں تھیں۔ لیکن ایک جگہ انگوٹھے کے نیچے ہتھیلی پر کافی زخم لگا تھا۔ اس زخم سے اب بھی خون رس رہا تھا۔ اور ثومی کے ہاتھ کی ریکھوں میں بھر رہا تھا۔

قدرے تذبذب کے بعد ثومی نے اپنا ہاتھ آگے کر دیا۔ اور ایسے ہی تذبذب کے ساتھ کلیم نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

لیکن ہاتھ کا ہاتھ سے چھونا تھا۔ کہ دونوں نے اپنی اپنی جگہ اک جھٹکا سا محسوس کیا دونوں نے اپنا اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔

کلیم کے لبوں پر بڑا ہی فرحت بخش تبسم لہرا گیا۔ اور ثومی کی جبین نم ہو گئی۔ جلتا ہوا سگریٹ ایش ٹرے سے اٹھا کر کلیم نے پھر ہونٹوں میں دبا لیا۔ پانی میں ڈیٹول کے چند قطرے ٹپکائے۔ آگے کو جھکا۔ اور ثومی کا ہاتھ پکڑ کر زخم دیکھنے لگا۔

"یہ معرکہ کیسے مارا۔" اس نے متبسم نظروں سے ثومی کو دیکھا۔ اپنی ہیجانی کیفیت پر وہ اب پوری طرح قابو پا چکا تھا۔

ثومی کسمسا کر رہ گئی۔ اب تو کلیم کی طرف دیکھنے کی اس میں قطعاً ہمت نہ رہی تھی۔

کلیم روئی سے زخم کو صاف کرنے لگا۔ اس کے ہاتھ میں ثومی کا ہاتھ تھا۔ ہاتھ جو خوبصورتی میں مسلّم تھا۔ گداز سا ہاتھ جو مسلسل کام کرنے سے کہیں کہیں سے سخت بھی ہو گیا تھا۔ انگلیوں کے سرے کچھ پھیل سے گئے تھے۔ ہتھیلی پر ریکھوں کی کثرت تھی۔ اور ناخن ٹیڑھے میڑھے ہو رہے تھے۔

اپنی خوبیوں اور خامیوں سمیت یہ ہاتھ کلیم کو کس قدر محبوب تھا۔ غیر ارادی طور پر

اس کی گرفت ہاتھ پر سخت ہو گئی۔

ثومی نے گھبرا کر اس کی طرف دیکھا۔ نادم ہو کر کلیم نے ہاتھ ڈھیلا چھوڑ دیا۔ زخم پر دوائی لگا کر بینڈیج رکھا۔

ثومی نے اس کی نگاہوں کا مفہوم پا لیا۔ اس کا دل بری طرح بے قابو ہو کر دھڑکا۔ نگاہوں میں نیلے پیلے دھبے رقص کرنے لگے۔

کلیم بڑے اطمینان سے پٹی کر رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں تند و تیز شراب کا نشہ لہرانے لگا تھا۔

کلیم نے پٹی کر کے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ ایک دم نہیں۔ آہستہ آہستہ۔ دھیرے دھیرے۔ ثومی نے بھی ہاتھ چھڑانے کی بظاہر کوئی عجلت ظاہر نہ کی۔ وہ تو جیسے میٹھے میٹھے پانی کی جھیل میں ڈوبتی چلی جا رہی تھی۔ وزنی پتھر کی طرح نیچے ہی نیچے بیٹھتی چلی جا رہی تھی۔

"زخم کافی ہے۔" کلیم نے کہا۔ "پٹی صبح پھر کروا لینا۔"

"شکریہ۔" وہ اٹھتے ہوئے بڑی ہی آہستگی سے بولی۔ "صبح سکول جاتے وقت پٹی کروا لوں گی۔"

"سکول کس وقت جاتی ہو۔" کلیم بیسن میں ہاتھ دھوتے ہوئے بولا۔

"ساڑھے سات" ثومی نے پٹی پر اپنا دوسرا ہاتھ پھیرتے ہوئے جواب دیا۔ وہ کلیم کے ہاتھ کا لمس اب تک کیف و تلطف کے ساتھ محسوس کر رہی تھی۔

"سات بجے تک پٹی کروا لینا۔" کلیم تولیے سے ہاتھ پونچھتا اس کے قریب آ گیا۔

"ساڑھے سات بجے مجھے بھی ہوسٹل جانا ہوتا ہے۔"

"جی۔ اچھا۔" اس نے سر جھکائے جواب دیا۔

"زخم کافی ہے۔ کچھ دنوں دونوں وقت پٹی کروانا ہو گی۔ پچھلے پہر بھی میں کلینک میں ہوتا ہوں۔"

"اچھا" ثومی نے سر خم کر کے کہا۔

کلیم نے برآمدے میں کھلنے والا دروازہ وا کرایا۔ ثومی ادھر سے باہر نکل گئی۔ کلیم کتنی ہی دیر کھڑا اپنے ہاتھوں کو دیکھتا رہا۔ یہ ہاتھ آج ثومی کے ہاتھوں سے چھوئے تھے۔ کتنی بھرپور لذت، کتنی دلفریب خوشی محسوس کر رہا تھا وہ۔

فریدہ اس دیر کو محسوس کر رہی تھی۔ جو ثومی نے اندر لگا دی تھی۔ اماں اٹھ کر اندر گئیں وہ تیر کی سی تیزی سے کلینک میں آ گئی۔

کرسی پر بیٹھا کلیم سگریٹ کے لمبے لمبے کش لے رہا تھا۔

"ثومی چلی گئی۔" فریدہ نے خالی کمرہ دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"جی ہاں۔ کب کی۔" کلیم نے کرسی کی پشت پر سر ٹکا کر دھواں چھوڑ دیا۔

"اوہ۔! میں بھی کہہ رہی تھی۔ پٹی کروانے میں اتنی دیر۔" فریدہ نے ہنستے ہوئے کہا۔

"مجھے اتنا کاہل ڈاکٹر سمجھ لیا آپ نے۔" کلیم جان بوجھ کر اس کے مفہوم سے قطع نظر کرتے ہوئے بولا:

"فریدہ کی بے چینی اس کے جذبات کی غماز تھی۔ ڈاکٹر بچہ نہیں تھا۔ جو سمجھ نہ سکتا لیکن اس وقت تو اس کی سوچ و فکر ثومی کے گرد گھوم رہی تھی۔

فریدہ کچھ دیر رک کر چل دی۔ ڈاکٹر نے اسے ٹھہرنے کے لیے ایک بار بھی نہ کہا۔ وہ تو اس وقت تنہائی چاہتا تھا۔

—— ٭ ——

صبح ثومی کلینک پہنچی تو کلیم وہاں موجود تھا۔ غالباً کیا یقیناً اس کا انتظار کر رہا تھا اسے دیکھتے ہی میگزین ہاتھ سے رکھ دیا۔ اور بے تکلفی سے مسکراتے ہوئے بولا۔

"مجھے تمہارا ہی انتظار تھا۔"

کلیم نے یہ جملہ کچھ ایسے والہانہ انداز میں اور کچھ ایسی بے تکلفانہ گرم جوشی سے ادا کیا تھا۔ کہ ثومی اس جملے کی حرارت و تپش محسوس کر کے سوچتی ہی رہ گئی۔ کیسے یقین کر لیتی کہ جملے کی شدت و حدت اس کی ذات کے لیے ہے۔ یہ تو اس کے لیے اک انہونی سی بات تھی۔ اپنی اور ڈاکٹر کی حیثیت میں جو بُعد تھا وہ اچھی طرح جانتی تھی۔ کل ڈاکٹر سے پٹی کروانے کے بعد وہ کتنی ہی دیر اس کے مضبوط مردانہ ہاتھوں کا لمس محسوس کرتی رہی تھی۔ جانگداز لمحے اس کی روکھی پھیکی زندگی میں چہل پہل بن کر بکھرے رہے تھے۔ اس نے تصور کی آنکھ سے قوس قزح کے حسین رنگوں کے پھیلتے سکڑتے نظر فریب سایوں کو دیکھ دیکھ کر مستقبل کے خاکے میں رنگ بھرے تھے۔ لیکن رات جب اپنے کرائے کے چھوٹے سے بے رنگ در و دیوار کے کمرے میں نامکمل سے بستر میں لیٹ کر سیاہ کڑیوں والے چھت پر نظریں جمائیں۔ تو اسے اپنے گرد و پیش کا احساس ہوا۔ یہ احساس ڈنک مارنے لگا۔ لمحوں کا گداز پن بکھر گیا۔ قوس و قزح کے رنگ پھیکے پڑ گئے۔ اسے اپنی سوچوں پہ پابندی لگانا پڑی۔ فکر کی اڑان کو محبوس کرنا پڑا۔ وہ اور ڈاکٹر طبقاتی حد بندیوں اور معاشرتی قدروں میں ایک دوسرے سے بندھے ہوئے

تھے۔ وہ اپنے آپ کو فریب نہیں دینا چاہتی تھی۔ خوش فہمی میں مبتلا نہیں ہونا چاہتی تھی۔ ڈاکٹر کے لیے اس کے دل میں انوکھے اور وارفتہ سے جذبے خود بخود جاگ اٹھے تھے۔ لیکن وہ اپنی آنچ کو اپنی ذات تک ہی محدود رکھنا چاہتی تھی۔ چپکے چپکے جل جانا نسبتاً آسان تھا۔ وہ تو سوچ بھی نہ سکتی تھی۔ کہ ڈاکٹر بھی اس کے لیے اپنے دل میں ویسے ہی آشفتہ سر جذبے لیے ہوئے ہے۔

ثومی نے اپنا دامن ہی سمیٹ لینے کا تہیہ کر لیا تھا۔ کل پٹی کرواتے وقت وہ بھی کچھ جذباتی سی ہو گئی تھی۔ کلیم کے ہاتھوں کا لمس۔ اس کی نگاہوں کا مفہوم اپنی محبت کے سانچے میں ڈھال لیا تھا۔ لیکن رات ـــــ رات سوچ و بچار کے بعد اس نے سب خوش فہمیاں دل سے نکال دی تھیں۔ اس کا دامن اس کی لامحدود آرزوؤں کا متحمل نہ ہو سکتا تھا۔ اس لیے اپنے بیدار جذبوں کو سینے کی گہرائیوں میں اتار لینے کا عہد کر لیا تھا آج صبح ہی صبح سکول کے لیے تیار ہو کر وہ کلینک میں پٹی کروانے آئی تھی۔ اک اجنبی مریضہ کی طرح۔

لیکن کلیم کی بولتی نگاہوں اور سادگی سے کہے ہوئے حرارت سے بھرے جملے نے اسے چونکا دیا تھا۔ اس کا عہد ڈول گیا تھا۔ اس کا تہیہ لرزہ براندام ہو گیا تھا۔ خوش فہمی اور خود فریبی پوری طرح بیدار ہو گئی تھی۔

"رات کوئی تکلیف تو نہ ہوئی تھی۔" کلیم نے ثومی کے سراپا پر نظر ڈالی۔

ثومی نے نفی میں سر ہلا دیا۔

"ادھر آ جاؤ۔" کلیم نے آہستگی سے کہا۔ وہ خود بھی اس سفید میز کی طرف گھوم گیا۔ جس پر پٹی کا سامان رکھا تھا۔

ثومی دھڑکتے دل سے اس طرف آ کر میز کے سرے کے قریب کھڑی ہو گئی۔

"بیٹھو۔" کلیم نے ڈیٹول کے چند قطرے پانی میں ٹپکائے۔

ثومی قریب سٹول پر بیٹھ گئی۔

کلیم نے نئی پٹی نکالی۔ دوائی کی شیشی رکھی۔ اور پھر ثومی کی طرف مڑا۔

"اٹھو۔"

ثومی اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔

کلیم کو اس کا حکم بجا لانے کا مشینی انداز بڑا ہی بھلا لگا۔ شوخی سوجھی۔ کنکھیوں سے اسے دیکھا اور سنجیدگی سے بولا:

"بیٹھو۔ بیٹھو۔"

وہ بلا جھجک پھر بیٹھ گئی۔

کلیم ہنس پڑا۔ "تم تو بالکل حکم کا بندہ ہو۔ بیٹھو کہا تو بیٹھ گئی۔ اٹھو کہا۔ تو اٹھ کھڑی ہوئی۔"

ثومی جھینپ گئی۔ "آپ ہی تو کہہ رہے ہیں۔" وہ سر جھکاتے ہوئے بولی۔

"میں جو کچھ کہوں — وہی کرو گی۔" کلیم نے اس کے خوبصورت خدوخال کو دیکھتے ہوئے مسکرا کر کہا۔

"جی —؟" ثومی اس کا مفہوم سمجھ کر بھی ناسمجھ بن گئی۔

کلیم نے سگریٹ سلگاتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھیں شوخی سے ناچ رہی تھیں۔ ثومی نے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔ وہ سرتاپا کانپ گئی۔ ان آنکھوں میں جو دعوت تھی جو پیام تھا۔ جو جذبہ تھا۔ وہ صاف طور پر محسوس کیا جا سکتا تھا۔

لیکن — نہیں۔

وہ کوئی دعوت قبول کرنے کی حیثیت میں نہ تھی۔ کوئی پیام نہ لے سکتی تھی۔ کوئی جذبہ محسوس نہ کرنا چاہتی تھی۔ وہ ڈاکٹر کے اتنے قریب آ کر اپنے آپ کو پھر کھینچ کر دور لے گئی اتنی دور جیسے ازلی وابد کے سرے۔

"تم ہر وقت ہراساں کیوں رہتی ہو۔" کلیم نے قدرے توقف کے بعد کہا۔

"ڈاکٹر صاحب پٹی کر دیجئے۔" ثومی سنبھالا لے چکی تھی۔ اس نے تلخ آواز سے کہا۔ اور بالکل سپاٹ نظروں سے ڈاکٹر کو دیکھا۔

"اوہ۔" کلیم نے تنگی نظروں سے یہ بھی محسوس کر لی۔ "معاف کرنا۔ میں نے شاید ذاتی قسم کا سوال — خیر —"

کلیم نے اک گہری سانس لے کر سگریٹ کا کش لے کر سگریٹ بڑی سختی سے ایش ٹرے میں مسل دیا۔ ہاتھ بڑھایا۔ ثومی نے پٹی والا ہاتھ خودکار گڑیا کی طرح اس کی طرف بڑھا دیا۔

کلیم نے آہستہ آہستہ پٹی کھولی۔ اس کی خوبصورت پیشانی پر جیسے لمحوں کا کرب تھم گیا تھا۔ ثومی کو دل مسلا گیا۔

کلیم اس کا ہاتھ ہاتھ میں لیے سنجیدگی سے پٹی کھول رہا تھا۔

ثومی کا دم گھٹ گھٹ رہا تھا۔ اس کا ہاتھ اس مرد کے ہاتھ میں تھا۔ جسے اس نے برسوں کے انتظار کے بعد پایا تھا۔ جس کو پانے کی امید میں وہ تلخیوں کے گھونٹ شہد جان جان کر حلق سے اتارتی رہی تھی۔ جس نے ہمیشہ اس کی تصوراتی دنیا میں فردوسی رعنائیاں بکھیری تھیں۔ جس نے ہر گام پر اس کا ہاتھ تھاما تھا۔ جس نے اسے جینے کے ڈھنگ سکھائے تھے۔

لیکن — اس مرد کے مضبوط ہاتھ میں ہاتھ دے کر بھی اس نے اپنے آپ کو اس سے صدیوں کے فاصلے پر لا ڈالا تھا۔ اس کی مالی حیثیت اور ذات کے پس منظر کا گھناؤنا پن راہ کی سنگ لاخ چٹان تھے۔

کلیم نے زخم صاف کیا۔ دوائی لگائی۔ اور پھر نئی پٹی باندھ کر گرہ لگا دی۔ گرہ لگاتے وقت اس نے ثومی کی بحر بیکراں سی وسعتیں سمیٹنے والی آنکھوں کو دیکھا۔ جذبوں

کی کوئی اپنی ہی زبان ہوتی ہے۔ جو کلیم کے جذبوں نے پکار کی۔ وہ ثومی سمجھ گئی۔ لیکن پھر وہی سنگ لاخ چٹان درمیان میں حائل ہو گئی۔ کلیم بیسن میں اپنے ہاتھ دھونے لگا۔

"شام پھر پٹی کروا لینا۔" کلیم نے اپنا سگریٹ پھر ایش ٹرے سے اٹھا لیا۔

"جی۔ اچھا۔" ثومی نے کہا۔ اور خاموشی سے واپس جانے کو مڑی۔

"ثومی۔" کلیم کے ہونٹوں سے بے ساختہ نکل گیا۔

"جی۔" ثومی نے چلتے چلتے گردن گھما کر ڈاکٹر کی طرف دیکھا۔ وہ کچھ کہنے کو تھا۔

"تم۔۔۔ سکول جا رہی ہو؟" کلیم نے قدرے تذبذب کے بعد کہا۔

"جی ہاں۔" ثومی کی آواز تن گئی۔

"میں بھی ہسپتال جا رہا ہوں۔" کلیم قدم اٹھا کر اس کے برابر آ گیا۔

"تو۔۔۔" ثومی حیران نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔

"میں تمہیں راستے میں ڈراپ کر دوں گا۔" کلیم نے اپنا میگزین ہاتھ بڑھا کر اٹھا لیا۔ ثومی نے پوری آنکھیں کھول کر بھرپور نظروں سے کلیم کو دیکھا۔ شاید اس کی پیشکش کے پس پردہ جذبوں کو جانچنا چاہتی تھی۔

کلیم کے چہرے پر تقدس کا نور تھا۔ اس کی کسی بھی پیش کش کو جنسی بے راہ روی کا نام دینا زیادتی تھی۔ لیکن ثومی پر پھر وہی اپنی کم مائگی اور پس منظر کا گھناؤنا پن مسلط ہو گیا۔

"شکریہ ڈاکٹر صاحب۔" وہ سرد مہری سے بولی۔

"میں اسی راستے ہوسٹل جاتا ہوں۔" کلیم اس سرد مہری کو محسوس کرنے کے باوجود حوصلے سے بولا:

"ضرور جاتے ہوں گے۔" ثومی قدم بڑھا کر آگے بڑھ گئی۔

"سنو تو ثومی۔" کلیم نے اسے پھر پکارا۔

"مجھے دیر ہو رہی ہے۔" "ڈاکٹر صاحب۔ بس میرا انتظار نہیں کرے گی۔" ثومی دروازے سے باہر نکل گئی۔

کلیم برآمدے تک اس کے پیچھے آیا۔ ثومی لال بجری والی اندرونی سڑک پر اک متوازن چال چلتی گیٹ سے باہر نکل گئی۔

کلیم برآمدے کے گول ستون کے قریب کھڑا سگریٹ کے کش لیتا رہا۔ وہ سوچ میں ڈوب گیا تھا۔

ثومی اس کے حواس پر جس وحشیانہ طریق سے قابض تھی۔ اس سے وہ انحراف نہ کر سکتا تھا۔ اس کے دل نے تو ثومی کے حق میں فیصلہ دے ہی دیا تھا لیکن اب تک عقلی اور دلیلی فیصلہ متزلزل تھا۔ آج یہ فیصلہ بھی خود بخود ہو گیا۔ ثومی اس کے ساتھ جانے کی پیش کش قبول کر لیتی۔ تو شاید دماغ اس کے حق میں یوں اپنی شکست تسلیم نہ کرتا۔

ثومی اک غیور اور شریف لڑکی تھی۔ غریب ضرور تھی۔ لیکن غربت کلیم کی نظروں میں کوئی جرم نہیں تھا۔ نہ ہی مالی کی بیٹی ہونا ناقابلِ معافی تھی۔ کلیم کی محبت کے جذبے سرکش سے ہو گئے۔ ثومی کی قدر و منزلت اس کی نظروں میں بہت بڑھ گئی۔

اماں کمرے سے نکل کر ادھر نہ آ جائیں۔ تو خدا جانے وہ کیف و سرور کی دنیا میں کتنی دیر اور ڈوبا رہتا۔ اماں کی آواز پر چونک کر مڑا۔

"ابھی گئے نہیں تم۔" اماں کی شفقت بھری آواز تھی۔

"جی بس جا ہی رہا ہوں۔" اس نے مؤدبانہ کہا۔

"رات بیگم شفیق کے ہاں کھانا ہے۔"

"جی ہاں۔۔۔ لیکن اماں۔۔۔ آپ بھی تو ان سب کو مدعو کریں نا۔ روز روز ہم کھانے کھائیں گے۔"

"میں بھی یہی سوچ رہی تھی۔ کوئی دن مقرر کر لینا۔ سب کو بلا لیں گے۔"

"اچھا۔ آ کر کوئی فیصلہ کریں گے۔ اب میں جا رہا ہوں۔"

کلیم نے ماں کو سلام کیا۔ اور برآمدے کے زینے پر قدم رکھ دیے۔

اماں نے زیر لب کئی دعائیں اپنے ہونہار بیٹے کو دے ڈالیں۔

کلیم گاڑی میں بیٹھا اور کچھ دیر بعد گاڑی گیٹ سے نکال لے گیا۔ اماں واپس مڑنے کو تھیں۔ کہ ان کی نظر فریدہ کے برآمدے پر پڑی۔

فریدہ کالج جانے کے لیے تیار ہو کر جا رہی تھی۔ سپیڈ یونیفارم میں وہ بڑی بہار نظر آ رہی تھی۔ اماں کے دل میں یہ لڑکی گھر بنا چکی تھی۔ وہیں کھڑے کھڑے اماں بڑی چاہت اور بڑے پیار سے اسے جاتے دیکھنے لگیں۔

کلیم کے لیے انہوں نے دل ہی دل میں فریدہ کو پسند کر لیا تھا۔

—— ؛ ——

بیگم شفیق نے کلیم اور اس کی اماں کے اعزاز میں کھانا دیا تھا۔ نئی جگہ پر نئے نئے دوستوں کا ملاپ اسی طور ہو رہا تھا۔ سلمیٰ اور فریدہ کے کئی قریبی ملنے والے ان کو مدعو کر چکے تھے۔ اماں تو اس ساری گہما گہمی کے لیے سلمیٰ کی شکر گزار تھیں خوب وقت گزر رہا تھا۔

آج رات بیگم شفیق کے ہاں جانا تھا۔ دوپہر کچھ دیر آرام کرنے کے بعد اماں سلمیٰ کے پاس جا بیٹھی تھیں۔ انہی کے ساتھ بیگم شفیق کے ہاں جانا تھا۔ گھر میں اماں کو نہ پا کر کلیم بھی ادھر ہی چلا آیا تھا۔ کئی دنوں کی مصروفیت کی بنا پر سلمیٰ اور فریدہ سے مل بیٹھنے کا اتفاق نہ ہوا تھا۔

سہ پہر کی چائے ماں بیٹے نے سلمیٰ اور فریدہ کے ساتھ پی تھی۔ چائے کے بعد فریدہ نے بڑے اصرار سے تاش کی بازی کی فرمائش کر دی تھی۔ سلمیٰ اور اماں تو زمانے بھر کی باتیں کر رہی تھیں۔ ان کے قریب ہی کلیم، فریدہ ساتھ دو دو ہاتھ کر رہا تھا۔ دو ایک بار وہ جان بوجھ کر ہارا۔ فریدہ کی خوشیوں کا ٹھکانہ نہ رہا۔ اس نے یہی جانا۔ جیسے کلیم کو شکست دینے یا اس پر فوقیت لے جانے کی وہ ہر طرح اہل ہے۔ بڑا اترائی۔ ذو معنی جملے کہے۔ آنکھیں نچا نچا کر کلیم کو اپنی برتری کا احساس دلایا۔ کلیم اس کی بے وقوفی کی حد تک خود پسندی سے دل ہی دل میں جھلاتا رہا۔ اور پھر وہ اپنے اصلی کھلاڑی کو زیادہ دیر دبا نہ سکا۔ فریدہ ایک بار ہاری دوسری بار اور پھر کئی بار۔ جھنجھلا جھنجھلا کر کھیل چالیں بدلیں پتے تبدیل کیے لیکن اس مشاق کھلاڑی کے سامنے ٹھہرنا مشکل ہو گیا۔

"اور کھیلنے کی ہمت ہے۔" کلیم فریدہ کی رونی صورت دیکھ کر ہنس پڑا۔

"جب تک آپ کو ہرا نہ لوں گی۔ کھیل جاری رہے گا۔" فریدہ نے بچوں کی طرح ضد کی۔

"بڑی ہمت ہے۔"

"جی ہاں۔"

"تو بانٹیے پتے۔"

"کاٹیے۔"

کلیم نے فریدہ کی رکھی ہوئی تاش کاٹ دی۔

"چلئے صاحب! جلدی کیجئے۔" کلیم نے اپنی گھڑی دیکھی۔

"کہیں جانا ہے۔" فریدہ نے پتے بانٹتے ہوئے پوچھا۔

"ہوں۔"

"کہاں؟"

"کلینک۔"

"واہ وا — کلینک۔ مریض تو کبھی دکھائی نہیں دیا۔ کلینک میں بیٹھنا ضروری ہوتا ہے کیا؟ —"

"لوگوں کو آہستہ آہستہ ہی پتہ چلے گا نا — ایک دو تو روزانہ ہوتے ہی ہیں۔"

"ایک دو کے لیے شام کا بہترین وقت آپ یوں بیٹھ کر گزار دیتے ہیں۔"

"میں ڈاکٹر ہوں فریدہ صاحبہ۔"

"جی ہم بھی جانتے ہیں۔"

"بس یہ آخری بازی ہوگی۔" کلیم نے بات بدلی۔

"اوں ہوں" فریدہ نے ادائے ناز سے کہا۔

"ساڑھے پانچ ہونے والے ہیں۔ شاید کوئی مریض آجائے۔"

"صاحب کوئی مریض آیا تو نتھو اطلاع کر دے گا۔ یا آپ کی نرس سسٹر وینا آپ کو بلا لے جائے گی۔"

"اچھا بابا۔ چلئے شروع۔"

"شروع۔"

کھیل شروع ہوا۔ کلیم نے ایسی شاطرانہ چالیں چلیں۔ کہ فریدہ بوکھلا گئی۔

"کہو تو پانسہ بدل دوں۔"

"جی نہیں۔ مجھ پر یہ احسان نہ کیجئے۔ میں خود آپ کو مات دوں گی۔"

"یہ حسرت ہی رہے گی۔"

"دیکھوں گی۔"

فریدہ جھنجھلاہٹ میں بالکل ہی الٹی چال چل گئی۔ بازی کلیم کے ہاتھ آگئی۔ وہ فریدہ کی ہار پر کھلکھلا کر ہنس دیا۔

"مابدولت کو مات دینا آسان کام نہیں۔" وہ شگفتہ ہنسی ہنستے ہوئے بولا۔ فریدہ کا غصہ آگیا۔ پتے برہم ہو کر پھینک دیے۔ اور میز پر سے دھکیل دی۔ کلیم نے ایک بھرپور قہقہہ لگایا۔

اماں اور سلمیٰ ان کی طرف متوجہ ہو گئیں۔ کلیم فریدہ کو چھیڑ رہا تھا۔ "چلی آئیں ہم سے کھیلنے — پہلے سیکھا تو ہوتا۔ مشاق کھلاڑیوں کے سامنے ٹھہرنا۔"

"بڑے آئے کھلاڑی۔" فریدہ نے نقل اتارنے کے انداز میں بچوں کی طرح رو بڑھ کر کہا۔

کلیم نے قہقہہ لگایا۔

"اے ہے کیوں بچی کو تنگ کر رہا ہے۔" اماں فریدہ کے قریب آکر اس کے سر پر

شفقت سے ہاتھ پھیرنے لگیں۔

"انہیں بڑا ناز تھا اماں اپنے کھیل پہ۔" کلیم ہنستے ہوئے بولا۔ "اب بار بار ہاری خود ہیں۔ غصہ اور برہمی مجھ پہ نکال رہی ہیں۔ توبہ۔ توبہ۔"

سلمیٰ کلیم کی چھیڑ سے محظوظ ہوئی۔

"ہار کا یوں برا منانا تھا۔ تو پھر کھیلنے کی ضرورت ہی کیا تھی۔" سلمیٰ نے فریدہ سے کہا۔ وہ کلیم کی طرف دیکھ کر مسکرا بھی رہی تھی۔

"چلو معاف کیا۔" کلیم نے پھر شوخی سے کہا۔ "چلو اٹھو۔ مزہ نہ بناؤ۔ رات دعوت پہ بھی جانا ہے۔ موڈ آف رہا تو دعوت بے مزہ ہو جائے گی۔" فریدہ اس بات سے نہ جانے کیا نتیجہ نکال بیٹھی۔ نگاہوں میں شکایت کا رنگ لیے اسے دیکھ کر مسکرا دی۔

سلمیٰ دونوں کی اس نوک جھونک سے دل میں لڈو پھوٹتے محسوس کر رہی تھی۔ کچھ ایسا ہی حال اماں کا بھی تھا۔ اپنی اپنی جگہ دونوں نے ہی کلیم اور فریدہ کے مستقبل کی یک جائی قبول کر لی تھی۔

فریدہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ دعوت پہ جانا تھا۔ تیاری کے لیے کافی وقت چاہیئے تھا۔ کلیم نے پھر آستین قدرے کھینچ کر گھڑی دیکھی۔

"اوہو۔" اس نے کہا۔ "بڑا وقت ہو گیا۔"

"جاؤ نا۔ کوئی مریض نہ آیا ہو۔" اماں نے اس سے کہا۔

کلیم مسکرا کر فریدہ کی طرف دیکھا۔ "کتنی بازیاں ہوئیں یاد رکھنا۔ قرض اتارنا ہوگا۔"

"اب جا بھی تو۔" اماں نے کہا۔ فریدہ نے نگاہوں ہی نگاہوں میں قرض بے باک کر دینے کا کہا۔ کلیم مسکراتے ہوئے وہاں سے چلا آیا۔

سسٹر وینا برآمدے ہی میں کھڑی تھی۔

"کوئی مریض ——!" کلیم نے اس سے پوچھا۔

"جی ہاں۔" سسٹر وینا بولی۔ "وہ لڑکی پٹی کرانے آئی ہے۔"

"ثومی"۔

"جی ہاں۔"

"کہاں ہے۔"

"اندر۔"

"کب آئی۔"

"بڑی دیر سے آئی بیٹھی ہے۔"

"دیر سے آئی بیٹھی ہے۔" کلیم نے اس کا جملہ حیران ہو کر دہرا دیا۔ "تم نے پٹی کر دی تھی؟"

"جی۔ میں نے تو کہا تھا۔ شاید وہ آپ ہی سے کروانا چاہتی تھی۔"

"تو پھر مجھے بلایا کیوں نہیں۔"

"جی اسی نے منع کر دیا۔ کہنے لگی ڈاکٹر صاحب کھیل میں مشغول ہیں۔ کھیل ختم ہو گا۔ جائیں گے۔"

"خدا ہو گئی"۔ کہتے ہوئے کلینک کے دروازے کی طرف مڑ گیا۔

ثومی کو یہاں بیٹھے پون گھنٹہ ہو گیا تھا۔ اس کی خوبصورت آنکھوں میں اداسی کے بادل گہرے ہو رہے تھے۔ انتظار کی کیفیت ٹوٹ رہی تھی۔ اس نے کلیم اور فریدہ کو اس کے سامنے بیٹھے تاش کھیلتے دیکھا تھا۔ وہ چپ چاپ یہاں آ کر بیٹھ گئی تھی۔ دنیا سے نہ جانے خدا جانے کیوں پٹی کروانا پسند نہ کی تھی۔ کلیم اور اپنے درمیان سنگلاخ چٹانوں کی موجودگی کے احساس کے باوجود اسے فریدہ کے ساتھ یوں دلچسپی کے ساتھ کھیل کھیلتے دیکھ کر دکھ ہوا تھا۔ اس دکھ کو سینے کی گہرائیوں میں سمیٹ کر وہ اپنے کمرے میں رہے منہ جا کر نہ پڑ گئی تھی۔ وہیں کلینک میں بیٹھی رہی تھی۔ کیوں؟ —

کیا اپنی آنکھوں کی اداسی کا رنگ کلیم پہ اگلنا چاہتی تھی؟

یا ــــ

اس کے چہرے سے خوشیوں کا اندازہ کرنا چاہتی تھی، خوشیاں جو فریدہ کی قربت میں اس نے سمیٹی ہوں گی۔

جو کچھ بھی تھا۔ وہ اتنی دیر سے اکیلی یہاں بیٹھی تھی۔ سسٹر دینا خاموشی سے اکتا کر باہر نکل گئی تھی۔

کلیم کو اس کے اتنی دیر انتظار کی کوفت سے دوچار رہنے کی وجہ سے افسوس ہوا تھا وہ متاسف سا کمرے میں داخل ہوا۔

ثومی اس کی چکنی سطح والی میز پر اپنا زخمی ہاتھ دوسرے ہاتھ میں رکھے کرسی پر بیٹھی تھی۔ اسے دیکھتے ہی خیالوں سے چونک کر اٹھنے کو ہوئی۔

"بیٹھو۔ بیٹھو ــــ" کلیم نے اس کو بغور دیکھتے ہوئے کہا۔

وہ اسی انداز میں بیٹھ گئی۔

"تم ــــ تم کافی دیر سے آئی بیٹھی ہو۔" کلیم نے مٹھیاں بند کرتے کھولتے کہا۔

"جی۔" اس نے بڑی آسودگی سے کہا۔ اور پھر بڑی بڑی حسین آنکھیں جن میں انتظار کی کیفیت ٹوٹ رہی تھی۔ جن میں اداسیوں کا رنگ گھل رہا تھا۔ ایک لمحہ کو کلیم کی آنکھوں میں ڈال دیں۔

یہ لمحہ ــــ یہ وقت کی تواریخ لمحہ ایک لمحے کو جامد ہو گیا۔

ثومی نے اپنے انتظار کی ساری کوفت اپنی اداسی کا سارا درد کلیم کو منتقل کر دیا۔

بے چین ہو کر اس نے پلکیں جھپکائیں۔

اور ــــ سارا بوجھ یوں پٹخ کر ثومی نے آنکھیں بند کر لیں۔

کلیم آگے بڑھ گیا۔ چپ چاپ ــــ پٹی کی چیزیں نکالنے لگا۔ ثومی اسی انداز میں بیٹھی رہی۔

"ثومی ــــ" کلیم نے آہستگی سے پکارا۔ "آؤ پٹی کر دوں ــــ"

ثومی اٹھی۔ جدھر کلیم کھڑا تھا ادھر ہی آ گئی۔ اور اپنا پٹی والا ہاتھ اس کی طرف بڑھا دیا۔

کلیم نے یہ ہاتھ تھام لیا۔ ارادی یا غیر ارادی طور پر اس نے اس کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑ لیا۔

ثومی نے اس کی طرف دیکھا۔ لیکن وہ پٹی کھول رہا تھا۔ بڑی سنجیدگی سے وہ اپنے کام میں مصروف تھا۔ ثومی نے پھر اس کی طرف دیکھا۔ ابھی ابھی وہ فریدہ کے ساتھ کس دل جمعی سے تاش کے کھیل میں مصروف تھا۔ کھڑکی سے وہ کتنی دیر اسے دیکھتی رہی تھی۔ لیکن اب ایسا سنجیدہ ــــ!

ثومی کو اپنا آپ ڈسنے لگا۔ اس کی آنکھیں کچھ نم سی ہو گئیں۔ رونے کو بے اختیار جی مچل اٹھا۔ محرومیاں آنسو بن جاتی ہیں۔ یہ آنسو بہہ جائیں۔ تو محرومیوں کا احساس جان لیوا نہیں رہتا۔

کلیم اس کے احساسات و جذبات سے بے خبر اپنی سوچوں میں گم پٹی اتار رہا تھا۔ دوائی والا کاٹن زخم کے ساتھ ذرا چپک گیا تھا۔

کلیم نے وہ پھاہا اٹھانے میں تو اپنی طرف سے بڑی ہی احتیاط سے کام لیا۔ لیکن ثومی کی آنکھوں کی نمی آنسو بن کر آنکھوں سے ڈھلک آئی۔ ہلکی سی اف پر کلیم نے نظریں اٹھائیں۔ ثومی اپنے آنسو چھپا نہ سکی۔ ان آنسوؤں کے ڈھلک آنے پر بھی اسے اختیار نہ رہا۔ آنسو گرتے چلے گئے۔

"بہت تکلیف ہوئی۔" کلیم اس کے آنسوؤں کو دیکھ کر ششدر سا ہوا۔ ثومی نے آنچل سے آنسو پونچھ کر نفی میں سر ہلا دیا۔

"تو ــــ" کلیم اس کا زخمی ہاتھ ہاتھ میں لیے اس کا منہ دیکھنے لگا۔ آبگینوں کو ٹھیس لگ جانے والی بات تھی۔ آنسو پونچھنے پر کچھ زیادہ ہی آنسو نکل آتے تھے۔ احساس محرومی پگھل رہا تھا۔ کوشش ضبط بے کار تھی۔ بازو کے حلقے میں اس نے اپنا چہرہ گرا لیا۔

کلیم دل گرفتہ سا نظر آنے لگا۔ ثومی کے آنسو اس کی ذہنی کیفیت کی کھلی داستان تھے۔

جذبے جذبوں کو پہچان جاتے ہیں۔ کتنی ہی ساعتیں گزر گئیں۔ وہ اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیے ایک ٹک اس کے جھکے ہوئے سر کو دیکھتا رہا۔ اس کے اندر ہی اندر کوئی چیز پگھلتی رہی۔

"ثومی۔" اس نے گم ہوتی آواز میں پکارا۔

ثومی کو جیسے بیہوشی ٹوٹ کر ہوش آ گیا۔ اسی جذباتی کمزوری کا شکار ہو کر اسے ندامت ہوئی۔ جلدی سے جھکا ہوا سر اٹھایا۔ آنچل سے آنکھیں پونچھیں۔ ہونٹ کاٹتے ہوئے اس نے اپنا ہاتھ کلیم کے ہاتھ سے ہٹا لیا۔

کلیم اب بھی اسے دیکھ رہا تھا۔ چپ چاپ بے حس و حرکت کھڑا صرف نگاہوں میں اسے جذب کر رہا تھا۔

ثومی ایک دم سنبھل گئی۔ ہاتھ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولی "پٹی کر دیجئے۔"

"رونا کس بات پہ آیا؟" کلیم نے بوجھل آواز میں جیسے سرگوشی کی۔

ثومی کچھ نہیں بولی۔ دل اب بھی بھر بھر آ رہا تھا۔ لیکن اب وہ کسی کمزوری کا مظاہرہ نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اسے تو اب ان آنسوؤں میں ندامت محسوس ہو رہی تھی۔ جو ذرا سی ٹھیس سے چھلک گئے تھے۔ کلیم کیا سوچے گا؟ کیا سمجھے گا؟ اپنے جذبوں کی رسوائی اسے کسی طرح منظور نہ تھا۔ محبت میں مر جانا گوارہ، لیکن سبک سر ہونا اسے منظور نہ تھا۔

"پٹی کر دیجئے ڈاکٹر صاحب۔" اس نے کلیم کی سرگوشی کو نظر انداز کرتے ہوئے دھیمے لہجے میں کہا۔

کلیم نے پھر کوئی بات نہ کی۔ گم صم سا ہو گیا۔ زخم دیکھا۔ صاف کیا۔ دوائی لگائی اور پٹی باندھ دی۔

وہ سوچوں میں ڈوبا ہوا تھا۔ شاید ثومی کے ان آنسوؤں کا تجزیہ کر رہا تھا۔

ثومی پٹی کرواتے ہی کلینک سے نکل گئی۔ کلیم بڑی دیر تک وہیں کھڑا سگریٹ پھونکتا رہا ——— ثومی کیوں روئی تھی؟ کون سا زخم تھا۔ جو اس کی پوری احتیاط کے باوجود دکھ

گیا تھا ———

کلیم کے خیالوں کی مار بہت دور تک ہو گئی۔

کیا ثومی بھی اسی آگ میں جل رہی تھی۔ جس میں خود اس کا رواں رواں جل اٹھا تھا۔

یا ثومی کا دکھ کوئی اور تھا!

غربت و افلاس کا دکھ بھی تو اس کی آنکھوں کو چھلکا سکتا ہے؟ لیکن نہیں۔ یوں اچانک آنسو مچل گئے ——— غربت و افلاس تو اس کے جنم کے ساتھی ہیں۔ ثومی۔ یقیناً ——— یقیناً۔

اس تپش، اس جلن اور اس اذیت سے گھبرا کر روئی۔ جو اس کی ذات کے اندر پھوٹ رہی ہے۔

کلیم کافی دیر وہیں کھڑا یونہی بے تکے سے خیالوں میں گم رہا۔

——— ٭ ———

بیگم

شفیق کے ہاں جانے کو اس کا جی قطعاً نہ چاہ رہا تھا۔ لیکن وہ مہمان خصوصی تھا
نہ جانا معیوب تھا۔ بادلِ نخواستہ تیار ہوا۔ اماں تو گھنٹہ بھر پہلے ہی تیار ہو کر
فریدہ کے ہاں جا چکی تھیں۔

فریدہ نے آج بھی خوبصورت ترین لباس زیب تن کیا تھا ہلکے ہلکے میک اپ اور
زیور نے اس کی شخصیت کو ابھارا تھا۔ سینٹ کی ہلکی ہلکی مہک اس کے دلفریب پیکر
کو اپنے حلقے میں لیے ہوئے تھی۔

ثومی اسے تیار ہوتے دیکھ رہی تھی۔ آرائش و زیبائش کی قیمتی چیزیں نئی وضع کا لباس
لباس۔ جگمگاتے ہوئے جڑاؤ بندے۔ اور بازو بند ——— دیکھ کر ثومی کو اپنی کم مائگی
کا احساس آج کچھ زیادہ ہی ہونے لگا تھا۔ وہ اپنا اور فریدہ کا موازنہ کر رہی تھی۔ سرخ
پھولوں والی چھینٹ کا بے رنگ سا کرتہ، سفید ململ کا دوپٹہ جو بار بار دھلنے کی وجہ
سے اب سپیدی سے محروم تھا۔ موٹے لٹھے کی شلوار ——— پاؤں میں اسفنجی چپل
جنہیں ایک بار نہیں کئی بار پیوند لگوا چکی تھی۔ ہمیشہ دیسی صابن سے بال دھونے کی وجہ
سے ان میں نکھار رہا تھا۔ نہ چمک وہ تو کچھ قدرتی ہی سیاہ چمکدار تھے۔ پھر بھی ان میں
فریدہ کے بالوں ایسی چمک تو نہ تھی۔ فریدہ کے قیمتی قیمتی شیمپو دیکھ کر اس کا جی چاہتا
تھا۔ کہ اپنے بالوں کی حفاظت ایسے ایسے نایاب اور قیمتی شیمپوؤں سے کرے لیکن یہ
حسرت ہی تھی۔ خیالوں کی اڑان تو فریدہ کو دیکھ دیکھ کر بہت اونچی ہوتی تھی۔ لیکن حقیقت
کا ہمیشہ منہ چڑاتی تھی۔

آج فریدہ کی سج دھج دیکھ کر کچھ عجیب سا دکھ محسوس ہو رہا تھا۔ جی بیٹھا جا رہا تھا۔
فریدہ کے سامنے اپنی کوئی وقعت نہ نظر آتی تھی۔ پھر ——— پھر ——— وہ کلیم کو من میں کیوں
بسا بیٹھی ہے۔ فریدہ جیسی لڑکی کے ہوتے ہوئے اس کی کیا حیثیت ——— ؟

حسب عادت فریدہ نے تیار ہو کر اتراتے ہوئے ثومی سے پوچھا۔ "کیسی لگ رہی ہوں"
ثومی کا جی چاہا۔ بے اعتنائی سے منہ پھیر لے۔ جل کر کہہ ڈالے "بہت بری۔"
لیکن وہ ایسا نہ کہہ سکی۔ مسکرانا پڑا۔ زخم چھپ جاتے ہیں نا بعض اوقات ثومی
کی مسکراہٹ بھی کچھ ایسی ہی تھی۔

فریدہ تیار ہو کر کمرے سے نکلی۔ ثومی بھی اس کے پیچھے پیچھے چلی آئی۔ محرومی اور
ناامیدی نے اس کے خوبصورت چہرے پر سایے سے پھیلا رکھے تھے۔ اس کا
صحل اور سوگوار چہرہ نگاہِ شوق کے لیے ایک کھلا چیلنج تھا۔ اپنے قدرتی حسن کی
جاں سوزی سے وہ قطعاً لاعلم تھی۔

فریدہ نے دعوت میں شریک ہونے سے معذرت کی تھی۔ وہ اپنے کاروبار میں ان دنوں
کچھ زیادہ ہی مصروف تھا۔ سلمیٰ اور فریدہ ہی جا رہی تھیں۔

فریدہ برآمدے میں آئی تو کلیم بھی اپنی گاڑی لے کر آ گیا۔

"ہلو ——— " فریدہ اٹھلاتی ہوئی پورچ میں گاڑی کے قریب آ گئی۔

"اوہو ——— کیا انداز ہیں ——— " کلیم نے گاڑی سے نکل کر فریدہ کی طرف دیکھ کر مسکرا
کر کہا۔

"شکریہ۔" فریدہ نے قدرے جھکتے ہوئے شوخی سے کہا۔

ستون کے عقب میں کھڑی ثومی یہ دیکھ کر دل ڈوبتا محسوس کرنے لگی۔

"اماں اور سلمیٰ خالہ" کلیم نے پوچھا۔

"بس آ ہی رہی ہیں۔ تیار ہیں دونوں۔"

"فرید صاحب۔"

"وہ نہیں جا رہے؟"

"کیوں؟"

"انہیں کوئی کام ہے۔ ساڑھے آٹھ بجے ان کے کوئی ڈیلر آ رہے ہیں۔"

"بس ہم چاروں ہی ہوں گے۔"

"جی ہاں — آپ ہی کی گاڑی میں چلے جائیں گے۔"

"ٹھیک ہے۔"

"اب چلنا چاہیئے۔ بلاؤ انہیں۔"

"اچھا۔"

فریدہ پورچ سے واپس برآمدے میں آئی۔ ثومی ستون کے ساتھ لگی کھڑی تھی۔

"اے ثومی! جانا ذرا ممی اور خالہ جان کو بلا لانا۔"

ثومی تعمیل حکم کے لیے وہاں سے ہٹی۔ کلیم کی نظر اس پر پڑی۔ اور اس نے بھرپور نظروں سے کلیم کو دیکھا۔

ان نظروں میں جانے شکوہ تھا یا شکایت۔ کلیم کی طبیعت پہلے ہی الجھی تھی۔ وہ کچھ اور الجھ سا گیا۔

تھوڑی دیر بعد اماں اور سلمیٰ آ گئیں۔ کلیم نے گاڑی کا دروازہ کھولا۔ اماں اور سلمیٰ پیچھے بیٹھ گئیں۔ اور فریدہ اس کے برابر والی سیٹ پر۔ وہ آج بیحد خوش تھی۔

ثومی نے دونوں کو ایک دوسرے کے برابر بیٹھے بغلی کمرے کے دروازے کی اوٹ سے دیکھا۔ خدا جانے دونوں کی یہ قربت برداشت نہ ہو سکی۔ یا اپنی موجودگی کا احساس کلیم کو لاشعوری طور پر دلانا چاہا۔ گاڑی کے سٹارٹ ہوتے ہی وہ لپک کر برآمدے میں آئی۔ اور ستون کو سختی سے تھامتے ہوئے گاڑی میں بیٹھے کلیم کو حسرت کی نظر سے دیکھنے

کلیم بھی کچھ چونک سا گیا۔ اور سلمیٰ تو یہی سمجھی کہ وہ کوئی بات پوچھنے یہاں آئی ہے۔

"کیوں؟ کیا ہے؟" اس نے کھڑکی سے جھانکتے ہوئے اس سے پوچھا۔

"جی؟ — جی — کچھ بھی تو نہیں۔" وہ گھبرا کر پیچھے ہٹی۔

کلیم کے ذہنی الجھاؤ کچھ اور بڑھ گئے۔ سارا راستہ فریدہ نے اسے باتوں میں لگانا چاہا۔ لیکن وہ اپنے خیالوں میں ہی ڈوبا رہا۔ اس کی کسی بات پر چونک کر ہوں ہاں کر دیتا۔ فریدہ اپنی ہی باتوں میں مگن رہی۔ کلیم کی قربت کا احساس مسحور کن تھا۔

دعوت شاندار تھی۔ بے فکرے لوگ خوب لطف لے رہے تھے۔ خوش گپیاں ہو رہی تھیں۔ کلیم بھی اس ہا و ہو اور رنگ و بو کی محفل میں پورا حصہ لے رہا تھا۔ فریدہ اس کے ساتھ ساتھ تھی۔ دونوں ہنس رہے تھے۔ قہقہے لگا رہے تھے۔ لیکن گہما گہمی میں کلیم کے ذہن کی اوپری سطح ہی مشغول تھی۔ اس سطح تلے کرب کے طوفان پھوٹ رہے تھے — ان طوفانوں میں ثومی ہی ثومی تھی۔ اس کے آنسو تھے۔ اس کی حیران حیران آنکھیں تھیں۔

ان آنسوؤں اور ان حیران حیران نظروں سے جو اذیت پھوٹ رہی تھی۔ اس سے کلیم کے لیے یہ اخذ کرنا مشکل نہ رہا تھا۔ کہ ثومی اس کی فریدہ کے ساتھ دوستی برداشت نہیں کر سکتی۔

آج شام وہ کتنی دیر فریدہ کے ساتھ تاش کھیلتا رہا تھا۔ اور وہ کلینک میں گھنٹہ بھر بیٹھی اس کا انتظار کرتی رہی تھی۔ زخم سے ذرا سا پھاہا چپک جانے پر اس کی آنکھیں بھر گئی تھیں۔ یہ تو اک بہانہ ہی تھا۔ ورنہ یہ اس دکھ کا اظہار تھا۔ جو اس کی وجہ سے اسے پہنچا تھا۔

اور رات کھانے پر آتے وقت بھی اس نے ستون کے ساتھ لگی ثومی کی حیران آنکھوں میں انہی آنسوؤں کی نمی دیکھی تھی۔ کلیم کا اضطراب اور بے چینی بہت بڑھ گئی تھی۔ ثومی واقعی کلیم کی فریدہ کے ساتھ دوستی برداشت نہ کر پا رہی تھی۔ ہر چند کہ اس

نے اپنی آرزوؤں کا گلا گھونٹ دینے کا عزم کر لیا تھا۔ اپنی کم مائگی کا احساس شدت سے تھا۔ اپنی حیثیت سے بھی آگہی تھی۔ چاہتی تھی۔ کہ کلیم کے خیال تک سے کنارہ کشی کر لے۔ فریدہ ہر لحاظ سے کلیم کے لیے موزوں تھی۔ دونوں کے مابین کوئی دیوار حائل تھی نہ قدر۔ دونوں دوستی کے بندھن میں بندھے بھی تھے۔ لیکن ان ساری باتوں کے باوجود دل اڑیل گھوڑا بنا ہوا تھا۔ یہ جانتی تھی۔ کہ وہ اس کی دید کے قابل نہیں۔ لیکن اس کا شوق اس کا انتظار اپنی جگہ اٹل حقیقت تھا۔ کلیم اور فریدہ کو ساتھ ساتھ دیکھ کر دکھ محسوس ہوتا۔ حسد کی آگ بھڑکنے لگی تھی۔ اپنے ماحول میں دم گھٹنے لگتا۔ پاگلوں کی طرح سوچیں لایعنی ہو جاتیں۔ کبھی اپنے آپ کو فریدہ بنانے کا سوچتی۔ کبھی کلیم کے ہم پلہ ہونے کا تصور سجاتی۔ اور جب ان لایعنی سوچوں کا حقیقت کی تلخی سے سابقہ پڑتا تو مایوسی کی سرد لہریں اس کی ذات کو اپنی زد میں لے لیتیں۔

کلیم گاڑی نکال کر لے گیا۔ ثومی اسی ستون کے ساتھ لگی کھڑی رہی۔ سوچوں کی اندھا دھند یلغار نے جیسے حواس پر جادو کر لیا۔ اس کا جی زمانے سے ٹکرا جانے کو چاہا۔ وہ کیوں فریدہ نہیں؟ شکل و صورت میں اسی سے کم نہیں۔ آداب و اطوار میں بھی پیچھے نہیں۔ کیا اسے فریدہ کی طرح لباس پہننا نہیں آتا ——؟ اس کی طرح آرائش و زیبائش کرنا نہیں آتی؟ زیور پہننے کا سلیقہ نہیں یا بات چیت کرنے کا ——؟ پھر وہ فریدہ کیوں نہیں بن جاتی۔ فریدہ —— جو کلیم کی ہم پلہ ہے۔ اسے اپنانے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ اس سے دوستی کرنے کا حق ہے جسے ——

گھنٹہ بھر یونہی گزر گیا۔

فریدہ اپنے کام سے فارغ ہو کر گھر پہنچا۔ تو ثومی وہیں کھڑی تھی۔

"سب چلے گئے۔" اس نے گاڑی سے نکلتے ہی ثومی سے پوچھا۔

"جی" اس نے اپنے آپ میں آتے ہوئے کہا۔

"تم اکیلی یہاں کیا کر رہی ہو۔" فریدہ نے اس کے قریب آ کر محبت سے پوچھا۔

"جی۔ کچھ نہیں۔ یونہی کھڑی تھی۔" وہ سر جھکاتے ہوئے بولی۔

"سکول جا رہی ہو نا۔"

"جی۔"

"دل لگ گیا۔"

"جی۔"

"فتو نے پیسے دیے تھے۔"

"جی۔"

"کپڑے خرید لیے۔"

"کل لاؤں گی۔"

"اچھے اچھے تین چار جوڑے سلوا لو۔ جوتے بھی نئے خرید لینا۔ سکول میں اپنا وقار بنائے رکھنا۔ یہ ضروری ہے۔ اور پیسے کی ضرورت ہو تو مجھ سے لے لینا۔ اچھا۔"

"جی شکریہ۔ پیسے کافی ہیں۔" ثومی نے تعظیم سے کہا۔

فریدہ کی نظر ثومی کے پٹی والے ہاتھ پر پڑی۔ بے چین ہو کر اس نے پوچھا۔ "ہاتھ کو کیا ہوا ——"

"بس کا شیشہ لگا تھا۔" ثومی نے آہستگی سے کہا۔ "ہتھیلی زخمی ہو گئی تھی۔"

فریدہ کا دل جیسے کسی نے مسوس کر رکھ دیا۔ اس کی آنکھوں میں اذیت کا رنگ گھل گیا۔ ہونٹ کاٹتے ہوئے اس نے منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ اک مجبور باپ کی تڑپ دید کے قابل تھی۔ اپنی خود غرضی ڈسنے لگی۔ باپ کی دو دو موٹریں تھیں۔ لیکن بدنصیب لڑکی بسوں میں خوار ہوتی پھرتی تھی۔ کاش۔ کاش وہ ثومی کے لیے کچھ کر سکتا۔

فرید کی نگاہوں کی بیچارگی اور لہجے کی شفقت ثومی نے محسوس کی۔ اس ہمدردی نے ہمیشہ اس کے من میں کچھ عجیب سی ہلچل پیدا کی تھی۔

فرید الجھا الجھا ــــ اپنی ذات کے مصنوعی خول میں تڑپتا اندر چلا گیا۔

ثومی عقیدت و احترام سے اسے دیکھتی رہی۔

"وہ کون ہے؟"

اس کی روح کے اندر یہ سوال ہمیشہ کی طرح آپ ہی آپ اٹھنے لگا۔

ــــ ٭ ــــ

ثومی نے اپنی دوست ریحانہ کے ساتھ تین کاٹن کی خوبصورت پرنٹ کی قمیضیں خریدیں۔ ان کی ہم رنگ شلواروں اور دوپٹوں کا کپڑا لیا۔ ربڑ کی چپل اور سکول کے لیے ایڑھی والا جوتا بھی خریدا۔ کچھ چھوٹی موٹی اور بھی چیزیں لیں۔ شاپنگ کرتے شام ہو گئی۔ ریحانہ اسی کے ساتھ کام کرتی تھی۔ اسے شہر جانا تھا۔ ثومی کا راستہ مخالف سمت تھا۔ ریحانہ نے رکشا لیا اور گھر چل دی۔ ثومی بس کے انتظار میں بس سٹاپ پر جا کھڑی ہوئی۔

پہلی بس میں جگہ نہ مل سکی۔ وہ دوسری کا انتظار کرنے لگی۔ لیکن انتظار شب ہجراں کی طرح طویل ہوتا گیا۔ بس کو نہ آنا تھا نہ آئی۔ اندھیرا اترنے لگا تھا۔ شام ڈوب رہی تھی۔ اور بس کے سٹاپ پر کھڑے اکا دکا لوگ ادھر ادھر منتشر ہو گئے تھے۔ فٹ پاتھ سے قدرے ہٹ کر پھل کی دکانیں تھیں۔ کچھ ریڑھیوں والے تھے۔ ایک دو سائیکلوں کی مرمت کی دکان تھیں۔ ان دکانوں پر بیٹھے لوگ بہانے بہانے اسے دیکھ رہے تھے۔ دو ایک منچلے تو خواہ مخواہ اس کے قریب آ کر سیاسی گفت گو میں الجھ گئے تھے۔

جوں جوں دیر ہو رہی تھی۔ ثومی کا دم نکلا جا رہا تھا۔ گو سڑک آباد تھی۔ موٹریں، گاڑیاں رکشے، تانگے گزر رہے تھے۔ سائیکل سوار بھی آ جا رہے تھے اور پیدل چلنے والے بھی۔ پر رونق سی سڑک تھی۔ لیکن ثومی کو اس گہما گہمی، ہنگامے اور شور و غل میں بھی تنہائی کا احساس ڈس رہا تھا۔ وہ ڈر رہی تھی۔ گھر پہنچنے کے لیے بیقرار تھی۔

اکیلے میں تانگہ یا رکشا لینے بھی ڈر لگتا تھا۔ انتظار نے اور طوالت چاہی تو وہ پیدل

گھر جانے کے لیے فٹ پاتھ پر چلنے لگی۔ کپڑوں کا بنڈل اور جوتے کا ڈبہ اٹھائے وہ طویل سڑک کا فاصلہ ماپنے لگی۔

سڑک پر گاڑیاں آجا رہی تھیں۔ وہ تیز تیز قدم اٹھاتے چلی جا رہی تھی۔ اچانک ایک گاڑی گھسر گھسر کی لمبی سی آواز کے ساتھ اس سے کچھ آگے جا کر رک گئی۔ خیالوں سے چونک کر اس نے اس طرف دیکھا۔ گاڑی پیچھے کی طرف مڑتے ہوئے اس کے قریب آ رہی تھی۔

پہلی ہی نظر میں اسے معلوم ہو گیا تھا۔ کہ گاڑی کلیم کی ہے۔

اس کا دل اچھل کر جیسے حلق میں آ گیا۔ اس کے قدم خود بخود رک گئے۔ اور وہ گردن موڑ کر گاڑی کو دیکھنے لگی۔

"ثومی" کلیم نے کھڑکی سے جھانکتے ہوئے اسے پکارا۔

ثومی زبان سے کچھ نہ بولی۔ نگاہیں اٹھائیں۔

"اس وقت کہاں؟ ــــ کلیم نے سٹیئرنگ پر ہاتھ رکھے اس کی طرف استفہامیہ نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

ثومی اب بھی کچھ نہیں بولی۔

"گھر جا رہی ہو۔" کلیم نے کچھ الجھ کر پوچھا۔

ثومی نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"گھر نہیں جانا کیا؟ کلیم نے حیران سا ہو کر پوچھا۔

"میں چلی جاؤں گی" اس نے پہلی بار آہستگی سے کہا۔

"میں بھی گھر ہی جا رہا ہوں۔" کلیم نے سادگی سے کہا۔ "آؤ۔"

ثومی وہیں ساکت و جامد کھڑی رہی۔ کلیم سے اس نے کنارہ کشی کا جو عہد کیا تھا وہ دراصل اک لاشعوری احتجاج تھا۔ اس دکھ کی پکار تھی۔ جو ثومی کو فریدہ اور کلیم کو

ساتھ ساتھ دیکھ کر پہنچا تھا۔ اسی لیے تو آج وہ اس کے کلینک میں پٹی کروانے بھی نہیں گئی تھی۔ شام بھی پٹی نہ کروانے کا مصمم ارادہ تھا۔

لیکن کلیم یوں راستے میں آن ملے گا۔ اس کا تو اسے وہم و گمان بھی نہ تھا۔ وہ اپنے من سے کیے ہوئے عہد کو نباہنے کے لیے اس وقت کلیم کی پیش کش کو سختی سے ٹھکرانے پر مجبور ہو گئی۔

کلیم کو ثومی کا یوں انکار ہٹ دھرمی کی بنا نظر آیا۔ لیکن غصے کو ضبط کرتے ہوئے اس نے دوبارہ اسے گاڑی میں بیٹھنے کو کہا۔

"ڈاکٹر صاحب! میں پیدل چلی جاؤں گی۔" اس نے دوبارہ کلیم کے اصرار کے جواب میں سرد مہری سے کہا۔

کلیم نے اسے سرتاپا گھورا۔ اس ضدی سی لڑکی پر اسے بے طرح غصہ آیا۔ شام گہری ہو رہی تھی۔ اندھیرا پھیل رہا تھا۔ سڑک آگے جا کر سنسان ہو جاتی تھی۔ اور وہ یوں سرکشی دکھا رہی تھی۔

کلیم گاڑی کا دروازہ اک دھچکے سے کھول کر باہر نکلا۔ اس کا چہرہ برہمی کا تاثر لیے تھا۔ آواز میں سختی اور ڈانٹ تھی۔ ثومی کو دیکھنے کی بجائے گھورتے ہوئے بولا۔

"اس وقت اکیلی جاؤ گی ــــ؟"

ثومی کچھ نہیں بولی۔

"چلو گاڑی میں بیٹھو ــــ" اس نے سختی سے کہا۔

ثومی نے نظریں اٹھا کر اسے دیکھا۔ ڈانٹ پڑنے سے وہ کچھ ٹھنڈی پڑ گئی تھی۔

"سوچ کیا رہی ہو۔" کلیم نے لہجہ اور ترش بناتے ہوئے کہا۔ "عجیب لڑکی ہو۔ تمہارا مطلب کیا ہے؟ ــــ میرے ساتھ جانے پر اعتراض ہے۔ کیا؟ ــ"

ثومی اس کے تلخ و ترش لہجے اور ڈانٹ ڈپٹ سے بجھ سی گئی۔ اس کے ساتھ جانے

پر اسے اعتراض تھوڑا ہی تھا۔ وہ تو روٹھی ہوئی تھی۔ کلیم منانے کی بجائے یوں پیش آ رہا تھا۔ ثومی اپنی تخیلی دنیا سے باہر نکلی۔ اسے اس سے روٹھنے کا حق کہاں پہنچتا تھا؟ یہ حق تو صرف فریدہ کو حاصل تھا۔ ڈاکٹر تو اس پر ترس کھا کر اسے اپنی گاڑی میں بٹھا کر گھر لے جانا چاہتا تھا۔ ازراہِ اخلاق ایسا کر رہا تھا۔ وہ کیوں باؤری ہو رہی تھی؟

"چلو بیٹھو گاڑی میں۔" کلیم نے ہاتھ کے اشارے سے اسے حکم دیتے ہوئے کہا۔

ثومی کے اندر کی کوئی شے ٹوٹ پھوٹ گئی۔ آنکھوں میں نمی تیر

کلیم نے اس کی خوبصورت جھلملاتی آنکھوں میں جھانکا۔ کرب کے پھیلے طوفان تڑپا ہی تو گئے۔ جلدی سے ثومی کے ہاتھ سے جوتے کا ڈبہ اور کپڑوں کا بنڈل لے کر سیٹ پر ڈال دیا۔

ثومی خاموشی سے موڑ کے گرد گھوم آئی۔ گاڑی سٹارٹ کرتے ہوئے اس نے ثومی کی طرف گوشۂ چشم سے دیکھا۔ وہ مجسم آنسو نظر آ رہی تھی۔

"خرید و فروخت ہوتی رہی شام تک۔" کلیم نے سگریٹ سلگا کر دھیل پر ہاتھ رکھا گاڑی چوڑی سڑک پر دوڑنے لگی۔"

ثومی نے کلیم کی کسی بات کا جواب نہیں دیا۔

"صبح پٹی کروانے کیوں نہ آئیں۔" کلیم نے قدرے توقف کے بعد پھر خود ہی بات کی۔

ثومی نے بھیگی بھیگی پلکوں سے اک نظر کلیم کی طرف دیکھا۔ آج پھر وہ آنسو بہانے کی کمزوری کا شکار ہو جانے کو تھی۔ بہزار وقت وہ مچلتے آنسوؤں کو روک نہ سکی۔

"پٹی کہیں سے کروا لی تھی؟" کلیم نے بے چین ہو کر پوچھا۔

ثومی نے نفی میں سر کو جنبش دیتے ہوئے رخ کھڑکی کی طرف پھیر لیا۔ آنسو مچل مچل کر بہہ نکلے تھے۔ رونے کی کیا تک تھی۔ ثومی خود بھی نہ جانتی تھی۔ یہ تو لطیف جذبے تھے۔ جو ذرا سی آنچ سے پگھل گئے تھے۔

کلیم چپ چاپ گاڑی چلاتا رہا۔ ثومی کھڑکی سے لگی باہر دیکھتی رہی۔ اک جامد سی خاموشی کا بوجھ دونوں اپنی روحوں پر محسوس کر رہے تھے۔ اس خاموشی میں گھلی آنسوؤں کی نمی کلیم اچھی طرح محسوس کر رہا تھا۔

"رو رہی ہو۔" اس نے کئی بے جان لمحے گزر جانے کے بعد گھمبیر آواز میں کہا۔ ثومی نے جواب دیا نہ پلٹ کر اس کی طرف دیکھا۔ پٹی والے ہاتھ سے آنکھوں کی نمی خشک کر لی۔

"ثومی۔" اس نے پھر بوجھل آواز میں اسے پکارا۔

ثومی آنکھیں خشک کر چکی تھی۔ سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔

"تم ——" وہ کچھ کہتے کہتے رک گیا۔

ثومی نے ایک گہری ٹھنڈی سانس لی۔

کلیم کی قوتِ ضبط و صبر ٹوٹنے لگی۔

"ثومی ——" اس کا لہجہ جذباتی ہو گیا۔

ثومی نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ خوبصورت آنکھوں کے گلابی کنارے اب بھی اتھے۔

"تم کیا ہو ——؟" کلیم بڑبڑایا۔ "میں تمہیں اب تک نہیں سمجھ سکا۔" ثومی نے پوری آنکھیں کھول کر کلیم کو دیکھا۔ اس کا دل بے طرح دھڑکنے لگا۔ کلیم نے کیا کہہ دیا تھا؟ کیا وہ اسے سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا ——؟ کیوں؟ کیوں؟ اس کا جی چاہا اس کیوں کے تال پر ناچ اٹھے۔

"ہاں ثومی ——" کلیم نے ہونٹوں پر اک دلنواز تبسم اور آنکھوں میں مستیوں کے ملتے جام لیے ثومی کو دیکھا۔ "میں تمہیں اب تک سمجھ نہیں سکا۔"

ثومی کے سانسوں کی رفتار بے قابو ہوتی جا رہی تھی۔ کچھ اور سمٹ کر وہ گاڑی کے پرے دروازے سے لگ گئی۔ روح کا پیغام روح نے پا لیا تھا! ——

لیکن ثومی کو اب بھی یقین نہ آ رہا تھا۔ ایسے بھی ہو سکتا ہے؟ وہ ڈانواڈول سی تھی۔

"ثومی۔" کلیم نے ہونٹوں میں سگریٹ دبائے دبی سی آواز میں کہا۔ محبوب کی قربت سے وہ از خود رفتہ سا نظر آ رہا تھا۔

ثومی نے سر کچھ اور جھکا لیا۔ کلیم کی طرف سے پھر رُخ قدرے پھیر لیا۔ اس کے سر سے دوپٹہ کھسک گیا۔ اور اس کی سیاہ لانبی چوٹی پشت پہ کالے ناگ کی طرح بل کھا گئی۔ چوٹی کا آخری سرا سیٹ پہ پڑا تھا۔ کلیم کو جانے کیا سوجھی۔ اس کی چوٹی کے سرے کو پکڑ کر آہستگی سے جھٹکا دیا۔

ثومی نے تڑپ کر گردن موڑی۔ کلیم مسکرا دیا۔ حواس باختہ سی ہو کر اس نے اپنی چوٹی چھڑانا چاہی۔ لیکن بال کلیم کے ہاتھ ہی میں رہے۔ وہ کچھ کہہ نہ سکی۔

"تم آج کلینک کیوں نہ آئیں۔" کلیم نے پھر اس کی چوٹی کو ہلکا سا جھٹکا دیا۔ ثومی نے گردن دھیرے دھیرے گھمائی۔ نگاہیں آہستہ آہستہ اٹھا کر کلیم کی طرف دیکھا۔ اس کا دل دھڑک دھڑک کر جو کچھ کہہ رہا تھا۔ اس کی تصدیق کلیم کے تاثرات سے کرنا چاہتی تھی۔

کلیم کے چہرے پر شوخی کے باوجود شرافت اور پاکیزگی کا نور تھا۔ ثومی نے پھر سر جھکا لیا۔ کلیم نے اس کے بال چھوڑ دیے۔

"صبح سکول گئی تھیں؟" اس نے بات دوسرے انداز سے شروع کی۔

"جی۔"

"پھر پٹی کیوں نہ کروائی۔"

"بس — ایسے ہی۔"

"زخم خراب ہو گیا تو۔"

"صبح کروا لوں گی۔"

"ابھی چل کر کیوں نہیں — کوئی غصہ باقی ہے ابھی —"

"جی — ؟" غصہ — غصہ کیسا — ؟" ثومی بوکھلا گئی۔

کلیم اس کی حالت پہ ہنس پڑا۔ "خیر جانے دو۔"

"جی"۔

"ثومی — ابھی جا کر پٹی کروا لینا۔ زخم خراب ہو جائے گا۔ سمجھیں —" کلیم نے گردن قدرے خم کر کے اس کی طرف دیکھا۔ ثومی بیچاری کچھ بھی تو نہ سمجھ سکی۔ حیران حیران نظروں سے کلیم کو دیکھنے لگی۔

"بزدل لڑکی —" کلیم ہونٹوں میں تبسم لہراتے بولا۔ "سوچ کا انداز منفی ہو تو بات بے بات یونہی آنسو نکل آتے ہیں۔ سوچ کا انداز بدل ڈالو۔"

"جی"۔ ثومی حیران حیران نظروں سے اسے تکے گئی۔

"تم کسی سے کمتر نہیں ہو ثومی۔" قدرے توقف کے بعد کلیم نے سامنے شیشے پر نظریں جمائے مستحکم آواز میں کہا۔ "تم — کسی سے — کمتر نہیں — ہو۔"

"میں — میں —" ثومی کی آواز حلق ہی میں اٹک گئی۔ کلیم کے الفاظ اس کے کانوں میں فردوسی نغموں کی طرح ٹپک رہے تھے۔

کیا وہ اتنی خوش نصیب تھی؟ کیا کلیم کے الفاظ اس کے جذبات کے آئینہ دار تھے۔ کیا اس کی مسرت ناآشنا زندگی میں خوشیوں کا ایسا بہاؤ بھی آ سکتا ہے۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھ مضبوطی سے الجھا کر گود میں رکھ لیے۔ اس کی آنکھیں خود بخود بند ہو گئیں۔ اس کے سینے میں ہلچل سی مچ گئی۔

"تم کسی سے کمتر نہیں ہو۔" کلیم کی سرگوشی اس کی روح میں اتر رہی تھی۔ باقی راستہ تقریباً خاموشی ہی میں کٹا۔ کہنے سننے کو جیسے کچھ رہا ہی نہ تھا۔ کلیم اپنے آپ میں رہا تھا۔ اور ثومی اپنے آپ میں —

ہاں ثومی کی گاڑی سے اتر کر چلے جانے کے بعد کلیم کتنی ہی دیر اس کی سیٹ پر ہاتھ رکھے بیٹھا رہا۔ ثومی کی انوکھی سی مہک اس کے دل و دماغ پر چھائی ہوئی تھی۔

صدیق

نے دس دس کے بیس نوٹ جیب سے نکال کر ماں کی طرف بڑھائے لیکن اس کے پکڑنے سے پہلے پھر واپس کر لیے اور ایک ایک کر کے دوبارہ گننے لگا۔ جیراں بھی اس کی اماں کے پاس بیٹھی تھی۔ صدیق ان روپوں کا رعب جیراں ہی کو دینا چاہتا تھا۔

"کتنے ہیں۔" ماں نے شوق اور تجسس سے پوچھا۔

"پورے دو سو ہیں ماں۔" صدیق نے نوٹ ماں کی طرف بڑھا دیے۔ "یہ تنخواہ سے علاوہ ہیں۔ ماں خوشی سے جیسے دیوانی ہو گئی۔ کماؤ بیٹے نے اس کی جھولی بھر دی تھی۔ جیراں بھی مرعوب ہو گئی۔ سو تنخواہ بھی آنے والی تھی۔ تین سو روپے ایک ماہ کی کمائی۔ کتنی بہت تھی۔ ثومی کے لیے صدیق موزوں تھا۔ جیراں نے تو دبی دبی زبان سے یہ رشتہ طے بھی کر دیا تھا۔

لیکن جب سے ثومی پڑھ لکھ کر اپنے پاؤں پر کھڑی ہو گئی تھی۔ صدیق کو وہ اپنی دسترس اور حصول سے باہر نظر آتی تھی۔ اسے اس نے کبھی منہ نہیں لگایا تھا۔ فریدہ سے پٹائی بھی کروائی تھی۔ اتنا لیے دیے رہتی تھی۔ کہ صدیق اب اس سے کسی حد تک ڈرنے بھی لگا تھا۔

لیے دیے وہ بچپن ہی سے رہتی تھی۔ ہمیشہ یوں نظر آتی جیسے وہ نوکروں کے سب بچوں سے الگ تھلگ مخلوق ہے۔ حالاں کہ بچپن کوارٹروں کے سب بچوں کے لیے یکساں ہی تھا۔ سارا سارا دن گندے مندے کپڑوں اور میل سے اٹے چہروں سے

کوٹھی کے گرد اگرد پھیلے باغ میں کھیلتے پھرنا۔ کوٹھی سے پھینکے ہوئے کوڑے کرکٹ میں کھانے کی چیزیں تلاش کرنا۔ ٹین کے ڈبوں میں کوئی بچی کھچی ٹافی۔ بسکٹ یا سوکھی مچھلی کا کوئی ٹکڑا نکال کر چھینا جھپٹی کرنا۔ اور پھر رات کو پیپل کے درخت تلے بیٹھے کام کاج سے فارغ ہو کر حقہ پیتے ہوئے زمانے بھر کی باتیں کرنے والے بزرگوں کو آنکھ مچولی کے کھیل سے تنگ کرنا۔ مار کھانا اور روتے روتے سو جانا تقریباً سبھی کا یہی مشغلہ تھا۔ لیکن اب جب کبھی صدیق بچپن کے ان دنوں کو ذہن میں اجاگر کرتا تو اسے ثومی کی شخصیت منفرد نظر آتی۔ اس کا مقام اپنا ہی ہوتا۔ وہ بڑا ہی لیے دیے رہتی۔ گندے مندے کھیل میں اس نے کبھی حصہ نہ لیا۔ بچی کھچی چیزیں۔ چھینا جھپٹی سے کبھی لے کر نہ کھائیں۔ بلکہ جب سب بچے ایسا کرتے تو وہ ناک منہ چڑھا کر ایک طرف ہو جایا کرتی۔

صدیق ثومی سے مرعوب تھا۔ اور اب تو اس سے مایوس ہو چکا تھا۔ لیکن ایک طرف تو جیراں کی شہ تھی۔ دوسری طرف لاشعوری انتقام کا جذبہ۔ وہ جیسے بھی ہو ثومی کو اپنانا چاہتا تھا۔ اس اپنانے کی خواہش میں اب محبت دم توڑ گئی تھی۔ مجروح انا کی تڑپ تھی۔ فریدہ سے پٹائی کے بعد وہ بڑا خونخوار ہو گیا تھا۔ یہ خونخوار حالات کی تہوں میں دبی تھی۔ لیکن موقع پا کر ابھر آنے کو بے تاب تھی۔

جیراں ثومی کے نکھرتے حسن اور قیامت خیز جوانی سے خائف تھی۔ کہیں نہ کہیں تو اسے ٹھکانے لگانا ہی تھا۔ صدیق جیسا کماؤ لڑکا اس کا طلب گار تھا۔ جیراں کے لیے یہی بات تسکین دہ تھی۔ ایسی لڑکی کے لیے کون ہاتھ پھیلائے گا۔ جس کا ماضی تاریک ہے۔ جس کے ماں باپ کا پتہ ہے نہ خاندان کا۔ جو گناہ کا ثمر ہے۔ جیراں یہی سوچ کر صدیق کو ہاتھ میں لے رہی تھی۔

لیکن ثومی کی نشوونما تو فطرت کے اصولوں کے سہارے ہو رہی تھی۔ اس کا اپنا ہی رنگ تھا۔ اپنا ہی فکر تھا۔ اپنی ہی سوچ تھی۔ اپنا ہی مزاج تھا۔ جن حالات میں

وہ رہ رہی تھی۔ ان سے فرار کا ہی سوچتی تھی۔ کوئی ان دیکھی دنیا تھی جس کا تصور کو واضح نہیں تھا۔ پھر بھی اس کی چھٹی حس اسے احساس دلاتی۔ کہ اس کی دنیا یہ نہیں وہ ہے۔

ہو سکتا ہے ثومی کی سوچیں فریدہ سے تغافل کا نتیجہ ہوں۔ بچپن ہی سے وہ اسے دیکھتی چلی آئی تھی۔ وہ اس کے آئیڈیل کی حیثیت اختیار کر چکی تھی۔ یا یہ بھی ممکن تھا۔ کہ وہ اپنے ان دیکھے والدین کے متعلق اس خوش فہمی کو ذہن میں جگہ دے چکی تھی۔ کہ وہ یقیناً دولت مند ہوں گے۔ کم از کم باپ کو تو ضرور ہی دولت مند تصور کرتی تھی۔ جس کھیل کے نتیجے میں اس کا وجود تخلیق ہوا تھا۔ وہ عام طور پر دھن والوں کا ہی کھیل ہوتا ہے۔ بہر حال جو کچھ بھی تھا۔ وہ ذہنی طور پر اب تک اپنے حالات سے مطابقت نہ کر سکی تھی۔

اور جب وہ حالات ہی سے مطابقت نہ کر سکی تھی۔ تو صدیق کو قبول کرنے کا کیا جواز ——

صدیق اور ثومی میں خاموش کھینچا تانی ایک عرصہ سے چلی آ رہی تھی۔ ثومی نے قدم قدم پر اسے دھتکارا تھا۔ جوں جوں دھتکار بڑھ رہی تھی۔ صدیق کے من میں اندھے جذبے شدید ہو رہے تھے۔ وہ ہر راستہ اختیار کر رہا تھا۔ جہاں پر اپنی کمائی کا رعب ڈال رہا تھا۔ اور ثومی کو زک پہنچانے کے حربے سوچ رہا تھا۔

فریدہ نے اسے ثومی کو چھیڑنے پر بری طرح پیٹا تھا۔ اور صدیق نے اسی دن سرکش گھوڑے کی طرح بھاگتے ہوئے جب پلٹ کر دیکھا تھا۔ تو ثومی فریدہ کے سینے سے لگی تھی۔ صدیق کے مسموم ذہن نے ثومی سے بدلہ لینے کی اک نئی تدبیر سوچ لی تھی۔

فریدہ کا کردار اس کی نظروں میں مشکوک ہو گیا تھا۔ اس کے بعد بھی اس نے ثومی اور فریدہ کو ایک دوسرے کے قریب ہوتے کئی بار دیکھا تھا۔ ثومی کے

چہرے پر شرمگیں مسکراہٹیں اور فریدہ کے چہرے پر شوق کے کوندے لپکتے نظر آئے تھے۔ ثومی کی نوکری کے سلسلہ میں فریدہ کی بھاگ دوڑ بھی اسی سلسلے کی کڑی معلوم ہوتی تھی۔

دیکھنا آنکھوں کا کام ہوتا ہے لیکن نظر کو معنی کا رنگ دینا ذہن کا یوں نظر ذہن کے تابع ہوتی ہے۔ یہ ذہن کی آلودگی ہی تھی۔ جو نظر کو ایسا رنگ دے رہی تھی۔ جس میں فریدہ و ثومی کا حقیقی رنگ دب گیا تھا۔

فریدہ نوجوان نہ سہی بوڑھا بھی تو نہ تھا۔ اور امیروں کی دل لگی صدیق پر واضح تھی۔ سامنے والی کوٹھی کے اقبال نظر کا اپنی جمعدارنی سے معاشقہ اور پچھلی سڑک پر رہنے والے اظہر بخاری کا جوان لڑکیوں کا باپ ہوتے ہوئے نوعمر لڑکی سے شادی ڈھکی چھپی بات نہ تھی۔ فریدہ بھی صدیق کی نظر میں ثومی کا طلب گار تھا۔ صدیق یہ بات سلمیٰ کی نظروں میں لانا چاہتا تھا۔ اس طرح سلمیٰ کے ہاتھوں ثومی کا جو حشر متوقع تھا —— صدیق ابھی سے شاد ہو رہا تھا۔ اس کے بعد اسے یوں لگتا جیسے ثومی پکے ہوئے پھل کی طرح اس کی جھولی میں خود ہی آن گرے گی۔

سلمیٰ تک نوں اس نے رسائی حاصل کر لی تھی۔ اس رسائی پر پارسائی کے ملمع بھی فریب نظر تھا۔ سلمیٰ کی خدمت میں وہ پیش پیش رہتا۔ بازار کے تقریباً سبھی کام اس نے اپنے ذمے لے لیے تھے۔ درزی کے پاس جانا ہوتا۔ یا ڈرائی کلینر کے پاس، وہ اپنی خدمات بڑے عجز سے پیش کر دیتا۔

صدیق اس حقیقت سے بھی آگاہ تھا۔ کہ سلمیٰ ثومی کو اچھا نہیں سمجھتی۔ فریدہ نے جب بھی اس کا ذکر کیا۔ سلمیٰ کے ماتھے پر بل پڑ گئے۔ اس نے جب بھی کوئی مالی امداد اسے دینا چاہی سلمیٰ نے کبھی خوشی سے اس بات کو گوارا نہ کیا۔ اسے وہ دن اچھی طرح یاد تھا۔ جب ثومی نے ایس وی میں داخلہ لیا تھا۔ اور فریدہ نے ہوسٹل جانے کے لیے ثومی کو کپڑے۔ بستر اور دیگر ضروری چیزیں سلمیٰ سے اسے دلوائی تھیں۔ سلمیٰ

نے بات بات پر مین میخ نکالی تھی۔ فرید نے اک غریب لڑکی کا مستقبل سنوارنے کو نیکی کہا تھا۔ تو سلمیٰ نے منہ بناتے ہوئے کہا تھا۔

"اک یہی غریب تو رہ گئی ہے ۔"

فرید خاموش ہو گیا تھا۔ لیکن اس کی بے چینی چھپی نہ رہی تھی۔

سلمیٰ بڑبڑ کرتی رہی تھی۔

صدیق سلمیٰ کے ثومی سے خدا واسطے کے بیر سے فائدہ اٹھانا چاہتا تھا۔ وہ جب بھی سلمیٰ کے پاس ہوتا۔ کسی نہ کسی طور ثومی کا ذکر نکال لیتا۔ یہ ذکر خیر کبھی نہ ہوتا۔ ہمیشہ ہی شر کا پہلو لیے ہوتا۔

وہ ہمہ وقت موقعے کی تلاش میں رہتا۔ سلمیٰ کو فرید و ثومی کے تعلقات کے بارے میں وہ جو کچھ بتانا چاہتا تھا۔ بلا ثبوت کچھ نہ کہہ سکتا تھا۔ اس لیے وہ ٹوہ میں ہی لگا رہتا۔

اس دن موقعہ اچھا تھا۔ ثومی پھولوں کی ایک کنج میں بیٹھی کوئی کتاب دیکھ رہی تھی۔ فرید نے اس کے ہاتھ سے کتاب لے لی تھی۔

ثومی اٹھ کر کھڑی ہو گئی تھی۔ فرید کتاب کے ورق الٹتے پلٹتے اس سے باتیں کر رہا تھا۔ ثومی اترا اترا کر اس کی باتوں کا جواب دے رہی تھی۔

صدیق دور کھڑا سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ باتیں تو سن نہ سکا۔ دونوں کی قربت کو اپنے ذلیل ذہن کی سوچ کے مطابق ڈھال لیا۔

یہ اس کی بدقسمتی تھی۔ کہ سلمیٰ اپنی ایک دوست کی بیمار پرسی کو گئی ہوئی تھی۔ ورنہ وہ اسے موقعے پر ہی لے آتا۔

یہ سنہری موقع ہاتھ سے نکل گیا۔ صدیق کفِ افسوس ملنے لگا۔ لیکن اس نے اپنی کوششوں میں لگے رہنے کا عزم زندہ رکھا۔ تخریب پسندی اس کی فطرت میں شامل

ہو چکی تھی۔ ہر حیلہ آزمانا تھا۔

آج ماں کو دو سو روپیہ بھی اس نے جیراں کے سامنے اسی لیے دیا تھا۔ اور جب جیراں نے اس کی کمر تھپکتے ہوئے کہا تھا۔ "تجھ سا کماؤ بیٹا ہی چاہیئے مجھے ۔"

تو صدیق کے دل میں لڈو پھوٹنے لگے تھے۔ یونہی منہ بنا کر بولا تھا،

"تیری لونڈیا بڑے اونچے اونچے خیال رکھتی ہے چاچی ۔ میری حیثیت ہی کیا ۔"

"سب ٹھیک کر لوں گی ۔" جیراں نے بڑے اعتماد سے کہا تھا۔

"وہ تو اپنا پیچھا بھول گئی ہے نا ۔ میں سب ٹھیک کر لوں گی۔"

صدیق خوش ہو گیا تھا۔

تلے کئی واقعات ایسے ہو گئے تھے۔ جن کی بنا پر ثومی کلیم کے جذبات کا تقدس آزما سکتی تھی۔ لیکن وہ ابھی تک ڈانواں ڈول تھی۔ کلیم اس میں دلچسپی لے رہا تھا۔ اب وہ جان گئی تھی۔ لیکن دلچسپی کی نوعیت کیا تھی۔ اس کے متعلق اس کا ذہن تاحال کسی ایک مرکز پر نہ آیا تھا۔

وہ کلیم کے التفات کو دیکھ رہی تھی۔ اس کی نگاہوں کی گرمی کو بھانپ رہی تھی۔ اس کے شوق کی گہرائیوں اور گیرائیوں کو محسوس کر رہی تھی۔ لیکن اس کی محبت پر کھل کر ایمان لانے میں اب بھی عالمِ تذبذب میں تھی۔ ہو سکتا ہے۔ یہ ایک امیر زادے کا کھیل ہو۔ دل لگی کا حیلہ ہو۔ وقت گزاری کا مشغلہ ہو۔ اس کی غربت کی کمزوری کا ناجائز فائدہ ہو۔

اسے اپنے عشق کی حرارت کا علم تھا۔ محبت کی تپش سے آگہی تھی۔ اسے اپنے جذبات پر ناز تھا، فخر تھا۔ کلیم اس کی زندگی میں آنے والا پہلا اور آخری مرد تھا کلیم کے حق میں اس کے دل و دماغ کا فیصلہ تھا۔ یہ کی طرح اٹل تھا۔ لیکن ان سب باتوں کے باوجود کلیم کو اپنا ــــ بالکل اپنا سمجھ لے۔ یہ ممکن نہ لگتا تھا۔

دن رات ثومی اپنی ہی سوچوں میں گم رہنے لگی تھی۔ اسے صدیق کے ناپاک منصوبوں سے واسطہ تھا نہ جیراں کے کسی فیصلے سے۔ ان دنوں تو اسے فرید کی شفقت کی ضرورت بھی محسوس نہ ہوتی تھی۔ کلیم حواس پر اس طرح چھایا تھا۔ دل میں اس طرح سمایا تھا۔ کہ دنیا بھر سے اسے بیگانہ کر دیا تھا۔ کلیم کی قربت کے لیے اس کا من مچلا

کرتا تھا۔ اور جب یہ قربت میسر آتی۔ ہوش و حواس جیسے جواب ہی دے جاتے۔ دل کی باتیں دل ہی میں رہ جاتیں۔

کلیم بھی شاید اسی کی طرح اس کی قربت کا متمنی ہوتا۔ وہ جب بھی اماں کے پاس کسی کام کے بہانے آتی۔ وہ بھی ارد گرد منڈلاتا رہتا۔ موقع ملتا تو ایک آدھ ذو معنی سا جملہ بھی کہہ جاتا۔

اس دن کلیم نے اماں سے اپنا کمرہ صاف کروانے کا کہا تھا۔ نتھو کی کوتاہی پر خوب گرم ہوا تھا۔ "کم بخت نے کمرہ کباڑ خانہ بنا رکھا ہے۔ کوئی چیز بھی تو ٹھکانے پر نہیں ہوتی۔ کپڑے جگہ پر ہوتے ہیں۔ نہ کتابیں ــــ"

ثومی اماں کے پاس بیٹھی مٹروں کے دانے نکال رہی تھی۔ کلیم کے چلے جانے کے بعد اماں نے بھی نتھو کو خوب ڈانٹا ــــ کوسا ــــ برا بھلا کہا۔ اسی وقت کمرہ ٹھیک کرنے کا حکم دیا۔

ثومی نے حسب عادت اپنی خدمات پیش کر دیں۔ نتھو نے ابھی باورچی خانے کا کام ہی نہ نپٹایا تھا۔ چھٹی کے دن کلیم کھانا بھی جلدی کھایا کرتا تھا۔ نتھو کو اس کام میں لگا دیا جاتا تو کھانے کو دیر ہو جاتی۔ ثومی نے اماں سے کمرہ ٹھیک ٹھاک کرنے کا کہہ دیا۔

اماں بھی یہی چاہتی تھیں۔ مفت کی نوکر ہاتھ لگی تھی۔ کام کر دیا کرتی تھی۔ پیسوں کا کبھی مطالبہ کیا ہی نہ تھا۔ جیراں کو کبھی کبھی اماں روپیہ دو روپے دیا کرتی تھیں۔

ثومی اماں کے ساتھ کلیم کے کمرے میں آئی۔ اماں نے بستر کی دھلی ہوئی چادر تکیوں کے غلاف اور میز پوش نکال دیئے۔ جمعدارنی جھاڑو لگا چکی تھی۔ صرف جھاڑ پونچھ ہی کرنا تھی۔ اماں کچھ دیر وہیں رکیں۔ ثومی کو ہدایات دیتی رہیں۔ پھر کوئی ان کی ملنے والی آ گئی۔ وہ ثومی کو وہیں چھوڑ کر ڈرائنگ روم میں آ بیٹھیں۔

ثومی اپنے کام میں مشغول ہو گئی۔ اس کے شوق کی فراوانی کا یہ عالم تھا۔ کہ قدم

بہک رہے تھے۔ یوں لگتا تھا۔ جیسے آسمان کی نیلگوں وسعتوں میں ہلکی پھلکی ہو کر تیر رہی رہی ہے۔ من گنگنا رہا تھا۔ انگ انگ سے خوشیوں کے سوتے پھوٹ رہے تھے۔ وہ سرشاری نظر آ رہی تھی۔ کلیم کی چیزوں کو چھو رہی تھی۔ اس کے کمرے میں تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے چاروں اور کلیم ہی کلیم ہے۔

چیزیں قرینے سے رکھ کر اس نے سارا کمرہ صاف ستھرا کر دیا۔ تازگی اور شگفتگی کا احساس ہونے لگا تھا۔ فارغ ہو کر اس نے کمرے پر اطمینان کی نظر ڈالی۔ کمرے سے نکلنے والی تھی۔ کہ کونے والی تکون میز پر پڑی کلیم کی تصویر نے اپنی کشش سے اپنی طرف کھینچ لیا۔ یہ تصویر اس نے صفائی کرتے وقت بھی دیکھی تھی ــــ لیکن اب ــ وہ آہستہ آہستہ کونے کی طرف بڑھی۔ تصویر اٹھا لی۔ اور غور سے اسے دیکھنے لگی۔

اللہ جانے تصویر دیکھنے ہی میں گم تھی۔ یا کلیم ہی دبے پاؤں اندر آیا تھا۔ بہر حال اس قدموں کی چاپ قطعاً سنائی نہ دی۔ وہ تو کلیم کے خدوخال کو پوری آزادی سے نگاہوں میں جذب کر رہی تھی۔ اتنے غور سے کبھی اسے دیکھنے کی اسے جرأت ہی کب ہوئی تھی۔

کلیم ذرا سے فاصلے پر اس کی پشت پر کھڑا اس کے شوق اس کے انہماک سے محظوظ ہو رہا تھا۔

جب کئی ثانیے گزر گئے ــ اور ثومی کی مدہوشی کو ہوش نہ آیا۔ تو کلیم نے اس کی پشت پر لہراتی لمبی سی چوٹی کو پکڑ کر ہلکا سا جھٹکا دیا۔

ثومی برق کی سی تیزی سے پلٹی۔ کلیم کو سامنے مسکراتا پا کر اس پر گھبراہٹ کا دورہ کچھ اس طرح سے پڑا۔ کہ تصویر ہاتھ سے چھوٹ گئی ــ ثومی بوکھلا کر تصویر اٹھانے کو جھک گئی۔ تصویر کا شیشہ ٹوٹ گیا تھا۔

"توڑ ڈالی۔" کلیم نے تصویر کی طرف اشارہ کیا۔ ثومی بے طرح گھبرا رہی تھی۔

"تم سے کبھی کوئی اچھا کام بھی ہو گا۔" کلیم نے اس کی گھبراہٹ سے محظوظ ہو کر

ہنسی ہونٹوں میں دباتے ہوئے غصے کا اظہار کیا۔

ثومی ڈر گئی۔ گھبرا کر بولی۔ "معاف کیجئے گا۔"

"ہر بات پہ تمہیں معاف ہی کرتا چلا جاؤں گا۔ پہلے قمیض جلا ڈالی۔ اب تصویر توڑ دی۔ ہیں ــ ہیں ــ نادم ــ ہوں ــ" ثومی نے تصویر میز پر رکھ کر کمرے سے بھاگ نکلنا چاہا۔ گھبراہٹ، بوکھلاہٹ اور کلیم کے غصیلے لہجے سے اس کا دم نکلا جا رہا تھا۔ وہ رو دینے کو تھی۔

اس نے قدم اٹھایا ہی تھا۔ کہ کلیم نے اس کی کلائی مضبوطی سے پکڑ لی۔ "بھاگ کہاں رہی ہو۔" "یہ تصویر تم نے وہاں سے اٹھائی کیوں تھی۔؟"

کلیم کے لہجے میں پہلے سے زیادہ غصیلی ڈانٹ تھی۔ ثومی سہم گئی۔ مجرموں کی طرح سر جھکائے کھڑی ہو گئی۔ آنسوؤں کے قطرے پلکوں پر لرزنے لگے۔

"بتاتی کیوں نہیں ــ" کلیم نے اس کی کلائی کو ہلکا سا جھٹکا دیا۔

ثومی ندامت کی انتہا سے رو پڑی۔ اس کے پیازی پیازی گالوں پر چمکیلی بوندیں لرزنے لگیں۔ کلیم کی مسکراہٹ پھوٹ پھوٹ پڑتی تھی۔ اس بزدل سی لڑکی پر بے انتہا پیار آ رہا تھا۔ لیکن اسے ستانے میں جو لطف تھا۔ وہ اپنی جگہ مسلم تھا۔

"تم میرے کمرے میں آئی کیوں تھیں ــــ؟" کلیم اب تک اس کی کلائی پکڑے ہوئے تھا۔ اور وہ مجرموں کی طرح گردن جھکائے چپکے چپکے آنسو بہا رہی تھی کلیم نے اس کی کلائی کو سختی سے مروڑا۔

"بیگم صاحبہ نے صفائی کے لیے کہا تھا۔" ثومی کلائی پر دباؤ محسوس کر کے اور سہم گئی۔

"اماں نے ــ" کلیم نے اسی انداز میں پوچھا۔

"جی ــ" وہ آہستگی سے بولی۔

"تصویر توڑ ڈالنے کا بھی اماں ہی نے کہا تھا ــ" وہ تیز آواز میں بولا۔

"غلطی ہو گئی۔" ثومی کو اپنی اس قدر اہانت پر غصہ آ گیا۔ آنسو پی کر وہ سنبھل گئی۔

"میں بار بار نقصان برداشت کرتا چلا جاؤں۔ یہ نہیں ہو سکتا۔ اس غلطی کی تمہیں سزا دوں گا۔ کڑی سزا۔" کلیم نے کلائی کے گھاؤ پر ہاتھ رکھ کر قدرے زور سے دبایا۔

ثومی نے کلیم کی طرف دیکھا۔ کلیم کی آنکھیں نشیلی ہو رہی تھیں۔ اور وہ نگاہ شوق سے ثومی کو دیکھتے ہوئے مسکرا رہا تھا۔ ثومی کے دیکھتے ہی وہ کھلکھلا کر ہنس پڑا۔

"بزدل کہیں کی۔" اس نے انتہائی پیار سے کہا۔

ثومی نے کلائی چھڑالی۔ نگاہوں کی گرمی برداشت نہ ہو سکی۔ وہ وہاں سے بھاگ جانے کو پلٹی۔

"ثومی" کلیم نے لپک کر اسے روکنا چاہا۔ لیکن عین اسی وقت پچھلے برآمدے سے اسے فریدہ ادھر ہی آتی نظر آئی۔

"ڈاکٹر صاحب ——" اس نے کمرے کے قریب آتے ہوئے آواز دی۔

"آ گیا ——" کلیم لمبے لمبے ڈگ بھرتا کمرے سے نکل گیا۔

ثومی ہراساں ہو کر وہیں کھڑی رہی۔ کلیم کے رویے کی سمجھ نہ آئی۔ اس کی نظروں کی تپش اس نے محسوس کی تھی۔ تو پھر —— وہ فریدہ کے آنے پر یوں کیوں چلا گیا کیا فریدہ اس پر اس قدر حاوی تھی ——؟ کیا وہ اسے صرف کھلونا سمجھتا تھا؟ نا سمجھ لڑکی یہ نہ جان سکی۔ کہ فریدہ کے اندر آ جانے پر ہنگامہ بھی کھڑا ہو سکتا تھا۔ کلیم نے عقلمندی کی تھی۔ کہ فوراً باہر جا کر اسے باتوں میں لگا کر ڈرائنگ روم میں لے گیا تھا۔

—— ٭ ——

ثومی کے ذہن میں یہ بات گھر کر گئی۔ کہ کلیم اسے محض اک کھلونا سمجھتا ہے وہ غریب ہے۔ اس کی غربت کی کمزوری سے وہ فائدہ اٹھانے کی کوشش کر رہا ہے۔ اسے اس بات سے صدمہ ہوا —— امیروں کے کھیل غربت کے کھلونوں ہی سے ہوتے ہیں۔ اسے بار بار اپنی ماں کا خیال آیا۔ یقیناً کسی امیرزادے نے اسے بھی کھلونا سمجھا ہو گا۔ وہ محبت پر ایمان لا کر لٹ گئی ہو گی۔

لیکن ثومی کھلونا بننے کو ہرگز ہرگز تیار نہ تھی۔ ان دیکھی ماں کی بھول اس کے لیے مشعل راہ تھی۔ کئی دن گزر گئے۔ کلیم کے گھر وہ دانستہ نہ گئی۔ اماں نے بلایا بھی تو کلیم کی عدم موجودگی ہی میں گئی۔ کلیم فریدہ کے ہاں کئی بار آیا۔ ثومی بڑی خوبصورتی سے کنی کترا گئی۔ کلیم کے جذبات سے اسے آگہی نہ تھی۔ وہ اس کی نام نہاد محبت کو شغل سے زیادہ اہمیت نہ دے رہی تھی۔

کلیم ثومی کے لیے بے چین و بیقرار تھا۔ اس سے بات تک کرنے کا موقع نہ مل رہا تھا فرصت کے اوقات فریدہ چھین لیتی تھی۔ کبھی تاش، کبھی کیرم اور کبھی سینما کا پروگرام بنا کر زبردستی اس پر مسلط کر دیتی۔

کلیم کے ذہن نے ثومی سے ملنے کی سہل سی ترکیب سوچی۔ اور اس پر اسی دن عمل پیرا ہو گیا۔

ثومی کو دو بجے کے قریب چھٹی ہوتی تھی۔ وہ ہسپتال سے فارغ ہوتے ہی اس کے سکول جا پہنچا۔ ثومی کو ساتھ لے کر وہ سکون و اطمینان سے اس کے ساتھ باتیں کرنا چاہتا تھا

کب تک دور دور رہ کر یوں وقت گزارا جا سکتا تھا۔

ثومی سکول سے باہر نکلی۔ ریحانہ اس کے ساتھ تھی۔ لڑکیوں کے غول کے غول بھی باہر آ رہے تھے۔ تانگے۔ رکشے اور دو ایک گاڑیاں سڑک کے کنارے کھڑی تھیں یہاں سے بس سٹاپ آدھ فرلانگ پر تھا۔ ثومی ریحانہ کے ساتھ باتیں کرتی بس سٹاپ کی طرف چل دی۔

گاڑی مسلسل اور جانے پہچانے ہارن پر اس نے سڑک کے دوسری جانب دیکھا۔ کلیم کی فوکس ویگن کھڑی تھی۔

ثومی ششدر سی ادھر دیکھتی رہ گئی۔

"کون ہے؟" ثومی کو گم صم ادھر دیکھتے دیکھ کر ریحانہ نے اسے ٹھوکا دیا۔

"ڈاکٹر صاحب ۔" ثومی نے گھبراہٹ چھپاتے ہوئے کہا۔ "برابر والی کوٹھی میں رہتے ہیں ۔"

"بلا ہے ہیں تمہیں ۔" ریحانہ نے کہا۔

"خدا جانے کیا بات ہے ۔" ثومی نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری۔

"جا کر پوچھ لو ۔" ریحانہ نے کہا۔

ثومی ہچکچائی۔ لیکن ریحانہ نے اسے جا کر ڈاکٹر صاحب سے بات کرنے پر مجبور کیا۔ مجبوراً ریحانہ کو خدا حافظ کہہ کر ثومی سڑک پار کر کے گاڑی کی طرف آ گئی۔ کلیم یقیناً اسے لینے آیا تھا۔ وہ یہ بات سمجھ گئی تھی۔ دو ایک بار پہلے بھی کلیم نے اسے سکول چھوڑنے کی پیش کش کی تھی۔

وہ بیحد سنجیدہ نظر آنے لگی۔ بے شک وہ غریب تھی۔ لیکن سرِ عام پڑا کھلونا ہرگز نہ تھی۔ اپنا وقار اسے جان سے بھی زیادہ عزیز تھا۔ وہ نپے تلے قدموں اور سنجیدہ چہرہ لیے گاڑی کے پاس آئی۔

کلیم نے بے تکلفی سے مسکراتے ہوئے گاڑی کا دروازہ کھول دیا۔

"آؤ ۔" کلیم نے بڑی اپنائیت سے کہا۔

"جی ۔۔۔ کیوں؟" ثومی نے تلخ لہجے میں پوچھا۔

"گھر جا رہا تھا۔ سوچا تمہیں ساتھ لیتا چلوں۔"

"جی ۔ شکریہ ۔ میں بس سے آؤں گی ۔"

"میرے ساتھ جانے میں کیا تکلیف ہے ۔"

"شکریہ ڈاکٹر صاحب ۔"

"چلو آؤ بیٹھو ۔۔۔ اتنی سنجیدہ نظر آنے کی کوشش نہ کرو ۔"

"میں نے کہہ دیا نا ۔ میں بس سے آؤں گی ۔"

"میں تمہیں کھا تو نہ جاؤں گا ۔"

"میں بس پہ آؤں گی ۔"

"ثومی ۔۔۔"

"دیکھو ایک شریف آدمی کو خواہ مخواہ پولیس دھر نہ لے ۔ لوگ سمجھیں گے میں تمہیں چھیڑ رہا ہوں۔"

"ڈاکٹر صاحب ۔۔۔ میں نہیں جاؤں گی ۔ آپ تشریف لے جائیے ۔" ثومی بولی۔

"میں ۔۔۔ تمہیں ۔۔۔ ساتھ لے ۔۔۔ کر ہی جاؤں گا ۔" کلیم نے اس کی نقل اتاری۔

"میں نہیں جاؤں گی ۔" اس نے لہجہ آہنی سا کر لیا۔

"کیوں؟ ۔۔۔" کلیم نے اس کی آنکھوں میں جھانکنے کی کوشش کی۔

"میں اپنا مقام پہچانتی ہوں ۔" ثومی نے منہ پھیرتے ہوئے کہا۔

"تم اپنا مقام متعین کرنے میں غلطی بھی کر سکتی ہو ۔" کلیم سنجیدہ ہو گیا۔

"جی نہیں ۔" ثومی نے خالی خالی نظروں سے اسے دیکھا۔

"چلو باتیں نہ بناؤ ۔ آؤ بیٹھو ۔" کلیم نے کھڑکی میں بازو ٹکاتے ہوئے کہا۔

"نہیں ڈاکٹر صاحب۔" وہ بدستور سنجیدہ تھی۔

"عجیب لڑکی ہو۔" کلیم کو غصہ سا آ گیا۔

"شاید۔" اس نے اسی لہجے میں جواب دیا۔

"خوب تو زبان چل رہی ہے۔ کبھی کبھی تو یوں لگتا ہے جیسے گونگی ہو۔" کلیم نے شوخی سے کہا۔

"آپ جو چاہیں کہہ سکتے ہیں۔" ثومی پتھر بنی جا رہی تھی۔

"تو پھر میرا کہا مانو۔ آؤ جلدی کرو۔ ایسی ہٹ دھرمی اچھی نہیں۔ دیکھو میں کتنی شرافت سے تمہیں بیٹھنے کو کہہ رہا ہوں۔ چلو آؤ بیٹھو۔" کلیم کا لہجہ منت سماجت کا رنگ لیے تھا۔

"جی میں نہیں بیٹھ سکتی۔ گاڑی میں۔" وہ قدرے تلخی سے بولی۔

"کیوں؟" کلیم نے اپنی طرف کا دروازہ کھولتے ہوئے باہر نکلنے کو پاؤں نکالا۔

"مجھے کوئی حق نہیں۔" وہ ورا پیچھے ہٹ گئی۔

"اوہو۔" کلیم کا ایک پاؤں گاڑی کے اندر اور دوسرا باہر تھا۔ وہ کھلے دروازے کو تھامے ہوئے تھا۔

"آپ تشریف لے جائیے۔" ثومی نے تلخی اختیار کی۔

"تو جناب کو گاڑی میں بیٹھنے کا حق نہیں۔" کلیم نے اس کی بات ان سنی کرتے ہوئے پوچھا۔

"جی۔ بالکل۔" ثومی نے الجھ کر کہا۔

"اگر میں کہہ دوں کہ تمہیں پورا پورا حق ہے ــــ تو ــــ" کلیم نے اس کی آنکھوں میں جھانک کر سرگوشی کی۔

ثومی نے کلیم کی طرف چونک کر دیکھا۔ اس کا دل اچھل گیا۔ کلیم جو کچھ کہہ رہا تھا۔ کیا اس میں صداقت نہ تھی؟ یقیناً تھی۔ ثومی کو باور کر لینا چاہیئے تھا۔ وہ کلیم کی

آنکھوں کے پُرسکون ٹھہراؤ میں جیسے ڈوب گئی۔

"آؤ بھی ــــ" کلیم نے پھر محبت بھرا اصرار کیا۔ لیکن ثومی ساکت و جامد کھڑی رہی۔ وہ بیحد سنجیدہ تھی۔ کلیم کو اس کی ہٹ دھرمی اور ضد پر غصہ آنے لگا۔ چند لمحے وہ بغور اس کا چہرہ دیکھتا رہا۔ سنگ دل نے کس بے دردی سے اس کی معصوم سی خواہش کو ٹھکرا دیا تھا۔ کلیم کا پارہ چڑھنے لگا۔ اسے اس کی ضد سے اپنی سبکی محسوس ہوئی۔

"نہیں آؤ گی۔ ؟" کلیم نے دوٹوک لہجے میں پوچھا۔

"نہیں آ سکتی۔" ثومی نے نرم پڑتے ہوئے کہا۔

کلیم نے اک قہر آلود نگاہ اس پر ڈالی۔ دروازہ اتنی زور سے یوں بند کیا۔ جیسے کہہ رہا ہو۔ دفع ہو جاؤ میری نظروں کے سامنے سے۔ اس کا چہرہ غصے سے لال بھبوکا ہو گیا۔ دوسری طرف کا کھلا دروازہ بھی اسی زور اور غصے سے بند کیا۔ گاڑی کا انجن کھولا۔ اور اک دھچکے سے گاڑی نکال لے گیا۔

وہ ناراض ہو گیا تھا۔ ثومی نے بھی تو پتھر بن کر اس سے بات کی تھی۔ اس کے احساسات کو جانچا تھا نہ جذبات کو دیکھا تھا۔

ایسی بھی ہٹ دھرمی کیا۔ ضد کی بھی کوئی حد ہونی چاہیئے؟"

گاڑی کے نکل جانے کے بعد بھی وہ اپنے آپ سے لڑتی رہی۔

بس میں بیٹھی وہ سوچ رہی تھی۔ کہ کلیم کے ساتھ نہ جا کر اس نے عقل مندی کی ہے یا بے وقوفی۔ اسے الجھن ہو رہی تھی۔ کلیم کے خلوص اور عقیدت پر شک کرنے کو جی چاہ رہا تھا۔ خلوص کو پرکھنے کی اس میں صلاحیت کیوں نہیں ہے؟ ہو سکتا ہے۔ کلیم کے دل میں بھی اس کی سچی چاہت تڑپ رہی ہو۔ وہ بھی اسے اسی شدت سے چاہتا ہو۔ جس کا اظہار اس نے ایک بار نہیں کئی بار کیا ہے؟

یہ بھی تو ہو سکتا ہے۔ اس کی اپنی محبت کی مقناطیسی کشش ہو۔ جس نے کلیم

اپنی طرف کھینچ لیا ہو۔ محبت ـــ محبت اک آزاد جذبہ ہے۔ آفاقی قدر ہے۔ رسم و رواج اور معاشرے کی حد بندیوں سے اس کا کوئی واسطہ نہیں۔ وہ خود بھی تو مفلسی کی داستان ہے۔ اس کا دل بھی تو کلیم جیسے صاحب حیثیت اور باوقار انسان سے جا ٹکرایا ہے۔ محبت حد بندیوں کو پھلانگ گئی ہے۔ تو پھر ـــ کلیم کیوں اک غریب لڑکی کے ساتھ خلوص سے محبت نہیں کر سکتا۔ کیوں کر اس کے جذبے صادق نہیں ہو سکتے۔ وہ کیوں کر اسے محض کھلونا سمجھ سکتا ہے ـــ؟

وہ کلیم کی محبت اور خلوص نیت پر ایمان لے آئی۔ دریا میں کود کر لہروں سے دامن بچایا تھوڑا ہی جا سکتا ہے۔ وہ خود تو کلیم کے عشق میں جل رہی تھی۔ محبوب ہر ادا کے ساتھ محبوب تھا۔ اس نے ذہن سے ہر وسوسہ نکال دیا۔ مستقبل آنے والا ہے۔ حال کا فکر ضروری ہے۔ جو اپنی دسترس میں ہے۔ ثومی نے کلیم کی محبت میں ڈوب کر اپنا آپ اس کے حوالے کر دینے کا فیصلہ کر لیا۔

وہ غریب ضرور تھی۔ لیکن غریبی جرم نہیں۔ عیب بھی نہیں۔ اس کا ماضی گھناؤنا تھا اس میں بھی اس کا کوئی ورثہ نہ تھا۔ تو پھر ان چیزوں کو جو اس کے اختیار میں نہ تھیں۔ کیوں اپنی خوشیوں کی راہ میں حائل کرتے ـــ؟

سارا راستہ وہ سوچوں میں گم رہی۔ لیکن جب وہ گھر پہنچی۔ تو اس کی حالت اس پجارن کی سی تھی۔ جو اپنا تن من دھن دیوتا کے قدموں میں نچھاور کر کے بھی دامن ہو کر بھی تہی دامن نہیں ہوتی ؂

کلیم پوری سنجیدگی سے ناراض ہو گیا تھا۔ ثومی بہانے بہانے اماں کے پاس گئی۔ اسے دیکھتے ہی وہ وہاں سے اٹھ کر چلا گیا۔ نگاہوں کی بیزاری اور اجنبیت ثومی نے پوری طرح محسوس کی۔

رات فریدہ کے ساتھ بھی وہ کلیم کے ہاں آئی۔ فریدہ نے آج شامی کباب بنائے تھے۔ کلیم سے داد پانے کے لیے وہ خود ہی کباب لے کر آئی تھی۔ کلیم اور اماں کھانے کی میز پر بیٹھے تھے۔ فریدہ نے ثومی کے ہاتھوں سے پلیٹ لے لی۔ اور کمرے میں چلی آئی۔ ثومی دروازے ہی میں رک گئی۔ کلیم کی دروازے کی پشت تھی۔

"اس وقت تکلیف کیوں کی بیٹی۔" اماں نے کبابوں کی پلیٹ لیتے ہوئے کہا۔ "بیٹھو۔ بیٹھو۔"

"میں نے بنائے ہیں خالہ جان ـــ دیکھئے کتنے لذیذ ہیں۔ آپ لوگوں سے داد پانے کے لیے خود ہی لے کر آ گئی ـــ لیجئے نا ڈاکٹر صاحب ـــ" فریدہ کرسی پر کلیم کے عین سامنے بیٹھ گئی۔

"شکریہ ـــ" کلیم نے بوجھل آواز میں کہا۔

"میری بیٹی بڑے کام کی ہے ـــ" اماں نے فریدہ کے چہرے کی بلائیں لیتے ہوئے اس کی پشت پر ہاتھ رکھا۔

"کباب کھا کر تو دیکھئے خالہ جان ـــ" فریدہ نے لہک کر کہا۔

اماں نے کباب اپنی پلیٹ میں رکھ لیا۔

"آپ بھی لیں نا ڈاکٹر۔" فریدہ نے پلیٹ اس کی طرف بڑھائی۔

"جی نہیں ــــ شکریہ۔" کلیم نے اسی انداز میں کہا۔

"ہائے اللہ۔ میں اتنے شوق سے بنا کر لائی۔ آپ چکھ کر تو دیکھیں۔" فریدہ نے شکوہ کیا۔

"لے لو نا بیٹے۔" اماں نے کہا۔ "دیکھو تو کھا کر کتنے کرارے کیسے خستہ ہیں۔"

اماں کے کہنے پر کلیم نے بے دلی سے کباب اٹھا لیا۔

"کیوں ــــ" فریدہ نے نگاہوں میں پوچھا۔

"بہت اچھے ہیں۔" کلیم کی آواز دبی دبی سی تھی۔ کلیم موڈ میں نہ تھا۔ وہ اسے غور سے دیکھنے لگی۔

"خیریت؟ ڈاکٹر صاحب۔ طبیعت تو ٹھیک ہے نا ــــ!" فریدہ نے جلدی سے پوچھا۔

"کچھ گڑبڑ ہی ہے۔" کلیم نے بغیر اس کی طرف دیکھے کہا۔

"تم بھی کھانا کھاؤ نا فریدہ بیٹی" اماں نے خالی پلیٹ اس کے سامنے کرتے ہوئے کہا۔

"شکریہ خالہ جان۔" فریدہ بولی۔

"تکلف نہ کرو ــــ کھاؤ" اماں نے اصرار کیا۔ فریدہ نے مجبوراً پلیٹ میں ذرا سا سالن ڈال کر نوالہ توڑا۔

اماں اور وہ گھل مل کر باتیں کرنے لگیں۔ ثومی دروازے کے ساتھ لگی کھڑی تھی۔ کلیم کے ناخوش گوار لہجے سے اسے دلی خوشی ہو رہی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ یہ سب اس سے کشیدگی کا اثر ہے۔ یہ احساس ثومی کو پاگل بنا رہا تھا۔ ؟ اللہ وہ بھی اسی قابل ہے کہ اس کے انکار سے کلیم کا دل یوں دکھ جائے ــــ؟ اس کا جی چاہا۔ پاگلوں کی طرح

چیختی پھرے۔ بلندیوں کو قدموں تلے روند ڈالے۔ وہ دروازے سے قدرے ہٹ کر دیوار سے لگی باتیں سنتی رہی۔ کلیم نے فریدہ سے شاذ ہی بات کی۔ ہاں وہ اماں سے باتیں کرنے کے ساتھ ساتھ کلیم کو بھی مخاطب کرتی رہی۔

سب سے پہلے کلیم نے ہی کھانا ختم کیا۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

"بس؟" فریدہ نے پوچھا۔

"طبیعت کچھ خراب ہی ہے۔ بھوک نہیں لگی۔" کلیم نے کہا۔ "نتھو گرم گرم پھلکے لے کر اندر آیا۔ تو کلیم نے اس سے کہا۔ "میں قہوہ پیوں گا۔ میرے کمرے میں پہنچا دینا۔" نتھو نے سر قدرے خم کیا۔

کلیم فریدہ کو شب بخیر کہہ کر معذرت کر کے کمرے سے نکل آیا۔

ثومی کے من میں جیسے پھلجھڑیاں چھوٹ رہی تھیں۔ اک نگاہِ دلربائی سے کلیم کو دیکھا کلیم نے بھی اسے دیکھا۔ دیکھتے ہی اس کی پیشانی پر سلوٹیں پڑ گئیں۔ "تم ــــ!"

"جی ــ میں ــ" اس نے قدرے شوخی سے اس کو دیکھا۔

"کیا کر رہی ہو یہاں۔ کیوں آئی تھیں؟" کلیم تو جیسے برس ہی پڑا۔ ثومی گھبرا گئی۔ اس گھبراہٹ میں بھی جو لطف تھا اس کی روح سرشار ہو گئی۔

اندر سے فریدہ جلدی سے اٹھ کر باہر آ گئی۔ "ثومی میرے ساتھ آئی تھی ڈاکٹر صاحب" کلیم نے اک جلتی ہوئی نگاہ اس پر ڈالی۔ راہ میں پڑی کرسی کو غصے سے ٹھوکر ماری۔ اور ناشتا ہوا برآمدے کے دوسرے سرے تک چلا گیا۔

فریدہ نے مسکرا کر ثومی کی طرف دیکھا۔ "ڈاکٹر صاحب کی طبیعت آج ٹھیک نہیں۔ ہا۔" وہ اندر چلی گئی۔ ثومی بھی چل دی۔

اماں نے جلدی سے پوچھا۔ "کون تھا؟"

"ثومی" فریدہ کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولی۔ "میں اسے ساتھ لائی تھی۔"

"چلی گئی ۔؟" اماں نے پوچھا۔

"جی ہاں" فریدہ نے کہا۔

اماں نے ماتھے پر آہستگی سے ہاتھ مارا۔ "خدا جانے اس لڑکی کو ثومی سے کیا بیر ہے دیکھ نہیں سکتا اسے ۔ بھلا باہر کھڑی تھی ۔ تو اس کا کیا لیتی تھی۔"

"ڈاکٹر صاحب کا موڈ خراب تھا نا اس لیے ۔" فریدہ نے سے اپنی انگلیاں صاف کرتے ہوئے کہا۔

"آج تو موڈ خراب ہے ۔ اکثر ایسے ہی ہوتا ہے ۔ میں اسے اپنی سہولت کے لیے کسی کام کو بلا لوں ۔ بس پارہ چڑھ جاتا ہے ۔ پہلے تو اسے دیکھتے ہی برہم ہو جاتا ہے ۔ خدا کرے کچھ عادت ہی تھی ۔ آج پھر وہی بات ۔" اماں نے تردد سے کہا۔

"کوئی بات نہیں خالہ جان" فریدہ نے جلدی سے کہا۔

"اے ہے بیٹی ۔۔۔ کچھ خدا خوفی بھی ہونی چاہیئے ۔ کتنے غصے سے بولا ہے میرا تو دل دہل گیا ۔ ایسی بھی کیا بات تھی ۔ کھڑی ہی تھی نا وہ ۔" اماں نے پلیٹ ہر رکھتے ہوئے کہا۔ "سو کام کر دیتی ہے میرا ۔ نوکر تھوڑی ہے ۔"

"چلیئے ۔ کیا ہوا ۔۔۔" فریدہ نے ہنس کر کہا ۔ "کبھی کبھی ایسے ہو ہی جاتا ہے ۔"

"غریب کے دل کی دعا ہی لینا چاہیے بیٹی ۔ میرا تو دل کانپ گیا ہے ۔" اماں نے کہا۔

"ثومی اچھی لڑکی ہے خالہ جان بے فکر رہیئے ۔" فریدہ نے ہنستے ہوئے کہا۔

"دعا ہی دے گی ۔۔۔"

چند لمحے اور رکنے کے بعد فریدہ اپنے گھر آ گئی ۔ کھانے کی میز پر اسی کا انتظار ہو رہا تھا ۔ فریدہ نے اترانے ہوئے بتایا ۔ کہ وہ کھانا خالہ اماں اور کلیم کے ساتھ کھا آئی ۔ سلمیٰ کو اس کی باتوں سے ایک گونہ خوشی ہوئی ۔ کلیم جیسے انسان ہی کی تو اسے

کے لیے تلاش تھی ۔

ثومی اس رات پوری طرح سو نہ سکی ۔ کلیم کا پھولا پھولا غضب ناک چہرہ آنکھوں میں پھرتا رہا ۔ اپنی خوش نصیبی پر رشک آتا تھا ۔

تین چار دن گزر گئے ۔ کلیم سے کئی بار سامنا ہوا ۔ ہر بار اس نے ٹھنڈی نظروں سے اجنبیت کا اظہار کرنے کی کوشش کی ۔ طبیعت بجھی بجھی رہی ۔ گھر میں ہونا یا فریدہ کے ہاں ۔ باتوں کا انداز پھیکا ہی رہتا ۔ ثومی سب کچھ محسوس کر رہی تھی ۔ کلیم من مندر کا دیوتا تو تھا ہی ۔ اب تو عقیدت ہزار گنا بڑھ گئی ۔

اس سہ پہر وہ برآمدے میں سلمیٰ کی مشین رکھے سلمیٰ کے دوپٹوں کو فیتہ لگا رہی تھی ۔ قریب ہی کرسی پر سلمیٰ بیٹھی تھی ۔ فریدہ بھی آرام کرسی پر نیم دراز تھی ۔

ثومی نے دوپٹہ تیار کر کے سلمیٰ کو دیا ۔ اور دوسرے کا فیتہ ماپنے لگی ۔ سلمیٰ کونے دیکھ رہی تھی ۔ ثومی نے بڑی نفاست سے کونوں پر سے فیتہ موڑا تھا ۔

"تم نے سلائی کیسے سیکھ لی تھی ثومی ۔" فریدہ نے دوپٹہ دیکھتے ہوئے کہا ۔ "اتنے باریک دوپٹے پر تو میں دو ٹانکے بھی نہ بھر سکوں ۔"

ثومی مسکرا دی ۔ سلمیٰ اس کی تعریف نہ کرنا چاہتی تھی ۔ دوپٹہ تہہ کرتے ہوئے بولی ۔ "یہ کونسا بڑا کام ہے ۔"

"نہیں ممی ۔" فریدہ نے کہا ۔ "ثومی سکول میں بھی کام کر رہی ہے ۔ گھر پر بھی کرتی ہے ۔ اس پر سوئی سلائی بھی ۔ کتنے اچھے سویٹر بنے تھے اس نے میرے ۔۔۔"

"تم بھی سیکھو نا ۔۔۔" سلمیٰ نے کہا ۔ "لڑکا تو نہیں ہو ۔"

"کس وقت سیکھوں ممی ۔" فریدہ پیار سے اٹھلائی ۔

"کیوں ۔۔۔ پڑھائی مانع تو نہیں ہوتی ۔ آخر ہم نے بھی تو پڑھا ہے ۔" سارے ہی کام سیکھے ۔۔۔"

"اوہ ممی ـــ آجکل وقت کا مصرف اور ہو گیا ہے۔"

"جی ـــ ہاں۔"

"اب دیکھئے نا آج چھٹی تھی۔ دوپہر تو نہاتے، سر دھوتے ہی آ گئی۔ شام سینما کا پروگرام ہے۔"

"سینما جانا ایسا ہی ضروری ہے کیا؟"

"ممی بڑی خوبصورت پکچر آئی ہے۔ وحیدہ اور صائمہ بھی جا رہی ہیں۔ انکل جمشید اور باجی نصیرہ بھی ـــ آپ بھی چلیں گی ـــ"

"میں تو آج نہ جا سکوں گی۔"

"ممی ضرور چلیئے۔"

فریدہ اصرار کرنے لگی۔ "آپ ضرور چلیں گی۔ ڈیڈی کو تو اپنی ہی مصروفیات رہتی ہیں۔ آپ تو ساتھ دیا کریں ہمارا۔"

"چلو چلیں گے۔"

"ممی آپ کتنی اچھی ہیں۔"

فریدہ نے بچوں کی طرح خوش ہو کر تالیاں بجائیں۔ ماں بیٹی کی گفت گو ثومی بھی سن رہی تھی۔ لاڈ پیار چاؤ چونچلے دیکھ کر اس کا دل کچھ بجھ سا گیا۔ ساری محرومیاں کیا اسی کے لیے مقدر تھیں۔ ماں کا حقیقی پیار۔ باپ کی شفقت وہ جانتی ہی نہ تھی۔ کہ کیا ہوتی ہے۔ بے شک جیراں اور فتو نے اسے پالا تھا۔ پیار بھی کیا ہو گا۔ لاڈ بھی دیکھے ہوں گے۔ لیکن جب سے جیراں کے اپنے بچے ہوئے تھے۔ اور ثومی نے ہوش سنبھالا تھا۔ جیراں اور فتو کو بیزار ہی پایا تھا۔ اور جب سے اسے معلوم ہوا تھا۔ کہ وہ ان کی بیٹی نہیں۔ خود اس نے بھی کبھی ان سے پیار و چاہت پانے کی توقع ہی نہ رکھی تھی۔

"ثومی" فریدہ کی آواز پر ثومی کا مشین پر تیزی سے گھومتا ہاتھ رک گیا۔ اس کے ذہن کی مشین بھی تھم گئی۔ اس نے فریدہ کی طرف دیکھا۔ سلمیٰ وہاں سے اٹھ کر جا چکی تھی۔

"آپ نے بلایا۔"

"ہاں۔"

"جی ـــ کہیئے۔"

"تو نے کبھی انگریزی فلم دیکھی۔"

"نہیں۔ اردو کی بھی دو چار آپ ہی کے ساتھ دیکھ لیں۔ ورنہ ـــ"

"چلو گی آج ہمارے ساتھ۔"

ثومی کچھ ہچکچائی۔ "بیگم صاحبہ ـــ سے پوچھ لیں۔ پہلے ـــ پھر ـــ"

"جی تو چاہ رہا ہے نا۔"

ثومی مسکرانے لگی۔ فریدہ بھی متبسم لبوں سے اسے دیکھنے لگی۔

ثومی جلدی جلدی مشین چلانے لگی۔ اور فریدہ اخبار کھول کر دیکھنے لگی۔

"میں آنٹی نصیرہ کو فون کر دوں ـــ" فریدہ اٹھنے کو تھی۔ کہ بغلی برآمدے سے کلیم آتا دکھائی دیا۔

"ہلو ـــ ڈاکٹر صاحب۔ وہ وفورِ مسرت سے جیسے چیخی۔

کلیم کی نظریں ثومی پر پڑیں۔ ثومی نے بھی فریدہ کی آواز پر سر اٹھا کر ادھر دیکھا۔ کلیم ادھر ہی آ رہا تھا۔ حسبِ سابق اس کی پیشانی بوجھل ہو گئی۔ اور آنکھوں میں سرد مہری کے آثار نظر آنے لگے۔ اس نے ہاتھ میں پکڑا ہوا کاغذوں کا ایک بنڈل سا فریدہ کی طرف بڑھایا۔

"فریدہ صاحب تو نہیں آئے ہوں گے۔"

"جی نہیں۔" فریدہ کاغذ پکڑتے ہوئے بولی۔

"یہ انہیں دینے ہیں۔" کلیم نے کہا۔

"بیٹھئے ڈاکٹر صاحب ——" فریدہ نے اصرار سے کہا۔

"یہاں بیٹھنا ضروری ہے کیا ——؟" کلیم نے ثومی کی طرف غصیلی نظروں سے دیکھ کر کہا۔ ثومی بے چین نظر آئی۔

فریدہ مسکرانے لگی۔ اسے اماں کی بات یاد آ گئی۔ ناحق کا بیر ہے اسے ثومی سے فریدہ نے دل ہی دل میں کہا اسے شرارت سوجھی۔ کلیم کو ستانے کو دل چاہا۔

"باہر دھوپ ہے ابھی۔" "یہیں بیٹھئے ——" وہ نگاہوں میں شوخی کی چمک لاتے بولی۔

"تو میں چلا ——" کلیم نے واپس جانے کو قدم اٹھایا۔ ثومی کو اس نے گوشۂ چشم سے دیکھا۔

"ہائے اللہ۔ بیٹھئے بھی ڈاکٹر صاحب ——" فریدہ نے ضدی بچے کی طرح کہا۔

کلیم کرسی پر بیٹھ گیا۔ ثومی کا دل جلانے کو اس نے فریدہ کے ساتھ کچھ زیادہ ہی التفات برتنے کا سوچا۔ "آج بیکار کیسے بیٹھی ہے۔"

"اس نے آج زبردست پروگرام بنایا ہے ڈاکٹر صاحب ——" فریدہ اس کے سامنے بیٹھ گئی۔ "بیکار بالکل نہیں۔ پروگرام۔ زبردست پروگرام ——"

"یعنی ——"

"پکچر ——"

"خوب ——" میں بھی چھٹی گزارنے کا سوچ رہا تھا۔

"ہم بہت سے لوگ جا رہے ہیں۔ آپ بھی چلیئے۔ چھٹی کے دن تو بخل سے کام نہ لیا کیجئے ——"

"کون کون جا رہا ہے ——"

فریدہ نے بہت سے ملنے والوں اور اپنی سہیلیوں کے نام گنوا دیئے۔ آخری نام اس نے ثومی کا لیا۔ اور شوخی سے کلیم کی آنکھوں میں جھانکا۔

کلیم کے چہرے پر بیزاری کے آثار نمودار ہوئے۔ فریدہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

"آپ جانے کی حامی تو بھریئے۔ جانے والوں کی فہرست میں کانٹ چھانٹ کر لیں گے ——" فریدہ نے دزدیدہ نظروں سے ثومی کو دیکھا۔ اور پھر آنکھوں سے کلیم کو اشارہ کر کے ہنس پڑی۔

ثومی بجھ سی گئی۔ گو جانتی تھی۔ کہ کلیم انتقاماً ایسا کر رہا ہے۔ پھر بھی انتقام کی یہ شدت برداشت کرنا مشکل ہو گئی۔

دوپہر ختم ہو گیا تھا۔ اس نے ساری چیزیں سمیٹیں۔ اور مشین اٹھا کر وہاں سے چل دی۔ فریدہ اور کلیم کا پروگرام بنا یا نہیں، اسے علم نہ تھا۔

وہ اپنے کوارٹر میں آ گئی۔ بڑی الجھی الجھی اور پریشان تھی۔ جیراں گود میں نوزائیدہ بچی کو لیے صحن میں بیٹھی تھی۔ صدیق اس کے برابر پڑی پلنگڑی پر بیٹھا مانی مٹی کی چلم پی رہا تھا۔ کچے صحن میں جیراں کے کالے کلوٹے بچے کھیل رہے تھے۔ ثومی سیدھی اپنے کمرے میں چلی گئی۔ صدیق کی طرف اس نے دیکھا تک نہیں۔ صدیق جیراں سے کھسر پھسر کرنے لگا۔

ثومی اپنے بستر پر پڑ گئی۔ وہ کس مخمصے میں پھنس گئی تھی۔ اسے کیا کرنا چاہیئے تھا۔ روٹھے ہوئے محبوب کو کیوں کر منانا چاہیئے تھا۔ اب تو معاملہ اس کی برداشت سے باہر ہو رہا تھا۔ انجام سے بے نیاز ہو کر اس نے اپنے آپ کو کلیم کے قدموں میں لٹا دینے کا سوچ لیا۔ محبت فنا کا ہی تو نام ہے ——"

شام وہ اماں کی احوال پرسی کو ادھر آ گئی۔ فریدہ اور سلمیٰ وغیرہ پکچر پر جا چکے تھے۔ یقیناً کلیم بھی۔ ثومی کا دل اداس اداس تھا۔ اماں بستر پر لیٹی تھیں۔ وہ کتنی ہی دیر

ان کے پاؤں دباتی رہی۔ اماں بھاری بھرکم تھیں۔ دن بھر کی تھکاوٹ ثومی کے دبانے سے قدرے کم ہو گئی۔

ثومی اٹھ کر جانے لگی۔ تو اماں نے تکیے کے نیچے سے ایک روپیہ نکال کر اسے دینا چاہا۔ ثومی کو اپنی ہتک سی محسوس ہوئی۔ لیکن مسکرا کر روپیہ لوٹا دیا۔ اماں بڑی متاثر ہوئی۔ پہلی بار بیٹی کہہ کر پکارا۔ ثومی کو محنت کا حق وصول ہو گیا۔

خوشی خوشی ہلکے ہلکے قدموں سے وہ وہاں سے اپنے گھر کی طرف چلی۔ پچھلی طرف سے گھوم کر برآمدے میں آئی۔ تو سامنا کلیم سے ہو گیا۔ وہ چمن کی طرف سے اندر آ رہا تھا۔

"آپ ——" ثومی آج اسے دیکھ کر گھبرائی نہیں۔

کلیم نے تلخ نظروں سے اسے گھورا۔ ثومی کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

"آپ لیکچر نہیں گئے۔" اس نے جگمگاتی مسکراہٹ سے کہا۔

کلیم نے اسے یوں دیکھا جیسے کچا ہی تو چبا جائے گا۔

"میں نے کوئی لیکچر تھوڑا ہی جانا تھا۔ آپ نے ناحق اپنا پروگرام —— خراب کیا۔" ثومی شوخ شوخ نظروں سے اسے دیکھ کر بولی۔

کلیم نے آج پہلی بار اس متین اور سنجیدہ حسن کو یوں شوخی سے پھڑکتے دیکھا۔ سحر زدہ سا ہوا۔ لیکن خفا جو تھا۔ یوں من تھوڑا ہی جانا تھا۔ چہرے پر چٹانوں کی سختی اور نگاہوں میں قہر کی تپش لیے ثومی کو گھورا۔

ثومی کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ اچانک نتھو نہ آ جاتا۔ تو من مندر کے دیوتا کو وہ اسی آن منا لیتی۔

——

"ثومی سنبھل جا —— خود فریبی میں لذتِ آسودگی سہی —— لیکن یہ خود فریبی تجھے مہنگی پڑے گی۔ کلیم اور تیرے درمیان غربت امارت کی کھائیں ہی نہیں۔ تیرے پس منظر کی سیاہی بھی حائل ہے۔ تیری غریبی کو اس نے سینے سے لگا بھی لیا۔ تو تیرے ماضی کے گھناؤنے پن کو اس کے سینے کی وسعتیں بھی جذب نہ کر سکیں گی۔"

"اس میں میرا کیا قصور؟ میری ماں نے گناہ کیا —— مجھے یہاں پھینک گئی۔ اس فعل میں میرا تو ہاتھ نہیں۔ کلیم کی فراخدلی یہ سب کچھ اپنا لے گی۔ محبت اندھی ہوتی ہے۔ بعض اوقات انہونی بھی تو ہو جاتی ہے۔"

"اور یہ بھی یاد رکھ۔ جب انہونی ہو جائے تو زمانہ اسے اپنے تیس دانتوں میں لے کر پیس ڈالتا ہے۔"

"مجھے انجام کی کوئی پرواہ نہیں۔ میں تقدیر کی قائل ہوں۔ جو قسمت کا لکھا ہو وہ ہو کر ہی رہتا ہے۔ بس اب تو میں کلیم سے دور نہیں رہ سکتی۔ نہیں رہ سکتی۔ زمانہ چاہے سزا دے۔ اب میری برداشت —— میری ہمت جواب دے گئی ہے۔ میں بے بس ہو گئی ہوں۔"

اپنے چھوٹے سے گھٹے گھٹے ماحول والے کمرے میں ثومی اپنے آپ سے الجھ رہی تھی۔ رات بیت رہی تھی۔ سامنے دیوار سے لگی چارپائی پر اس کی نام نہاد بہنیں رابعہ اور شمو سو رہی تھیں۔ ایک طرف اس کا نیا خریدا ہوا لوہے کا بکس پڑا تھا۔

دیواروں پر رابعہ نے رنگین کاغذی تصویریں لگا رکھی تھیں۔ یہ کمرہ اور کمرے کی کم مایہ چیزیں ہمیشہ ثومی کی سوچوں کی راہ میں حائل ہوا کرتی تھیں۔ لیکن آج ثومی ان رکاوٹوں کو پائے استقامت سے ٹھکرا رہی تھی۔

رات سوتے میں وہ رنگا رنگ خواب دیکھتی رہی۔ کبھی وہ سوہنی کہاروں تھی۔ ٹھاٹھیں مارتے چناب کو عبور کر رہی تھی۔ کبھی ہیر تھی۔ اور عشق کی خاطر زہر بھرا جام نوش کر رہی تھی۔ کبھی سسی تھی۔ اور پنوں پنوں پکارتی تھلوں میں جلتی ریت پر دوڑ رہی تھی۔

اگر کبھی ملکہ ثریا تھی۔ جرمنی اور اٹلی کے عالیشان ہوٹلوں میں ذی شان اجتماعوں میں کھو کر اپنا غم غلط کرنے کو اپنی ذات میں چھپی تنہائی سے نبرد آزما تھی۔ تو کبھی پرنسس آف ویلز کی مسز سمپسن تھی۔ تخت و تاج کو ٹھوکر مار کر اس کا محبوب اس کی بانہوں میں آ گیا تھا۔

وہ کبھی لیلیٰ تھی تو کبھی شیریں اور کبھی مناکو کے پرنس رینیئر کی شہزادی گریس۔ خواب لاشعوری اور شعوری خیالات و احساسات کے عکس ہوتے ہیں۔ ثومی رات بھر ان عکسوں کے حسن و قبح میں کھوئی رہی۔

صبح وہ بیدار ہوئی۔ تو اسے یوں لگا۔ جیسے وہ کوئی بہت بڑا بوجھ اپنے سر سے اتار آئی ہے۔ ہلکی پھلکی ہو گئی ہے۔ ہر مشکل سے نپٹ چکی ہے۔

جیراں کے پاس چولھے کے قریب بیٹھ کر ثومی نے روٹی کے ساتھ چائے کا پیالہ پیا۔ باقی بچے بھی اس کے گرد اگرد اودھم مچا رہے تھے۔ ثومی سکول جانے کے لیے تیار تھی۔ نئی خریدی ہوئی گلابی پھولوں والی قمیض کے ساتھ اس نے اسی رنگ کا دوپٹہ اوڑھ رکھا تھا۔ سپید لٹھے کی شلوار تھی۔ ان سادہ سے کپڑوں میں بھی اس کا خوبصورت سراپا قیامت بنا ہوا تھا۔ جیراں نے نظر بھر کر دیکھا۔ صدیق سے کیے وعدے اسے ڈانواڈول ہوتے گئے۔ یہ لڑکی اس ماحول میں پنپنے کی نہ تھی۔

ثومی جب سے ملازم ہوئی تھی۔ جیراں اس سے مرعوب مرعوب سی رہتی تھی۔ اس

کی تنخواہ نے مالی طور پر اسے بڑا استحکام بخشا تھا۔ ایسی صورت میں بھی وہ ثومی کے خلاف منشا کوئی فیصلہ کرنے پر قادر نہ رہی تھی۔

ثومی سکول جانے کے لیے اپنے کوارٹر سے نکلی۔ صدیق بھی اپنی خاکی وردی میں اپنے کوارٹر سے نکلا۔ وہ ٹیکسی کا ایک چکر لگا بھی آیا تھا۔ ثومی اپنے خیالات میں کھوئی سر جھکائے چلی جا رہی تھی۔ نعیم کے گھر جانے والی گارڈ بینیا کی باڑ توڑ کر جو بجری کی سڑک بنی تھی۔ ثومی کے قدم خود بخود اس پر اٹھنے لگے۔

فریدہ نے اسے ادھر جاتے دیکھا۔ اور صدیق نے بھی۔ فریدہ نے تو کوئی خیال نہ کیا لیکن صدیق کو ثومی کا صبح صبح ادھر جانا کچھ عجیب سا لگا۔

وہ باڑ کے قریب اس کی واپسی کا منتظر رہا۔

لیکن ثومی واپس آنے کو تھوڑا ہی گئی تھی۔ اس نے آج دونوں کوٹھیوں کا درمیانی راستہ ہی عبور نہیں کیا تھا۔ ایک زندگی سے دوسری زندگی میں قدم رکھا تھا۔ تند و تیز موجوں کی شوریدہ سری کے باوجود دریا میں کود گئی تھی۔ انجام و عواقب سے بے نیاز ہو کر روحانی آسودگی کا سامان کر لیا تھا۔

نعیم کی گاڑی برآمدے کے سامنے شہتوت کے پھیلے ہوئے درخت کے نیچے کھڑی تھی۔ اور نتھو اس کا چرمی بیگ گاڑی میں رکھ رہا تھا۔

ثومی گاڑی کے پاس آ گئی۔ "ڈاکٹر صاحب تیار ہیں۔" اس نے نتھو سے پوچھا۔

"ہاں ہاں۔ بس آ ہی رہے ہیں۔" نتھو نے واپس مڑتے ہوئے کہا۔

ثومی گھوم کر دوسری طرف آئی۔ گاڑی کا دروازہ کھولا۔ اور اگلی سیٹ پر بیٹھ کر دروازہ بند کر لیا۔ اس کا انداز گرنے کا سا تھا۔ دل دھک دھک کر رہا تھا۔ ہونٹ خشک ہوئے جا رہے تھے۔ اور ماتھے پر پسینے کی ننھی ننھی بوندیں چھلک آئی تھیں۔

اس کی مدہوشیوں کو جیسے ایک دم ہوش آ گیا۔ اپنی ایسی جرأت مندی پہ خود ہی گھبرا گئی۔ گھبرا کر اس نے ارد گرد دیکھا۔ یوں لگا جیسے چاروں اور زمانے کی کھا جانے والی نظریں ہیں۔ کانوں میں طعن و تشنیع کے آوازے گونجنے۔ سلمیٰ کی کڑک۔ فریدہ کا طنز جیراں کے کوسنے نتو مالی کا جھکا ہوا سر ــــ اف اس کا دماغ چکرانے لگا۔ اسے یوں لگا جیسے وہ کوئی آوارہ سی لڑکی ہے۔ جو عزت داؤ پہ لگا کر بھاگ آئی ہے۔

سیٹ کی پشت پہ سر ٹکا کر اس نے لمبے لمبے گہرے گہرے سانس لیے پھر اس کے اندر سے اٹھتی آواز نے اس کی ہمت بندھائی۔ محبت جرم نہیں۔ گناہ نہیں یہ آفاقی قدر ہے۔ یہ روحانی جذبہ ہے۔ عشق دین ہے۔ عشق دنیا ہے۔ عشق آغاز ہے۔ عشق انجام ہے۔ عشق موت ہے۔ عشق زندگی ہے۔

اس آواز کے سحر سے ثومی سنبھل گئی۔ جب اس نے اپنا آپ داؤ پہ لگا ہی دیا تھا۔ تو پھر ڈر ڈر کر مرنے کی کیا تک تھی۔

اپنے ٹھنڈے ٹھنڈے نم نم ہاتھوں کو مسلتے ہوئے وہ سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔ جرأت اور ہمت سے اس نے حالات کا مقابلہ کرنے کا عزم کیا۔

اور ــــ جب تھوڑی ہی دیر بعد کلیم گاڑی کے قریب آیا۔ تو اس کے بھرے بھرے ہونٹوں پہ خوش آمدیدی تبسم رقص کر رہا تھا۔

کلیم اپنے ہی خیالوں میں مگن گاڑی کے پاس آیا۔ دروازہ کھول کر وہ اندر بیٹھنے کو جھکا۔ تو برابر کی سیٹ پہ ثومی کو پا کر ٹھٹک گیا۔

دوسرا لمحہ اس کے لیے بے پایاں حیرتوں کا حامل تھا۔ ثومی کی نادم مسکراہٹ اس کی شکست قبول کرنے کی غماز تھی۔ کلیم کے ہونٹوں پہ مسکراہٹ بکھر گئی۔ اس کی آنکھوں میں تارے ٹوٹنے لگے۔ اک لمحہ کو تو اسے یوں لگا۔ جیسے خوشیوں کی یہ دین اس کی برداشت سے باہر ہے۔ وہ اپنی سیٹ پہ بیٹھا۔ تو ثومی سمٹ کر پرلی طرف

ہو گئی۔ وہ سر جھکائے لرزتے کانپتے ہونٹوں کے گوشے بار بار کاٹ رہی تھی ــــ یہ مسکراہٹ ــــ یہ نادم سی مسکراہٹ بڑی ہی قاتل تھی۔

کلیم نے گاڑی سٹارٹ کرتے ہوئے اسے دیکھا۔ اور بار بار دیکھا۔ ثومی نے ہار مان لی تھی۔ اس کی محبت قبول کر لی تھی۔ یہ خوشیوں کا پاگل کر دینے والا مقام تھا لیکن ثومی نے اسے کتنا ستایا۔ کتنا تڑپایا تھا۔ کیا وہ اسے یونہی بخش دینے والا تھا۔

نہیں ــــ اس نے فیصلہ کر لیا۔ اور دوسرے لمحے اپنے اوپر بوجھل سی سنجیدگی طاری کر لی۔ گاڑی تیزی سے بنگلے سے نکال کر وہ سڑک پر لے آیا۔ ثومی سے اس نے کوئی بات نہ کی۔ منہ بنائے بیٹھا رہا۔ ثومی نے اسے دیکھا۔ مسکرائی۔ کچھ کہنے کو گنگنائی لیکن کلیم بدستور خاموش بیٹھا گاڑی کو تیز رفتاری سے اڑائے لیے گیا۔

گاڑی سنسان سڑکوں سے ہوتی شہر کی آباد سڑکوں پہ آئی۔ دائیں مڑی بائیں گئی۔ اور پھر کھلی سڑک پہ آ گئی۔ ثومی نے کھڑکی سے باہر دیکھا۔ گاڑی جرنیلی سڑک پہ تیزی سے جا رہی تھی۔ اس نے کلیم کی طرف دیکھا۔ یقیناً یہ ہسپتال کا راستہ نہیں تھا۔ نہ ہی سکول اس طرف تھا۔ کلیم کی طرف اس نے گھبرا کر دیکھا۔ وہ تو بت بنا شیشے پر نظریں جمائے وھیل پہ ہاتھ رکھے گم صم سا بیٹھا تھا۔ ثومی کو اپنی جسارت کا احساس ڈسنے لگا۔ محبت کی کون سی سند اس کے پاس تھی۔ جو وہ یوں بے دھڑک اس کے ساتھ چلی آئی تھی۔ قریب تھا۔ کہ اس پہ غشی کی سی کیفیت طاری ہو جاتے۔ لیکن اس نے سنبھالا لیا۔ اور بڑی جرأت سے کلیم کی طرف دیکھ کر پوچھا "آپ کہاں جا رہے ہیں۔"

"پنڈی ــــ" کلیم نے بغیر اس کی طرف دیکھے جواب دیا۔

"پنڈ ــــ ی ــــ" ثومی حیران ہو کر آگے کو جھکتے ہوئے جلدی سے بولی۔

"جی ــ ہاں ــــ" اس کی خود ساختہ متانت اور سنجیدگی عروج پہ تھی۔

"لیکن ــــ میں ــــ میں نے تو سکول جانا ہے۔" مارے گھبراہٹ کے

اس کا بُرا حال تھا۔

"ضرور جانا ہوگا۔" وہ اسی انداز میں بیٹھا رکھائی سے بولا۔

"ڈاکٹر صاحب۔ میں نے سکول جانا ہے۔" اس نے پھر ہکلاتے ہوئے کہا۔

"چلی جاتیں ——" وہ بے پروائی سے بولا۔ "میں نے تمہیں کب بلایا تھا۔"

"بخدا ——" ثومی روہانسی ہو گئی۔ ندامت سے اس پر گھڑوں پانی پڑ گیا۔ اٹکتے ہوئے بیقراری سے بولی۔

"گاڑی واپس موڑ لیجئے ڈاکٹر صاحب —— مجھے سکول پہنچا دیجئے۔"

"مجھے پنڈی میٹنگ میں وقت پر پہنچنا ہے۔" وہ رکھائی سے وار کرتے ہوئے بولا۔

"تو —— تو میں —— کیسے جاؤں گی —— میں کیا کروں ——" وہ بے طرح گھبرا گئی۔ "آپ نے پہلے کیوں نہ بتایا ——"

"تم نے پوچھا ہی کب تھا؟" وہ جھلا کر کہا۔

"اب میں کیا کروں" وہ روہانسی ہو گئی۔

"میں کیا خدمت کر سکتا ہوں۔" وہ ماتھے پر بل ڈال کر بولا۔

"خدا کے لیے مجھے واپس چھوڑ آئیے ——" اس نے بہ منت کہا۔

"میں ایسا نہیں کر سکتا ——" وہ خشکی سے بولا۔

"کیوں ——" وہ ہاتھوں کو مسلتے ہوئے بے چینی سے بولی۔

"میں نے دس بجے پنڈی پہنچنا ہے۔ دیر ہو جائے گی ——" وہ سگریٹ سلگاتے ہوئے بولا۔ کن انکھیوں سے گھبرائی ہوئی ثومی کو دیکھ کر محظوظ ہوا۔

"ہائے اللہ ——" اس نے سینے پر ہاتھ اوپر تلے رکھتے ہوئے کہا۔ "میں کیسے جاؤں ——"

"پنڈی جانے کے سوا چارہ ہی کیا ہے۔" اس نے انگلیوں میں سگریٹ دبائے دھیلی پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"نہیں۔ نہیں ——" وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھنے لگی۔ کلیم کو ہنسی آ رہی تھی۔ لیکن اس نے کھڑکی سے باہر دیکھنے کے بہانے اس کی طرف سے گردن موڑ لی۔

"مجھے واپس چھوڑ آئیے۔ ڈاکٹر صاحب۔" ثومی نے لجاجت سے کہا۔ اس کی آنکھیں نم ہو رہی تھیں۔

"کیسے چھوڑ آؤں ——" کلیم غصے سے غرایا۔ ثومی ڈر گئی۔

"کہا جو ہے مجھے وقت پر پنڈی پہنچنا ہے۔ واپس جاؤں تو دیر ہو جائے گی۔ میں کل شام لوٹ آؤں گا۔ تم بھی اب کل ہی آ سکتی ہو۔"

"ہائے اللہ —— یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ میں پنڈی —— نہیں جا سکتی ——" اس کی آنکھوں میں نمی پھیل گئی۔

"تو پھر میں کچھ بھی نہیں کر سکتا۔ اتنا ہی جانے کی فکر ہے تو یہاں اتر جاؤ۔ کسی گاڑی یا بس کو ہاتھ دے کر روک لینا۔ واپس پہنچ جاؤ گی ——" وہ تلخ آواز میں پیشانی پر بل ڈال کر بولا۔ "روک دوں گاڑی؟" اتر جاؤ ——"

ثومی نے حیران و پریشان ہو کر پوری آنکھیں کھول کر اسے دیکھا۔ ذلت و رسوائی سے اس کا دل بیٹھ بیٹھ گیا۔

کلیم نے زبردست بریک لگائی۔ گاڑی کو دھچکا لگا۔ ثومی بے سہارا ہو کر کلیم کے اوپر گرتے گرتے بمشکل بچی۔ کلیم نے کسی جذباتی خوشی کا اظہار نہیں کیا۔ بلکہ ہاتھ سے اسے پرے ہی روک دیا۔ گاڑی سڑک کے کنارے رک گئی۔

ثومی نے پریشان ہو کر استفہامی نظروں سے اسے دیکھا۔ سڑک اس وقت تقریباً سنسان تھی۔ سامنے سے ایک ٹرک آ رہا تھا اور اس سے کافی دور لال رنگ کی ٹیوٹا آتی دکھائی دے

رہی تھی۔

"یہاں اتر جاؤ۔ کسی نہ کسی گاڑی میں لفٹ مل جائے گی۔" کلیم نے انتہائی سنگ دلی کا مظاہرہ کیا۔

"بس ملے یا موٹر۔ لفٹ لے لینا۔"

ثومی نے پھر اس کی طرف دیکھا۔ کہیں وہ مذاق تو نہیں کر رہا۔ لیکن ثومی کو مایوسی ہوئی۔ اس کے چہرے پر ظالمانہ سی سنجیدگی تھی۔ ماتھے پر شکنیں ڈالے ہونٹ بھینچے وہ اس کے گاڑی سے اترنے کا منتظر تھا۔

ثومی کی غیور طبیعت، اتنی ذلت۔ ایسی رسوائی برداشت نہ کر سکی۔ نمی آنکھوں میں گھل گئی۔ اس کی آنکھیں ڈبڈبائیں۔ اور پھر بے اختیار ہو کر رو دی۔

"انزو بھی اب ـــ کیا مصیبت ہے۔ مجھے دیر ہو رہی ہے۔ سنتی نہیں ہو کیا۔" غصیلے لہجے کی ڈانٹ سے آنکھیں برس گئیں۔ اس نے دونوں ہاتھوں میں منہ چھپا لیا۔ اور بچوں کی طرح رونے لگی۔

کلیم اسے روتے دیکھ کر بے خود سا ہو گیا۔ روتے میں وہ اور بھی پیاری لگنے لگی تھی۔ کلیم کا جی چاہا۔ اسے محویت کے عالم میں دیکھتا چلا جائے۔

بے بسی اور مجبوری کے آنسوؤں کا وار بھی خالی دیکھ کر ثومی کی غیرت امنڈ آئی۔ دوپٹے سے آنسو پونچھ کر اس نے کلیم پر اک تیز سی نظر ڈالی۔ جھٹکے سے دروازہ کھولا۔

لیکن دوسرے جھٹکے سے وہ باہر نکلنے کی بجائے کلیم کے بازوؤں میں آ رہی۔ کلیم کا قہقہہ بکھر گیا۔ اسے اپنے قریب کھینچ کر اس نے بازوؤں کا حلقہ تنگ کرتے ہوئے اسے جیسے سینے میں سمو لینے کی کوشش کرتے ہوئے سرگوشی کی ـــ "ثومی ـــ تم تو بے وقوفی کی حد تک سادہ ہو۔"

ثومی نے کوئی مزاحمت نہ کی۔ وہ تو اس مسافر کی طرح بے دم ہو گئی تھی۔ جو محنتِ شاقہ

بعد منزل پر پہنچ کر نڈھال ہو جاتا ہے۔

"پورے پانچ دن تم نے میرا حوصلہ آزمایا۔" وہ اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے اس کے چہرے پر جھکا۔ بے خودی کے عالم میں کہہ رہا تھا۔ "اور خود ذرا سی دیر میں ہمت ہار گئیں۔ بزدل کہیں کی۔"

ثومی نے بند آنکھیں کھول کر ایک لمحہ کو اس کی آنکھوں میں دیکھا۔ دونوں ایک دوسرے میں ڈوب گئے۔ لمحوں کی مسکراہٹیں چٹکنے لگیں۔

بے خود و بے سدھ ہو کر کلیم اسے سینے سے لگائے اس کے بالوں پر گال ٹکائے آنکھیں بند کیے ـــ "ثومی ـــ میری زندگی ـــ میری روح ـــ" بڑبڑاتا رہا۔ اور اسے بے دم مسافر کی طرح اپنی منزل سے لپٹی رہی۔

مال سے بھرا ٹرک پہیوں کی کھڑکھڑاہٹ سے چونکا نہ دیتا۔ تو جانے مدہوشی کے لمحے وقت کی کتنی طوالت پر پھیل جاتے۔

ـــ ؛ ـــ

گناہ کی طرح حسین تھا۔ رُت بدل رہی تھی۔ آسمان پر بھورے بھورے بادل
موسم کالے کالے بادلوں کے سینے میں جذب ہونے کی اندھا دھند کوشش کر
رہے تھے۔ بوجھل ہوائیں جھوم رہی تھیں۔ فضا خنک تھی۔

فریدہ اپنا ریکارڈ پلیئر لیے چمن میں بیٹھی تھی۔ اس نے چند مشہور گلوکاروں کے نئے
ریکارڈ خریدے تھے۔ موسم کے سہانے پن میں دلفریب موسیقی سے ترنم پیدا ہو گیا تھا۔

گگو اور جمی بھی چمن ہی میں تھے۔ اپنے فٹ بال سے دونوں بھائی کھیل رہے تھے۔
ثومی بھی فریدہ سے ذرا ہٹ کر درخت کے تنے سے لگی بیٹھی تھی۔ وہ فریدہ کا سویٹر بُن
رہی تھی۔ فریدہ کل ہی اون خرید کر لائی تھی۔

مالی کے چھوٹے بچے۔ خانساماں کا بیٹا اور جمعو دھوبن کے جڑواں بچے چمن کے
دوسرے کنارے پر بیٹھے جمی گگو کے کھیل کو دلچسپی سے دیکھ رہے تھے۔ بال کک لگنے
سے کہیں دور چلا جاتا۔ تو ان میں سے ہر کوئی دوڑ کر بال دونوں بچوں تک پہنچانے کی
کوشش کرتا۔

جمی گگو کے ساتھ وہ بھی شور مچا رہے تھے۔ فریدہ موسیقی میں ڈوب رہی تھی۔ یہ شور
گراں گزرا۔ اس نے بچوں کو ڈانٹ دیا۔

"بھاگو یہاں سے ۔۔۔ گگو جمی تم بھی اپنا بال دوسرے چمن میں لے جاؤ۔" وہ درخت
کے سہارے نیم دراز خوبصورت ریکارڈ پلیئر پر ریکارڈ بدلتے ہوئے بولی۔ نوکروں
کے بچے تو ڈر کر بھاگ گئے۔ لیکن گگو جمی کہاں ماننے والے تھے۔

"بجیا ہم آپ سے تو کچھ نہیں کہتے۔ آپ ریکارڈ سنیں۔ ہم اپنے بال سے کھیلیں گے۔"
گگو نے کہا۔

"تم یہاں سے تشریف لے ہی جاؤ تو اچھا ہے۔" فریدہ نے کہا۔

"نہیں باجی۔ اللہ قسم شور نہیں مچائیں گے۔" جمی بولا۔

"ضرور مچائیں گے ۔۔۔" کلیم کی آواز پر فریدہ نے چونک کر دیکھا۔ وہ اس کے پیچھے
چند قدم کے فاصلے پر کھڑا تھا۔

"آہا ہا ہا ۔۔۔" بچے بال سمیت کلیم کے دائیں بائیں آن کھڑے ہوئے۔

"کلیم" آیئے بھائی جان بال کھیلتے ہیں ۔۔۔"

فریدہ سنبھل کر بیٹھتے ہوئے بڑے دلفریب انداز سے مسکرائی۔ رسمی نمادوپٹہ
اس نے کندھوں پر ڈال لیا۔

"آپ کب آئے۔" اس نے ادائے ناز سے بالوں کو جھٹکا دیتے ہوئے پیچھے
ہٹایا۔ ثومی کلیم کو دیکھ کر سرخ ہو گئی۔ کل کا واقعہ پہلے ابھی تک اس کے ہوش و حواس
پر نشے کی طرح چھایا تھا۔ جلوت میں بھی خلوت کے مزے لوٹ رہی تھی۔ کلیم کے
جسم کے سانسوں کی گرمی اس کے سینے کی وسعتوں کا پھیلاؤ۔ اس کی باہوں کا لمس۔ اس
کے الفاظ کی شیرینی زندگی کا انوکھا پیغام بنی جا رہی تھی۔ اس نے دامن مراد کی وسعتوں
سے کہیں بڑھ کر پا لیا تھا۔ سرحد فہم و ادراک سے بھی بعید تھا۔ کہ کلیم یوں اس کا ہو جائیگا۔

یہی حال کلیم کا بھی تھا۔ اسے یوں لگا تھا جیسے روٹھی ہوئی زندگی نے اس سے
نباہ کر لینے کو بازو پھیلا دیے ہیں۔ اسے ثومی نہیں ملی۔ ہفت اقلیم کی دولت ہاتھ آ
گئی ہے۔ ثومی کو یوں پا کر اسے اپنی محبت کی گہرائی اور اپنے عشق کی شدت کا احساس
ہوا تھا۔ اب تک تو وہ اپنے جذبوں کی گہرائیوں اور گیرائیوں کا خود بھی اندازہ نہ کر سکا تھا۔

کل جب وہ اسے سکول چھوڑ کر آیا تھا۔ تو بن پیئے مدہوش تھا۔ ہسپتال سے

آ کر بھی وہ کیف و سرور کی دنیا رہا تھا۔ ثومی کو اس نے رات کو دیکھا نہ وہ اسے صبح نظر آئی۔ وہ توکل کی جرأت پر اس حد تک سرشار تھی۔ کہ کلیم کا سامنا کرنے کا حوصلہ ہی نہ رہا تھا۔

کلیم میں تاب ضبط و صبر کہاں تھی ــــ اپنے برآمدے میں کھڑا تھا۔ کہ گانے کی آواز پر چونک کر ادھر دیکھا۔ ثومی درخت تلے بیٹھی اس نے وہیں سے دیکھی کھنچتا چلا آیا۔

فریدہ بھلا کیا جانتی تھی۔ عشق کی منزلیں جستوں میں طے ہو گئی تھیں۔ وہ تو یہی سمجھی کلیم اس کی خاطر ادھر آیا ہے۔

"آیئے ڈاکٹر صاحب۔" وہ اٹھ کر بیساکھی ہو کر بیٹھ گئی۔

"اچھا شغل ہے۔" کلیم ریکارڈ پلیئر کی طرف دیکھتے ہوئے مسکرایا۔

"غضب کے ریکارڈ لائی ہوں ڈاکٹر صاحب۔" وہ بے تکلفی سے مسکرائی۔

ثومی نے دھیرے دھیرے کلیم کی طرف سے کمر موڑ لی تھی۔ کلیم کی نگاہوں کی شوخ شوخ بے حجابی سے اسے حجاب آ رہا تھا۔

فریدہ نے دو تین ریکارڈ اٹھا کر کلیم کی طرف بڑھائے۔

وہ ریکارڈ دیکھ کر واہ وا ــــ کہتے ہوئے ثومی کی طرف دیکھنے لگا۔ جو اس کی طرف پشت کیے بیٹھی تھی۔

فریدہ اک نگاہِ غلط انداز اس پر ڈال کر مسکرا دی۔ وہ یہی سمجھی۔ کلیم کو ثومی کی موجودگی ناگوار گزری ہے۔

بچے مصر تھے۔ کہ کلیم ان کے ساتھ بال کھیلے۔ فریدہ کا اصرار تھا۔ کہ وہ بیٹھ کر نئے نئے ریکارڈ سنے۔ یہ گانے وہ چن چن کر لائی تھی۔ اس کے جذبات کی ترجمانی ان گانوں سے بخوبی ہو سکتی تھی۔ رومانوی موسم اس پر یہ قربت۔ دل کی کہنے کا اس سے بہتر طریق اور کیا ہو سکتا تھا۔

اس نے بچوں کو ڈانٹ کر بھگانا چاہا۔ "ڈاکٹر صاحب ــــ آپ انہیں زیادہ منہ نہ لگائیں۔

"بجیا ــــ" بچے چیخے۔

"چلیئے پہلے ہم ان سے کھیلتے ہیں۔ پھر آپ کے گانے سنیں گے ــــ" کلیم نے کہا۔ اور فریدہ کا کوئی جواب سنے بغیر وہ بچوں کے ساتھ بال اچھالتے آگے بڑھ گیا۔ وہ جس رخ پڑا تھا۔ وہ ثومی کے عین سامنے تھا۔

ثومی شرمگین مسکراہٹ ہونٹوں میں دبا کر رہ گئی۔ کلیم اسے دیکھ کر سرشار ہو گیا۔ فریدہ وہ ریکارڈ بجانے لگی۔ جو اس کے ڈھکے ڈھکے چھپے چھپے جذبات کا آئینہ دار تھا۔ چند لمحے بچوں کے ساتھ اودھم مچانے کے بعد کلیم نے انہیں چھٹی کرنے کو کہا۔

بچے مچلے ــــ لیکن وہ بال کو پورے زور سے دوسرے چمن میں پھینک کر ادھر آ گیا۔ جدھر فریدہ کا ریکارڈ پلیئر تھا۔ اور جہاں سے ثومی کی کافرادائیاں پوری شدت سے نظر آ سکتی تھیں۔

"یہیں بیٹھیں گے۔ یا کرسی منگواؤں۔" فریدہ نے کلیم سے پوچھا۔ بچے بال کے پیچھے بھاگ گئے۔

"تکلف جانے دو ــــ" وہ وہیں بیٹھ گیا۔ فریدہ نے نظر بھر کر اس کی طرف دیکھا۔ گھر کے ڈھیلے ڈھالے سفید کپڑوں میں وہ کتنا وجیہہ نظر آ رہا تھا۔

ثومی دھیرے دھیرے پھر اس کی طرف سے اس طرح گھوم گئی۔ کہ کلیم کی طرف اس کی پشت ہو گئی۔ کلیم کو جھنجھلاہٹ ہونے لگی۔ وہ اس کی پشت کو گھورنے لگا۔

فریدہ بے ساختہ ہنس پڑی۔ ثومی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے آنکھوں ہی آنکھوں میں پوچھا۔

"کیا اسے اٹھا دوں یہاں سے۔"

کلیم فریدہ کی سادگی پہ دل ہی دل میں مسکرا دیا۔ پھر ریکارڈوں کی طرف متوجہ ہو گیا۔

"کیا سنیئے گا۔" فریدہ نے پوچھا۔

"کوئی مرصع سی غزل۔" کلیم نے جیسے جھومتے ہوئے کہا۔

فریدہ نے اپنی پسند کا گانا چلایا۔

"اوہو — ہو — بس — بس رہنے دیں جی — ایک دم بوگس۔" کلیم بولا۔ فریدہ اترائی۔ اٹھلائی۔ ریکارڈ بجتا رہا۔

ثومی نے گانے کے دوران صرف ایک بار گردن موڑ کر کلیم کی طرف دیکھا۔ ذومعنی نظروں کا تبادلہ فریدہ کیا جان پاتی۔ وہ تو کلیم کی فرمائش پہ اس کی پسند کا گانا ڈھونڈ رہی تھی۔

مطلوبہ ریکارڈ نکال کر اس نے کلیم کی طرف اک ادائے ناز سے دیکھا "لیجئے یہ رہی آپ کی پسند۔ ایک دم بوگس۔"

"چلاؤ تو سہی — لطف آ جائے گا۔ کیا بے ساختہ پن ہے جذبات کے اظہار میں۔ الفاظ تو جیسے شاعر نے چن چن کر استعمال کیے ہیں۔ گانے والے نے ان الفاظ کو جادو کے سانچے میں ڈھال دیا ہے۔ ملاحظہ ہو۔"

ریکارڈ بجنے لگا۔ کلیم واہ وا — سبحان اللہ کہنے لگا۔ فریدہ زیر لب مسکرانے لگی اور ثومی — ثومی کو یوں لگا جیسے کوئی گلوکار نہیں۔ خود کلیم اس کے سامنے اپنے دلی جذبات کا کھل کر اظہار کر رہا ہے۔ وہ جان گئی۔ کہ کلیم نے اسی کی خاطر یہ ریکارڈ بجوایا ہے۔ کچھ ایسے ہی خیالات فریدہ کے تھے۔ بڑی جانکاہ اداؤں کے ساتھ وہ مسکرا مسکرا کر کلیم کو دیکھنے لگی۔

ریکارڈ ختم ہوا۔ کلیم نے بڑھا چڑھا کر اس کی تعریف کی۔ فریدہ کو جیسے نشہ

آ گیا۔ ثومی گانے کے سحر میں ڈوب گئی۔

کچھ دیر اس گانے پر تبصرہ ہوتا رہا۔ پھر کلیم اپنی گھڑی دیکھتے ہوئے بولا۔ "اوہو مجھے تو جانا تھا۔"

"کہاں؟" فریدہ نے جلدی سے پوچھا۔

"میٹنگ پہ۔" کلیم اٹھتے ہوئے بولا۔

"بیٹھئے تو ابھی۔ کل بھی آپ سارا دن غائب رہے۔ فریدہ نے شاکی نظروں سے اسے دیکھا۔

"کل؟" کلیم کے ہونٹوں پہ تبسم بکھر گیا۔

"جی ہاں۔ کل۔" فریدہ نے گلے کے انداز میں کہا۔

"کل تو میں پنڈی گیا تھا۔" کلیم نے اک نگاہ غلط انداز ثومی پر ڈال کر ہونٹوں میں مسکان دباتے ہوئے کہا۔ ثومی کسمسائی — دل دھک دھک کرنے لگا۔ اللہ! کلیم سے کتنی شرم آ رہی تھی۔

"پنڈی!" فریدہ نے بھی اٹھ کر اس کے برابر کھڑے ہوتے ہوئے حیرانی سے کہا۔ واقعی —!"

"ہاں۔ ہاں" وہ قدم اٹھاتے ثومی کے سامنے آ گیا۔ ثومی کی سیاہ پلکیں کانپ کانپ گئیں۔

"جھوٹ — میں نے آپ کو ہسپتال سے آتے دیکھا تھا۔" فریدہ مسکرائی۔

"سات گیا تھا۔" کلیم بولا۔ اور پونے دس لوٹ آیا۔"

"جھوٹے کہیں کے —" فریدہ نے بے ساختہ پیار سے کہا۔ پھر خود ہی کچھ لجا سی گئی۔ "تین گھنٹے میں جا کر لوٹ بھی آئے۔ بائے ایئر گئے ہوں گے۔"

"نہیں تو اپنی گاڑی میں گیا تھا۔" کلیم متبسم لبوں اور شوخ نظروں سے ثومی کو دیکھ

کر بولا۔ ثومی شرمائی لجائی اٹھ کھڑی ہوئی۔

"جی ہاں ضرور۔ آپ کی گاڑی نہ ہوئی ٹرائیڈنٹ ہو گیا۔" فریدہ شوخی سے بولی۔

"نہیں مانتی تو نہ سہی۔ گواہ پیش کروں۔ جو میرے ساتھ تھا۔" کلیم نے دل لگی کی۔ ثومی ایک دم گھبرا گئی۔ پھیلی پھیلی آنکھوں سے کلیم کی طرف دیکھا۔ پھر اس کی سیاہ جھالروں ایسی پلکیں پھڑپھڑانے لگیں۔ ہونٹوں کے گوشے کانپ گئے۔ اس کی حالت کچھ عجیب سی ہو گئی۔ اس نے گھبرا گھبرا کر کلیم کی طرف دیکھا۔ جو شوخی سے ہنسنے کی حد تک مسکرا رہا تھا۔

فریدہ نے اس کی طرف دیکھا۔ اور یوں دیکھا جیسے اسے پہلی بار دیکھا ہو۔ وہ اسے بلا کی حسین نظر آئی۔ اس پر یہ معصوم سی گھبراہٹ ـــــ یہ سب کیا تھا! اس نے کلیم کا مسکراتا ہوا چہرہ دیکھا۔ اس کی نگاہوں کی چوری اس نے ایک ہی نظر میں پکڑ لی۔

فریدہ ایک دم بجھ گئی۔ اس کی ساری خوشیاں ہرن ہو گئیں۔ سمجھ تو کچھ نہ سکی۔ دل ضرور بیٹھنے لگا۔

"ثومی ـــ یہ ریکارڈ پلیئر میرے کمرے میں رکھ آؤ۔" اس نے بجھے بجھے دل شکستہ لہجے میں کہا۔

ثومی جھک کر ریکارڈ اکٹھے کرنے لگی۔ فریدہ نے ریکارڈ پلیئر بند کیا۔ اور ثومی کی طرف بڑھا دیا۔

"مجھے دے دو۔" کلیم نے بڑھ کر ثومی کے ہاتھ سے دونوں چیزیں لینا چاہیں

"جی ـــ میں لے جاؤں گی۔" ثومی کے حسین چہرے پر نم نم سی مسکراہٹ تھی۔ کلیم نے زبردستی اس کے ہاتھ سے دونوں چیزیں لے لیں۔ فریدہ کچھ بھی نہ بولی۔ اسے یوں لگ رہا تھا۔ جیسے اب تک وہ بیوقوف بنتی چلی آئی ہے۔

رات اس پر بھاری تھی۔ کروٹیں بدل بدل کر آج ثومی اور کلیم کی نظروں کا مفہوم سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ جو کچھ دیکھا تھا۔ جو کچھ محسوس کیا تھا۔ وہ دل پر بار کی طرح تھا۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟

یہ کیوں کر ممکن ہے؟

ثومی کی حیثیت ہی کیا؟

اس نے اپنے دل بے تاب کو تسلی دینے کے لیے سوچا۔ لیکن خطرے کا سگنل نظر آ چکا تھا۔ فرار کی کوشش بے سود تھی۔ وہ کلیم کے ساتھ گزرے وقت کا تجزیہ کرتی رہی۔ کلیم اس کے ساتھ ہمیشہ شفقت سے پیش آیا تھا۔

شفقت جو محبت یقیناً نہ تھی۔

تو کیا؟ ـــ ثومی بازی جیت لے گئی۔ چپکے چپکے خاموشی ہی سے۔ سن کی مار اتنی دور تک ہو سکتی تھی ـــ؟

سب کچھ سوچنے کے باوجود بھی اسے یقین نہ آ رہا تھا۔ کہ ایسا ہونا ممکن بھی ہے؟

ـــ ٭ ـــ

سلمیٰ کو فریدہ کے مستقبل کا کوئی اندیشہ تو نہ تھا۔ دولت مند باپ کی بیٹی تھی رشتوں کی کمی نہ تھی۔ کئی خواہش مند موجود تھے۔ لیکن کلیم کی وجاہت حسب نسب، اخلاق و کردار اور اس کی خاندانی حیثیت۔ اس کے مالی استحکام نے اسے بڑا مرعوب کیا تھا۔ وہ ہر لحاظ سے اسے فریدہ کے لیے موزوں تھا۔ سات آٹھ ماہ کی رفاقت نے ایک دوسرے کو سمجھنے میں کافی مدد دی تھی۔ پھر کوئی ایسا جنجال بھی نہ تھا۔ ایک ماں بیٹے کا خاندان تھا۔ فریدہ جیسی لاڈ و پیار اور ناز و نعم میں پلی لڑکی ایسے گھرانے ہی میں خوش رہ سکتی تھی۔ ساس نندوں کے وبال سہارنے کے قابل نہ تھی۔

کلیم کی اماں نے دبے دبے لفظوں میں کئی بار اپنی خواہش کا اظہار کیا تھا۔ فریدہ سے والہانہ پیار۔ بات بات پر قربان صدقے۔ ہر لمحہ دعائیں۔ یہ سب باتیں ایسی تھیں جو اس کی تمنا کا خاموش اظہار تھیں۔ سلمیٰ نے ہمیشہ اس اظہار کا خوش دلی سے خیر مقدم کیا تھا۔ لیکن زبان سے تا حال کوئی اقرار نہ کیا تھا۔ جہاں تک فریدہ کا تعلق تھا۔ وہ ڈاکٹر کو ضرور پسند کرتی تھی۔ تجربہ کار نگاہیں نئے نئے شوق اور نوزائیدہ جذبوں کو اک آن میں پہچان جاتی ہیں۔ ہاں اس سلسلے میں اس نے فرید سے کوئی بات نہ کی تھی۔

فریدہ بی اے کے آخری سال میں تھی۔ سلمیٰ چاہتی تھی۔ کہ نسبت طے ہو جائے اور شادی امتحانوں سے فارغ ہونے کے بعد ہو۔ تاخیر وہ بھی اچھی

چاہتی تھی۔ بہت سے خواہشمند اس کے پیچھے بھی لگے ہوئے ہیں۔ اور کلیم بھی یقیناً بہت سے لوگوں کی نظر میں تھا۔ اس لیے تاخیر مناسب نہ تھی۔

اسی خیال کے پیش نظر اس نے اس رات سونے سے پہلے فرید سے یہ تذکرہ چھیڑ دیا۔

کلیم اپنی خوبصورت شخصیت کی بنا پر فرید کی نظروں میں بھی عالی مقام تھا۔ اسے اس رشتے میں کوئی قباحت نہ نظر آتی تھی لیکن اس نے دبے لفظوں میں فریدہ کا عندیہ لینے کا کہہ دیا۔

"اس کی فکر آپ نہ کریں۔ میں اس کی ماں ہوں۔ سب کچھ سمجھتی ہوں۔ پھر بھی احتیاطاً پوچھ لوں گی۔ آپ اپنی کہیئے۔"

"ڈاکٹر صاحب کی والدہ رشتہ طلب تو کریں پہلے۔ پھر میری رائے بھی پوچھ لینا۔"

"آج نہ تو کل۔ وہ بات کرنے ہی والی ہیں۔"

"دیکھیں گے۔"

"آپ کو کوئی اعتراض تو نہیں۔"

"بظاہر تو کوئی نہیں۔"

"بس — ٹھیک ہے۔ یہ رشتہ مبارک ہوگا۔ ہماری بچی عیش کرے گی۔ کلیم اچھا لڑکا ہے۔"

سلمیٰ مسرور نظر آنے لگی۔ اماں اور کلیم کی تعریفیں کرنے کے ساتھ ساتھ فریدہ کی شادی دھوم دھام سے کرنے کی باتیں بھی ہونے لگیں۔

باتیں کرتے کرتے سلمیٰ سو گئی۔ لیکن فرید کی آنکھوں سے نیند دور بھاگ گئی۔ سلمیٰ نے جس چاہت محبت اور چاؤ سے فریدہ کے رشتے اور شادی کا ذکر کیا تھا۔ فرید اس سے متاثر ہوا تھا۔ اس کے ذہن میں ثمی کا خیال آ گیا تھا۔ وہ بھی تو جوان ہو گئی

تھی۔ اس کی بھی شادی کا سوال تھا۔ فریدہ کے لیے اچھے سے اچھا بر مل سکتا تھا لیکن ثومی ـــــ اس کا کیا بنے گا۔؟ کیا کوئی اچھا رشتہ اس کے لیے بھی مل سکے گا؟ اس کا ماضی اس کے مستقبل پر تو سایہ فگن نہ ہوگا۔؟

سلمیٰ نے فریدہ کی شادی کا ذکر خیر چھیڑ کر گویا فریدہ کی دکھتی رگ کو چھیڑ دیا تھا۔ ثومی کے لیے کسی نیک بر سر روزگار لڑکے کی ضرورت تھی۔ لیکن نوکروں کے کوارٹروں میں پرورش پانے والی ایسی لڑکی کو جس کا ماضی دھندلا تھا۔ جس کی ماں کا گناہ اس کی ہستی پر داغ تھا۔ قبول کرنے کو کوئی تیار رہوگا۔؟ اگر کوئی بھی تیار نہ ہوا۔ تو۔ تو کیا ہوگا ـــــ؟

سوچ سوچ کر فریدہ کا دماغ چکرانے لگا۔ آج پھر بلو شدت سے یاد آئی۔ اس نے کیسا خوفناک انتقام لیا تھا۔ سفاک مرحلہ تو اب آنے والا تھا۔ وہ کیا کرے؟ کیا کرے ـــــ؟ بے بس ہو کر وہ رات بھر بستر پر مرغِ بسمل کی طرح تڑپ تڑپ کر سوچتا رہا۔

ادھر جیراں اور فتو بھی ثومی کے مستقبل کے متعلق پریشان تھے۔ صدیق جیراں کے پیچھے لگا ہوا تھا۔ لیکن وہ اب کوئی آخری فیصلہ نہ کر سکتی تھی۔ اس نے فتو سے اسی رات ذکر کیا۔ جس رات سلمیٰ نے فریدہ کی شادی کے متعلق فریدہ سے بات کی تھی۔

فتو، صدیق اور ثومی کا ناطہ جوڑنے میں ہچکچا رہا تھا۔ ثومی اور صدیق میں کوئی مناسبت نظر نہ آتی تھی۔ بھدے بھدے نیلے ہونٹوں، اندر کو دھنسی شیطانی چمک والی آنکھوں اور پرانے لوہے کی رنگت والے صدیق کے ساتھ ثومی جیسی کانچ کے سے بدن والی حسین لڑکی ـــــ کیا جوڑ تھا بھلا ـــــ اور پھر صدیق چھٹی جماعت سے آگے نہ بڑھ سکا تھا۔ جب کہ ثومی اب پڑھ لکھ کر اپنے پاؤں پر کھڑی ہو چکی تھی۔ ثومی کے

عادات و اطوار کا ٹھہراؤ۔ اس کی شخصیت کا جامع پن بھی تو مانع تھا۔

"یہ جوڑ کچھ مناسب نہیں۔ اور پھر میرا خیال ہے ثومی بھی نہیں مانے گی۔ وہ تو اسے ایک آنکھ نہیں دیکھ سکتی۔" مالی نے چلم گڑگڑاتے ہوئے کہا۔ جیراں چمک کر بولی:۔

"تو نے ہی تو اسے سر چڑھایا ہے۔ اس کا منہ دیکھے جائے گا۔"

"زبردستی بھی تو نہیں کر سکتے۔"

"اس کی اڑانیں تو بہت اونچی ہیں۔ صدیق کو منہ نہیں لگاتی۔ اور کونسا شہزادہ آئے گا کہیں سے ـــــ صرف شکل و صورت ہی تو نہیں دیکھی جاتی۔"

"کہتی تو تم ٹھیک ہو ـــــ لیکن ـــــ"

"لیکن ویکن کیا ـــــ اس کا بار تو ہم نے اتارنا ہی ہے نا۔ اس کے پسند کا رشتہ تو ملنے سے رہا۔ اجی کون قبول کرے گا۔ ایسی لڑکی کو جس کی ماں اپنا داغ چھپانے کے لیے جن کر یہیں ڈال گئی۔"

"ہوں۔"

"یہ تو صدیق ہی ہے۔ ورنہ کوئی نام ہی نہیں لیتا۔ لوگ نفرت سے منہ پھیر لیتے ہیں۔ وہ جانے کس دنیا میں جی رہی ہے۔"

جیراں اپنے طور پر ٹھیک ہی کہہ رہی تھی لیکن فتو اب بھی ہچکچا رہا تھا۔ جیراں غصے میں آ گئی۔ "اس مصیبت کو ٹالنا بھی ہے یا نہیں۔ میں تو اس وقت کو کوستی ہوں۔ جب اسے گود لیا تھا۔ پتہ ہوتا بڑی ہو کر یوں مصیبت بنے گی۔ تو کبھی غلطی نہ کرتی۔"

"مصیبت تو خیر نہیں۔ جب سے نوکر ہوئی ہے۔ تیری اور تیرے گھر کی حالت ہی بدل گئی ہے۔"

"لو تو اب اس کی کمائی ہی کھاتے رہو گے۔"

"یہ میں نے کب کہا۔"

"تو پھر جتنی جلدی ہو سکے۔ اسے بناہ دو۔ آج تو صدیق بھی خواہش کر رہا ہے کہیں اس کے کان بھی کسی نے بھر دیے تو انکاری ہو جائے گا۔ پھر کیا کرو گے۔"

"مجھے تو کچھ سمجھ نہیں آ رہا۔ کچھ بھی ہو صدیق اور ثومی کا کوئی جوڑ نہیں۔"

"تو پھر ڈھونڈھ لاؤ اس کا جوڑ۔"

"شاید کوئی مل ہی جائے۔"

"شہزادہ آسمان سے اترے گا کوئی۔ زمین والے تو حرام حلال کو پرکھ کر ہی بات کرتے ہیں۔"

جیراں اور فتورات گئے تک اس مسئلے کو تشویش سے دیکھتے رہے۔ اور ثومی درمیانی دروازے کے ساتھ بچھی اپنی چارپائی پر لیٹی ان کی باتیں سنتی رہی۔ جیراں نے جس تنفر اور کراہت اور بیزاری کا اظہار کیا تھا۔ وہ کوئی نئی بات نہ تھی۔ ثومی نے بچپن میں اس سے کوئی ماورائے شفقت پائی ہو تو ہو۔ جب سے ہوش سنبھالا تھا۔ اسے اپنے کالے کلوٹے بچوں کے ہی گرد پروانہ بنی پایا تھا۔ پہلے تو اس نے پیار چھن جانے کو بری طرح محسوس کیا تھا۔ لیکن جب سے یہ آگہی ہوئی تھی۔ کہ وہ اس کی اولاد نہیں ہے۔ اسے اک صبر سا آ گیا تھا۔ جیراں کے ساتھ جو وابستگی تھی۔ وہ بھی ویسی نہ تھی۔ وہ ان دونوں کی احسان مند ضرور تھی۔ کہ انہوں نے اسے پالا پوسا تھا۔ یہ احسان وہ اپنی خدمت گزاری سے چکاتی رہی تھی۔ اب تنخواہ جیراں کے حوالے کر کے بھی چکا رہی تھی۔

آج کی باتوں سے جو اسے کچھ لگاؤ جیراں سے تھا بھی، وہ بھی بے شک مٹتا چلا گیا لیکن جس سنجیدہ سوچ نے ثومی کے ذہن میں گھر کیا۔ وہ اپنی جگہ بیحد اہم تھی۔ ان دنوں اس کے شب و روز کلیم کی محبت کے وسیع دامنوں تلے گزر رہے تھے۔ وہ ماضی،

حال، مستقبل سب کو فراموش کر چکی تھی۔ کلیم اس کی زندگی تھا۔

لیکن ــــ! آج جیراں کی باتوں نے اسے لرزا دیا۔ کلیم کو اس نے اپنے متعلق کچھ بھی تو نہیں بتایا تھا۔ اگر اس نے بھی کراہت، نفرت اور بیزاری سے اس کی ہستی کے گھناؤنے داغ سے منہ پھیر لیا۔ تو ــــ تو وہ کیا کرے گی؟

ثومی کو آج اپنی گناہ گار ماں پر پہلی بار اتنا غصہ آیا۔ کہ اس نے غصے کی آگ اسے بلا بلا کہہ کر اگل دی۔ وہ کتنی دیر روتی بھی رہی۔"

لیکن نہ ہی غصے کی آگ اس داغ کو مٹا سکتی ہے۔ نہ آنسو اس داغ کو دھو سکتے تھے۔

جس بات کو اس نے ہمیشہ معمولی سمجھ کر نظر انداز کیا تھا۔ وہ جیراں کی باتوں کی اساس پر واقعی غیر معمولی نظر آئی۔

اس کی پریشانیاں یک لخت بڑھ گئیں۔ رو رو کر اس نے برا حال کر لیا ــــ اپنی زاختہ جنت کی شادابیوں سے وہ پوری طرح لطف اندوز بھی نہ ہو پائی تھی۔ اس کے بھک سے اڑ جانے کا اندیشہ پیدا ہو گیا۔

ــــ ٭ ــــ

اماں

کا پاؤں غسلخانے کے چکنے فرش سے کچھ اس طرح پھسلا۔ کہ اپنے ہی بدن تلے دب گیا۔ یوں موچ آئی۔ کہ اٹھنا محال ہو گیا۔ ننھو بیچارہ کیا کرتا۔ بھاگم بھاگ سلمیٰ کو بلا لایا۔ جمو، دھوبن، جیراں اور صغرا کو بھی بلا لیا۔ سانولی بھی دوڑی آئی۔ کلیم کے ہسپتال سے آنے تلک ان سب نے مل کر اماں کو سنبھالا تھا۔ ہلدی اور گھی کا لیپ بھی کر دیا تھا۔

کلیم گھبرایا ہوا آیا۔ سلمیٰ نے فون کیا تھا۔ فوراً ہی چلا آیا۔ آتے ہی پاؤں دیکھا اور اماں کے لاکھ منع کرنے پر انہیں موٹر میں ڈال ہسپتال لے گیا۔ پاؤں کا ایکسرے کروایا۔ اور جو ممکن طبی امداد تھی۔ بہم پہنچائی۔ سلمیٰ بھی اماں کے ساتھ ہسپتال گئی۔ پاؤں خاصا سوج گیا تھا۔ ذرا سے ہلانے جلانے سے بھی تکلیف ہوتی تھی۔ اماں بستر پر پڑ گئیں۔ شکر ہے جو ہڈی نہ ٹوٹی تھی۔ کلیم انہیں واپس گھر لے آیا۔ سلمیٰ کافی دیر اس کے پاس بیٹھی رہی۔ کوٹھی کے خدمت گار ان کی بیویاں سبھی اماں کی احوال پرسی کو آئے۔ کلیم بھی اماں کے پاس بیٹھا رہا۔

"اماں آپ سے کتنی بار کہا ہے۔ کسی مائی کا بندوبست کر لیں۔ اب آپ سے یہ گھریلو ذمہ داریاں کہاں سنبھالی جا سکتی ہیں ——" کلیم نے یہی بات کئی بار اماں سے کہی۔

"شادی کر لو نا ——" اماں کی ذمہ داریاں ختم ہو جائیں ——" پڑوس والی صفیہ بیگم جو اماں ہی کی ہم عمر تھیں۔ کلیم سے کہا۔

"واقعی ——" سلمیٰ کسر نفسی سے مسکرائی۔

"اب تو واقعی مجھے بہو کی سخت ضرورت ہے۔" اماں نے لیٹے لیٹے کہا۔

"بہو تو ایک دن میں آنے سے رہی۔ مائی کا فوراً بندوبست ہونا چاہیئے ——" کلیم نے لاڈ سے اماں کی طرف دیکھا۔ آپ بستر سے اٹھیں نہیں ——"

"ہمارے کوارٹروں میں تھوڑی عورتیں ہیں۔ کسی کو بلوا دیتی ہوں۔" سلمیٰ نے کہا۔

"وہ سب بچوں والی ہیں۔" اماں نے کہا۔ "ایک آتی ہے۔ تو چار بچے ساتھ ہوتے ہیں۔"

"ثومی تو آپ کا کام کرتی ہی رہتی ہے ——" سلمیٰ نے کہا۔ کلیم کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ جلدی سے بولا۔ "وہ بھی تو سکول جاتی ہے۔ تین چار یوم تو اماں کے پاس صبح سے شام تلک کوئی نہ کوئی ہونا چاہیئے۔" کلیم کی بات پر اماں مسکرانے لگیں ——

"تم اس کا فکر نہ کرو۔ ہم سب ان کے پاس ہی ہیں ——" سلمیٰ نے کہا۔ صفیہ نے اس کی تائید کی۔

اماں نے ان کو دعائیں دیتے ہوئے کہا۔ "ثومی ہی کو بلا لوں گی۔ بڑی خدمت گزار لڑکی ہے۔ مجھے تو ایمان کی کہوں، بڑا ہی آرام پہنچاتی ہے۔ بن کہے کام کر دیتی ہے۔"

کلیم نے اماں کی مسکراہٹ دیکھی تھی۔ ان پر رعب ڈالنے کو ماتھے پر بل ڈال لیے۔ ورنہ ثومی کو اماں اپنے پاس رکھیں۔ یہ تو اس کی دلی خواہش تھی۔ یوں بھی اماں اور ثومی جتنا ایک دوسرے کے قریب ہوں گی۔ اچھا ہے۔ کلیم تو مستقبل کے راستے سنوارنے کی سوچ رہا تھا۔

اماں نے ثومی ہی کو پاس رکھنے پر زور دیا۔ کلیم خفگی سے بولا۔ "وہ کوئی ملازمہ تھوڑی ہے۔ پھر سکول بھی جاتی ہے۔ آپ خواہ مخواہ اسے بلانے کا کہہ رہی ہیں۔"

پھر اس نے سلمیٰ اور صفیہ سے کہا۔ کہ کسی مائی کا بندوبست فوراً کر دیں۔ اماں نہ مانیں وہ اٹھ کر دوسرے کمرے میں گیا۔ تو اماں نے ہنس ہنس کر کلیم کی ثومی سے بلا وجہ عداوت کی روداد سنائی۔

"خدا جانے اسے اس بیچاری سے کیا بیر پینا ہے۔ حالانکہ بڑی پرخلوص لڑکی ہے۔ مجھے تو اس نے بڑا آرام دیا ہے۔ کپڑے استری کر دیتی ہے۔ سی دیتی ہے۔ سبزی بنا دیتی ہے۔ کئی چھوٹے موٹے کام کر جاتی ہے۔ اور کام نہ ہو تو دبانے ہی لگتی ہے۔

"بس تو پھر دو چار دن اسے نہ ہی بلا لیں۔ سکول کا کیا ہے۔ چھٹی لے لے گی۔" سلمیٰ نے کہا۔ "میں اسے کہہ دوں گی — گھر پہ وہ کونسا جیراں کا کام کرتی ہے بیکار ہی پھرتی رہتی ہے شام کو۔"

کلیم ساتھ والے کمرے میں ان کی باتیں سن رہا تھا۔ سلمیٰ کا لہجہ حاکمانہ سا تھا ثومی سے اس نے سلمیٰ کو کبھی اچھے موڈ میں باتیں کرتے نہ دیکھا تھا۔ اماں ثومی کی صفات کا اعتراف کر رہی تھیں۔ اس بات سے اسے بڑی خوشی ہو رہی تھی۔

کالج سے واپسی پر فریدہ کو اماں کے گرنے کا پتہ چلا۔ تو احوال پرسی کو چلی آئی۔ وہ کچھ دل گرفتہ سی تھی۔ کلیم نے محسوس کیا۔ کہ اس میں ہر روز والی شگفتگی مطلقاً نہ تھی۔ کلیم نے دو ایک بار مذاق بھی کیا۔ لیکن وہ بڑی سنجیدہ نظر آئی۔ کلیم نے محسوس تو کیا لیکن اسے کوئی اہمیت نہ دی۔ دس پندرہ منٹ ٹھہر کر وہ گھر واپس لوٹ گئی۔

ثومی کو اماں کی موچ کا جو نے بتایا۔ وہ جھجکتے جھجکتے ادھر آئی۔ اماں سو رہی تھیں۔ اور کلیم اخبار لیے میز پر پاؤں رکھے کرسی پہ اماں کے پلنگ کے قریب ہی نیم دراز تھا۔

ثومی ڈرائنگ روم کی طرف سے آئی۔ کلیم کا چہرہ اخبار کے پیچھے چھپا تھا۔ اور اماں سو رہی تھیں۔

ثومی کو کلیم کا سامنا کرتے جھجک آ رہی تھی۔ یوں تنہائی میں اس کا سامنا کسی معرکے سے کم تو نہ تھا۔

اس نے لوٹ جانا مناسب سمجھا۔ لیکن دل کے تقاضے پاؤں کی زنجیریں بن گئے۔ اس نے دھیرے دھیرے قدم اٹھایا۔ اور اماں کے پلنگ کی طرف آئی۔ محبوب کے لیے تو دل کی دھڑکنیں بھی آواز پا بن جاتی ہیں۔ یہاں تو ثومی بنفس نفیس آئی تھی۔ اسی انداز میں کرسی میں نیم دراز کلیم نے اخبار قدرے ہٹا کر دیکھا۔

"اوہ — ثومی —" وہ اخبار پھینک کر کرسی سے اٹھ بیٹھا۔

"بیگم صاحبہ کو کیا ہوا" — اس نے کلیم کی بے تابی سے چشم پوشی کرتے ہوئے آہستہ سے پوچھا۔

"بیگم صاحبہ نہیں — اماں کہا کرو۔" کلیم اس کے سامنے آن کھڑا ہوا۔ ثومی کے گالوں پر سرخی بکھر گئی۔

"آئندہ میں بیگم صاحبہ کا لفظ نہ سنوں۔" اس نے ثومی کا جھکا ہوا چہرہ ٹھوڑی سے پکڑ کر قدرے اونچا کیا۔

ثومی چند قدم پیچھے ہٹ گئی۔ گھبرا کر اس نے چاروں طرف دیکھا۔ کلیم اس کی گھبراہٹ سے بڑا محظوظ ہوا۔ چند لمحے خاموشی رہی مہکتی خاموشی۔ مسکراتی خاموشی۔ مترنم خاموشی۔

"کیسے موچ آئی" ثومی نے اماں کی طرف دیکھتے ہوئے کلیم سے پوچھا۔

"غسل خانے میں گر گئیں۔" کلیم اسے پرشوق نظروں سے دیکھتے

ہوئے بولا۔

"کب ؟" ثومی نگاہیں جھکائے بولی۔

"صبح ——" وارفتگی کے عالم میں وہ اسے تکے گیا۔

"اُف —— بڑی تکلیف ہوئی ہوگی۔" ثومی نے جیسے اماں کی تکلیف محسوس کی۔

"تکلیف ہوئی بھی ہو تو تمہیں کیا —— ؟" کلیم نے منہ پھیرتے ہوئے کہا۔

"کیوں ؟ ——" وہ قدرے شیر ہو گئی۔

"تم کسی کی تکلیف محسوس تھوڑا ہی کرتی ہو۔" کلیم نے دیوار پر لگی تصویر کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"کیوں۔ نہیں کرتی —— ؟" وہ اٹھلائی۔ "ان کی تکلیف سے مجھے تکلیف ہوتی ہے۔"

"ان کی تکلیف سے تو تکلیف ہوتی ہے۔" ان کے بیٹے کی تکلیف بھی کبھی محسوس کی۔" کلیم نے شوخی سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"کیوں انہیں کیا ہوا —— ؟" ثومی نے بصد ناز کہا۔ وہ دھیمی دھیمی سلگتی سی مسکراہٹ ہونٹوں میں دبائے ہوئے تھی۔

"تمہیں علم ہی نہیں۔" کلیم نے یوں کہا۔ جیسے حیران ہوا ہو۔

ثومی نے بھی بن کر نفی میں سر ہلا دیا۔ کلیم اس کی شوخ ادائی پر مٹ ہی تو گیا۔

"بے ایمان کہیں کی۔" کہتے ہوئے وہ ثومی پر جھپٹنے کو تھا۔ کہ اماں کی ہائے پر پیچھے پلٹ کر اماں کو دیکھنے لگا۔

اس کی حرکت اتنی بے ساختہ اور مضحکہ خیز تھی۔ کہ ثومی کو ہنسی ضبط کرنا دشوار ہو گیا۔ اماں نے کروٹ بدلی تھی۔ آنکھیں ذرا ایک بار کھولی کر کلیم کو دیکھا۔ اور پھر کلیم سے وقت پوچھا۔

کلیم نے گھڑی دیکھ کر وقت بتا دیا۔

"جاؤ۔ لیٹ جاؤ تم بھی جا کر ——" اماں نے غنودگی میں کہا۔ "بیٹے کے آرام

کا انہیں کتنا خیال تھا۔

"آپ آرام کیجئے۔ میں بھی آرام میں ہوں۔" کلیم نے اماں کے کندھے دبائے۔

"جیتے رہو۔ بیٹے —— جاؤ دوسرے کمرے میں تھوڑی دیر آرام کر لو۔" اماں نے اونگھتے ہوئے کہا۔

"اچھا جی۔" کلیم سیدھا ہوتے ہوئے بولا۔ چند ہی لمحوں میں اماں پھر گہری نیند سو رہی تھیں۔

کلیم دبے دبے قدموں سے ثومی کی طرف آیا۔ جو کھڑکی کے قریب خاموش کھڑی تھی۔ وہ کسی اور ہی دنیا کی مخلوق نظر آ رہی تھی۔ کپڑے معمولی سے تھے۔ کوئی زیبائشی چیز بھی نہ پہنی تھی۔ بال بھی سیدھے سادے بنائے تھے۔ پھر بھی وہ عام لڑکیوں سے الگ تھلگ نظر آنے والی شخصیت کی حامل تھی۔ کلیم اب تک نہ جان سکا تھا اسے دوسری لڑکیوں سے منفرد کرنے والی کیا چیز ہے۔ صرف حسن ؟ یقیناً نہیں حسین لڑکیاں اس نے اور بھی دیکھی تھیں۔ ثومی میں کچھ اور ہی بات تھی۔

کلیم اس وقت بڑے ہی شوخ موڈ میں تھا۔ ثومی کی طرف آتے ہی اس کا ہاتھ پکڑا اور گھسیٹتے ہوئے دوسرے کمرے کی طرف لے جانے لگا۔

"کیا، کیا کر رہے ہیں آپ ——" وہ ہاتھ چھڑانے کی بے جان سی کوشش کرتے ہوئے بولی۔

"اماں نے کہا ہے۔ دوسرے کمرے میں جا کر آرام کرو۔" کلیم نے چبا چبا کر الفاظ کہے۔ اس نے انداز سنجیدہ اختیار کیا تھا۔ لیکن ہنسی پھوٹ پھوٹ گئی۔ وہ اسے اپنی طرف کھینچنے لگا۔

"تو آپ جائیے نا —— آرام کیجئے ——" ثومی ہاتھ چھڑا کر بولی۔ "مجھے خواہ مخواہ لیٹ رہے ہیں۔"

"تم یہاں کیا کرو گی۔" وہ اسے گھورتے ہوئے بولا۔

"میں ——؟" ثومی قدم اٹھاتے ہوئے بولی۔ "گھر چلی جاؤں گی۔"

"گھر چلی جاؤں گی۔" کلیم نے اس کی نقل اتاری۔ ثومی مسکرانے لگی۔

"اماں کی خدمت کون کرے گا۔ تین چار دن تو وہ پلنگ سے اٹھنے سے رہیں۔" کلیم نے کہا۔ اور پھر شوخ نظروں سے ثومی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولا۔ "تمہاری بھی تو کچھ لگتی ہیں۔ تم پر ان کی خدمت فرض ہے، سمجھیں۔"

ثومی اس بات سے کانوں تک لال ہو گئی۔ اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں میں چھپا لیا۔

"اللہ! —— آپ —— کیسی باتیں کرتے ہیں ——"

"دل میں تو لڈو پھوٹ رہے ہیں۔ بن یوں رہی ہو جیسے ——" کلیم اس کے ہاتھ پکڑ کر چہرے سے ہٹاتے ہوئے بولا۔ لیکن بات پوری بھی نہ ہو پائی تھی کہ راہداری میں قدموں کی آواز سے چونک گیا۔

"باپ رے۔ کوئی اماں کو دیکھنے آیا ہے شاید۔ چلو اس کرسی پر جا کر بیٹھو جاؤ۔ اب تمہاری باری ہے۔ میں دو گھنٹے بیٹھا رہا۔"

کلیم جلدی جلدی کہتے بغلی دروازے میں گھس گیا۔ ثومی کو اس کے ہڑبڑانے پر ہنسی آ گئی۔

اندر کوئی نہ آیا۔ شاید نتھو کسی سے باتیں کرتے ادھر سے گزرا تھا۔ ثومی کرسی پر بیٹھ کر اماں کے جاگنے کا انتظار کرنے لگی۔ کلیم کی باتیں ذہن میں دہراتے ہوئے دل ہی دل میں مسرور ہو رہی تھی۔ رات جبران کی باتوں سے جن وسوسوں نے اسے گھیرا تھا۔

اس وقت وہ ان سب کو جیسے بھول چکی تھی۔

ہاں رات، جب وہ اماں کے سو جانے پر چھ گھنٹے کی مسلسل ڈیوٹی دینے

بوجھل آ کر اپنے گھٹے گھٹے ماحول والے کمرے میں بستر پر لیٹی۔ تو اسے خوشیوں کے غلبے میں بھی مایوسی کا دباؤ محسوس ہوا۔

اس کی یہ جنت اگر تباہ ہو گئی۔

تو

وہ کیا کرے گی۔

وہ تو ایسا تصور بھی برداشت نہ کر سکتی تھی۔

اگر حقیقت تلخی کے اس روپ میں سامنے آئی۔ تو کیا کرے گی؟

—— ؟ ——

نے سکول سے تین دن کی رخصت لے لی۔ اماں کی خدمت اس نے
ثومی فرض سمجھ کر کرنا تھی۔ کلیم کی خوشیوں کا ٹھکانہ نہ تھا۔ فرطِ انبساط
سے وہ جھوم جھوم اٹھتا تھا۔ ثومی کی گھر میں موجودگی کے احساس سے وہ دیوانہ
ہوا جا رہا تھا۔ چھیڑ چھاڑ۔ جیلے بہانے باتیں۔ دل لگی۔ شوخی اس کا مشغلہ بن
گیا۔ اماں کے سامنے یوں معصوم بن جاتا۔ جیسے ثومی کی موجودگی کا اسے احساس
ہی نہیں۔ کئی بار تو دانستہ بیزاری کا اظہار کرتا۔ اماں اس کی پرخلوص خدمات سے
مرعوب تھیں۔ کلیم جب بھی ایسا کرتا اسے گھورنے لگتیں۔ زیرِ لب سرزنش بھی
کرتیں۔ کلیم دوسری جانب منہ پھیر کر مسکرانے لگتا۔

سلمیٰ جب بھی اماں کو دیکھنے آتی۔ وہ یہی تذکرہ لے بیٹھتیں۔ ثومی کی خدمات کا
اعتراف کرتیں۔ کلیم کی زیادتی کا ذکر کرتیں۔ سلمیٰ مسکرا دیتی۔

لیکن اس دن جب اماں نے یہی بات فریدہ کے سامنے بھی کی۔ تو وہ بے چین
سی ہو گئی۔ وہ بھی اماں کو دیکھنے آئی۔ دس پندرہ منٹ بیٹھ کر چلی جاتی۔ کلیم سے
اس نے خود کبھی بات نہ کی۔ کلیم ہمیشہ اس کے ساتھ خلوص سے پیش آیا لیکن
اسے صرف خلوص کی تو ضرورت نہ تھی۔

اماں نے بار بار دہرایا۔ "پتہ نہیں اس لڑکے نے بیچاری ثومی سے کس جنم کا بدلہ
لینا ہے۔ خواہ مخواہ ڈانٹ دے گا۔ ہر کام میں نقص نکالے گا۔ توبہ ہے۔ میں
تو ڈرتی ہی رہتی ہوں۔ کہیں وہ کام چھوڑ کر چلی ہی نہ جائے۔ پر آفرین ہے اس پر

سب کچھ چپ چاپ سہہ جاتی ہے۔"

"بڑی اچھی لڑکی ہے۔" فریدہ نے کچھ سوچتے ہوئے صرف اتنا ہی کہا۔ اماں
کی سادگی کو وہ کیا کہتی۔ ابھی کل دوپہر ہی تو اس نے جو کچھ دیکھا تھا۔ ثومی اور کلیم کی
والہانہ چاہت کا غماز تھا۔ وہ اماں کو دیکھنے آئی تھی۔ کھانے کے کمرے کے قریب
سے گزرتے ہوئے اس نے کلیم کی آواز سنی تھی۔ وہ زوردار آواز میں کہہ رہا تھا:

"تم ضرور کھاؤ گی۔"

جواب میں ثومی کچھ ہنہنائی تھی۔ فریدہ کے قدم خود بخود رک گئے تھے۔ کھڑکی کے
تو ڈے ہٹے پردے سے اس نے دیکھا تھا۔ کھانے کی میز پر ایک سرے پر کلیم بیٹھا تھا
کھانا چنا ہوا تھا۔ ثومی اس کے دائیں ہاتھ کی کرسی پر بیٹھی تھی۔ کلیم کھانے کی چیزیں
اس کے آگے بڑھا رہا تھا۔ دونوں کا انداز کچھ ایسا والہانہ تھا۔ کہ فریدہ دم بخود ہو کر پیچھے
ہٹ گئی تھی۔

"تم نے نہ کھایا تو میں بھی نہیں کھاؤں گا۔" یہ کلیم تھا۔

"ہائے اللہ۔ آپ۔ سمجھتے کیوں نہیں۔ کسی نے دیکھ لیا۔ تو میری شامت آ جائے گی۔"
یہ ثومی کی آواز تھی۔

"تم تو ڈرتے ڈرتے مر ہی جاؤ گی۔"

"میری پوزیشن ہی ایسی ہے۔"

"پھر وہی بات۔"

"حقیقت کا سامنا کرنا ہی چاہیئے۔ آپ مجھے وہیں رہنے دیجئے۔ جہاں میں ہوں
باعزاز۔"

"اوہ خدایا۔ کس بے وقوف سے پالا پڑا ہے۔ ثومی جتنے دن تم ہمارے یہاں ہو۔
تمہیں کھانا میرے ساتھ کھانا پڑے گا۔"

"مجبور نہ کیجئے۔" آپ کھائیے نا۔"

"میں نے کہہ دیا۔ نہیں کھاؤں گا۔ نہیں کھاؤں گا۔ نہیں کھاؤں گا۔"

"مجھے ڈر لگتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب۔"

"میرا نام کلیم ہے۔ ڈاکٹر صاحب خدا جانے تمہارے ڈر اور خوف اور وسوسے کیوں کر دور ہوں گے۔"

"بزدل کہیں کی ــــ یوں زمانے سے ٹکرا سکو گی۔"

ثومی نے کوئی جواب نہ دیا۔

"ثومی ــــ! تم میری دنیا ہو۔ بس ــــ میں اتنا جانتا ہوں مجھے کسی کی پروا نہیں زمانہ جو چاہے کہے۔ دنیا جیسے چاہے غرائے۔ میں نے تمہیں پا لیا ہے۔ مجھے اس سے بڑھ کر اور کوئی تمنا نہیں۔ کیا تم بھی میرے انداز میں نہیں سوچ سکتی۔؟ میں تمہاری خاطر ہر دیوار کو گرا دوں گا۔ تم ــــ کسی سے کمتر نہیں ہو۔ ثومی۔"

ثومی نے جانے کیا کہا۔ اس کی آواز اتنی گہری آلود تھی۔ کہ فریدہ سمجھ نہ پائی۔ یوں بھی اس کا دل ڈوبتا چلا جا رہا تھا۔ دھیرے دھیرے وہ وہاں سے لوٹ گئی۔ آج اماں جس انداز میں ثومی اور کلیم کا ذکر کر رہی تھیں۔ اس کا جی ہنسنے کو چاہ رہا تھا۔ دل میں کچھ شوریدہ سر جذبے مچلے تھے۔ کہ ان دونوں کی محبت کا راز فاش کر دو۔ لیکن انسانیت کی خدا جانے کون سی رمق تھی۔ جس نے فریدہ کو یہ کہنے پر مجبور کر دیا تھا۔

"بڑی اچھی لڑکی ہے۔"

رات اس نے ثومی کو اک نئی نظر سے دیکھا تھا۔ بلاشبہ وہ قاتلانہ حد تک حسین تھی۔ آج تک اس نے اس حسن کو جیسے نظر انداز ہی کیا تھا۔ حسن کے علاوہ فریدہ کو ثومی میں کوئی ایسی شے نظر آ رہی تھی۔ جو اس کا الگ تھلگ مقام متعین کرتی تھی۔ نوکروں کے کوارٹر میں پلنے والی یہ لڑکی اک شاہانہ سا وقار ضرور رکھتی تھی۔ غالباً

یہی بات اسے دوسری لڑکیوں سے ممتاز کرتی تھی۔ دل میں اس کے خلاف بغض و عناد ہونے کے باوجود وہ اسے کچھ نہ کہہ سکی تھی۔ اسے یوں لگا تھا۔ جیسے کلیم ثومی کا جائز حق ہے۔ اس کی راہ کی رکاوٹ بننا غلطی ہے۔

کل کے واقعے نے اسے دل گرفتہ کر دیا تھا۔ لیکن آج سلمیٰ کے کہنے پر اسے اماں کو پھر دیکھنے آنا پڑا تھا۔ اماں کو دیکھنے سے زیادہ وہ ثومی اور کلیم کو دیکھ رہی تھی۔ ان کی نظروں کے مبہم مبہم پیغام وہ بخوبی سمجھ رہی تھی۔

فراخ دلی دکھانے کے باوجود اس سے برداشت نہ ہو سکا۔ سلمیٰ اماں سے باتوں میں لگی رہی۔ وہ اٹھ کر چل دی۔

ثومی اور کلیم نے برآمدے میں اسے دیکھا۔ "جا رہی ہیں ــــ" کلیم نے بات کرنے کی غرض سے کہا۔

"جی ــــ ظاہر تو یہی ہو رہا ہے۔" اس کی آواز میں کپکپا دینے والی ٹھنڈک تھی۔ ثومی سہم گئی۔ لیکن کلیم نے دکھتی رگ کو چھیڑا۔

"کیا بات ہے۔ آجکل آپ کا موڈ کچھ ٹھیک نہیں ہوتا۔ کچھ اداس سی رہتی ہیں۔" کلیم نے اس کی طرف خلوص سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"ان دنوں آپ تو بہت خوش رہتے ہیں نا۔" اس نے دکھی نظروں میں کچھ طنز کا نیش شامل کرتے ہوئے کہا۔ اس کا واضح اشارہ کلیم نے بھی سمجھ لیا۔ اور ثومی نے بھی۔ وہ بغیر جواب سنے وہاں سے تیزی سے نکل گئی۔

"بیچاری لڑکی ــــ" کلیم اس کے جانے کے بعد کبھی کبھی ہنسی ہنستے ہوئے بولا۔ ثومی اس کے طنز سے بری طرح سہم گئی تھی۔

کلیم کئی لمحے خاموشی سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔ وہ بری طرح گھبرا رہی تھی۔

"بس ــــ پہلے وار ہی میں بس ہو گئیں۔" کلیم نے مسکراتے ہوئے اس کی طرف

دیکھا۔" ثومی تم تو ضرورت سے زیادہ ہی ڈرپوک ہو۔ کبھی کبھی تو شک ہونے لگتا ہے کہ تم نامساعد حالات میں میرا ساتھ بھی دے سکو گی؟ ابھی تو ابتدا ہے ثومی۔ حوصلہ یوں ہار دیا تو بیڑہ غرق ——"

ثومی کلیم کے اندازِ گفتگو پر ہنسے ہی دھیمے انداز میں مسکرا دی۔

"عشق اور مشک چھپ نہیں سکتے ثومی صاحبہ۔ یہ وہم دل سے نکال ہی دو۔ جب سب کو پتہ چلنا ہی ہے تو بس ٹھیک ہے۔ اچھا ہی ہوا۔ سب سے پہلے فریدہ کو احساس ہوا۔ کہ ——"

"میرا تو دم نکل رہا ہے۔ آپ نہیں جانتے۔"

"سب جانتا ہوں۔ تم کسی بات کی پرواہ نہ کرو۔"

"ہوں۔ پرواہ نہ کروں۔ ثومی نے بچوں کی سی معصومیت سے کہا۔ اس کا ہوں کہنے کا انداز اتنا فطری اور پیارا تھا۔ کہ کلیم نے بے ساختہ اسے پیار کر لینا چاہا۔ وہ تو ثومی ہی پیچھے ہٹ گئی۔ کلیم کی شوخی اور چھیڑ چھاڑ۔ انقلابی سوچ۔ کوئی بات بھی ثومی کے دل میں فریدہ کی جانب سے پیدا ہونے والے خدشے کو نکال نہ سکی۔

عشق اور مشک واقعی چھپائے نہیں چھپتے۔ صرف فریدہ ہی نہیں۔ صدیق بھی ان کے رازِ محبت کو پا چکا تھا۔

اس دن تو اس نے گارڈینیا کے پاس کھڑے ہو کر ثومی کو کلیم کے ہاں جاتے دیکھا تھا۔ خود ہی دل کو تسلیاں بھی دے لی تھیں۔ لیکن اماں کی تیمارداری کرنے کو آنے والی ثومی کو کل رات اس نے کلیم کے بازو پر جھکے جس انداز میں دیکھا تھا۔ وہ کافی تھا۔ آج صبح بھی اس نے ثومی کو کلیم کے برابر بیٹھ کر ناشتہ کرتے ہوئے دیکھا تھا۔ کچھ تھوڑا اعتماد ہی لے کر راز اگلوائے تھے۔

انہونی ہو جانے کو آنکھوں میں یک دم کھٹک جاتی ہے۔ کلیم کے ہاں ثومی کو آتے

"دو تین دن سے تم نظر نہیں آئیں۔ کہاں ہوتی ہو۔

اماں کے پاس۔ ان سے چلا پھرا نہیں جاتا۔ میں کام کر دیتی ہوں۔" ثومی نے اک نگاہِ ناز سے کلیم کی طرف دیکھ کر جواب دیا تھا۔

"یہ کام جبران بھی کر سکتی ہے۔" فریدہ نے الجھتے ہوئے کہا تھا لیکن ثومی مسکراتے ہوئے ٹرے اٹھا کر وہاں سے چل دی تھی۔

کلیم کو فریدہ کا لہجہ کچھ گراں گزرا تھا۔

لیکن فریدہ —— اک نئے کرب۔ اک نئی کوفت سے دوچار تھا۔

تاریخ اپنے آپ کو دہراتی ہے۔ کیا ثومی بھی بلو بن جائے گی۔؟ جو اس سال ڈاکٹر وہی کھیل تو نہیں کھیل رہا۔ جو اس نے بلو سے کھیلا تھا۔ فریدہ کی سوچوں میں کیا کیا بھیانک موڑ نہیں آ رہے تھے۔

—— ؛ ——

کئی دنوں سے سخت پریشان تھی۔ صدیق نے اشاروں کنایوں میں اسے جتلا دیا تھا۔ کہ وہ کلیم اور اس کے رازِ محبت سے آگاہ ہو چکا ہے۔ اس نے تیور بھی بدل لیے تھے۔ قہرمانی تناؤ آنکھوں میں لیے اسے گھورتا۔ جیراں کے پاس جب بھی بیٹھتا۔ ثومی کے کردار کو مشکوک ظاہر کرنے کی کوشش کرتا۔

"ایک بار تو اس نے دبے دبے لفظوں میں اسے چیلنج بھی دیا تھا۔

ادھر سلمیٰ کو بھڑکانے میں بھی اس کا بڑا ہاتھ تھا۔ سلمیٰ پہلے ہی ثومی کو کون سی ہمدرد تھی۔ اب تو کھا جانے والی نظروں سے اسے دیکھا کرتی تھی۔

فریدہ کی رکھائی اور سرد مہری بھی سوہانِ روح تھی۔

اور سب سے بڑھ کر تو فریدہ کا رویہ اس کے لیے جانگسل تھا۔

جیراں بھی کچھ کم نہ تھی۔ ثومی بری طرح گھبرا گئی۔ ٹھنڈی جنگ عروج پر پہنچ رہی تھی۔ لیکن ثومی کسی کو کچھ کہہ سکتی تھی۔ نہ بول سکتی تھی۔ اپنی پریشانیوں کو سینے سے لگائے دن گزار رہی تھی۔

کلیم کی محبت میں روز بروز جنون کی سی کیفیت شامل ہو رہی تھی۔ ثومی کو پریشان دیکھ کر وہ اس کی ہمت بندھاتا۔ وہ یہی سمجھ رہا تھا۔ کہ ثومی اپنی اور اس کی مالی حیثیت کے تفاوت سے پریشان ہے۔ وہ اس بات کو قطعاً کوئی اہمیت نہیں دیتا تھا۔ ثومی گھبراہٹ اور پریشانی میں کبھی اپنے خدشوں کا ذکر کرتی بھی تو وہ لاپرواہی سے ہنس کر ٹال دیتا۔

"ڈرپوک ـــ بزدل ـــ" وہ صرف اتنا ہی کہہ کر اسے مطمئن کرنے کی کوشش کرتا ـــ ان دنوں اسے ہر کوئی اپنا دشمن نظر آتا تھا۔ اس کی پیدائش کا داغ ہر کوئی نمایاں کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ثومی کانپ کانپ جاتی تھی۔ کلیم کو بھی پتہ چل گیا۔ تو کیا وہ اس سے کراہت سے منہ نہ پھیر لے گا۔

سلمیٰ نے کل ہی تو کہا تھا ـــ "اتراتی کس بات پہ ہو۔ ماں کا روپ دھارنے لگی ہو۔"

جیراں نے بھی کئی بار کہا تھا ـــ "اللہ قسم! ان باتوں کا پتہ ہوتا۔ تو اسے کبھی گود نہ لیتی۔ مصیبت میں پھنس گئے ہم تو ـــ"

صدیق تو اٹھتے بیٹھتے جتلا رہا تھا ـــ "دیکھیں سب کچھ جانتے بوجھتے اسے کون قبول کرے گا ـــ"

ثومی کا کئی بار جی چاہا۔ کہ کلیم کو اپنے متعلق سب کچھ بتا دے۔ لیکن وہ ایسا نہ کر سکی۔ اپنی جنت کو اپنے ہاتھوں کون آگ لگا سکتا ہے ـــ

دن گزر رہے تھے۔ ثومی کی حالت اس درخت کی سی تھی۔ جو دوسروں کے لیے سایے کی ٹھنڈک بہم پہنچا سکتا ہے۔ لیکن خود دھوپ میں جلتا رہتا ہے۔ کلیم کے لیے وہ سراپا عشق ہونے کے باوجود اپنی آگ میں آپ جل رہی تھی۔

اس دن کلیم اسے زبردستی سکول سے واپسی پر اپنی گاڑی میں لے آیا۔ ثومی کا انکار سننے کی اس کے شوریدہ سر جذبوں میں طاقت ہی نہ تھی۔ گھر آنے کی بجائے وہ اسے "سحر" ریسٹورنٹ میں لے گیا۔

سحر کے خوبصورت اور سحر خیز کیبن میں ثومی کو لا کر وہ اس سے کھل کر باتیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ دنوں کی پریشانی دیکھ رہا تھا۔ ثومی کا حوصلہ بڑھانے کو اس سے کھل کر بات کرنے کی ضرورت تھی۔ گھر میں موقع تو ملتا۔ لیکن یکسوئی میسر نہ آتی۔ کوئی نہ کوئی

دھڑکا لگا ہی رہتا۔

چائے کا آرڈر دے کر اس نے سگریٹ سلگایا۔ اور لمبے لمبے کش لیتے ہوئے میز کے دوسری طرف اپنے بالمقابل بیٹھی پریشان حال ثومی کو بند بند آنکھوں اور دھوئیں کے مرغولوں میں سے دیکھنے لگا۔

ثومی سوچوں میں گم تھی۔

"ثومی ــــ!" کلیم نے کئی لمحوں کی خاموشی کے بعد کہا۔

"جی!"

"تمہیں ان دنوں ہو کیا گیا ہے ــــ"

"مجھے ڈر لگتا ہے۔"

"کس بات کا۔"

وہ چپ ہو گئی۔ اپنے ناخنوں سے میز کی سطح کریدتے ہوئے دل گرفتہ ناخنہ کی طرح نظر آئی۔ پھر دھیرے دھیرے سر اٹھایا۔ کلیم کی طرف دیکھا۔ آنکھیں جھکاتے ہوئے بولی۔ "مجھے یوں لگتا ہے زمانہ آپ کو مجھ سے چھین لے گا۔"

"اور مجھے یوں لگتا ہے جیسے میں نے تمہیں زمانے سے چھین لیا ہے۔" کلیم شوخی سے اس کی نقل اتارتے ہوئے مسکرایا۔

لیکن ثومی بدستور سنجیدہ رہی۔

"ثومی۔ میں آج تمہیں دانستہ یہاں لایا ہوں۔" کلیم نے سگریٹ کی راکھ جھاڑتے ہوئے کہا۔ وہ اب بالکل سنجیدہ تھا۔ اس کے چہرے پر اس سنجیدگی سے تقدس کا نور پھیل گیا تھا۔

ثومی نے بے چین ہو کر اسے دیکھا۔

"میں تمہارے اضطراب کو محسوس کرتا ہوں ثومی۔" اس نے آگے کو جھکتے ہوئے

کہا۔ جو سوچیں تمہیں بہکاتی ہیں۔ ان کا بھی مجھے احساس ہے۔ اسی لیے اب میں اماں سے بات کر کے تمہیں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اپنا لینا چاہتا ہوں۔ میں آج ہی اماں سے بات کروں گا۔ تمہیں یہاں اسی لیے لایا ہوں۔ ہو سکتا ہے۔ یہ مرحلہ کٹھن ہو۔ اماں کے لیے میری بات بم کی طرح ہو۔ یہ سب میں سنبھال لوں گا۔ صرف تم ہمت نہ ہارنا۔ تمہاری سوچوں میں میں نے انقلابی رنگ بھرنے کی ہمیشہ کوشش کی۔ تمہیں حالات سے ٹکرانے کی ہمیشہ ہمت دلائی۔ لیکن تمہارا ردعمل کبھی حوصلہ افزا نہ ہوا۔ اب میں تمہیں صورت حال سے باخبر کر رہا ہوں۔ ہو سکتا ہے اماں میری بات منظور کر لیں۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ یہ بات سن ہی نہ سکیں۔ دونوں حالتوں میں تمہیں میرا ساتھ پوری قوت ہمت اور جرأت سے دینا ہو گا۔ دو گی نا ــــ"

کلیم نے اپنی انگلی کی پوروں سے ثومی کی ٹھوڑی کو چھوا۔

دل کی دھڑکن زندگی کی علامت سہی۔ لیکن جب حد سے بڑھ جائے تو موت کا پیش خیمہ بھی بن جاتی ہے۔

ثومی کا دل کلیم کی بات سے کچھ اس طرح دھڑکنے لگا تھا۔ کہ وہ موت و حیات کے درمیان معلق سی ہو گئی تھی۔

اک لمحہ ــــ اک لمحہ اپنی وسعت اور لچک سے پھیل گیا۔ پھیلتا چلا گیا۔ اس لمحے میں ثومی کو کلیم کی اماں کا چنگھاڑتا ہوا وجود بھی نظر آیا۔ اور اپنی ہستی کا داغ بھی جلتا ہوا دکھائی دیا۔

اسی لمحے بم کی طرح پھٹ کر اس نے اپنی ہستی کا اسرار کلیم پر وا کر دینا چاہا۔ لیکن ــــ موت اک زندہ حقیقت سہی۔ اس کا انتظار خوشی سے کیا جاتا ہے۔ اسے گلے لگانے کو دانستہ بازو پھیلا کر خیر مقدم کیا جاتا ہے۔

ثومی بھی کچھ نہ کہہ سکی۔

کلیم اسے اتنی سنجیدگی سے خاموش پاکر مضطرب سا ہوا۔ کرسی پر پہلو بدلتے ہوئے بولا۔ "میری بات سے تمہیں خوشی نہیں ہوئی۔"

ثومی نے تڑپ کر کلیم کی طرف دیکھا۔ اور بے تابی سے بولی "مجھے ڈر لگتا ہے مجھے ڈر لگتا ہے۔"

اب کے کلیم ہنسا نہیں۔ شوخی سے مسکرا کر اس کی نقل بھی نہ اتاری۔ کرسی کی پشت سے لگ کر اس نے اپنا وجود ڈھیلا چھوڑتے ہوئے گھمبیر آواز میں بولا۔ "مجھے دکھ ہوتا ہے ثومی۔ کہ تم اب تک مجھے نہ جان سکیں۔"

وہ قدرے رکا۔ نیا سگریٹ ہونٹوں میں دباتے ہوئے سلگایا۔ لائیٹر جیب میں ڈالتے ہوئے بھاری آواز میں بولا۔ "ثومی ــــ میں نے تمہیں چاہا ہے۔ گو یہ حقیقت میں خود بھی نہیں کر سکتا۔ کہ کیوں ــــ میری زندگی میں حسین سے حسین تر لڑکیاں آئیں دولت مند لڑکیوں سے بھی میرا واسطہ رہا۔ صاحب اخلاق و کردار۔ دوشیزائیں بھی میرے قریب رہیں۔ میں نہیں جانتا۔ کہ ان سب کے لیے میری جنوں خیزیاں کیوں رنگ نہ لائیں۔ میں نہیں کہہ سکتا۔ کہ تم میں کیا چیز تھی جس نے مجھے مسخر کر لیا۔ تمہاری صورت نے یا تمہاری سیرت نے ــــ اور شاید ان دونوں چیزوں سے ہٹ کر تمہاری زندگی میں کائی کی طرح جمی افسردگی اور مایوسی نے ــــ جو کچھ بھی ہے۔ میری چاہت کا مرکز تمہاری ذات کے اندر ہے۔ مجھے اپنی چاہت پر ناز ہے۔ اپنے انتخاب پر فخر ہے۔ مجھے نظر ثانی کی ضرورت نہیں۔ میرا فیصلہ محض جذباتی ہی نہیں۔ عقلی اور دلیلی بھی ہے۔"

ثومی بے خودی کے عالم میں میز کی چمکتی سطح پر ہاتھ پھیرتی رہی۔ اس کی ذات پارہ پارہ ہو جانے کو تڑپ رہی تھی۔

"ثومی ــــ تمہارے اعصاب پر جو خوف، ڈر اور وسوسہ مسلط رہتا ہے۔ اس کی وجہ ــــ میں جانتا ہوں ــــ" کلیم نے اس کے ہاتھ پر اپنا بھاری ہاتھ رکھ دیا۔

"اور اپنی غربت سے تم اس درجہ خائف کیوں ہو؟ ــــ"

ثومی نے سہم کر کلیم کی طرف دیکھا۔ چیخ چیخ کر کہنا چاہا۔ خائف ہونے کی وجہ غربت سے بھی بڑی ہے۔ لیکن اپنی تقدیر پر ناکامی کی مہر ثبت کرنے کا حوصلہ نہ تھا۔

"غریبی جرم ہے نہ گناہ۔" کلیم نے اپنے سیاہ چشمے سے کھیلتے ہوئے متین آواز میں کہا۔ "اصل شے شرافت ہے۔ انسانیت کا یہی جوہر میں نے تمہاری ذات میں پا لیا ہے ــــ"

ثومی گم صم بیٹھی رہی۔

"ثومی ــــ" اس نے قدرے مسکرا کر ثومی کی طرف دیکھا۔ اور پھر گہری سانس لی۔ گہری سانس، جو طمانیت اور سکون کی غماز تھی۔

"میں شاعر ہوں نہ ادیب۔ کہ تمثیلوں اور استعاروں سے اپنے جذبات کی حدت اگل سکوں۔ سیدھا سادہ عملی قسم کا انسان ہوں۔ میں تمہیں زیادہ ذہنی تذبذب کے عالم میں نہیں رکھنا چاہتا ہوں۔ نہ خود دل کے تقاضوں کو مذہب، قانون اور رسم و رواج سے متصادم ہونے کی دھیل دینا چاہتا ہوں۔" کلیم نے ثومی کا ہاتھ مضبوطی سے اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا۔ "یہ ہاتھ میں نے تھام لیا ہے ثومی ــــ یہ ہاتھ اب اس ہاتھ سے کبھی نہ چھوٹے گا۔"

"کلیم ــــ" ثومی کی آواز شدت جذبات سے بھرا گئی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اپنے ہاتھ پر رکھے کلیم کے ہاتھ کی پشت پر اپنی پیشانی ٹکاتے ہوئے بڑبڑائی۔

"اگر کسی وقت ــــ کسی رکاوٹ ــــ کسی الجھاؤ نے آپ کا ہاتھ میرے ہاتھ سے چھڑا لیا۔ تو ــــ تو ــــ"

ثومی کی آواز رندھ گئی۔ جملہ پورا نہ ہو سکا۔ اس کے آنسوؤں کی نمی کلیم کے ہاتھ کی پشت پر پھیل گئی۔ کلیم نے سنجیدگی سے اس کا جملہ مکمل کرتے ہوئے کہا۔ "تو کلیم بھی

اسی انجام سے ہم کنار ہو گا ثومی ــــ جس سے تم ــــ"

"آپ ــــ آپ یہ سب کچھ۔ سچے دل سے کہہ رہے ہیں؟" ثومی بے اعتمادی سے اسے دیکھتے ہوئے بولی۔ اس نے کلیم کا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں اس مضبوطی سے پکڑ لیا تھا۔ جیسے دنیا کی کوئی طاقت اسے چھڑا نہ سکے گی۔ کلیم ان ہاتھوں کی اس آہنی گرفت سے بڑا متاثر ہوا۔

"میں زندگی کے آخری سانسوں تک تمہارا ہوں ثومی۔ مجھے تو یوں لگتا ہے۔ مر کر بھی میری مٹی کا ذرہ ذرہ تمہیں ہی پکارے گا۔"

ثومی کی حالت دگرگوں تھی۔ خلوص کے ایسے مظاہرے کے بعد اپنی ہستی کا راز کلیم سے چھپا رکھنا آئینِ وفاداری کے خلاف تھا۔ وہ لمبے لمبے غیر ہموار سانس لیتے ہوئے کلیم کو دیکھنے لگی۔

"مجھ پر یقین کرو ثومی ــــ تمہاری غریبی میری نظروں میں قابلِ احترام ہے۔ میری سوچ کا انداز مثبت ہے۔ سب کچھ سوچ کے انداز پر ہی منحصر ہوتا ہے ثومی دیکھو نا ــــ لوگ رات کے پچھلے پہر کو آخر شب کہتے ہیں۔ میں اسے طلوعِ سحر کا نام دیتا ہوں۔ یہ سب سوچ ہی کا اعجاز ہے نا۔ تمہاری غربت میری نظروں میں مقدس ہے ــــ ثومی ــــ تم غربت کی وجہ سے اپنے آپ کو کمتر نہ سمجھو۔ تم انسانیت کا معراج ہو۔"

"میں کون ہوں۔ نہیں کلیم ــــ آپ نہیں جانتے۔" اس کی آواز اس انسان کی طرح تھی۔ جو گہری کھڈ میں گرنے والا ہو۔

کلیم اس بے ربط سے جملے کو کچھ بھی تو نہ سمجھ سکا۔ حیران آنکھوں سے ثومی کو دیکھا ثومی کے بھیگے بھیگے لبوں پر اک فیصلہ کن مسکراہٹ لہرائی۔ کلیم سے کچھ چھپانا نفضول تھا۔ آنکھوں میں جانکنی کی سی کیفیت ہونٹوں پر فیصلہ کن مسکراہٹ۔ کلیم کو ثومی کا

اچانک بدلا ہوا انداز عجیب سا لگا۔

"کلیم ــــ میں۔ میں۔ میں ــــ" وہ ہانپ گئی۔ اس نے اپنا سر میز پر رکھ کر بازو پر رکھ دیا۔

"تمہیں کیا ہو رہا ہے ثومی ــــ جو کہنا چاہتی ہو کہہ ڈالو۔" کلیم نے گھبرا کر اس کے ہاتھ پھیرا۔ ثومی نے دھیرے دھیرے سر اٹھایا۔ کلیم کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے خواب ناک آواز میں بولی۔ "آپ نہیں جانتے۔"

"کیا" کلیم بے صبری سے بولا۔ وہ پریشان ہوا جا رہا تھا۔

"کیا ثومی ــــ" اس نے ثومی کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔

"میں مالی کی بیٹی نہیں ہوں۔" ثومی نے پیچھے ہٹتے ہوئے کرسی کی پشت سے سر ٹکا کر آنکھیں بند کر لیں۔ اس نے گہری خوفناک اور مسموم ہواؤں والی کھڈ میں بالآخر چھلانگ لگا ہی دی۔

اک لمحے کو تو کلیم سمجھ ہی نہ سکا۔ کہ اس نے کیا کہا ہے ــــ بیرہ چائے بھی لے آیا تھا۔ کلیم ایک دم اس سے وضاحت بھی نہ چاہ سکا۔

بیرے کے جاتے ہی کلیم برق کی سی تیزی سے ثومی کے برابر آن بیٹھا۔ "کیا کہا تم نے ــــ تم ــــ مالی کی بیٹی ہو۔"

"ہاں ــــ" ثومی کو یوں لگا جیسے وہ اور کلیم ازل و ابد کے آخری سرے ہیں۔

"تو ــــ تو ــــ کیا ہوا۔؟" کلیم صرف اتنا ہی کہہ سکا۔

ثومی ہنسی۔ یوں جیسے آنسو غنچوں کی طرح چٹک گئے ہوں۔ ٹوٹے پھوٹے لفظوں میں اس نے وہ راز اگل دیا۔ جو اس کی ہستی سے متعلق تھا۔

کلیم کو کچھ نہیں سوجھا بوجھا۔ حیران تھا۔ پریشان بھی۔ سمجھ نہ پا رہا تھا۔ کہ اس انکشاف سے اسے خوشی ہوئی ہے یا غم ــــ بے حس سا بیٹھا رہا۔ اس کا بے جان

سا ہاتھ ثومی کے کندھے پر تھا۔

ثومی کو یوں لگا جیسے اس کی کنواری جنت بارود کے دھماکے سے بھک سے اڑ گئی ہے۔ کلیم کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں پکڑ کر بھیگی آنکھوں سے لگا کر بولی۔ "کلیم۔ کیا آپ اتنے فراخدل ہیں۔ جو اس دہکتے داغ کو سینے میں سما لیں گے۔"

کلیم اب بھی گنگ تھا۔ ثومی رو پڑی۔ "اس میں میرا کیا قصور ہے کلیم۔ گناہ گار میری ماں ہے۔ میرا کوئی دوش نہیں۔ کوئی قصور نہیں۔ میں نے عمر بھر ماں کے اس گناہ کی سزا پائی ہے۔ تنفر، کراہت اور بیزاری میرا مقدر بنی رہی۔ آپ نے ــــ آپ نے بھی اپنی جذبات کا اظہار کیا ــــ تو میں ــــ میں جی نہ سکوں گی ــــ میرا کوئی قصور نہیں کلیم ــــ میرا کوئی قصور نہیں۔"

وہ دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر سسک سسک کر رونے لگی۔

کلیم ابھی تک اس انکشافی لمحے سے چمٹا ہوا تھا۔ ششدر۔ حیران۔ ہراساں وہ روتی ثومی کو دیکھ رہا تھا۔ کتنی ہی دیر ہو گئی۔ چائے پڑی پڑی ٹھنڈی ہو رہی تھی ساتھ والے کیبنوں میں بیٹھے خوش باش جوڑوں کی دبی دبی ہنسی اور پھوٹتی خوشی کی مہک آ رہی تھی۔ ہلکے ہلکے سروں میں بجنے والے آرکسٹرا کی مترنم دھن سسکیوں کی طرح سنائی دے رہی تھی۔

ثومی کے دل کا غبار آنسوؤں سے دھل گیا۔ اس نے مایوسی کی آخری حدوں سے ٹکراتے ہوئے سر اٹھایا۔ آنچل سے خود ہی آنکھیں خشک کر لیں۔ پھر بڑے ہی جانے طریق سے مسکرائی۔ ٹھنڈی آہ سینے میں گھٹ کر بولی۔ "آوارہ لہو ــــ کوئی قبول نہیں کر سکتا۔ میری نادانی ــــ"

"ثومی ــــ" تڑپ کر کلیم نے اسے اپنے بازوؤں میں لے کر بے صبری سے اس طرح دبایا۔ کہ ثومی کو سانس لینا مشکل ہو گیا۔

کے اندھیروں میں منہ چھپائے بڑبڑایا۔

"کلیم!" ثومی وفورِ مسرت سے چیخی۔

"میری جان۔ میری زندگی۔" کلیم کی گرفت اور سخت ہو گئی۔

ثومی کو یوں لگا۔ جیسے قل قل کرتے فروسی چشموں کی گنگناہٹ سن رہی ہے گھنٹہ بھر بعد جب وہ "سحر" سے باہر نکلے تو ثومی کے ضمیر کا بوجھ چھٹ چکا تھا۔ وہ معصوم مسکراہٹ کی طرح ہلکی پھلکی تھی۔

لیکن کلیم خوش ہونے کے باوجود الجھا ہوا تھا۔ ثومی کے انکشاف سے اسے اپنے راستے میں نئی نئی رکاوٹیں ابھرتی نظر آ رہی تھیں۔ پیچیدگیاں اور پیچیدہ ہوتی محسوس ہو رہی تھیں۔

اور جب ثومی کو رخصت کرتے وقت اس نے افسردہ سی مسکراہٹ سے کہا۔ "گھبراؤ نا نہیں۔ میں سب باتوں سے نپٹ لوں گا ــــ چند دن ضرور لگیں گے۔ چند دن ضرور لگیں گے۔ تم بے فکر رہنا ــــ سب ٹھیک ہو جائیگا۔"

تو ثومی خوشی سے جھوم اٹھی تھی۔ اسے اپنی منزل اپنے سامنے نظر آ رہی تھی لپکتی ہوئی چلی آئی تھی۔

اس کے جانے کے بعد کلیم حقیقت کی تلخیوں کا جائزہ لیتے مایوسی سے ہمکنار تھا۔

ــــ ٭ ــــ

نے دونوں کو سحر سے نکلتے دیکھا۔ اور ان کی گاڑی کا اپنی ٹیکسی میں
صدیق تعاقب بھی کیا۔ ثومی اور کلیم کا راز اب اس کے لیے راز نہ رہا
تھا۔ لیکن وہ حیران ضرور تھا۔ کہ آخر ثومی کہاں کھڑی ہے۔ ایک طرف وہ فرید سے
تعلقات قائم کیے ہوئے ہے اور دوسری طرف کلیم سے۔
جو کچھ بھی تھا ثومی اس کی دسترس سے اب دور ہو چکی تھی اسے پانے کا امکان
نہ رہا تھا۔ وہ اگر اسے پا کر کامرانی سے ہم کنار نہیں ہو سکتا تھا۔ تو اسے بھی کامیاب
ہونے نہیں دے گا۔ اس نے اپنے مجروح دل سے فیصلہ کر رکھا تھا۔ سلمیٰ سے اس
نے ابھی تک ثومی اور فرید کے بارے میں کھل کر کچھ کہا تو نہیں تھا۔ لیکن ثومی کو
ڈبونے کی سب راہیں ہموار کر لی تھیں۔
جال پھیلانے کو اماں سے رابطہ بھی ضروری تھا۔ صدیق ان کی خدمت میں بھی
پیش پیش رہنے لگا تھا۔ اپنی سعادت مندی اور خدمت گزاری کی وجہ سے
اماں اسے اچھا انسان سمجھنے لگی تھیں۔
ثومی کے تعلقات فرید سے ہوں خواہ کلیم سے۔ صدیق کو ہر حال میں اسے ناکامی
سے ہم کنار کرنا تھا۔ چنانچہ ہر وقت اس کا شر انگیز ذہن منصوبے بناتا رہتا۔
کبھی سلمیٰ کو اکسانے کی سوچتا تو کبھی اماں کے کان بھرنا چاہتا۔ جیران تو اس
کے ہاتھ میں تھی۔ ثومی کے متعلق اس نے اس کا ذہن اس حد تک مشکوک کر رکھا تھا
کہ جیران اٹھتے بیٹھتے زہر اگلنے لگی تھی۔

ثومی کے مستقبل کے لیے اگر کوئی پریشان تھا تو صرف فرید۔ دن رات وہ انہی سوچوں
میں غلطاں رہتا تھا۔ دل ڈوب ڈوب جاتا تھا۔ طبیعت بیزار رہتی تھی۔ ثومی دل کا
روگ بن گئی تھی۔
اگلے دن بڑی جرأت کا سہارا لے کر اس نے سلمیٰ سے کہا تھا۔ "کوئی معقول رشتہ
ڈھونڈ کر ثومی کا نکاح کر لو۔ جوان لڑکی ہے۔ خوبصورتی اور غریبی۔ کہیں داغ نہ بن
جائیں ——"
سلمیٰ کو فرید کی بات نہ تھی تو نہیں۔ عجیب ضرور لگی تھی۔ "میں نے کیا شادی کرانے
کا بیورو کھول رکھا ہے۔" اس نے تلخ سا جواب دیا تھا۔
"جوان بیٹی کی ماں ہو۔ ثومی کو اس نظر سے دیکھو۔ خدا واسطے کا کام ہے۔
مجھے تو اس کا بڑا فکر رہتا ہے۔"
"ساری عمر آپ کو اسی کا فکر لگا رہا۔" سلمیٰ نے تلخ آواز میں جواب دیا۔
فرید کو یوں لگا جیسے عمر بھر کا چھپایا ہوا راز سلمیٰ آگاہ ہو چکی ہے۔ اس کا رنگ
اڑ گیا۔ دل بیٹھنے لگا۔ آنکھوں میں اندھیرا سا در آگیا۔ لیکن اس نے صوفے پر بیٹھتے ہوئے
سنبھالا لیا۔ جانے کیسے جرأت آگئی۔ غصے سے سلمیٰ کو دیکھ کر تیز آواز میں بولا۔ "تمہیں
اس لڑکی سے خدا واسطے کا بیر ہے۔ اپنے تنفر اور بیزاری کا ہر وقت مجھے احساس دلانے
کی کوشش کرتی ہو۔ آخر تمہارا مطلب کیا ہے۔؟"
فرید کا حربہ کامیاب رہا۔ سلمیٰ اس کے غصے سے مرعوب ہو گئی۔
"مجھے اس لڑکی سے ہمدردی ہے۔" فرید نے اسی غضب ناک لہجے میں کہا۔
"اذکروں میں پلی ضرور ہے۔ لیکن ان میں سے نہیں ہے۔ وہ ہمارے گھر میں رہتی ہے
اس کے متعلق سوچنا ہمارا فرض ہے۔ خدا ترسی بھی کوئی چیز ہے۔"
سلمیٰ چپ ہو گئی۔ ثومی کو اس نے کبھی بھی ہمدردی کی نگاہ سے نہیں دیکھا تھا۔

اس سے واقعی اسے خدا واسطے کا بیر تھا۔ شاید لاشعور میں یہ وسوسہ تھا۔ کہ کہیں یہ فریدہ ہی کے کسی گناہ کا ثمر نہ ہو۔ اس وسوسے نے ثومی کے جوان ہوتے ہی دوسری صورت اختیار کر لی تھی۔ وہ اس کی کافر جوانی سے خائف رہنے کی وجہ سے بھی اس سے متنفر تھی۔ اس تنفر کو صدیق نے اپنی شاطرانہ باتوں سے اور بھی ہوا دی تھی۔

فریدہ کے ثومی کے کہیں نکاح کر دینے کے فکر مندرویے سے سلمیٰ کا اس کی جوانی کا پیدا کردہ وسوسہ تو کسی حد تک دب گیا تھا۔ لیکن اس لڑکی سے اس کے دل میں کوئی ہمدردی پیدا نہ ہو سکی۔ ٹھنڈی ٹھنڈی بجھی بجھی بیزاری کا جذبہ موجود رہا۔ اس جذبے کو اس دن صدیق نے آگ کی طرح بھڑکا دیا۔

صدیق کو سلمیٰ نے اپنے کسی ضروری کام سے بازار بھیجا ہوا تھا۔ وہ بڑی دیر کے بعد لوٹا۔ سلمیٰ اور فریدہ ڈرائنگ روم میں بیٹھی تھیں۔ آج کافی سردی تھی۔ دو چار ملنے والیاں آ گئی تھیں۔ گھنٹہ بھر ان کے ساتھ یہیں بیٹھے بیٹھے گپ شپ چلتی رہی تھی۔ ان کے جانے کے بعد بھی ماں بیٹی یہیں بیٹھی تھیں۔ سلمیٰ کلب کا سویٹر بُن رہی تھی۔ اور فریدہ کوئی کتاب دیکھ رہی تھی۔ فریدہ کی طبیعت کئی دنوں سے مضمحل تھی۔ سلمیٰ آج بھی اسے ڈاکٹر سے کوئی دوائی لینے کا کہہ رہی تھی۔ فریدہ سُنی اَن سُنی کر رہی تھی۔ سلمیٰ کو نئی نسل کی لاپرواہی اور بے اعتدالی پر غصہ آ رہا تھا۔ اچھا خاصہ لیکچر دینے لگ گئی۔

دریں اثنا صدیق بھی آ گیا۔ وہ اس کو ڈانٹتے ہوئے تاخیر کی وجہ پوچھنے لگی۔ صدیق اک کایاں تھا۔ ایسا موقعہ ہاتھ سے کہاں جانے دیتا۔ آنکھوں میں شیطانی چمک پیدا کرتے ہوئے مسکرایا۔ "جی میں آج ذرا "سحر" چلا گیا تھا۔ گھنٹہ بھر رہا ——؟"

"کیا؟" سلمیٰ نے پوچھا۔ فریدہ نے بھی اس کی طرف دیکھا۔ شہر کے سب سے

ہوٹل میں وہ ٹیکسی لے کر تو جاتا ہوگا۔ لیکن وہاں گھنٹہ بھر ——

"کیا بک رہا ہے" سلمیٰ نے غصے سے کہا۔

"سچ کہہ رہا ہوں بیگم صاحبہ۔" سحر کے باہر گھنٹہ بھر کھڑا رہا۔

"بلا سے کھڑا رہا۔ میرا کام تو پہلے کر دیتا۔"

"بات ہی ایسی تھی بیگم صاحبہ۔ ثومی اور ڈاکٹر صاحب "سحر" میں گئے۔ تو مجھے ہی کرید لگی۔

"کون ——؟" ثومی اور ڈاکٹر۔ کونسا ڈاکٹر۔" سلمیٰ نے ایک ہی سانس میں کہا فریدہ کا دل کانپ گیا۔ چہرے پر مردنی سی چھا گئی۔

"اپنے کلیم صاحب۔ بیگم صاحبہ —— اور کون ——" صدیق نے حیران و پریشان سلمیٰ سے کہا۔

"وہ کیوں گئی ان کے ساتھ۔ سحر میں" اس نے بے تکے پن سے کہا۔

صدیق شیطانی ہنسی ہنسا۔ فریدہ نے مضطرب ہو کر صوفے پر کروٹ بدلی۔

"آپ کتنی سادہ ہیں بیگم صاحبہ۔ گل کھل رہے ہیں۔ اور آپ کو پتہ ہی نہیں۔ ثومی اور ڈاکٹر صاحب۔" وہ معنی خیز انداز میں رک گیا۔

سلمیٰ ششدر سی رہ گئی۔ پھر غصے میں آ گئی۔ "بکواس مت کرو۔"

صدیق ہاتھ کان کے پیچھے لے جا کر کھجلی کرتے ہوئے مسکرایا۔ اس کی اندر کو دھنسی آنکھوں میں شعلوں کی لپک لیے تھیں۔ اور بھدے بھدے نیلے نیلے ہونٹوں پر تبسم رقصاں تھا۔ وہ سلمیٰ کی ڈانٹ حوصلے سے سنتا رہا۔

"ممی۔" فریدہ نے ماں سے کہا۔ "صدیق سچ کہہ رہا ہے۔"

"کیا ——؟" سلمیٰ چکرا گئی۔ صدیق فریدہ کی تائید میں جیسے میدان جیت گیا۔

"حیرانی کی کیا بات ہے ممی۔" فریدہ تلخی سے مسکرائی۔ "ثومی حسین لڑکی ہے۔"

ڈاکٹر صاحب نے اسے پسند کر لیا۔

"لیکن وہ ـــ تو ـــ وہ تو ـــ" سلمیٰ نے کچھ کہنا چاہا۔ فریدہ سمجھ گئی۔ ٹھنڈے سے لہجے میں بولی۔ "سب دکھاوے کو تھا ممی۔ اماں سیدھی سادی عورت ہیں۔ وہ تو اب تک اسی خوش فہمی میں مبتلا ہیں۔"

"یہ ثومی بڑی چالباز ہے بیگم صاحبہ۔ بڑا اونچا اڑتی ہے۔ ہم جیسوں کو تو منہ نہیں لگاتی۔ صاحب بہادروں پر ڈورے ڈالتی ہے۔"

سلمیٰ کو اس انکشاف سے دھچکا سا لگا۔ کلیم کو تو وہ فریدہ کے لیے منتخب کر چکی تھی۔ فریدہ کے کئی دنوں کے اضمحلال کا سرا بھی ہاتھ آ گیا۔ وہ ثومی کو بے نقط سناتے ہوئے اس کی آوارہ ماں کو کوسنے لگی۔ صدیق وہاں سے چپ چاپ کھسک گیا۔

فریدہ کچھ دیر تو ماں کی غصیلی باتیں خاموشی سے سنتی رہی۔ پھر بڑے ٹھہرے ہوئے انداز میں بولی۔ "ممی! ـــ آپ ناحق پریشان ہو رہی ہیں۔ ڈاکٹر صاحب اپنی کا کونسا حق ہے۔ انہیں اپنی پسند کا اختیار ہے۔"

"وہ یقیناً ثومی کے متعلق نہیں جانتا۔" سلمیٰ نے بھڑک کر کہا۔

"نہیں جانا تو جان جائے گا۔ آپ کو کیا۔" وہ اٹھتے ہوئے بولی۔ "آپ ان کے معاملات میں دخل انداز نہ ہوں۔"

وہ کمرے سے تیزی سے نکل گئی۔ اس کا دل بھر آیا تھا۔ لیکن وہ کسی کمزوری کا مظاہرہ نہ کرنا چاہتی تھی۔ ماں کے سامنے مظاہرہ نہ کرنا چاہتی تھی۔

وہ کسی کے سامنے بھی اپنی کمزوری کا مظاہرہ نہ کرنا چاہتی تھی۔ ڈاکٹر کے لیے اس کے دل میں پسندیدگی کے جذبات تھے۔ پسند محبت بن رہی تھی۔ لیکن جب سے اسے ثومی اور ڈاکٹر کے راز محبت سے آگاہی ہوئی تھی۔ اس نے اپنا دامن سمیٹ لیا تھا۔ خالی دامن ـــ"

وہ بے غیرت نہیں تھی۔ اک غیور لڑکی تھی۔ اپنے جذبات کا گلا گھونٹ کر دل ہی میں محبت کا مدفن بنا لیا تھا۔ یہ اس کا اپنا ہی نکتۂ نظر تھا۔ وہ ایسے شخص کے پیچھے ماری ماری پھر کر اپنی محبت کی توہین نہیں کرنا چاہتی تھی۔ جو اسے نظر انداز کر کے کسی اور کے زلف گرہ کا اسیر ہو چکا ہے۔

ثومی خوش نصیب تھی۔ اس کی خوش نصیبی سے اسے دکھ ضرور ہوا تھا۔ لیکن اس نے حالات سے ٹکرانے کا نہیں سوچا تھا۔ اپنی مایوسیوں کو اپنی ذات میں سمیٹ لیا تھا۔ صدیق نے آج کا واقعہ جیراں کے گوش گزار بھی کر دیا۔

"تو نے اسے بہت ڈھیل دے رکھی ہے چاچی ـــ کل کلاں کو کچھ ہو گیا۔ تو لوگ تیرا ہی نام اچھالیں گے۔"

جیراں تو سنتے ہی سن ہو گئی تھی۔ "غریبوں کی بیٹیوں سے بڑے لوگ بیاہ رچانے ہی تو رہے۔ کھیل ضرور لیتے ہیں۔ ثومی کا دماغ ٹھکانے پہ آ جائے گا۔ جب کھیل ختم ہو جائے گا۔ کھیل کبھی نہ کبھی تو ختم ہوتا ہے ہی چاچی ـــ"

جیراں کے خون میں ابال اٹھنے لگے۔ صدیق لگائی بجھائی کر کے چلتا بنا۔ اور وہ بھوکی شیرنی کی طرح ثومی کے کمرے کی طرف لپکی۔

ثومی اس وقت آسمان کی وسعتوں میں تیر رہی تھی۔ اس کے گھناؤنے پس منظر کے باوجود کلیم نے اسے اپنا لیا تھا۔ اپنی خوش نصیبی پہ اسے رشک آ رہا تھا۔

وہ کھڑکی میں کھڑی گنگنا رہی تھی۔ کہ جیراں عتاب بن کر آئی۔ اس نے اس کی بکواس کو کوس ڈالا۔ اسے لعن طعن کی۔ اپنے نصیبے کو برا بھلا کہا۔ ثومی سب کچھ کمال ہمت سے سنتی رہی۔

"ہم اپنے سر کوئی بدنامی لینے کو تیار نہیں۔ اپنا ٹھکانہ جہاں ہو سکتا ہے بنا لے۔" کف اڑاتی بولی۔ "میری اپنی بیٹیاں بھی ہیں۔ تجھ جیسی ناہنجار کا سایہ ان پر بھی

پڑ گیا۔ تو میں کیا کروں گی۔ ہائے ہائے مجھ نصیبوں جلی سے کیا بھول ہو گئی۔ جو آوارہ لہو کو اپنانے کا سوچا تھا۔

ثومی اس طعنے سے تڑپ گئی۔ اس کا جی چاہا۔ سب کچھ چھوڑ کر یہاں سے بھاگ جائے۔ وہ کسی کی محتاج تو نہ تھی۔ جیراں کو اسے اس حد تک کوسنے کا حق ہی کیا تھا۔ جب وہ اسے بیٹی تسلیم نہ کرتی تھی۔ تو اس کے اعمال سے اسے کیوں سروکار تھا۔ لیکن وہ اس وقت سر جھکائے خاموش کھڑی رہی۔ چند دنوں ہی کی تو بات تھی۔ پھر

پھر ——!

وہ ہوگی اور اس کی حسین دنیا۔

اپنے اردگرد پھیلے ہوئے سازشی جالوں سے بے خبر ثومی آنے والے سنہری دنوں کی گہما گہمیوں میں ڈوبی رہی۔

بک جھک کر جیراں واپس چلی گئی ؛

—— ؛ ——

کلیم خاصہ پریشان تھا۔ اس پریشانی نے اس کی مجنونانہ محبت کو کم نہیں کیا تھا ہاں ثومی کے حصول میں اسے ایسے رکاوٹیں نظر آ رہی تھیں۔ جن سے نا آسان نہ تھا۔ سلمیٰ نے اماں کو ثومی کے بارے میں سب کچھ تفصیل سے بتا دیا۔ اس کے آوارہ لہو کا حوالہ دیتے ہوئے اس پر کئی بہتان لگائے تھے۔ گو ان نانوں کا راوی صدیق ہی تھا۔ پھر بھی اس نے تنفر اور بیزاری کی ساری آگ اگل دی تھی۔ اماں ششدر رہ گئی تھیں۔ اور سلمیٰ کے جاتے ہی صدیق کو بلا بھیجا تھا۔ صدیق نے ثومی اور فرید کے عشق کی فرضی داستان اس طرح سنائی —— کہ اماں دل کو ہاتھ لگانے لگیں۔

صدیق نے موقع پا کر ثومی اور کلیم کے بارے میں بھی اماں کو کہہ دیا۔ وہ تو سنتے سکتے میں آ گئیں۔ "یہ کیسے ہو سکتا ہے۔" وہ بڑی دیر بعد سوچ سے چونکیں۔

"یہ سب ہو گیا ہے بیگم صاحبہ۔"

"میں نہیں مانتی۔ میرا بیٹا ایسا نہیں۔"

"یقیناً ایسا نہیں۔ لیکن یہ لڑکی بڑی صراقہ ہے۔ جہاں کہیں بن پڑا۔ اپنا مطلب نکالا۔ پہلے میرے ساتھ عشق لڑایا۔ پھر فرید صاحب کے ہتھے چڑھی۔ اور اب کلیم صاحب —— بیگم صاحبہ —— آپ پوچھ سکتی ہیں۔" صدیق قسمیں کھا کر بنائے بولا۔

"مجھے تو اپنا ہی دکھ ہے بیگم صاحبہ۔ بچپن سے چاچی جیراں نے اسے مجھ سے

منسوب کیا تھا۔ لیکن ــــ اب ــــ اتنی بڑی بڑی آسامیوں کے سامنے میری کیا
وقعت ــــ

جب ننھو نے بھی صدیق کی باتوں کی تائید کی۔ تو اماں بوکھلا گئیں۔ اپنے بیٹے کو
تو کچھ نہ کہا۔ مظلوم لڑکی کو وہ وہ سنائیں۔ کہ الاماں ــــ اور شومئ تقدیر پہ کچھ ہی دیر
بعد ثومی اماں کے کپڑے استری کرنے ادھر آ گئی۔

"نکل جا یہاں سے ــــ اب ادھر کا رخ کیا۔ تو تیری ٹانگیں توڑ ڈالوں گی۔
کمینی، ذلیل جس تھالی میں کھایا اسی میں چھید ــــ میرے بیٹے پر ڈورے ڈالنے
لگی ہے۔ کمینی ــــ" ثومی الٹے پاؤں لوٹ گئی۔ اس کی دنیا چکر لینے لگی۔ زمین
آسمان گھومتے محسوس ہوئے۔ انا کی ٹھیس تو اس سے کبھی بھی برداشت نہ ہو
تھی۔ یہ اماں نے ایک دم کیوں آنکھیں بدل لی تھیں۔

اپنے بستر میں گھس کر وہ گھنٹہ بھر روتی رہی۔ پہلے تو جی چاہا۔ کلیم کے پاس جائے
لیکن پھر اس نے یہ خیال دل سے نکال دیا۔ وہ پیدائشی غیور لڑکی تھی۔ اپنے آپ
کو گرانا نہیں چاہتی تھی۔ روتے روتے اس نے دل سے عہد کر لیا۔ کہ اب وہ کلیم سے
اس وقت تک نہیں ملے گی۔ جب تک وہ اماں کو ہموار کر کے ابدی ملن کی راہیں
نہیں کر لیتا۔ کلیم نے بھی تو اسے صبر اور ہمت سے واقعات سے نپٹنے کی تلقین کی
بڑی سوچ بچار کے بعد اس رات اماں کے کمرے میں کلیم گیا۔ اسے علم نہ تھا
اماں کے مزاج کس رخ جا رہے ہیں۔ اس نے ادھر ادھر کی باتوں کے بعد اپنی
کا ذکر چھیڑا۔

اماں پلنگ پر سیدھی ہو کر بیٹھ گئیں۔ وہ بھی محاذ پر لڑنے کو پوری طرح تیار تھا
کلیم جو کہنے والا تھا۔ اس کا انہیں علم تھا۔

کلیم پلنگ کے قریب کرسی پر سر جھکائے بیٹھا تھا۔ اور وہ اسے تیز نظروں

دیکھ رہی تھیں۔

"اب شادی ہو ہی جائے تو اچھا ہے۔" وہ دھیرے سے مسکرایا۔ "آپ کو
بھی تو بہو کی ضرورت ہے۔ آپ سے اب گھر سنبھالا بھی تو نہیں جاتا۔ شادی۔"

"ہوں۔" اماں نے صبر سے کہا۔ "شادی ہو ہی جانی چاہیئے۔ فریدہ کے بارے
میں تمہارا کیا حال ہے ــــ"

"اچھی لڑکی ہے۔" کلیم نے کہا۔ اماں کچھ خوش ہو گئیں۔

"پیغام دے دوں۔" انہوں نے پوچھا۔

"نہیں۔" کلیم نے تحمل سے کہا۔ "میں فریدہ سے شادی نہیں کر سکتا۔"

"تو پھر کس سے کر سکتے ہو۔" اماں برداشت نہ کر پائیں۔

"اماں۔ ثومی بہترین لڑکی ہے۔" اس نے آہستہ لیکن مستحکم آواز میں کہا۔
"میرا انتخاب ثومی ہے اماں۔ آپ کو اعتراض تو نہیں۔"

اماں نے دانت پیس لیے۔ لیکن حوصلہ برقرار رکھتے ہوئے بولیں۔ "تو ان
دنوں اس لڑکی کے ہتھے چڑھا ہوا ہے۔ مجھے سب باتوں کا علم ہے۔ اس ساحرہ
نے اپنا جادو تجھ پر ڈال دیا ہے۔"

"اماں۔" کلیم کا منہ کھل گیا۔

"اس کے بارے میں کچھ جانتا بھی ہے۔" اماں نے جیسے بم پھوڑا۔ "وہ ہے کون
کس کی اولاد ہے۔"

"ہاں اماں۔" کلیم نے سر جھکا کر کہا۔

"جانتا ہے ــــ؟" اماں حیرت سے اسے دیکھنے لگی۔

"اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔" کلیم نے آہستگی سے کہا۔

"اچھا ــــ! کوئی فرق ہی نہیں پڑتا۔ حسب نسب کوئی چیز ہی نہیں تیرے

یہ۔ جس لڑکی کے آگے پیچھے کا کچھ پتہ ہی نہیں۔ جس کی رگوں میں آوارہ لہو ہے۔"

"اماں۔" کلیم بے چین ہو کر کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ "ثومی کا اس میں کیا قصور ہے۔"

"قصور نہیں۔ گناہ کی پوٹ۔ ہمارے لیے ہی رہ گئی ہے۔" اماں غصے سے پھنکاریں۔

"جیسی ماں ویسی بیٹی ــــ ہونھ ــــ"

"اماں۔" کلیم نے کچھ کہنا چاہا۔

"میں اس لڑکی کا نام سننا بھی گوارا نہیں کر سکتی۔" وہ بستر میں دراز ہوتے ہوئے غرائیں۔ وہ اونچی آواز میں تیز تیز باتیں کرتی رہیں۔ کلیم خاموش کھڑا رہا۔ لیکن اس کے کھڑے ہونے سے یوں لگتا تھا۔ جیسے وہ کلیم نہیں۔ قطب صاحب کی لاٹ ہے۔"

کئی دن اماں اور کلیم میں یہ مسئلہ زیر بحث رہا۔ کلیم اماں کے آہنی عزم سے اپنا سر پھوڑتا رہا۔ اماں کے پائے استقلال کو جنبش نہ آئی۔

ثومی ان کی نظروں میں اک بدکار لڑکی تھی۔ جو صدیق اور فرید سے ناجائز تعلقات رکھنے کے بعد اب ان کے بیٹے کو ورغلا رہی تھی۔ ایسی لڑکی کو قبول کرنا ممکنات میں سے نہیں تھا۔ اچھا خاصہ ہنگامہ کھڑا ہو گیا۔ اماں بیٹے سے بالکل روٹھ گئیں۔

کلیم کی پریشانیاں بڑھتی گئیں۔ الجھاؤ زیادہ ہوتے گئے۔ صدیق نے اس مرتبہ سے خوب فائدہ اٹھایا۔ یہ بات اماں کے ذہن نشین کرا دی۔ کہ ثومی ایک طرف فرید سے ناطہ جوڑ رہی ہے۔ اور دوسری طرف کلیم کو برباد کر رہی ہے۔

پورا ہفتہ کش مکش میں گزر گیا۔ کلیم پریشان ضرور تھا۔ مایوس نہیں تھا۔ اس پورے ہفتے میں ثومی اس کے قریب نہ آئی تھی۔ تین چار دفعہ اس نے اسے فرید کے لان میں دیکھا تھا۔ اس کی اپنی الجھنیں اتنی تھیں۔ کہ ثومی کی قربت کی خواہش ابھرتی بھی تو دبا دیتا۔ روز روز کی بک بک سے وہ تنگ آ گیا۔ اس کے آخری فیصلے پر اماں کو مہر ثبت کرنے گئے۔ یہ سوچ کر وہ اس سلسلے میں فیصلہ کن انداز میں ماں سے مخاطب ہوا۔

"تیری آنکھوں پر اندھے جذبات کی پٹی بندھی ہے۔" اماں نے گرم ہوتے ہوئے جواب دیا۔ "تو اس ناگن کے حسن پر ریجھ گیا ہے۔ تجھے حقیقت کا کچھ علم نہیں۔"

"بس حقیقت کا علم نہیں؟" کلیم جلدی سے بولا۔

"اب میں کیا بتاؤں تجھے۔" اماں نے الجھن پیچیدہ کرتے ہوئے کہا۔ "جا کے صدیق سے پوچھ یا فرید سے استفسار کر ــــ"

کلیم حیران ہو کر پھٹی پھٹی نظروں سے اماں کو دیکھنے لگا۔ اماں موقع شناس تھیں۔ اور ثومی کے بارے میں جو کچھ صدیق سے سنا تھا۔ گول مول الفاظ میں کہہ ڈالا۔

"اماں ــ" کلیم نے سر ہاتھوں پر گرا لیا۔ "یہ زہر کس نے آپ کے ذہن میں گھول ــــ"

"ہاں ہاں! تو تو ایسا ہی کہے گا۔ تجھے گرد و پیش کی ہوش ہی کب ہے حقیقت دنیا میں آؤ۔ تو سب کچھ پتہ چلے گا۔"

کلیم کا سر چکرانے لگا۔ اماں نے بھی تاک تاک کر جو تیر مارا۔ تو خطا نہ ہوا۔

"آنکھیں کھولو۔ خطا کھاؤ گے۔" اماں نے مزید کہا۔ "خوبصورت بے آسرا فرید جیسے دولت مند کے لیے کھلونا بنی ہوئی ہے۔ میں بھی حیران ہوں۔ فرید اس لڑکی پر التفات دیکھ کر ــــ ہونھ ــــ"

پول کھل گیا۔

کلیم اماں کے کمرے سے اپنے کمرے میں اٹھ آیا۔ اماں نے جو کچھ کہا تھا۔ وہ اس کے لیے ناقابل قبول تھا۔ جانتا تھا۔ کسی نے لگائی بجھائی کر کے اماں کو بھر کایا ہے۔ لیکن اب وہ کیا کرے۔ معاملہ پہلے ہی قابو سے باہر تھا۔ اب یہ نیا شوشہ اس نے چھوڑ دیا تھا۔

اماں کی ہر کہی ہوئی بات کو ذہن سے اس نے جھٹک ڈالا۔ لیکن اندر ہی

اندر اسے یوں لگ رہا تھا۔ جیسے کوئی شے ٹوٹ پھوٹ رہی ہے۔ وسوسے ایسے ہی موقعہ پر ڈس لیتے ہیں نا۔ وہ فرید اور ثومی کے بارے میں نہ سوچنا چاہتا تھا لیکن کئی واقعے ذہن میں خود بخود اجاگر ہو رہے تھے۔ اور اسی شام باوجودیکہ وہ ثومی کے خیال سے کوئی علاقت وابستہ نہ کر سکا تھا۔

صدیق کو دیکھتے ہی اندیشے، وسوسے اور اندھا تجسس ابھر آیا۔

"ادھر آؤ۔" اس نے صدیق کو اشارہ کیا۔

صدیق مسکین صورت بنائے اس کے پیچھے پیچھے چلا آیا۔

کمرے میں پہنچتے ہی کلیم نے سوال کیا۔ "تم ثومی کو کب سے جانتے ہو۔"

وہ شاطر آدمی تھا۔ معاملہ بھانپ گیا۔ عاجزی سے بولا۔ "ہم ان کو ارڈوں میں اکٹھے ہی پلے بڑھے ہیں۔"

"ثومی — فرید صاحب۔" وہ اپنے الفاظ کو ترتیب نہ دے سکا۔

"جی وہ — جناب — کیسے علم نہیں — صاحب —" صدیق نے جان بوجھ کر رکتے رکتے کہا۔

"ثومی سب کو اچھی لگتی ہے — بڑے سرکار کو — بھی —"

"تم یہ سب کیسے کہہ سکتے ہو۔" کلیم تڑپ کر گرجا۔ وہ اس کا مطلب سمجھ گیا تھا

"آنکھوں دیکھی بات ہے جی۔" اس نے معصوم بنتے ہوئے کہا۔

"کسی دن آپ بھی دیکھ لیں گے۔" ○

"بکواس بند کرو۔" چلے جاؤ یہاں سے"۔ کلیم کی آنکھوں سے شعلے سے نکلنے لگے۔ صدیق بھس میں چنگاری ڈال کمرے سے نکل گیا۔

کلیم اس کے جاتے ہی بے دم ہو کر بستر پر گر گیا۔ اس کی سوچیں الجھے لچھوں کی طرح تھیں۔ کوئی بھی سرا ہاتھ نہ آ رہا تھا۔ جس سے وہ اپنی سوچ کی ابتدا کر سکتا

ثومی کے متعلق سب کچھ سن کر بھی یقین کرنے کا سوال نہ تھا۔ لیکن اماں اور صدیق کی باتیں کانوں میں پگھلی ہوئی آگ کی طرح ٹپک رہی تھیں۔

وہ اٹھ کر دیوانہ وار ٹہلنے لگا۔ ثومی ایسی نہیں ہو سکتی تھی۔ وہ تو رائے پتھورا کی لاٹ تھی۔ مستحکم۔ مضبوط۔ صدیوں کے حوادث کا مقابلہ کرنے والی۔

گھنٹوں کی بے قراری، انتشار اور اضطراب کے بعد اس نے اماں اور صدیق کی باتوں کو تسلیم کرنے سے بالکل انکار کر دیا۔

ثومی نور تھی۔

ثومی روشنی تھی۔

روشنی!

جو تاریک نہیں ہوتی۔

——— ؟ ———

ہیں۔ عشق اور مشک چھپائے نہیں چھپتے۔

کہتے لوگ کہتے ہیں۔ تو ٹھیک ہی کہتے ہوں گے۔ صدیوں کے تجربوں کا نچوڑ غلط نہیں ہو سکتا۔

بات ثومی کے عشق کی بھی پھیلی۔ اور۔ خوب پھیلی۔

لیکن یہ ثومی کی بدقسمتی تھی۔ کہ حالات نے مشک کو ایسی بدبو بنا دیا تھا۔ کہ جس کے نتھنوں تک یہ بو پہنچی۔ اس نے کراہت کا اظہار ہی کیا۔

جیراں اور فتو نے تو اس بات کو اس طرح اُچھالا۔ کہ ثومی کی پاکدامنی داغ داغ ہو گئی۔ کوارٹروں کے بوسیدہ ماحول میں زندگی گزارنے والے نوکروں نے ثومی کو بدنام کرنا اپنا حق جانا۔ داغ داغ کردار اور ڈھکے چھپے جذبات کی واردات سے دوچار ہونے والے بھی پارسا بن بیٹھے۔

ثومی پر عرصۂ حیات تنگ ہو گیا۔ ماں کے طعنے سنتے سنتے اس کے کان پک گئے۔ وہ اس قدر تنگ آ گئی۔ کہ تنگی بغاوت کی اساس بننے لگی۔

اس خستہ حالی میں اسے سہارا تھا۔ تو صرف کلیم کا۔ اس کی بے پایاں محبت کا۔ مجنونانہ چاہت اور والہانہ عشق کا۔ وہ ہر چوٹ سہہ کر بھی دل برداشتہ نہیں ہو رہی تھی۔ کلیم سے ملے اسے کافی دن ہو گئے تھے۔ اس رات تنگ آ کر وہ کلیم کے پاس جا رہی تھی۔ کہ صدیق نے سایے کی طرح اس کا تعاقب کیا۔ اس کے گھر کی جانب مڑنے سے پہلے ہی اس کے راستے میں آن کھڑا ہوا۔ ثومی واپس لوٹ آئی

ثومی کی داستانِ عشق خوب ہی اچھالی گئی۔ بات کوارٹروں سے نکل کر کوٹھی میں آئی اور کوٹھی سے گرد و نواح میں پھیلتے دیر نہ لگی۔

سلمیٰ نے بیگم اقبال سے جب اس مباشقے کا ذکر سنا۔ تو شاداں نظر آئی۔ اپنے چکنا چور خوابوں کا بدلہ وہ ثومی کی رسوائی سے ہی لے سکتی تھی۔

یہ معاملہ اس نے فرید تک بھی پہنچانا ضروری سمجھا۔ اس دن وہ لائبریری میں بیٹھا ضروری کاغذات کی ورق گردانی کر رہا تھا۔ برابر کی کرسی پر وہ بھی بیٹھی تھی۔ اس کے فارغ ہونے سے پہلے ہی رازداری سے بولی۔ "کچھ سنا آپ نے بھی؟ ——"

"کیا؟ ——" فرید سہم گیا۔

ثومی اور کلیم کے بارے میں۔" وہ طنز سے مسکرائی۔

"کیوں؟ کیا ہوا ——؟" فرید سر تا پا کانپ گیا۔ پین اس کی لرزتی انگلیوں سے میز پر گر گیا۔

"معاشقہ لڑا رہی ہے ڈاکٹر سے۔" سلمیٰ نے آنکھیں نچائیں۔

فرید کا دماغ ریل کے پہیے کی طرح گھوم گیا۔ ہاتھ پاؤں میں سنسناہٹ ہونے لگی۔

سلمیٰ شاکی انداز میں بولی۔ "آپ کو اس کا بڑا فکر رہتا تھا نا۔ اس نے خود ہی ڈھونڈھ لیا ٹھکانہ۔ کم بخت نے ہاتھ بھی کہاں مارا۔ سچ پوچھیے تو۔ میرا تو دل کلیم سے بھی بیزار ہو گیا ہے۔ اتنا گھٹیا کردار —— تف —— شکر ہے میں نے اپنی بچی کا نام نہیں لے لیا تھا۔"

فرید فائل پر نظریں جمائے بیٹھا رہا۔ "ہوٹلوں میں گھومتی پھرتی ہے ڈاکٹر کے ساتھ ——" سلمیٰ نے طنز اور تمسخر سے کہا۔ "ماں بیٹے میں دن رات تکرار ہو رہی ہے۔"

"بیگم صاحبہ! آپ کا فون ہے ——" نوکر لائبریری میں آ کر بولا۔

"اچھا ——" سلمیٰ اٹھی۔

فرید نے اس کے اٹھ جانے کو غنیمت جانا۔ اس کے جاتے ہی کہنیاں میز پر ٹکا کر اپنا سر تھام لیا۔ کیا تاریخ اپنے آپ کو دہرا کر رہے گی۔" وہ پاگلوں کی طرح سوچ رہا تھا۔

سلمیٰ کچھ ہی دیر بعد گھبرائی ہوئی آئی۔ فرید کی حالت اس انسان کی سی تھی جس کو شکنجے میں جکڑ کر منہ میں کپڑا ٹھونس دیا گیا ہو۔ ہلنے کی طاقت رہی ہو نہ بولنے کی صرف شدتِ کرب سے آنکھیں پھٹی پڑتی ہوں۔

"سنبل کا ٹیلیفون ہے۔ ابا جان۔ ہسپتال میں ہیں۔ سخت بیمار ہیں۔" سلمیٰ ہاشم صاحب کی بیماری کا ذکر کرتے ہوئے پریشان نظر آئی۔"

"اوہو۔" فرید نے صرف اتنا کہا۔

"کئی دنوں سے مجھے برے برے خواب آ رہے تھے۔" وہ روہانسی ہو گئی۔ فرید نے اسے تسلی و تشفی دی۔ ضعیفی اور بیماری۔ سلمیٰ مایوس نظر آنے لگی۔

سلمیٰ سب کچھ بھول کر باپ کے ہاں جانے کی تیاری میں لگ گئی۔ فریدہ بھی اس ماحول سے کچھ دنوں کے لیے چھٹکارا پانے کا سوچ رہی تھی۔ ماں کے ساتھ وہ بھی تیار ہو گئی۔ یوں بھی دسمبر کی چھٹیاں قریب تھیں۔

شام ہونے سے پہلے ماں بیٹی ڈرائیور کے ہمراہ چلی گئیں۔

فرید نے بھی ایک دو دن کے اندر وہاں پہنچنے کا کہا۔ لیکن ان کے جانے کے بعد جیسے اس کے سر سے بہت بڑا بوجھ اتر گیا۔ اب وہ صورتِ حال سے جس حال میں بھی تھا۔ نپٹ سکتا تھا۔

شام اس نے جیراں اور فتو کو بلایا۔ سلمیٰ کے بیان اور اپنے وہموں کی پوری تصدیق ہو گئی۔ وہ کانپ کانپ گیا۔ تڑپ تڑپ اٹھا۔ گناہوں کی ایسی کڑی سزا انیس سالوں کی مسلسل تڑپ بھی اس کے گناہوں کا کفارہ نہ بن سکی۔

جیراں نے بات کا بتنگڑ تو بنایا ہی تھا۔ صدیق نے جو کچھ کہا۔ اسے کچھ زیادہ ہی بڑھا چڑھا کر فرید کو سنایا۔

جیراں ایسا نہ بھی کہتی تو فرید بھلا ثومی اور کلیم کی محبت کے قصے پر ایمان کیسے لا سکتا ہے۔ ایک ڈاکٹر اور مالی کی غریب لڑکی میں دوستی جس اساس پہ ہو سکتی تھی۔ اس کا فرید کو عملی تجربہ تھا۔ اسی لیے تو وہ کانپ کانپ اٹھا تھا۔

اس پر قیامتیں ٹوٹ پڑی تھیں۔

اس دن کلیم کے ہاں ثومی کو دیکھ کر اس کا ماتھا ٹھنکا تھا۔ خطرے کا سگنل دکھائی دیا تھا۔ اب تو بات کھل کر سامنے آ گئی تھی۔

اس نے کلیم کے جذبات کو بھی اہمیت دینے کی ضرورت نہ سمجھی۔ اب وہ خاموش تماشائی نہیں بن سکتا تھا۔ کلیم کو ثومی کا ہاتھ تھام لینا چاہیئے تھا۔ یہ کھیل وہ کسی صورت برداشت نہ کر سکتا تھا۔ وہ تاریخ کو دہرانے نہیں دینا چاہتا تھا۔ وہ حالات کے پاؤں کی زنجیر بن جانا چاہتا تھا۔

وہ کلیم کے پاس آخری فیصلے کے لیے گیا۔ اگر اس کے جذبات میں تقدس تھا تو اسے فوراً ثومی سے نکاح کر لینا چاہیئے۔ اگر نہیں۔ تو اسے ثومی کو برباد کرنے کا حق بھی نہیں دیا جا سکتا۔

کلیم گھر پہ نہیں تھا۔

مضطرب و پریشان وہ واپس لوٹ آیا۔ فتو کو کہہ آیا۔ کہ جونہی ڈاکٹر اس کے پاس بھیج دے۔

ایک ایک لمحہ اس کے لیے جاگتا عذاب تھا۔ وہ بہت جلد کلیم سے مل کر اس آخری فیصلے کو شکل دینا چاہتا تھا۔ وہ ثومی کو کسی صورت بلو نہ بننے دے گا۔ اس کے لیے اگر اسے اپنے کردار کو ننگا بھی کرنا پڑا۔ تو وہ کر گزرے گا۔

ایک طرف تو اس نے کلیم پر شادی کے لیے دباؤ ڈالنے کا سوچا۔ دوسری طرف ثومی کو کلیم سے ملنے سے روکنے کا خیال آیا۔

نظام اس کے کمرے میں آیا۔ تو اس نے ثومی کو بلا لانے کا کہا۔ وہ سختی سے اس پہ پابندی عائد کرنا چاہتا تھا۔

نظام کے جانے کے بعد وہ عالمِ اضطراب میں کمرے میں گھومنے لگا۔ کیا ثومی بلو بن جائے گی۔ ؟ گناہوں کی سزا ایسی کڑی بھی ہو سکتی ہے ؟

انتقام ایسا خوفناک بھی ہو سکتا ہے ؟

وہ کمرے کے دیوانہ وار چکر لگاتے ہوئے سوچ رہا تھا۔

ثومی ان دنوں اپنے کمرے ہی میں مقید ہو گئی تھی۔ ہر وقت کی طعن و تشنیع سے کان پک گئے تھے۔ صدیق نے توہم تیز کر کے اس کو مسلسل عذاب میں مبتلا کر دیا تھا۔ اٹھتے بیٹھتے طنز و تمسخر کی باتیں کرتا۔ اپنی شاطرانہ چالیں کامیاب ہوتی نظر آ رہی تھیں۔ کلیم اور اماں کا ہنگامہ جو جو رخ موڑ رہا تھا۔ وہ ضرورت سے زیادہ بڑھا چڑھا کر ثومی تک پہنچا دیتا۔

اور اب تو اس نے پیشین گوئی کر دی تھی۔ کہ کلیم ماں کے سامنے ہتھیار ڈال دیگا وہ ماں کی ناراضگی مول لے کر اسے اپنانے کی حماقت نہیں کر سکتا۔

ثومی بیچاری پہلے ہی کیا کم سہمی تھی۔ ان خبروں سے دل برداشتہ ہوتی جا رہی تھی۔

گھر والوں کا رویہ ناقابلِ برداشت تھا۔ جیراں اس سے بات کرتی تھی۔ نہ نتو۔ بچوں کو بھی انہوں نے منع کر دیا تھا۔ گھر میں اچھوت بن کر رہ گئی تھی۔ سکول میں بھی چھٹیاں تھیں۔ ثومی اپنے نصیبے کو کوستی کمرے کی چہار دیواری میں مقید ہو گئی تھی۔ کوئی بھی تو اس کا ہم نوا نہ تھا۔ کوارٹروں کے مکینوں نے تو کلیجہ چھلنی کر دیا تھا۔ کوئی سیدھے منہ بات نہ کرتا تھا۔

ایسے مصائب میں گھر کر بھی ثومی کو کلیم کی محبت نامہ چاہت کا سہارا تھا۔ وہ اس کی خاطر زمانے سے ٹکرا جائے گا۔

اماں کو آج نہیں تو کل منانے گا۔ خوشیاں ہی ہوں گی۔ راتوں روٹھی نہ رہیں گی۔

کبھی تو امیدوں کے چراغ روشن ہوں گے۔ ثومی سب کچھ اسی آس پہ سہے جا رہی تھی۔

لیکن

جب دن گزرتے ہی چلے گئے۔ کلیم نے اس سے ایک بار بھی ملنے کی کوشش نہ کی۔ تو صدیق کی باتوں سے ثومی کا دل کانپنے لگا۔

—— ۰ ——

"میں نے کہا تھا نا چاچی۔ کھیل ایک نہ ایک دن تو ختم ہوتا ہی ہے۔ آج سمجھو کر کھیل ختم ہو گیا۔" صدیق نے چولھے کے پاس بیٹھی جیراں کے پاس چارپائی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

ثومی ڈیڑھ دن کے فاقے کے بعد دو چار لقمے زہر مار کر رہی تھی۔ صدیق کی بات پر چونک گئی۔

وہ قہقہہ لگاتے ہوئے بولا۔ "ڈاکٹر صاحب کی اماں نے دھمکی دی تھی۔ کہ انہوں نے ان کی بات نہ مانی۔ تو وہ گھر چھوڑ کر چلی جائیں گی۔ سو ڈاکٹر صاحب بس ہو گئے ماں کے فرماں بردار بیٹے نکلے۔" صدیق نے طنزیہ نظروں میں ثومی کو دیکھا۔ ثومی کا ہاتھ وہیں رک گیا۔ کھانا کھائے بغیر ہی وہ اٹھ کر وہاں سے چلی گئی۔

جیراں کی بڑبڑاہٹ اور صدیق کی طنز بھری ہنسی اسے سنائی دیتی رہی۔ اس کے سوختہ دل و جگر پھر جل اٹھے۔ اس کا دم گھٹنے لگا۔ سر چکرانے لگا۔ وہ دونوں بازوؤں میں سر چھپا کر سسکیاں بھر بھر کر رونے لگی۔ کس عذاب میں پھنس گئی وہ۔ پہلے ہی زندگی کیا کم تلخ تھی۔ اس محبت نے تو اسے ذلیل و رسوا کر دیا تھا۔ لوگوں کی آگ برساتی نگاہوں سے وہ چھپتی پھرتی تھی اسے کلیم پر بھی غصہ آ رہا تھا۔ وہ عورت تو نہیں تھا۔ اپنے حق کے لیے لڑ سکتا تھا۔ اس سے ملنے کا موقعہ بھی نکال سکتا تھا۔ سکول ہی آ سکتا تھا۔ لیکن وہ تو جیسے یہاں تھا ہی نہیں۔

رو دھو کر دل کی بھڑاس نکال کر ثومی نے حالات کا جائزہ لیا۔ کلیم سے مل کر ساری

بات سے آگہی ہو سکتی تھی۔ صدیق کی بات پر ایمان لانے کی ضرورت نہ تھی۔ وہ تو جل جل کر جھوٹ بولتا تھا۔ اپنی بدنصیبی یقینی ہی تھی۔ تو وہ صدیق سے نہیں۔ کلیم سے آخری فیصلہ سننا چاہتی تھی۔

مایوسی نے عمل کی جرأت دلائی۔ اس نے کلیم کے پاس جا کر صورت حال کا جائزہ لینا چاہا۔

اک عزم کے ساتھ وہ اپنے کمرے سے نکلی۔ کوارٹروں کی بتیاں جل رہی تھیں بچے بالے کھیل رہے تھے۔ کوٹھی میں ان دنوں کچھ کام تھا ہی نہیں۔ نوکر چاکر فراغت پا کر کسی ایک کوارٹر میں حقے کے گرد جمع تھے۔ ثومی اور ڈاکٹر کا عشق زیر بحث تھا۔ ثومی کان بہرے کیے اس کچے صحن اور سبزے کی باڑ والے کوارٹر کے قریب سے گزری۔ رات اتر رہی تھی۔ فضا خنک تھی۔ کوٹھی کی بیرونی بتیاں روشن تھیں۔ وہ تیز تیز قدم اٹھاتے کلیم کی کوٹھی کو جانے والے راستے پر مڑی۔ کلیم کے کلینک میں بتی جل رہی تھی۔ اور اس کی موٹر بھی برآمدے کے باہر کھڑی تھی۔

"اے ثومی" نظام نے اسے ادھر جاتے دیکھا۔

وہ ٹھٹک گئی۔

"بات سنو۔" نظام اس کے قریب آیا۔

ثومی نے متورم آنکھوں سے اسے دیکھا۔

"تمہیں بڑے سرکار بلا رہے ہیں۔" وہ کندھے پر جھاڑن ڈالتے ہوئے بولا۔

"کیوں؟" وہ چونکی۔

"اب میں کیا جانوں۔ ابھی بلایا ہے۔ جا کر خود ہی پتہ کر لو۔" نظام اکھڑ طریقے سے پیش آیا۔

"کہاں ہوں گے" ثومی بیچارگی سے بولی۔

"گول کمرے میں ہیں۔ بھاگ کے جا۔" نظام کہتے ہوئے کوارٹروں کی طرف چلا گیا۔

ثومی چند لمحے تذبذب کے عالم میں کھڑی رہی۔ کلیم کے پاس پہلے جائے یا زید کے پاس۔ اس نے کھڑے کھڑے سوچا۔ پھر وہ مڑی۔ اور فرید کی بات سننے اس کے گول کمرے کی طرف گئی۔

اندر داخل ہونے سے پہلے اس نے دوپٹہ اچھی طرح اوڑھا۔ دوپٹے کے کونے سے آنکھیں صاف کیں اور دھیرے دھیرے اندر داخل ہو گئی۔

وسیع و عریض کمرے کی بتیاں روشن تھیں۔ قیمتی چمکتی چیزیں جگمگا رہی تھیں۔ کمرے کے عین وسط میں کشمیری کام کی سبک سی میز کے قریب فرید کھڑا خوبصورت گلدان میں لگے پھولوں کی پتیاں نوچ رہا تھا۔

دبیز قالین پر سبک خرام ثومی کے قدموں کی چاپ کیا سنائی دیتی۔ ثومی فرید کے قریب اس کی پشت پر کئی لمحے کھڑی رہی۔ پھر اپنا احساس دلانے کو اس نے ہلکے سے کھنگارا۔

فرید نے ایک دم پلٹ کر اس کی طرف دیکھا۔

"جی — آپ نے مجھے بلایا —" اس نے سر جھکاتے ہوئے تعظیم سے کہا۔

فرید کوئی جواب دینے کی بجائے ایک ٹک اس کا پریشان چہرہ دیکھے گیا۔ بھیگی بھیگی متورم آنکھیں جھکی تھیں۔ اس کے نم نم گلابی گالوں پر سیاہ پلکوں کی جھالریں یوں لگ رہی تھیں۔ جیسے برسات کی دھندلی شام شفق کی بھیگی سرخیوں پہ جھک آئی ہو۔

فرید اسے دیکھتا رہا۔ اس کے معصوم چہرے پر مقدس سایے لہرا رہے تھے۔ گناہ کی کوئی آلودگی نہ تھی۔ اس نے اطمینان کا سانس لیا۔

"جی آپ نے بلایا۔" اس نے پھر اپنا جملہ دہرا دیا۔

"ثومی" وہ اس کے بالمقابل کھڑا ہو گیا۔

"جی" ثومی منتظر نظر آئی۔

"میں نے ہی تمہیں بلایا ہے۔"

"فرمائیے۔"

فرید نے پھر غور سے ثومی کو دیکھا۔ وہ پریشان ہونے لگی۔ فرید نے آہستہ آہستہ رخ اس کی جانب سے پھیر لیا۔ اور ملائمت سے بولا۔ "ڈاکٹر صاحب اچھے انسان ہیں۔"

ثومی کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ فرید سے اسے عقیدت تھی۔ اس نے ہمیشہ ہی اس کا ساتھ دیا تھا۔ اور اکثر ایسا جذباتی پن دکھایا تھا۔ کہ وہ اسے کیا سے کیا سمجھنے پر مجبور ہو گئی تھی۔ آج بھی اس کے لہجے میں وہ مخصوص جذباتی گرفت تھی جس کو اس نے زندگی میں پہلے بھی کئی بار محسوس کیا تھا۔

"ثومی — تمہیں زمانے کی اونچ نیچ سے آگاہی نہیں —" اس کا لہجہ ایک دم ناصحانہ ہو گیا۔ "کلیم اچھا آدمی ہے۔ لیکن تمہارے اور اس کے درمیان کچھ حد بندیاں کچھ — خیر ثومی میں تمہارے اور ڈاکٹر کے متعلق بہت کچھ سن چکا ہوں۔ میں دہرانا چاہتا ہوں — نہ تم سے اعتراف کروانا چاہتا ہوں —"

وہ اک لمحے کو رک گیا۔ ثومی دم سادھے کھڑی رہی۔

"ثومی — اگر ڈاکٹر سنجیدہ ہے۔ تو اسے تم سے فوراً شادی کر لینا چاہیئے۔" فرید نے آہنی سی آواز میں رک رک کر کہا۔ "بصورتِ دیگر — تم خود — سوچ سکتی ہو۔ بہرحال" وہ رکا — اور پھر سخت کڑی آواز میں بولا۔ "جب تک ڈاکٹر کوئی آخری فیصلہ نہیں کر پاتا۔ میں تمہارا اس سے ملنا قطعاً پسند نہیں کروں گا۔ میں نے صرف یہی کہنے کو تمہیں بلایا ہے۔ تم — میری — مرضی کے بغیر اس سے نہیں مل سکتیں۔ سمجھیں —"

ثومی حیران و ہراساں آنکھوں سے اسے دیکھنے لگی۔ وہ ایک دم اپنے پاؤں پر گھوم کر اس کی طرف مڑا۔ "تم بھی کہتی ہو گی۔ کہ میں — میں تم پر ایسی پابندی لگانے والا

کون ہوتا ہوں۔"

ثومی کی نظریں استفہامیہ تھیں۔

فرید نے ہونٹ کاٹ لیے۔ ہاتھوں کو عالم بیچارگی میں ملتا۔ وہ سر کو ادھر سے ادھر جھٹکے دیتے ہوئے کچھ کہنے کو ہوا۔ لیکن ہر بار آواز نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا۔

"تم — تم — ثومی — میں تمہاری بھلائی کے لیے کہہ رہا ہوں۔ تم زمانے کے نشیب و فراز سے آگاہ نہیں ہو۔" وہ اس کے کندھے پر محبت سے ہاتھ رکھتے ہوئے بے بسی سے بولا۔ اس کا سانس تیز تیز چل رہا تھا۔ اور ہاتھوں کی لرزش بھی صاف طور پر محسوس کی جا سکتی تھی۔ آنکھوں کا اضطراب واضح تھا۔

کیا وہ صرف ایک مخلص آقا تھا۔؟ جو اپنے ملازموں کی بھلائی کے لیے ہمہ وقت سوچ سکتا تھا۔؟

نہیں نہیں۔ ثومی نے اس کی آنکھوں کے اضطراب میں جو تڑپ محسوس کی وہ آقا یا مالک کی نہیں تھی۔ یہ ہمدردی یہ خلوص۔ یہ محبت ثومی کے لیے جانا پہچانا نہ سہی۔ پھر بھی نیا نہ تھا۔ اپنی مختصر سی عمر میں ایسے سہانے تجربے اس نے پہلے بھی کیے تھے۔ اس کے ذہن میں ہمیشہ اک سوال تشنہ رہا تھا۔ لیکن آج وہ اپنے اوپر قابو نہ رکھ سکی۔ ایک ٹک فرید کو دیکھتے ہوئے وہ اپنے ذہن میں ہلنے والے اس تشنہ سوال کو روکنے کا حوصلہ نہ کر سکی۔

"آپ کون — ہیں —؟" اس نے فرید کی چھاتی پر اپنے دونوں ہاتھ رکھ دیے۔ خواب ناک آواز میں یہ سوال اس کے لبوں سے پھسل گیا۔

یہ سوال نہیں اک برقی جھٹکا تھا۔ فرید بوکھلا گیا۔

"آپ بتا کیوں نہیں دیتے۔ کہ آپ — کون ہیں۔" نگاہوں میں اذیت و کرب کے آثار لیے ثومی نے اسے کندھے سے پکڑ کر ہلایا۔

"ثومی —" فرید بے بس ہو گیا۔ بے اختیار ہو کر اس نے ثومی کو سینے سے لگا لیا

"یہ نہ پوچھو۔ ثومی — یہ نہ پوچھو — یہ نہ پوچھو۔" اس کی سسکیاں بکھر گئیں۔ وہ دیوانہ وار اسے سینے سے لگائے یہ الفاظ دہرانے لگا۔

نفی میں اثبات کا پہلو تھا۔ ثومی کی ترسی ہوئی روح سیراب ہو گئی۔ اسے اپنی ہستی کے آغاز کا سرا مل گیا۔ فرید کی شفقت محبت اور التفات کی آج سمجھ آ گئی۔ بے سدھ بے خود ہو کر وہ اس شفیق سینے میں کھو جانے کو مچل گئی۔

برسوں کی جمی ہوئی برفانی تہہ محبت کی آنچ سے پگھل گئی۔ ثومی فرید کے سینے سے لگی سسکنے لگی۔ فرید کے بازوؤں کی پدرانہ گرفت اسے اپنے ہالے میں لیے رہی۔

"کیا وہ واقعی اس کا باپ ہے۔" ثومی نے گھبراہٹ، بے چینی اور اضطراب کے عالم میں سوچا۔ اس کے سینے کی شفیق گرمی وہ اپنے وجود میں جذب کرتی رہی۔

یہ لمحہ فردوسی تھا۔ ثومی اس میں کھو گئی۔ لیکن بدنصیب لڑکی کے لیے یہی لمحہ قاتل بھی بن گیا۔ جہنمی بھی ہو گیا۔

گول کمرے کے صدر دروازے سے اندر آتے آتے کلیم ٹھٹک کر کھڑا ہو گیا تھا وہ ابھی ابھی نتھو کے کہنے پر ادھر آیا تھا۔ فرید کے بازوؤں میں لپٹی ثومی اس کے ہوش و حواس زائل کر دینے کو کافی تھی۔ وہ ساکت و جامد دروازے کا پٹ پکڑے حیرت سے پھٹ جانے والی آنکھوں سے یہ روح فرسا منظر کئی لمحے دیکھتا رہا۔ اسکے حواس بجا نہ رہے۔ بصارت ضعف کھاتی محسوس ہوتی۔ آگ کی لپک پاؤں سے سر تک جاتی محسوس ہوئی۔ وہ لڑکھڑایا، لہرایا۔ اور اندھوں کی طرح فضا میں ہاتھ مار مار کر راستہ تلاش کرتے برآمدے میں آ گیا۔

دوسرے ستون تک ہی پہنچا۔ کہ ہمت جواب دے گئی۔ بمشکل ستون کا سہارا لے کر کھڑا ہو گیا۔ اس کا وجود بھربھری مٹی بنا جا رہا تھا۔ آگ ہی آگ کا احساس ہو رہا

تھا۔ صدیق کے الفاظ کانوں میں اتر رہے تھے۔ "آنکھوں دیکھی بات ہے جی۔ کسی دن آپ بھی دیکھ لیں گے۔" اس نے اپنا سر دونوں ہاتھوں سے تھام لیا۔ تیورا تیورا گیا۔ سارا جسم پسینے میں نہا گیا۔

ادھر فردوسی لمحہ بیت گیا۔ معاً فرید کو اپنی کمزوری کا احساس ہوا۔ وہ ہڑبڑا گیا۔ ثومی کو اپنے آپ سے الگ کرتے ہوئے صوفے پر گر گیا۔ اپنے آپ کو سنبھالا بالکل اجنبی آواز میں بولا:

"تم جاؤ۔ مجھے تم سے ہمیشہ سے ہمدردی رہی ہے۔ میں تمہارے متعلق خلوص سے سوچتا ہوں۔ اور ــــ اور ــــ کوئی بات نہیں۔ تمہاری بہتری ہی کے لیے ڈاکٹر سے ملنے سے منع کر رہا ہوں۔ سمجھیں۔ جاؤ۔ اب جاؤ۔"

ثومی جو لمحے کی فردوسی رعنائی سے ابھی تک چمٹی تھی۔ اس کے لہجے کی غیریت اور آواز کی اجنبیت سے چونک کر اسے دیکھنے لگی۔ ابھی ابھی اس نے جو حسین خواب دیکھا تھا۔ وہ چکنا چور ہو گیا تھا۔ فرید اک محسن تھا۔ ہمدرد تھا۔ خدا ترس تھا اور بس۔ اس نے مرتے مرتے فرید کے الفاظ سنے۔

"مجھے تمہارا فریدہ ہی کی طرح خیال رہتا ہے۔ جوان بیٹی کے باپ کی نظر سے سوچتا ہوں۔ تم آئندہ ڈاکٹر سے میری مرضی کے بغیر نہ ملنا۔ میں خود اس سے بات کر کے شادی کے لیے آمادہ کر دوں گا۔"

وہ پژمردہ دل گرفتہ سی ہو کر کمرے سے باہر نکلی۔ ذہن میں انتشار ہی انتشار تھا۔ اسے یوں لگ رہا تھا۔ سیر ہو کر پانی پینے کے باوجود وہ پیاسی رہ گئی ہے۔ حلق میں تلخی محسوس ہونے لگی۔ اچانک اس کی نظر ستون سے لگے کلیم پر پڑی۔ اس نے صرف کلیم کو دیکھا۔

اس کی آنکھوں میں پھیلی ڈراؤنے خواب کی سی کیفیت کو نہیں دیکھا۔ وحشت اور

زندگی کو نہیں دیکھا۔

"کلیم ــــ" وہ اس کی جانب کھنچتی چلی گئی ــــ بے اختیار ہو کر، بے بس ہو کر۔ فرید کی باتیں اس کے ذہن سے نکل گئیں۔ وہ کیوں کلیم سے نہ ملے؟ سامنے منزل ہو تو کون ہے بے اختیار ہو کر چھو نہیں لیتا۔

کلیم نے سختی سے آنکھیں میچ لیں۔

"کلیم" ثومی نے اپنا نرم و گداز ہاتھ اپنائیت اور محبت سے اس کے کندھے پر رکھ دیا۔ کتنا ترس گئی تھی وہ اسے دیکھنے کو ــــ اس کا اپنا کلیم ــــ کئی دنوں کے بعد آج اچانک اس کے اتنے قریب آ گیا تھا۔

"کلیم ــــ" اس نے بیتاب ہو کر پھر پکارا۔

کلیم نے آنکھیں کھول دیں۔ سر تا پا اسے گھورا۔ ایک بار نہیں دو بار۔ تین بار۔ پھر کئی بار۔ ثومی کچھ بھی تو نہ سمجھ سکی۔

"میں کتنی بے چین تھی آپ سے ملنے ــــ" اس کا جملہ پورا نہ ہو سکا۔ اک زناٹے دار تھپڑ نے اس کا چہرہ گھما دیا۔ اس کی آنکھوں میں نورِ ظلمت گڈمڈ ہو گئے۔ گال جل اٹھا اس کا ہاتھ گال پر آ گیا۔ پوری طرح کلیم کی طرف دیکھ بھی نہ پائی تھی۔ کہ وہ چنگھاڑا۔

"ذلیل ماں کی آوارہ بیٹی۔ تیرا آوارہ لہو۔"

"اُف" ثومی اس سے زیادہ کچھ نہ سن سکی۔ اس نے ہاتھ دونوں کانوں پر رکھ لیے آنکھیں بند کر لیں۔ اس کے ہونٹ دانتوں سے کٹ گئے۔ وہ پاگلوں کی طرح وہاں سے دوڑ گئی۔ کلیم کا بہیمانہ غصہ ٹھنڈا نہ ہوا۔ آنکھوں میں اب تک گرم گرم ریت چبھ رہی تھی۔ اس کا بس چلتا۔ تو ثومی کے ٹکڑے کر کے ہوا میں اچھال دیتا۔

ثومی۔ روشنی کا مینار۔ اور روشنی تاریک تھی۔

رائے پتھورا کی لاٹ گر چکی تھی۔

کے اعتماد کو اتنی زبردست ٹھیس پہنچی تھی۔ کہ وہ دیوانہ سا ہو گیا۔ خدا کی

کلیم خدائی میں ایسا تہر بھی ہو سکتا تھا۔ اتنا اندھیر بھی ممکن تھا۔ ثومی اور ہرجائی ـــــ اس کی محبت کا خدا اور دو غلا ـــــ اُف کلیم کی کنپٹیاں پھٹ رہی تھیں دماغ ریزہ ریزہ ہو رہا تھا۔ اماں نے ٹھیک کہا تھا۔ صدیق سچا تھا۔ وہ محبت کی لاش پر نوحہ کناں تھا۔

ثومی کے حواس بھی جواب دے گئے۔ کلیم کو ایکا ایکی کیا ہو گیا۔ اس نے بھی سب کی طرح اس کے گھناؤنے پس منظر کو دیکھا۔ اس نے کتنی بڑی گالی دے ڈالی۔ ذلالت اپنی حدوں سے بھی پھلانگ گئی۔

ثومی کا آخری سہارا ٹوٹا۔ اور جس طرح ٹوٹا۔ اس نے ثومی کی دنیا تہس نہس کر دی۔ جیراں، فتو اور کوارٹر والوں نے جگہ پہلے ہی کباب کر ڈالا تھا۔ فرید نے سنہری جھلک دکھا کر تاریکی پھیلا دی تھی۔ اک کلیم کا سہارا تھا وہ بھی نہ رہا۔ تو اس آگ کے سمندر میں رہنا کس لیے۔ ایک بار تو اس کا جی چاہا۔ کہ وہ بھی اپنی ماں کی طرح آوارہ ہو جائے۔ جی بھر کر اخلاق و کردار کی دھجیاں بکھیرے۔ گناہ کرے اور برملا کرے۔ زمانہ شرافت سے جینے جو نہیں دیتا تھا۔ یہ اس کے شدید احساس جذبوں کا ردعمل تھا۔

لیکن ثومی ایسا نہ کر سکتی تھی۔

روتے دھوتے اس نے رات کے رینگتے لمحوں میں اس جہنم کدہ کو چھوڑ دینے

کا فیصلہ کیا۔ ایک پرچی پر صرف اتنا لکھا:

"مجھے تلاش کرنے کی کوشش نہ کی جائے۔ ثومی ـ"

یہ پرچی اس نے اپنے تکیہ کے اوپر رکھ دی۔ اور آخر شب اس کوارٹر سے اس کوٹھی سے یوں نکل گئی۔ جیسے موت کے وقت روح جسم سے نکل جاتی ہے۔

اور صبح جب یہ پرچی بارہ سالہ رابعہ کے ہاتھ آئی۔ تو اس نے ماں کو بتایا ثومی کے فرار کی خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی۔

پل بھر میں سارے کوارٹروں کے نوکر چاکر جیراں کے گرد جمع ہو گئے۔ فتو سے باز پرس کرنے لگے۔ صدیق بھی بدحواس ہو کر آیا۔ ظالم صیاد کے جال پھیلانے کے باوجود صید ہاتھ سے نکل گیا تھا۔

خبر کوارٹروں سے کوٹھی تک پہنچی۔

فرید کے تو ہوش ہی اڑ گئے۔ لیکن کلیم نے اس خبر کو یوں سنا۔ جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ ثومی کی موجودگی جہاں جہاں متوقع تھی اسے تلاش کیا گیا۔ نظام اور مالی جگہ جگہ مارے پھرے۔ لیکن وہ کوئی سانپ کی خاصیت تو نہ رکھتی تھی۔ جو راستے کا نشان چھوڑ جاتی۔ وہ تو اک نازک سا خیال تھی۔ اک لطیف سا نور تھی۔ اسے حقیقت کی اس دنیا میں پانا ممکن نہ تھا۔

اڑوس پڑوس والے بھی اس کی تلاش میں گئے۔ فرید نے بھی سارا دن سڑکوں کی طوالتیں ماپیں۔ لیکن اسے ملنا تھا نہ ملی۔

شام تک چرچے اور چہ میگوئیاں دم توڑ چکے تھے۔ ہر کوئی دم بخود تھا جو کچھ ہوا سب کی توقع کے خلاف تھا۔ جیراں کے صحن میں سب سر جھکائے منہ لٹکائے بیٹھے تھے۔ یوں جیسے ماتم ہو گیا ہو۔

دن ڈوبتا چلا گیا۔ ساتھ ہی فرید کا دل بھی۔ جوان لڑکی زمانے کی دستبرد سے

کیوں کہ محفوظ رہ سکے گی؟ آج تو انہیں برسوں سے دب دب جانے والا ضمیر چیخ اٹھا تھا۔ گناہ کی آواز تند ہو گئی تھی۔ وہ شروع ہی سے اعترافِ گناہ کر لیتا۔ تو آج نوبت یہاں تک نہ پہنچتی۔

اس لمحے ملحے کی موت سے تو اچھا تھا۔ وہ خودکشی کر چکا ہوتا۔ قضا و قدر نے بھی تو اسے تاک تاک کر نشانہ بنایا تھا۔ ورنہ دنیا میں جرم بھی ہوتے ہیں۔ اور مجرم یوں ذہنی اذیت بھی عمر بھر نہیں پاتے۔

اس کا گناہ تو عذاب بن کر اس پر ٹوٹتا رہا تھا۔ حقیقی خوشی اس نے کبھی محسوس ہی نہ کی تھی۔ اپنے دوسرے بچوں سے بھی بیزار ہو گیا تھا۔ ان کی محبت بھی اپنی اس ذہنی پریشانی کی نذر کر دی تھی۔ وہ ثومی کے ساتھ ان کا بھی مجرم تھا۔

لیکن جو کچھ تھا۔ ثومی نظروں کے سامنے تو تھی اسے توقع تھی۔ کہ اس کی شادی کہیں نہ کہیں ہو جائے گی۔ گناہ یوں سمٹ جائے گا۔

لیکن ــــ اب ــ ثومی کے فرار نے اسے نئے مصائب سے دوچار کر دیا تھا۔ اس کی ہمت ٹوٹ گئی تھی۔ اس کی برداشت جواب دے گئی تھی۔

شام گہری ہو گئی تھی۔ نظام کسی کام سے اس کی خواب گاہ میں آیا۔ تو فرید کی حالت دگرگوں تھی۔ رنگ زرد تھا۔ آنکھیں سرخ تھیں۔ دل دونوں ہاتھوں سے تھام کر وہ پلنگ پر پاؤں لٹکائے جھکا ہوا بیٹھا تھا۔

ڈاکٹر صاحب کو بلاؤں سرکار ــ" وہ کہتے ہوئے مڑا ــ اور لپک کر کلیم کے ہاں گیا۔

کلیم کی اپنی حالت جاں بلب مریض کی سی تھی۔

"سرکار کی طبیعت بہت خراب ہے ڈاکٹر صاحب ــ جلدی آئیے ــ" نظام کہہ رہا تھا ــ اور کلیم کے اندر تخریبی انتقامی قوتیں چنگھاڑ رہی تھیں۔ اس نے دھتکار کر

نظام کو کمرے سے نکال دینا چاہا۔

کل رات سے کلیم اس کمرے میں مقید تھا۔ وہ اپنی ذات سے لڑ رہا تھا۔ محبتوں کو نفرتوں میں تبدیل کرنے کا عمل کر رہا تھا۔ اماں گھبرا رہی تھیں۔ کئی بار اسے آ کر دیکھ گئی تھیں۔ انہیں اصل واقعے کا کہاں علم تھا۔ وہ تو ثومی کی گم شدگی کا اثر سمجھ رہی تھیں۔ بیٹے کی حالت دیکھ کر ممتا تڑپ اٹھی تھی۔ اس مرحلے پر ہتھیار ڈال دیے تھے۔ اسے اتنی عزیز تھی۔ تو پھر وہ کیوں اس کے راستے کی چٹان بنیں۔

صبح سے اس نے کھایا تھا نہ پیا۔ شیو کی تھی نہ کپڑے بدلے تھے۔ اماں پریشان تھیں۔ ہمدردی اور تسلی دیتے ہوئے بھی ڈر رہی تھیں۔

"آئیے نا ڈاکٹر صاحب" نظام نے مضطرب ہو کر کہا۔ اماں دروازے میں کھڑی تھیں۔ کلیم کی بجائے نظام نے ان سے گزارش کی۔ "صاحب کی حالت ہے بیگم صاحبہ۔ ڈاکٹر صاحب سے کہیے انہیں دیکھ آئیں۔"

"جاؤ بیٹے ــ" اماں صرف اسی قدر کہہ پائیں۔

کلیم نے ماں کے حکم پر سر خم کیا۔ "چلو میں آتا ہوں ــ" وہ بوجھل آواز میں بولا۔ وہ صرف کلیم ہی نہیں ڈاکٹر بھی تھا۔ کلیم کی تباہ کن رنجشیں فرید سے ہو سکتی تھیں۔ ڈاکٹر کی نہیں۔ وہ فرید کو دیکھنے پر آمادہ ہو گیا۔ آج وہ اس فرید کو دیکھنے جا رہا تھا۔ جو جوان بیٹی کا باپ ہوتے ہوئے بھی اک جوان لڑکی کو سینے میں سمو لینے کا اہل تھا۔

اس نے لباس تبدیل کیا نہ کنگھی کی۔ گاؤن پہنا۔ ہاتھوں سے ہی بال سلجھائے بیسیوں پھونکے۔ سگریٹوں کے ٹکڑوں اور راکھ کو دیکھتا کمرے سے نکل گیا۔

فرید پر ڈپریشن کا دورہ پڑا تھا۔ لیکن آج وہ بیحد نڈھال اور لٹا لٹا دکھائی دے رہا تھا۔ کلیم نے اک رقیب کی نظر سے اسے دیکھا۔ وہ اپنے آپ پر قابو نہ رکھ سکا۔ طنز کا زہر گھولتے ہوئے چبھتی آواز میں بولا۔

"کیوں فرید صاحب! کیا پریشانی لاحق ہو گئی۔ بڑے بے چین ہیں۔ کاروبار میں گھاٹا رہا۔"

وہ ہنس پڑا۔ فرید بے تابی سے ٹہل رہا تھا۔ اس بے موقعہ ہنسی پر بھنا کر اس کی طرف دیکھنے لگا۔ بڑھی ہوئی شیو۔ شکن آلود کپڑے۔ بکھرے بال۔ آنکھوں میں وحشت۔ چہرہ پژمردہ۔ ثومی جہاں فرید کی کمر ہمت توڑ گئی تھی۔ وہاں کلیم کو بھی دیوانہ بنا گئی تھی۔ کلیم کے لیے فرید کے دل میں ہمدردی اور محبت کے جذبات امنڈ پڑے۔

ثومی کیوں بھاگ گئی۔ کلیم کا پیار بھی اس کی راہ نہ روک سکا۔ کیا محض میرے کلیم سے ملنے کو روکنے پر اس نے اتنا سنگین قدم اٹھایا۔ اس نے عشق صادق کو تو پرکھ لیا ہوتا۔ فرید کلیم کو دیکھتے ہوئے سوچ رہا تھا۔

"فرید صاحب۔" کلیم کی آواز پر وہ چونکا۔ کھردری، اجنبی اور طنز بھری آواز۔ فرید کو خدشہ ہوا کہیں ثومی نے رات اس کی لگائی پابندی کا ذکر کلیم سے تو نہیں کر دیا تھا اس کا مطلب برا تو نہ تھا۔ اس نے تو ثومی کی اچھائی کے لیے ہی کہا تھا۔

"بہت پریشان ہو رہے ہیں۔" کلیم اس کے سامنے آ کر تن کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے ہاتھ سینے پر باندھ رکھے تھے۔

"ہاں ڈاکٹر۔ آج میرے حالات قابو سے باہر ہو گئے ہیں۔" فرید نے بیچارگی سے اظہار کیا۔

"میں آج آپ کے ڈپریشن کے دوروں کی نوعیت سمجھ گیا ہوں۔" اس نے بہانہ ہنسی ہنستے ہوئے کہا۔

"اگر نہیں سمجھے تو میں سمجھائے دیتا ہوں ڈاکٹر۔ میں سخت پریشان ہوں۔ ثومی۔"

وہ بات پوری کرنے نہ پایا تھا۔ کہ کلیم ہنسا۔

"ثومی بھاگ گئی۔"

"ڈاکٹر" فرید کلیم کی طرف پھٹی پھٹی نظروں سے دیکھنے لگا۔

"حسین بے آسرا اور غریب لڑکی۔" کلیم سنگین آواز میں بولا۔ "خوب دل لگایا اپنے فرید صاحب۔"

"ڈا ــــ کٹر" فرید نے چیخ کر کہا۔ لیکن اس کی طرف دیکھے بغیر کلیم اپنی آگ اگلتا رہا۔ "بیگم کے گھر پر نہ ہونے سے خوب موقعہ تھا خلوتیں آباد کرنے کا۔ لیکن وہ کم بخت راہی ہو گئی۔ خوبصورت بلا۔ زہریلی ناگن۔"

"ڈاکٹر۔" کلیم کا جملہ ختم ہونے سے پہلے ہی فرید چیخا اور اس کا ہاتھ اٹھا ــــ غیض و غضب میں اس نے اک بھرپور تھپڑ کلیم کے گال پر جڑ دیا۔

کلیم اس اچانک اور غیر متوقع حرکت پر سناٹے میں آ گیا۔ اس کا دماغ بھنا گیا۔ آنکھوں میں تارے ٹوٹ بکھرے۔ وہ ابھی سنبھلنے بھی نہ پایا تھا۔ کہ فرید نے دونوں ہاتھوں میں اپنا چہرہ چھپا لیا۔ وہ سسکتے ہوئے بولا۔ "یا خدا ــــ ابھی یہ تیر باقی تھے۔ کلیم پتہ نے کس نظر سے مجھے دیکھا۔ یہ کیا سوچا ــــ ثومی ــ ثومی ــ ثومی تو۔"

وہ ہانپنے لگا۔ اس کا سارا وجود کانپنے لگا۔ جھپٹ کر اس نے کلیم کو کندھوں سے پکڑ لیا۔ برداشت ٹوٹ گئی۔ ہانپتے ہوئے چیخا۔ "تم نے کیوں کہا اتنی سنگین بات کہہ ڈالی کلیم۔ ثومی۔ میری بیٹی ہے۔ ثومی میرا خون ہے۔ میں اس کا باپ ہوں ڈاکٹر۔ بدنصیب لڑکی کا حرماں نصیب باپ۔" اس نے جھٹکے سے کلیم کے کندھے چھوڑ دیے۔ بچوں کی طرح کمرے کے چکر لگاتے ہوئے چیخا۔ "مجھے آج اس حقیقت کا اعتراف کر لینے دو۔ ثومی میری بیٹی ہے۔ میرا خون ہے۔ میری اولاد ہے۔"

کلیم کا دماغ ریل کے پہیے کی طرح گھوم گیا۔ آنکھیں پھٹ گئیں۔ دل ڈوبنے لگا "میں انیس سالوں سے چپ تھا ڈاکٹر۔" فرید بچوں کی طرح روتے ہوئے بولا۔ اس زرد چہرہ آنسوؤں سے بھیگ گیا۔ "یہ چپ مجھے کھوکھلا کر گئی ہے۔ اب مجھ میں ہمت

رہی ہے نہ صبر۔ میں بڑا گنہ گار ہوں کلیم۔ میں نے اپنے عیبوں کی ستر پوشی ثومی کی زندگی کی پوری خوشیوں کی قیمت پر کی ہے۔ میں نے اپنے گناہ کو قبول نہیں کیا تھا لیکن آج، آج ــــ میرا سینہ پھٹ جائے گا۔ مجھے ــــ اس حقیقت کا اعتراف کر لینے دو۔ میرا سینہ پھٹ جائے گا ڈاکٹر ــــ"

کلیم اس انکشاف سے سکتے کے عالم میں تھا۔ ثومی نے جب اپنی روئداد اسے سنائی تھی۔ تو اس کے ذہن میں یہی خیال آیا تھا۔ لیکن صدیق کی باتوں نے رنگ ہی اور دے دیا تھا۔ وہ کتنا بڑا فریب کھا گیا تھا۔

فرید نے کلیم کے کندھے پر سر رکھ دیا۔ اس کے آنسو بہنے لگے۔ وجود کر جھٹکے لگنے لگے۔ وہ گرا جا رہا تھا۔

سنبھلنے کی طاقت تو کلیم میں بھی نہ تھی۔ پھر بھی بڑی ہمت کر کے اسے پلنگ پر لٹا دیا۔ فرید مرغِ بسمل کی طرح تڑپنے لگا۔ اس نے بلو کی ساری روئداد اسے سنا ڈالی۔ انیس سالوں کی اذیت و کوفت کا کہہ ڈالا۔

کلیم گم صم کھڑا تھا۔ اس کی حالت غیر ہو رہی تھی۔ پلنگ کے تکیئے پر جھک کر اس نے اپنا چکراتا سر دونوں ہاتھوں پر گرا لیا۔

"ڈاکٹر۔" فرید پلنگ پر اٹھ بیٹھا ــــ "میری اذیتوں کا حساب لگاؤ ڈاکٹر۔ میں نے اس راز کو سینے کی گہرائیوں میں اتار لیا تھا۔ لیکن یہ راز تپتی ہوئی آگ تھی۔ تو کیا جانتا تھا۔ تم نہیں سمجھ سکتے۔ مجھ پر کیا کیا بیتی ــ میں نے اپنی بچی پر کتنے مظالم ڈھائے وہ نوکروں کے کوارٹر میں پلتی رہی۔ اور میں اپنی آن عزت اور وقار پر اسے قربان کرتا رہا۔ مجھ سا ظالم۔ مجھ سا سفاک، مجھ سا بے رحم بھی ہو گا کوئی۔"

فرید بلک بلک کر رونے لگا۔ کلیم تکیہ چھوڑ کر اس کے برابر پلنگ پر بیٹھ گیا۔ اس کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں تھام کر رقت سے بولا۔

"مجھے معاف کر دیجئے فرید صاحب ــــ میں نے نادانستگی میں آپ کو صدمہ پہنچایا۔ لیکن ــــ لیکن ــــ" اس نے فرید کا چہرہ چھوڑ دیا۔ سر ندامت سے جھک گیا۔ اس غلط فہمی کی بنا پر وہ جو غلطی کر چکا تھا۔ اب اس کا کیا ہو گا۔

رات کا واقعہ اس نے ٹوٹتے الفاظ میں فرید سے کہہ ڈالا۔

"اوہ ــــ میرے خدا۔ فرید تڑپ گیا۔" میری مظلوم بچی ــ!"

کلیم اپنے ہونٹ کاٹتے ہوئے اپنے دل کے درد کو دبانے کی کوشش کرنے لگا۔ فرید رو رہا تھا۔ بچوں کی طرح بلک بلک کر رو رہا تھا۔

"خدا کے لیے ثومی کو کہیں سے ڈھونڈ لاؤ ڈاکٹر۔ اس بدنصیب لڑکی کا دامن خوشیوں سے بھر دو۔ میرے دکھ بانٹ لو کلیم۔ میرے ضمیر کا بوجھ ہلکا کر دو۔ مجھے سلمیٰ کی نظروں میں گرنے سے بچا لو۔ مجھے فریدہ کی نظروں میں ذلیل ہونے سے بچا لو۔"

"حوصلہ رکھیئے فرید صاحب۔" اپنا حوصلہ ٹوٹ رہا تھا۔ پھر بھی کلیم نے فرید کی حالت سے متاثر ہو کر اس کی ہمت بندھائی۔ "ثومی مل جائے گی۔ ضرور مل جائے گی میں آپ کا دکھ بانٹنے میں فخر محسوس کروں گا۔ ثومی ــ میری ــ زندگی ہے ــ"

"ڈاکٹر۔" کلیم کی بات پر فرید کے ہونٹ کپ کپا گئے۔"

"ہمت رکھیئے۔" کلیم سر جھکائے بولا۔ میرے عزیز!" فرید نے بے ساختہ کلیم کو اپنے سینے سے لگا لیا۔ "میں نے یہ راز سلمیٰ سے بھی چھپایا تھا۔ لیکن تمہارے سامنے۔"

"آپ سارے وسوسے دل سے نکال دیجئے فرید صاحب۔" کلیم نے دکھے لہجے میں کہا۔ "یہ راز دفن ہی رہنے دیجئے۔ میں ثومی کو ضرور تلاش کر لوں گا۔ ضرور تلاش کر لوں گا۔"

فرید کے ضمیر کا بوجھ اتر گیا۔ پریشان و متفکر تو تھا۔ لیکن کلیم کی تسلی و تشفی کے سہارے ثومی کی تلاش میں کلیم کا ساتھ دینے کو پوری طرح تیار تھا۔ معاملہ الٹ گیا تھا۔ کلیم درد کے نئے زاویے سے تڑپ رہا تھا۔

ــــ ٭ ــــ

ثومی

گھر سے منزل کا تعین کیے بغیر نکل کھڑی ہوئی تھی۔ تھوڑے سے پیسے پاس تھے۔ دو تین جوڑے کپڑے تھے اور بس۔ دماغ ماؤف ہوا جا رہا تھا۔ جسم پر ذہنی تکان کا اثر تھا۔ پژمردہ دل گرفتہ آزردہ ثومی سڑکوں کی طرف لیے پیادہ پا طے کرتی سٹیشن تک جا پہنچی۔ یہاں ٹکٹ خریدنے کے لیے خاصی پریشانی ہوئی۔ کہاں جائے؟ یہ سوال اب ابھرا۔ قدرت نے اس کی خود ہی مدد کی۔ ایک مسافر مونا والی کا ٹکٹ خرید رہا تھا۔ اس نے بھی وہیں کا ٹکٹ خرید لیا۔ مونا والی ہی میں تو اس کی سہیلی نگہت کی شادی ہوئی تھی۔ فی الحال سر چھپانے کو اسی کے یہاں جانے کی سوچی۔

نگہت اسے یوں سویرے سویرے اتنی اچانک آجانے پر دیکھ کر حیران سی رہ گئی۔ ثومی اس کے سارے استفساروں کے جواب میں اس کے کندھے پر سر رکھ کر بے اختیار ہو کر رو دی۔ نگہت گھبرا گئی۔ ثومی کو تھپ تھپاتے ہوئے چارپائی پر بٹھایا۔ اس کے سارے استفساروں کے جواب میں اس کے کندھے پر سر رکھ کر بے اختیار ہو کر رو دی۔ نگہت گھبرا دی۔

ثومی نے اپنی داستان غم سسکتے سسکتے اسے سنا ڈالی۔ نگہت کو بڑا ہی دکھ ہوا۔ لیکن اس کی ہمت افزائی کرتے کو بولی "گھبرانے کی کوئی بات نہیں ثومی۔ دنیا میں ایسا ہوتا ہی رہتا ہے۔ میرے گھر کو اپنا ہی گھر سمجھو۔"

نگہت اپنے چھوٹے سے صاف ستھرے گھر میں اپنے شوہر اور دو سالہ بچی

کے ساتھ رہتی تھی۔ زندگی بڑی پرسکون تھی۔ نگہت کا خاوند مونا والی کے رئیس آفتاب عالم کے کاروبار کے جنرل مینجر کا اسسٹنٹ تھا۔ معقول تنخواہ تھی۔ قناعت اور ایمانداری شیوہ تھا۔ اس لیے پرسکون زندگی تھی۔

نگہت کی وجہ سے اس نے بھی ثومی کو خوش آمدید کہا۔ ثومی خلوص اور محبت کی متلاشی تھی۔ یہاں آکر بہل گئی۔ زخم تو اپنی جگہ تھے ہی۔ لیکن خلوص کا مرہم بھی بڑی چیز تھا۔ دو چار یوم تو دل کی کہتے اور سنتے گزر گئے۔ نگہت کی گول مٹول بچی ثومی کی دوست بن گئی۔ وقت بہت اچھا گزرا۔ لیکن ثومی ان لوگوں پر زیادہ عرصہ بار نہ بننا چاہتی تھی اسے جلد از جلد ملازمت چاہیئے تھی۔ کسی قسم کی بھی ملازمت ہو۔ وہ کرنے کو تیار تھی اس نے اپنا عندیہ نگہت پر ظاہر کیا۔ تو وہ ہنس کر ٹال گئی۔ "ثومی ہم اتنے غریب بھی نہیں ہیں۔ کہ تمہارا بوجھ نہ سہار سکیں۔" اس کے شوہر امیر علی نے بھی خلوص سے کہا۔ "خدا نے مجھے بہن دے دی ہے بہنیں بھائیوں پر بار نہیں ہوتیں۔"

یہاں بیوی کے خلوص سے ثومی متاثر تو بہت ہوئی۔ لیکن اس کی انا نے اسے بوجھ بن کر رہنے سے گریز ہی سکھایا۔ وہ دن رات ملازمت ہی کے لیے دونوں کو مجبور کرنے لگی۔

نگہت اور امیر علی پورے صدق سے اسے پناہ دینے کو تیار تھے۔ لیکن جب اس کا اصرار بڑھا تو انہوں نے اس کے متعلق سنجیدگی سے سوچا۔

انہی دنوں مہ جبین کی پرانی خادمہ اماں بی کے داغ مفارقت دے جانے کے بعد سوچا گیا نئی ملازمہ کی ضرورت تھی۔ یہ ضرورت یوں مسئلہ بن گئی تھی۔ کہ مہ جبین جو بھی ملازمہ آتی اس سے نباہ نہ کرتی۔ کسی کے بال نوچ ڈالتی۔ کسی کے کپڑے پھاڑ ڈالتی۔ کسی کو کمرے میں آنے کی اجازت نہ دیتی۔ اماں بی سے وہ ذہنی طور پر بھی وابستہ تھی۔ وہ خلا پورا نہ ہو سکتا تھا۔ وہ کئی کئی دن بھوکی رہتی۔ دوائی نہ کھاتی۔ کپڑے نہ بدلتی۔

نئی صورتِ حال سے آفتاب عالم اور حویلی کے دوسرے ساکن پریشان تھے۔ تربیت یافتہ عورتیں بھی آئیں۔ پڑھی لکھی لڑکیاں بھی۔ برسوں ملازمت کا تجربہ رکھنے والی خواتین بھی۔ لیکن مرجبین کی کسی سے بن نہ آئی۔ اس کے دوروں میں بھی ان دنوں اضافہ ہوگیا۔ اور وہ خاصی کمزور اور نڈھال بھی ہوگئی۔

امیر علی کو سارے حالات کا علم تھا۔ نوکری تو برائے نام ہی تھی معقول تنخواہ، رہائش کا بندوبست۔ شریف گھرانہ۔ ثومی کے لیے اس سے بہتر جگہ ملنا ممکن نہ تھی۔ لیکن کیا عجب۔ مرجبین اس سے بھی نباہ نہ کرے۔ بہرحال اس نے نگہت سے بات کی۔ آزما لینے میں کیا ہرج تھا۔

ثومی امیر علی سے تقریباً روزانہ ہی پوچھتی تھی۔ کوئی کام بنا میرا بھائی جان۔ "آج بھی اس نے پوچھا۔ تو امیر علی نے نگہت کو آنکھوں ہی آنکھوں میں اشارہ کیا۔ نگہت مسکرائی۔

"کیوں؟" ثومی نے پوچھا۔

"ایک ملازمت ہے تو سہی۔" نگہت بولی۔

"اچھا۔" ثومی بے تابی سے بولی۔ "بس جیسی بھی ہے میں ضرور کرلوں گی۔"

"سن تو لو پہلے۔" نگہت نے کہا۔

"ہوں۔" ثومی ہمہ تن گوش ہوگئی۔

"ایک نیم پاگل عورت سے واسطہ پڑیگا۔" نگہت ہنس کر بولی۔

"کیا ــــ؟" ثومی ڈر گئی۔

"بھئی! یہاں کے رئیس آفتاب عالم ہیں نا۔ جن کے پاس تمہارے بھائی ملازم ہیں۔"

"ہاں ــــ"

"ان کی بھابی ہیں۔ نیم پاگل سی۔ ان کی ملازمہ فوت ہوگئی ہے۔ اس کے لیے انہیں کسی ایسی ملازمہ کی ضرورت ہے۔ جو صرف اس کی دیکھ بھال کرے۔ اس سے باتیں

ے۔ اس کا دل بہلائے۔ کھانا کھلائے۔ وقت پر دوائی دے وغیرہ وغیرہ۔ تنخواہ ا سے بھی زیادہ ہے۔ دیگر سہولتیں بھی بہت ہیں۔ رہائش کی ساری ذمہ داری ان ــ سوچ لو اب ــــ؟" ثومی واقعی سوچ میں پڑ گئی۔

"کام تو برائے نام ہی ہے۔ حویلی میں بیسیوں نوکر ہیں۔ تمہارے لیے الگ نوکر ا۔ گھر کا فرد بن کر رہو گی۔ میرے خیال میں تو عیب والی کوئی بات نہیں۔ مانا ہوا ریف گھرانہ ہے یہاں کا ــــ"

"لیکن ــــ"

"کیا ــــ؟"

"پاگل عورت"

"اے کچھ ایسی پاگل بھی نہیں۔ بس دورے پڑتے ہیں۔"

"اس کے ساتھ بڑا زبردست المیہ ہوا ہے۔ بی بی۔" امیر علی بولا۔ "اس بدنصیب ت سے تو سب کو ہمدردی ہے۔"

اور پھر امیر علی نے مرجبین کے ساتھ بیتے سانحے کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا۔ ں کا خیال تھا۔ آفتاب عالم نے جائیداد اور روپے پیسے کے لالچ میں لڑکی کو ا ڈالا۔ لیکن آفتاب تو اس واقعے کے بعد اپنے آپ کو بھی بھلا بیٹھا۔ درویش چکا ہے وہ تو ــــ بڑی قابلِ رحم حالت ہے حویلی والوں کی۔ دولت کا کوئی حساب ں۔ لیکن سکون ــــ یہ لوگ اس لفظ سے آشنا ہی نہیں۔"

"مرجبین بڑی خوبصورت عورت ہے۔ جوانی میں خدا جانے کتنی حسین ہوتی ں۔ لیکن اس کا سایہ نصیب شاید ہی کوئی ہو۔" نگہت نے افسردگی سے کہا۔

"اس عالی شان حویلی کی ذی شان رونقیں مجھے اب تک یاد ہیں۔" امیر علی بولا۔ "خورشید عالم کا مرنا تھا۔ کہ ان کی مسرتوں کا آفتاب غروب ہوگیا۔ پھر وہ دن

نہیں دیکھے حویلی کے در و دیوار نے ـــ بچی جیتی رہتی ـ یا آفتاب عالم ہی شادی کر لیتے ـ تو حویلی کے مکینوں کا نام زندہ رہتا ـ زندگی کچھ تو بیدار ہوتی ـــ لیکن تو بہ ـ سناٹے ہی سناٹے ہیں اب تو ـ وہ گہما گہمی ـ وہ ہلچل ـ وہ زندگی کی حرارت سب ختم ہو چکی ہے ـ

ثومی کو حویلی والوں کی روداد سن کر ترس آیا ـ اور ان دیکھی مرجبین سے کچھ ہمدردی بھی محسوس ہوئی ـ لیکن پھر وہی پاگل عورت کا خیال ـ ڈرنے لگی ـ

"آزما لینے میں کیا ہرج ہے ثومی ـــ تم وہاں جا کر تو دیکھو ـ جی نہ لگا تو چھوڑ دینا" ثومی نے بجھے بجھے دل سے حامی بھری ـ

اور دوسرے دن وہ نگہت اور امیر علی کے ساتھ حویلی گئی ـ

محل نما حویلی میں قدم رکھتے ہوئے اس کا دل بری طرح دھڑک رہا تھا ـ ماتھے پر پسینے کے ننھے ننھے قطرے چمک رہے تھے ـ

چاروں طرف وسیع و عریض کمرے تھے ـ اور درمیان میں بہت بڑے بڑے چمن اپنی تراش خراش میں یکتا ـ پھولوں سے لدے پڑے تھے ـ

ملازم انہیں آفتاب عالم کے کمرے میں لے آیا ـ کمرہ اپنے مکین کی مالی حیثیت کی منہ بولتی تصویر تھا ـ بڑے بڑے قدیمی فانوس ـ بھاری بھاری پردے ـ دبیز قالین ـ پرانے طرز کا نایاب فرنیچر ـ ثومی کو یوں لگا جیسے وہ کسی خوابوں کے جزیرے میں آ گئی ہے ـ

ادھیڑ عمر آفتاب عالم بڑے سادہ سے لباس میں پوری تمکنت اور جاہت سے میز کے دوسری طرف اونچی سی کرسی پر بیٹھا تھا ـ علیک سلیک کے بعد معاملے کی بات شروع ہوئی ـ آفتاب عالم دورانِ گفت گو بڑے غور سے ثومی کو دیکھتا رہا ـ

امیر علی کی وساطت سے ہی ساری باتیں طے ہوئیں ـ ثومی تو مرعوب سی بیٹھی تھی ـ

"بیٹی" آفتاب عالم نے کرسی سے اٹھتے ہوئے کہا ـ "تمہیں امیر علی نے ہمارے

تعلق سب کچھ بتا دیا ہے ـ تم اپنی کوشش سے ہماری دکھیا بھابی سے تعاون کرنا ـ روپے پیسے کی یہاں کوئی کمی نہیں ـ تمہیں ضرورت سے بڑھ کر ملے گا ـ آؤ میں تمہیں بھابی سے ملاؤں ـ"

ثومی بھی اٹھ کھڑی ہوئی ـ امیر علی اور نگہت بھی ـ دونوں آفتاب عالم سے اجازت لے کر چل دیے ـ ثومی وہیں رہ گئی ـ آفتاب عالم نے جس محبت سے ثومی کو بیٹی کہا تھا ـ ثومی نے اس لفظ کی حقیقی حرارت محسوس کی ـ اس کا دل ہمدردی سے لبریز ہو گیا ـ اور اس نے ہر صورت اس خاندان سے نباہ کرنے کا تہیہ کر لیا ـ

مرجبین سو رہی تھی ـ ایسے میں اسے جگانا مناسب نہیں تھا ـ آفتاب عالم ثومی کو حویلی کے کمرے دکھانے لگا ـ مرجبین کی خواب گاہ سے ملحقہ کمرہ ثومی کے لیے مخصوص ہوا ـ ثومی شاندار حویلی کی سونی سونی بالکنیوں ـ برآمدوں اور کمروں سے ہوتی ہوئی پھر مرجبین کی خواب گاہ سے ملحقہ کمرہ ثومی کے لیے مخصوص ہوا ـ ثومی شاندار حویلی کی سونی سونی بالکنیوں، برآمدوں اور کمروں سے ہوتی ہوئی پھر مرجبین کی خواب گاہ کے بیرونی برآمدے میں آ گئی ـ بلاشبہ حویلی کسی رنگیلے بادشاہ کی نشاط انگیز محفل کی طرح سجی ہوئی تھی ـ لیکن سناٹے اور سونا پن اس کے مقدر بن چکے تھے ـ نایاب اشیاء کے ذخیروں کے باوجود حویلی کو تنہائی کا بھوت نگل چکا تھا ـ مرجبین کی نئی ملازمہ کو دیکھنے حویلی کے پرانے نوکر چاکر جمع ہو گئے ـ ملازمہ بذاتِ خود کسی اجڑی ریاست کی ملکہ معلوم ہوتی تھی ـ سادہ سے لباس میں بھی اس کا پروقار چہرہ دمک رہا تھا ـ سبھی اس سے مرعوب نظر آئے ـ

ثومی کے مزاج کا ٹھہراؤ اور بات چیت کا سلجھا ہوا انداز آفتاب نے دورانِ گفتگو اچھی طرح محسوس کر لیا تھا ـ ہر چند کہ لڑکی غریب تھی ـ لیکن اس کی رگوں میں خون پکار پکار کر کہہ رہا تھا ـ کہ وہ کوئی عام سی لڑکی نہیں ـ وہ اس کے متعلق کچھ نہیں جانتا تھا ـ

ثومی ہی کے کہنے پر اس کے ماضی کو دہرایا نہیں گیا تھا۔ اس نے کام کرنا تھا۔ ماضی سے پردے اٹھانے کی کیا ضرورت تھی۔ آفتاب عالم کو بھی پوچھنے کی ضرورت نہ تھی۔ امیر علی کی ضمانت کافی تھی۔ پھر اس نے کام ہی لینا تھا۔ جس کے لیے ثومی تیار تھی۔

آفتاب اس کے لیے اسے مخصوص کمرے میں لے آیا۔ ضرورت کی ہر چیز وہاں مہیا کرنے کے لیے اس نے حویلی کے ناظم کو حکم دے دیا۔ آرام دہ پلنگ پر صاف ستھرا بستر موجود تھا۔ کشادہ کمرا بڑا ہی پرسکون تھا۔ ثومی نے زندگی کو اڑکے گھٹے گھٹے ماحول والے نیم تاریک کمرے میں گزاری تھی۔ وہ تو جیسے جنت میں آ گئی۔ خواب کا گمان ہونے لگا۔

آفتاب نے چائے وغیرہ وہیں منگوا لی۔ کتنی ہی دیر بیٹھا وہ ثومی سے باتیں کرتا رہا۔ مرجبین کی جو جو خدمت اس کے ذمہ تھی۔ وضاحت سے سمجھاتا رہا۔ ثومی پوری توجہ سے سنتی رہی۔

"گھبرانے کی ضرورت نہیں بیٹی ۔۔۔ نہ ہی ڈرو۔ تم جلد ہی یہاں کی فضا سے مانوس ہو جاؤ گی۔ خدا کرے۔ بھابی مرجبین تمہارے ہاتھوں سکون پائے۔ بیٹی! ہم بڑے دکھی لوگ ہیں۔" آفتاب دکھی آواز میں بولا۔

"میں اپنی پوری کوشش کروں گی۔ آپ مطمئن رہیئے۔" ثومی نے یقین دلایا۔

"بھابی کے اٹھنے تک تم آرام کر لو۔" آفتاب نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"بہت بہتر۔" ثومی بھی تعظیم سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

اس کے جانے کے بعد ثومی نے بستر پر نیم دراز ہو کر ساری باتوں کا جائزہ لیا۔ وہ فکرِ معاش سے بے فکر ہو گئی تھی۔ لیکن دل کے معاملے! اُف وہ کتنی بے چین کتنی بے کل ہوئی۔ کلیم نے اسے ناکردہ گناہ کی کتنی بڑی سزا دی تھی۔ کتنا عالی ظرف بنتا تھا وہ ۔۔۔ کتنی وسعتیں نظر آتی تھیں۔ اس کے فراخ سینے میں ۔۔۔ لیکن ۔۔۔ خیر ثومی نے اپنی محبت کو سینے کی گہرائیوں میں دفن کرنے کا تہیہ کر لیا۔ زمانے میں محبت کے سوا

کم اور بھی تو تھے۔ اس نے اپنا دھیان کلیم کی طرف سے ہٹانے کو اٹھ کر کمرے کی چیزوں کا جائزہ لینا شروع کیا۔ خوبصورت قیمتی چیزوں کی طرف توجہ مبذول کر دی۔

اس کمرے کا درمیانی دروازہ مرجبین کی خواب گاہ میں کھلتا تھا۔ ثومی پردہ ہٹا کر بند شیشوں میں سے اس کمرے میں جھانکنے لگی۔

وسیع و عریض خواب گاہ بیش قیمت سامان سے آراستہ تھی۔ قدیم نایاب قیمتی چیزیں اپنی تمکنت و نزاکت کی آئینہ دار تھیں۔ بلاشبہ حویلی کے رئیس نوابی شان کو برقرار رکھے ہوئے تھے۔ کتنا بڑا المیہ تھا۔ کہ بے بہا دولت سکون جیسی بے قیمت شے کو خریدنے سے قاصر تھی۔ آفتاب عالم کی مایوس اور مسرت ناآشنا نظریں کتنی قابلِ رحم تھیں۔ ثومی کی نظر ریشمی باریک پردوں والی خوبصورت مسہری پر پڑی۔ پردوں میں سے دھندلا دھندلا عکس نظر آ رہا تھا۔ کوئی بے خبری کی نیند سویا ہوا تھا۔ یہی مرجبین تھی۔ ثومی کو وہ پوری طرح نظر نہیں آ رہی تھی۔ اسے دیکھنے کی تمنا بڑی بے قرار ہوئی۔ ثومی نے دھیرے سے دروازہ کھولا۔ اور بے آواز قدم اٹھاتی مسہری کے قریب آ گئی۔ ڈرتے ڈرتے اس نے مسہری کے مہین پردوں کو ہٹایا۔ مرجبین دونوں ہاتھ گال تلے دبائے سو رہی تھی۔

زرد زرد چہرے اور خوبصورت خدوخال والی مرجبین ثومی کو پہلی نظر میں ہی اتنی اچھی لگی۔ کہ اس کا دل بے ساختہ اسے چھونے کو مچل اٹھا۔ خدا جانے یہ کونسا جذبہ تھا اس نے اپنا ہاتھ مرجبین کے گال پر بڑی آہستگی سے رکھ دیا۔ گال پر مسہ کے دانے کے برابر سیاہ تل تھا۔ ثومی کو یہ تل بڑا ہی اچھا لگا۔

انگلیوں کی پوریں گال سے چھونے کی دیر تھی۔ کہ مرجبین ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔ سیاہ حلقوں میں گھری بڑی بڑی گہری آنکھیں کھول کر اس نے ثومی کو دیکھا۔

ثومی ڈر گئی۔ گھبرا کر پیچھے ہٹنے کو تھی۔ کہ مرجبین نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ ثومی اتنی خوف زدہ ہوئی۔ کہ اس کے منہ سے دبی سی چیخ نکل گئی۔ دل ڈر کے مارے بے طرح

دھڑکنے لگا۔ سارے بدن پر کپکپی سی طاری ہو گئی۔ مہ جبین کی گرفت اتنی مضبوط تھی کہ ثومی ہاتھ بسیار کوشش کے باوجود چھڑانے سے قاصر رہی۔

"تم کون ہو۔" صورت کی طرح مہ جبین کی آواز بھی خوبصورت تھی۔ ڈرنے کے باوجود ثومی اس کے قریب کھڑی رہی۔ اس کا ہاتھ مہ جبین کی گرفت میں تھا۔

"کون ہو تم۔" مہ جبین کی نظروں سے اذیت جھلکنے لگی۔ یوں دیکھنے لگی۔ جیسے پہچاننے میں دشواری پیش آ رہی ہو۔

"جی میں کلثوم ـــ میں ثومی ہوں جی ـــ" ثومی نے ڈرتے ڈرتے اس کی طرف دیکھا۔

"کلثوم ـــ!" مہ جبین یوں سوچنے لگی۔ جیسے اس نام کو اپنے ذہن میں ٹٹول رہی ہو۔

"ثومی ـــ سب ثومی کہتے ہیں مجھے ـــ جی ـــ ثومی ـــ" ثومی نے پھر رکتے رکتے کہا۔ لیکن اپنے آپ کو سنبھالا دیا۔

مہ جبین نے غور سے اس کے چہرے کو دیکھا۔ اور پھر نفی میں سر ہلا دیا۔ "نہیں ـــ تمہارا نام ثومی نہیں ـــ"

"تو پھر کیا ہے ـــ؟" ثومی اپنے ڈر پر غالب آ چکی تھی۔ دلچسپی سے بولی۔ "مہ جبین اچھی بھلی تو تھی۔ ڈر کا کیا مقام ـــ؟"

مہ جبین نے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ وہ سوچنے لگی۔ سوچتی گئی۔ پھر الجھی اور پھر پریشان نظر آئی۔

"یاد نہیں آ رہا ـــ تمہارا نام ـــ تمہارا نام ـــ یاد نہیں آ رہا ـــ تمہارا نام یاد نہیں ـــ آ رہا ـــ"

اس نے سر کو کئی بار جھٹکا دیا۔

"یاد نہیں آ رہا ـــ مجھے یاد نہیں آ رہا ـــ مجھے یاد نہیں آ رہا ـــ"

اپنی انگلیوں سے اس نے کنپٹیوں کو کئی بار مسلا۔ وہ سخت پریشان ہو گئی۔

"مجھے یاد نہیں آ رہا۔"

اسی جملے کی رٹ مہ جبین زور زور سے لگانے لگی۔

ثومی گھبرا گئی ـــ مہ جبین کے تیور اچھے نظر نہ آ رہے تھے۔ وہ یہ جملہ بار بار کہے جا رہی تھی۔

اس کی آواز اونچی ہوتی جا رہی تھی۔

چند ہی لمحوں کے بعد وہ بے طرح چیخ رہی تھی۔ کئی خادمائیں دوڑی دوڑی آ گئیں ـــ نوکر بھی دروازے تک آ کر کھڑے ہو گئے۔

مہ جبین کو دورہ پڑ گیا۔ خوفناک دورہ۔ وہ اٹھ اٹھ کر بھاگنے لگی۔ خادماؤں نے تھام تھام لیا۔

ثومی کا خوف، دہشت اور گھبراہٹ کے مارے برا حال تھا۔ آفتاب عالم آ کر اسے تسلی نہ دیتا۔ تو شاید اسی وقت وہ اس حویلی سے بھاگ نکلتی۔

ـــ ٭ ـــ

"تم رات کہاں تھی؟"

"جی میں ساتھ والے کمرے میں تھی۔"

"ساتھ والے کمرے میں کیوں؟"

"وہ کمرہ مجھے دیا گیا ہے نا۔"

"تمہیں دیا گیا ہے۔"

"جی۔۔"

"لیکن ــــ کیوں؟"

"میں۔ میں۔"

"تم کون ہو ــــ؟"

"آپ کی خادمہ۔"

"نہیں۔"

"اچھا جی۔ نہیں۔"

"تو پھر کون ہو تم۔"

"میں۔ میں۔ جی آپ کے لیے چائے بناؤں۔"

صبح صبح ثومی مہ جبین کے کمرے میں آئی تو مہ جبین نے اس پر نظر پڑتے ہی سوال کیا۔ یوں لگتا تھا وہ اس کا انتظار کر رہی تھی۔ ثومی کو کل کا واقعہ یاد تھا اس لیے اس کے سوالوں کا جواب دینے کی بجائے کام میں مصروف ہو گئی تھی۔ لیکن

گھنٹے بھر بعد جب مہ جبین پھر اس سے اس کا نام پوچھنے لگی۔ تو ثومی اس کے سوالوں سے بچنے کے لیے ٹرالی کو سامنے گھسیٹ کر چائے بنانے لگی۔ مہ جبین اپنی نظریں ثومی کے چہرے پر گاڑے دیکھتی رہی۔ اس کے چہرے پر پھر کل والی ہی اذیت کی تکان تھی۔ جیسے وہ اسے اپنے ذہن کے کسی گوشے میں پہچان لینے کی اکساہٹ کے باوجود پہچان نہ پا رہی ہو۔

رات مہ جبین آرام سے سوئی رہی تھی۔ ثومی ساتھ والے کمرے میں تھی۔ اس نے رخشندہ کو جو حویلی کے ناظم کی بیٹی تھی۔ اپنے کمرے میں سلایا تھا۔ مہ جبین کے خوفناک دورے سے وہ دہشت زدہ سی تھی۔ رخشندہ نے رات اسے ہر طرح سے تسلی دی تھی۔ مہ جبین کے دورے دوسروں کے لیے قطعاً بے ضرر تھے۔ اسی کی ذات ان سے متاثر ہوتی تھی۔ کبھی بھاگتے بھاگتے تیورا کر گر جاتی۔ تو نوکیلی چیز چبھنے سے زخم آ جاتا۔ ایک بار تو کلائی کی ہڈی بھی ٹوٹ گئی تھی۔ سر میں تو تین چار دفعہ چوٹ آئی تھی۔ کئی دفعہ الٹا گرنے سے پاؤں میں موچ آ چکی تھی۔ مہ جبین کی داستانِ غم ثومی کے دل پر بری طرح اثر انداز ہوئی۔ اس دکھیاری کے سارے دکھ بانٹ لینے کو اس کا جی مچل اٹھا۔

ثومی نے آج اپنے فرائض کی ادائیگی اتنی محبت سے کی۔ کہ مہ جبین اس کا دم بھرنے لگی۔ اس نے محبت سے اس کا ہاتھ منہ دھلایا۔ کپڑے بدلوائے۔ بالوں میں کنگھی کرتے ہوئے تو مہ جبین بچوں کی طرح اونگھ اونگھ گئی۔

"تم اتنے دنوں سے کہاں تھی۔" مہ جبین نے پھر سوچ کے انداز میں اذیت محسوس کی ــــ

"جی۔ میں۔" ثومی کو فی الفور کوئی جواب نہ بن پڑا۔ کل کے واقعے سے ڈر گئی تھی۔ کوئی سیدھا جواب بھی الٹا تاثر دے سکتا تھا۔

"یہ بسکٹ بھی لیجئے نا۔" ثومی نے بات بدلنے کو کہا۔

لیکن مہ جبین نرم و گداز صوفے میں یوں بیٹھی نظر آتی جیسے کانٹوں پر بیٹھی ہو۔ وہ

پیالی ہاتھ میں لیے بڑے غور سے ایک ٹک ثومی کو دیکھے گئی۔

"شا - شائستہ - " مہ جبین کے لب ہلے - اس کی آنکھوں کی دھندلی پرچھائیاں کچھ اور گہری ہو گئیں - "شاید - تمہارا نام - شائستہ ہے - "

"جی - جی - تو - جی ہاں شائستہ ہی ہے جی - " ثومی نے حاضر دماغی سے کام لیتے ہوئے کہا - وہ مہ جبین کی کوئی بھی بات کاٹ کر اسے پریشان نہ کرنا چاہتی تھی - نام کا کیا ہے - نام سے فرق بھی کیا پڑتا ہے - نام تو اک صوتی اشارہ ہوتا ہے کسی شخصیت کو منفرد کرنے کا - اور بس - "

"مجھے یاد آ گیا نا - " مہ جبین کی آنکھوں میں ستارے چمکنے لگے - اس نے خالی پیالی ٹرالی میں رکھ دی -

"جی بالکل - " ثومی نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا -

"میرے پاس آؤ - آؤ - نا - ادھر بیٹھو میرے قریب - " مہ جبین کی آواز میں محبت کی ایسی کشش تھی - کہ ثومی ڈرنے کے باوجود اس کے پہلو میں جا بیٹھی -

مہ جبین نے آہستہ آہستہ ہاتھ اٹھائے - اور پھر ثومی کا چہرہ بڑی ملائمت سے دونوں ہاتھوں میں تھام لیا - اس کی نظروں کا تاثر بدل رہا تھا - کچھ انجانے سے جذبے پھیل رہے تھے - ثومی اس کی آنکھوں میں دیکھ رہی تھی - وحشتی سی نظریں - لیکن وہ بت بنی بیٹھی تھی - خوف تھا نہ ہراس - مہ جبین نے اس کا چہرہ اپنے قریب کر لیا - بہت قریب - اور پھر - پھر اس نے ایک چیخ ماری - چیخ جو کئی چیخوں کا پیش خیمہ تھی - ان چیخوں میں ایک ہی لفظ کی گونج تھی - "شائستہ - "

اس کے ہاتھوں میں سے ثومی کا چہرہ چھوٹ گیا - چیخیں بلند سے بلند تر ہوتی گئیں -

آج ایک بار پھر مہ جبین نے کمرے میں آفتاب عالم کچھ دور پار کے رشتہ دار اور حویلی کی خادمائیں جمع ہو گئیں -

ثومی کو جانے کیا ہوا - ایک طرف دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑی ہو گئی - اور اس کے نسوبے اختیار ہو کر بہنے لگے - وہ کیوں رو رہی تھی - مہ جبین کی دردناک بیماری سے تاثر ہوئی تھی - یا اس محبت سے پگھل گئی تھی - جو مہ جبین نے چند لمحے پیشتر اس پر ہاتھوں کے لمس اور نگاہوں کی گرمی سے پہنچائی تھی - بہرحال جو کچھ بھی تھا - وہ زار و قطار رو رہی تھی -

آفتاب عالم بڑا پریشان ہوا - کل بھی دورہ پڑا آج پھر ——

"شائستہ " - شائستہ - " سن کر تو آفتاب عالم نے سر تھام لیا تھا - شائستہ مہ جبین کو آج اتنی مدت کے بعد کیسے یاد آ گئی - اس کا تو اس نے کبھی بھولے سے بھی نام نہ لیا تھا -

"شائستہ - جو آفتاب کے ضمیر کا پھوڑا تھی - جو عرصہ ہوا اس کے بھیانک منصوبے کی بھینٹ چڑھ چکی تھی - آج مہ جبین کو وہ کیوں کر یاد آ گئی -

ادھر ثومی کو روتے دیکھ کر اس کا دل بیٹھنے لگا - کہیں یہ لڑکی بھی نوکری سے جواب دے کر چلی گئی تو —— شاید وہ ہراساں ہو کر رو رہی تھی - آفتاب عالم ثومی کے پاس آیا -

"بیٹی - " اس نے اس کے سر پہ پیار سے ہاتھ رکھا -

ثومی سسکیاں لے لے کر رونے لگی - وہ اسے اس کے کمرے میں لے آیا -

"تم شاید ڈر رہی ہو ثومی بیٹی - " اس نے ہاتھ ملتے ہوئے کہا -

"جی نہیں - " ثومی نے آنچل سے آنسو پونچھے - " ایسی کوئی بات نہیں -"

"تو پھر رو کیوں رہی ہو - "

"یونہی - دل بھر آیا - " وہ پھر رو دی -

"شائستہ - شائستہ - " مہ جبین نے زور زور سے چیخ رہی تھی - ثومی نے آنکھیں جلدی جلدی صاف کیں - اور مہ جبین کے کمرے کی طرف چلی دی -

"ثومی بیٹی۔ تم فی الحال یہیں رہو۔ وہاں جانے کا کوئی فائدہ نہیں۔ ابھی ڈاکٹر آکر انجکشن لگا دے گا۔"

"وہ مجھے بلا رہی ہیں۔"

"تمہیں؟"

"جی۔"

"شائستہ تمہارا۔ نا۔ م بھی ہے ــــ"

"جی نہیں۔"

"تو۔"

ثومی نے ساری بات آفتاب عالم سے کہہ سنائی۔ آفتاب عالم بڑا ہی مضطرب نظر آیا۔ بڑے دکھ سے اپنے ہونٹ کاٹے ہاتھ ملے۔ کمرے کے دو تین چکر عالمِ اضطراب میں کاٹے۔ ثومی کچھ نہ سمجھ سکی۔ حیران ہو کر اس کی طرف دیکھنے لگی۔

"ثومی بیٹی۔ جانتی ہو۔ شائستہ کون تھی۔ نہیں۔ تمہیں کیا پتہ۔ شائستہ مہ جبین کی بدنصیب بچی تھی۔

"جو حادثے کی نذر ہو گئی تھی۔ مجھے امیر بھائی نے بتایا تھا۔ وہ حادثے میں مر گئی تھی۔"

"ہاں! مر گئی تھی۔ ہا۔ ہا۔ آں۔" آفتاب عالم پر ایک عجیب طرح کی وحشت آمیز گھبراہٹ طاری ہو گئی۔ مجرم ضمیر نے نشتر چبھویا۔ لیکن پھانسی کو نکالے بھی تو نہ بنتی تھی۔ جھوٹ کا لبادہ اوڑھے اپنے جرم کو سینے سے لگائے ہوئے جو تھا۔ کیسے کہہ دیتا۔ مر نہیں گئی تھی۔ میں نے مروا ڈالی تھی۔

انجکشن کے اثر سے مہ جبین شام تک بے سدھ پڑی رہی لیکن جب اس نے ہوش میں آ کر آنکھیں کھولیں۔ تو وہ نحیف سی آواز میں شائستہ کو پکار رہی تھی۔ ثومی گھنٹہ بھر سے اس کے قریب بیٹھی تھی۔ جلدی سے اس پر جھک گئی۔

شب و روز کا چکر چلتا رہا۔ مہ جبین ثومی سے بیحد مانوس ہو گئی۔ ثومی کو بھی اس کی خدمت میں گو ناخوشی محسوس ہوتی۔ مہ جبین کے دوروں اور وحشت ناک حرکتوں سے اب وہ عاری ہو گئی تھی۔ اب وہ اس سے ڈر کر نہ بھاگتی تھی۔ بلکہ اسے تھام کر سینے سے لگا لیتی۔ اس کے سینے کی گرمی سے بعض اوقات مہ جبین کا دورہ منٹوں میں ختم ہو جاتا۔ آفتاب عالم نے سکھ کا سانس لیا تھا۔ اس کی کئی پریشانیاں ثومی نے بانٹ لی تھیں۔ فارغ اوقات میں وہ اسے بھی تو تسلیاں دیا کرتی تھیں۔ وہ تو دونوں کے لیے کوئی اسیر مرہم بن گئی تھی۔

پچھلے چند دنوں سے مہ جبین کے رویے میں ایک عجیب سی تبدیلی آ گئی تھی۔ ثومی کوئی کام کرتی۔ تو اس کے ہاتھ سے جھپٹ لیتی۔

"نوکر مر گئے ہیں کیا؟" اور پھر نوکروں کی پوری پلٹن کو بلا کر خوب ڈانٹتی۔ ثومی اپنی بلا شرمندہ ہوتی۔ وہ خود بھی تو نوکر ہی تھی۔ لیکن مہ جبین کے سامنے اس کی پیش نہ جاتی۔ آفتاب عالم سے اس نے اپنی پوزیشن کے متعلق بات کی۔ تو اس نے پیار سے کہا۔

"تمہارا یہی احسان کیا کم ہے بیٹی۔ کہ مہ جبین تمہاری وجہ سے بہلی رہتی ہیں۔ ورنہ اماں بی کے مرنے کے بعد تو جتنی لڑکیاں اور عورتیں بھی آئیں۔ مہ جبین نے وہ ہنگامہ بپا کیا۔ کہ خدا کی پناہ۔ تم اس بات کا کوئی تردد نہ کرو۔ جس طرح وہ خوش رہتی ہیں۔ اسی طرح کیا کرو۔ تمہیں ہر حال میں انہیں خوش رکھنا ہے۔"

ثومی رات اپنے کمرے میں سویا کرتی ہیں۔ مہ جبین نے اس بات پر بھی سخت اعتراض کیا۔ ثومی کا پلنگ اٹھوا کر اس کے کمرے میں ڈال دیا گیا۔ سادہ سے بستر والا سادہ سا پلنگ دیکھ کر تو مہ جبین بھڑک اٹھی۔ اپنی ہی طرح کی مسہری۔ ویسے ہی مہین ریشمی پردے لگوائے۔ پہلے تو ثومی ہچکچاتی۔ لیکن مہ جبین کے اس کھیل میں وہ خود بھی دلچسپی لینے لگی تھی۔ ایسی مسہری کا تو اس نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا۔

مہ جبین نے ثومی کے سوتی کپڑے بھی ناپسند کیے۔ اس کے حکم پر ثومی کے لیے نگارنگ ریشمی لباس تیار ہوئے۔ مہ جبین ان دنوں کس قدر خوش رہتی تھی۔ حویلی کا ہر فرد محسوس کر رہا تھا۔ کہ سارا سارا دن ثومی کے آرام و آرائش ہی کا تردد کرتی رہتی۔

ثومی کو اس کی ان نوازشات سے جھجک بھی آتی تھی۔ لیکن کرتی بھی کیا۔ حکمِ حاکم تھا۔ اس دن جب ثومی نے مہ جبین کے اصرار پر بلکہ حکم پر ہلکے زرد رنگ کے نفیس ریشم کا چین تراش کا لباس پہنا۔ تو وہ آئینے میں اپنا سراپا دیکھ کر خود ہی حیران ہو گئی۔ اس کا بے مثال حسن نکھر کر قیامت بن گیا تھا۔ گالی گھٹاؤں جیسے بال پشت پر لہرا رہے تھے۔ آئینے میں اپنے سراپا کو دیکھتے ہوئے وہ آئینۂ ایام میں جھانکنے لگی۔ کلیم کی یاد آندھی کے جھونکے کی طرح یادوں کے شبستان میں در آئی۔ ستارے ماند پڑ گئے۔ روشنی بجھ گئی۔ دھندلاہٹیں ہی دھندلاہٹیں پھیل گئیں۔ پھر ان دھندلاہٹوں سے صاف شفاف چمکتے موتی لڑھکنے لگے۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ ڈھانپ لیا۔

کلیم کی یاد کوئی نئی تو نہ تھی۔ وہ تو پھانس بن کر کلیجے میں چھپی رہتی تھی۔ اور سانس کے زیر و بم سے بھی دکھا کرتی تھی۔ لیکن اس وقت۔ اس وقت اللہ جانے اسے کیا سوچ کر رونا آ گیا تھا۔ اپنے دکھ کو تو اس نے بہت گہرا دفن کر رکھا تھا۔ آج ایکا ایکی ایسے کیوں امنڈ پڑا۔ شاید اس لیے۔ اس لیے کہ کلیم کو یہ رنگ بہت پسند تھا۔

آنسو تو اس نے جلد ہی خشک کر لیے۔ لیکن ان کی نمی سے چہرہ یوں نظر آنے لگا جیسے شبنم سے دھلا ہوا پھول۔۔۔ مہ جبین نے اسے دیکھا۔ تو فرطِ مسرت سے جھوم اٹھی۔

"تم کتنی پیاری ہو۔ شائستہ۔" اس نے اس کی پیشانی چوم لی تھی۔

ثومی اور مہ جبین دن رات اکٹھی رہنے لگی تھیں۔ ثومی کا مقام مہ جبین کی منظورِ نظر اور بیٹی سے کسی طرح کم نہ تھا۔ ثومی کو تو یہ سب کچھ اک خواب کی طرح لگتا۔ وہ اپنی موجودہ

حالت سے خوش تو بہت تھی۔ لیکن ایک دھڑکا ہر وقت لگا رہتا۔ کہیں یہ قوسِ قزح کے رنگ بکھر گئے۔ یہ خواب چکنا چور ہو گئے۔ تو۔ اسے اس طلسماتی ماحول سے اس رنگ و بو کے جہاں سے۔ اس بے پناہ دولت کے اصراف سے اتنا لگاؤ نہیں تھا اسے تو وہ محبتِ آبِ حیات تھی۔ جو مہ جبین کے پاگل پن کی بدولت اسے مل رہی تھی۔ دھڑکا تو یہی تھا۔ کہ کسی وقت یہ محبت بھی چھن گئی۔ تو وہ کیا کرے گی۔؟ کلیم کی محبت کے بغیر تو اس نے جی لیا تھا۔ لیکن یہ محبت اگر اس سے چھن گئی۔ تو وہ زندہ نہ رہ سکے گی۔ اسے یہی محسوس ہوتا تھا۔

مہ جبین اس پر دیوانہ وار فدا بھی ہو رہی تھی۔ مہینے ڈیڑھ مہینے ہی میں خادمہ کو فرش سے اٹھا کر عرش تک پہنچا دیا تھا۔ آفتاب عالم تو خوش تھا۔ کہ مہ جبین کو جینے کا ڈھنگ آ گیا۔ دورے اب بھی پڑ جاتے تھے۔ لیکن اب ان کا علاج ممکن نظر آ رہا تھا۔

آفتاب عالم مہ جبین اور ثومی مثلث کے تین زاویے بن گئے تھے۔ ہر کوئی کسی نہ کسی طرح ایک دوسرے سے منسلک تھا۔

ثومی کی زندگی یکسر بدل چکی تھی۔ کبھی تو اسے یوں لگتا تھا۔ جیسے مدتوں بھٹکنے کے بعد وہ اپنے اصلی مقام پر آ کر ٹھہر گئی ہے۔ اور کبھی ایسے لگتا جیسے وہ بھی الف لیلوی داستان کا حسن ہے۔ جسے بادشاہ کی طبیعت کی اپج نے بادشاہت بخشی تھی۔ لیکن جو دوسرے ہی دن پھر اپنی اصلی جگہ پر لا پھینکا گیا تھا۔ ابھی یہ ایک دن کی بادشاہت تھی۔ ثومی کا دل اس دن کی طوالت کا شدت سے آرزومند تھا۔ کوارٹر کے جہنم میں گزارے انیس برس جب اسے یاد آتے تو اس پر کپکپاہٹ طاری ہو جاتی۔

کلیم نے ثومی کی تلاش میں دن رات ایک کر دیے۔ ہر امکانی کوشش کی لیکن ثومی کو تو آسمان نگل گیا تھا۔ یا زمین کھا گئی تھی۔ اس کا کوئی نشان نہ مل رہا تھا۔ اس نے ہسپتال سے ایک ماہ کی رخصت لے لی تھی۔ کلینک بھی بند رہتا تھا۔ وہ تو صبح کا نکلا رات گئے گھر لوٹتا۔ ان شاہراہوں پر میلوں گاڑی دوڑاتا پھرتا جن پر کبھی ثومی کے ہمراہ آیا تھا۔ "سحر کے اس کیبن میں تنہا کئی کئی گھنٹے بیٹھا رہتا جہاں ثومی کے ریشمی سانسوں کے الجھاؤ اب تک بکھرے معلوم ہوتے تھے۔ وہ اس بڑی سڑک پر روز ہی آتا اور اس جگہ جھٹکے سے گاڑی روزانہ ہی روک لیتا۔ جہاں پہلے دن ثومی کو بے وقوف بناتے لے آیا تھا۔ وصیل پر سر رکھے وہ اس لمس کو ذہن میں از سر نو تازہ کرتا۔ جو ثومی کو پہلی بار بازوؤں میں سمیٹ لینے سے محسوس کیا تھا۔

جوں جوں دن گزر رہے تھے۔ کلیم کی زندگی کی ویرانیاں بڑھتی جا رہی تھیں۔ نگہت فرید بھی تھا۔ کسی حد تک حیران اور فتو بھی۔ اور اپنی جگہ صدیق بھی مضطرب تھا۔ لیکن کلیم کے غم کا عالم ہی اور تھا۔ اسے تو صرف محبت کا رونا نہیں تھا۔ پچھتاوے بھی ڈستے تھے۔ اس نے اندھے جذبات سے مغلوب ہو کر ثومی سے جو بہیمانہ سلوک کیا تھا۔ اس کا مداوا کیوں کر کرتا۔ اسے صرف تھپڑ ہی مارا ہوتا۔ تو بات بڑی نہ تھی۔ اس نے تو ناداں انتقامی میں اسے اتنی بڑی گالی دے دی تھی۔ اتنا ذلیل طعنہ دیا تھا کہ اس انسانیت سوز اور شرمناک رویے کو وہ کیوں کر ذہن سے نکال پھینکتا۔

سلمیٰ اپنے باپ سیٹھ ہاشم کی طویل اور تشویش ناک بیماری کی وجہ سے میکے

ہی تھی۔ یہ موقع فرید کے لیے غنیمت تھا۔ وہ احوال پرسی کو گیا تھا۔ ثومی کی گمشدگی کی خبر اس نے اسے سنائی تھی۔ لیکن اس نے ذرہ بھر ملال کا اظہار بھی نہیں کیا تھا۔ الٹا دل جلا دینے والے الفاظ کہے تھے۔

کوئی ڈاکٹر سے بھی بڑی آسامی ہاتھ آ گئی ہوگی۔ جس کے ساتھ بھاگ گئی۔

فرید کا دل تڑپ اٹھا تھا۔ لیکن کہہ کچھ بھی نہ کہہ سکا۔ کہہ بھی کیا سکتا تھا۔ سزا کے طور پر ایسا ہر تیر کلیجے میں اتار رہا تھا۔

دن گزر رہے تھے۔ وقت کے ساتھ ساتھ کلیم کا غم بھی بڑھتا پھیلتا جا رہا تھا بالکل چپ سادھ لی تھی۔ نیند سوں نرل پلیز کی محتاج ہو گئی تھی۔ ماں بیٹے کے غم سے بری طرح متاثر ہوئی تھی۔ یہی سوچ سوچ کر پریشان ہوتی رہتی۔ کہ اس نے ثومی اور کلیم کے درمیان چٹان بن کر ناروا ظلم کیا ہے۔ ثومی کا یہاں سے فرار اپنے تشدد کی وجہ سے نظر آتا۔ ہاتھ مل مل کر اس وقت کو کوستی۔ ثومی جب کلیم کو منظور تھی تو اسے کیا ماں ہو کر بیٹے کی خوشیوں کو ڈائن کی طرح نگل گئی تھی۔ ایسی لڑکی کو اپنانا تو نیکی کا کام تھا۔ وہ تو خدا کی نظروں میں بھی گناہگار ہو گئی تھی۔ جب سے اسے کلیم نے صرف یہ بتایا تھا۔ کہ ثومی اور فرید کے تعلقات کو برائی کا رنگ دے کر شریف صدیق نے اچھالا ہے۔ فرید ثومی کو اک باپ کی طرح سہارا دیے تھا۔ تو اماں کے دل میں خوفِ خدا نے گھر کر لیا۔ ایسی خوبصورت، ایسی خدمت گزار ایسی با اخلاق لڑکی کو اس نے جذبات کی رو میں آ کر اپنے ہی بیٹے پر جو ظلم کیا تھا۔ اس کا مداوا نہ ہو سکتا تھا۔

وہ کئی دفعہ ہمت کر کے کلیم کو تسلی دینے آئیں۔ لیکن دیوانے کے تیور دیکھ کر اک لفظ کہنے کی جرأت نہ ہوئی۔

کاش انہیں کہیں سے ثومی کا سراغ مل جاتا۔ وہ اپنے ہاتھوں اسے دلہن بنا کر بیٹے کو سونپ دیتیں۔

ثومی کے جانے کے بعد ہر سُو ویرانی پھیلی تھی۔ یوں لگتا تھا۔ جیسے وہی جانِ بہاراں ہے۔ وہ گئی تو روزگار کے دلفریب رنگ بھی بکھر گئے۔

چھٹیاں ختم ہو گئیں۔ کلیم کو ہسپتال جانا پڑا۔ مایوس و محروم ہو کر اس نے اپنی تمامتر توجہ اپنے پیشے کی طرف مبذول کر دی۔ کلینک بھی کھول دیا۔ دکھی لوگوں کے دکھ درد پہ پھاہا رکھ کر اسے کچھ سکون ملنے کی توقع تھی۔ اس نے اپنے آپ کو ذہنی اور جسمانی طور پر حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے آمادہ کر لیا۔ غم اپنی جگہ سلگتے رہے اور وہ اپنے آپ کو مصروفیات کے ایثار تلے پیستا چلا گیا۔ ثومی کا غم ہمالیہ کی چوٹیوں پر جمی صدیوں پرانی برف کی طرح منجمد ہو گیا۔ اس غم کے پگھلنے کی توقع رہی نہ امید۔

کلیم نے اب سلمیٰ اور فریدہ سے بھی رابطہ نہیں رکھا تھا۔ کبھی کبھار ہی ملنے کا اتفاق ہوتا۔ سلمیٰ کو کلیم کی ذات میں کوئی کشش کوئی جاذبیت نہ نظر آتی تھی۔ یوں بھی فرید کا رشتہ سیٹھ ہاشم نے مرتے وقت اپنے پوتے سے کر دیا تھا۔ شاہد امریکہ سے انجینئرنگ کی ڈگری لے کر آیا تھا۔ سلمیٰ نے بھی باپ کی رضا پر سر خم کر دیا تھا۔ اور فریدہ نے بھی خاموشی سے قبول کر لیا تھا۔ کلیم کی طرف سے پہلے بھی ناامیدی تھی۔ اب ثومی کی گمشدگی نے اس کی جو حالت بنائی تھی۔ فریدہ بڑی متاثر تھی۔ محبت واقعی کوئی آفاقی قدر ہے اس پر ڈاکہ ڈالنا یا جبراً تسلط جمانا اس کی نظر میں بدترین فعل تھا۔

دونوں خاندان اجنبی ہمسائے بن کر رہ گئے تھے۔ ہاں فرید کلیم سے کچھ اور قریب آ گیا تھا۔ ثومی کے متعلق وہ دونوں آپس میں پوچھ گچھ کرتے رہتے۔ اپنی اپنی جگہ اب بھی دونوں تلاش میں مصروف تھے۔ لیکن تلاش سعیٔ ناکام بن چکی تھی۔

یوں شب و روز کا چکر چلتا رہا۔ ثومی کے شب و روز بھی گزرتے گئے۔ کلیم کے بخشے ہوئے زخموں سے لہو رستا رہا اور محبت مجروح ہو کر تڑپتی رہی۔

زندگی کی ہر آسائش مل گئی تھی۔ لیکن ان آسائشوں نے دل کے آبگینے کچھ زیادہ

ہی حساس کر دیے تھے۔ کلیم پر اسے کتنا اعتماد تھا۔ کتنا بھرپور بھروسہ تھا۔ لیکن وہ بھی بدل گیا۔

اپنی مختصر سی زندگی کا جائزہ لیتی تو اور پژمردہ ہو جاتی۔ قدرت سے خاموشی سے گلہ کرتی۔ تقدیر سے چپکے چپکے شاکی ہوتی۔ اسے یوں لگتا جیسے وہ صبح کی روشنی ہے جو اندھیروں سے جنم لیتی ہے اور اندھیروں ہی میں ڈوب جاتی ہے۔ آغاز کا کچھ پتہ نہ تھا۔ انجام بھی مخدوش ہی تھا۔ کرنت زدہ اور اذیت وہ زندگی میں کچھ پل بھر کے لیے سہانا روپ آیا تھا۔ لیکن اس روپ کو دیکھنے کی اسے جتنی کڑی سزا ملی تھی۔ وہ تو عمر بھر کے بھوگے ہوئے دکھوں سے کہیں زیادہ تھی۔

اب بھی بیٹھے بیٹھے آنسو نکل آتے۔ دل بے تاب ہو کر کلیم تک پہنچنے کی سعی کرتا۔ اپنے آپ کو بہلانے کے لیے وہ مصروفیت کے سہارے لیتی۔ کبھی کبھی نگہت ملنے آ جاتی۔ تو دل کی باتیں اس سے بھی کر لیتی۔

ادھر مہ جبین کا پاگل کھیل اپنی تمامتر رنگینیوں سے جاری تھا۔ وہ ثومی کی وجہ سے بہل گئی تھی۔ ہر وقت مصروف رہتی۔ اب اس کی متلاشی آنکھوں میں کچھ پا لینے کی چمک ہوتی۔

لیکن ماضی کے اس دور سے وہ اب تک شناسائی نہ کر پائی تھی۔ خورشید عالم کون تھا۔ اور شائستہ اس کی کیا لگتی تھی۔ اسے پتہ نہ تھا۔ اس المناک حادثے کا کوئی سراغ اس کے ذہن میں نہ ملتا تھا۔

فرصت کے اوقات میں آفتاب عالم ثومی کو حویلی کے ساکنان کا دورِ مسرت بتلایا کرتا تھا۔ وہ حسین شب و روز۔ وہ رنگین محفلیں۔ وہ گہما گہمی۔ وہ رونقیں وہ چہل پہل جب آفتاب عالم یاد کرتا تو اس پر افسردگی کی کہر سی پڑ جاتی۔ وہ اکثر باتیں کرتے کرتے کھو جاتا۔ اس کی نظریں کرب و اذیت کی غماز ہوتیں۔

ثومی کو یوں حویلی کے تاریخی سنہری دور سے خاصی واقفیت ہو چکی تھی۔ گو آفتاب عالم

نے اس سربستہ راز سے پردہ نہیں اٹھایا تھا۔ جو راتوں کی اندھی تنہائیوں میں اس کے ضمیر کو ڈستا رہتا تھا۔ تاہم ثومی نے اندازہ لگا لیا تھا۔ کہ لوگوں کے شک میں کچھ اصلیت ضرور ہے۔ وہ برملا تو نہ کہہ سکتی تھی لیکن محسوس ضرور کرتی۔ کہ وہ کسی بہت بڑے بوجھ کو اب بھی سینے پر اٹھائے پھرتا ہے۔

لیکن ثومی کو اس سے کیا؟ اسے تو اپنے کام سے کام تھا۔ کام جو اہم بھی تھا۔ اور برائے نام بھی۔ اک پاگل عورت کے ہاتھوں کھلونا بننا کوئی معمولی کام بے شک نہ تھا۔ لیکن مہ جبین کے عمل سے وہ جو محبت کشید رہی تھی۔ پیار جو اسے اس طور مل رہا تھا۔ اہمیت جو اس طرح حاصل ہو رہی تھی۔ وہ اپنی جگہ اتنی زیادہ تھی۔ کہ ثومی کو دل کے درد نے تباہ حال نہ کیا ہوتا۔ تو وہ اپنے آپ کو دنیا کی خوش قسمت ترین لڑکی سمجھنے میں حق بجانب ہوتی۔

اسے حویلی میں آئے تقریباً ڈیڑھ دو ماہ ہو چکے تھے۔ مہ جبین کے دوروں میں حیرت انگیز کمی آ گئی تھی۔ اب دورہ پڑتا بھی تو معمولی طور پر۔ کبھی کبھی تو ڈاکٹر کے پہنچنے سے پہلے ہی وہ ہوش میں آ جاتی۔

لیکن پچھلے دو چار دنوں سے مہ جبین کے رویے میں تبدیلی آ رہی تھی۔ وہ ثومی کو دیکھنے سے زیادہ گھورنے لگتی۔ اس کی آنکھوں میں خشونت ابھرنے لگی۔ ثومی کا دل ڈرنے لگا تھا۔ کیا ایک دن کی بادشاہت کے لوٹ جانے کا وقت آ گیا تھا۔ کیا یہ خوبصورت سپنے بکھر جانے کو تھے۔ کیا قوس قزح کے رنگ فق ہو جانے کو تھے۔ ثومی اس زندگی سے لپٹ جانا چاہتی تھی۔ ماضی کی تلخیوں کا اعادہ کرنے کی وہ اب متحمل نہ تھی۔

—— ٭ ——

دن کی بھرپور بدمستی کو اندر آنے سے روکنے کو کافی تھے۔ موسم بڑا دلفریب تھا۔ وسیع و عریض کمرے کی خوبصورت نفیس اور چمکتی دمکتی چیزیں خواب کے دھندلکے میں لپٹی تھیں۔ ثومی اپنے نرم و گداز ریشمی بستر میں دھنسی پڑی تھی۔ اس کے سیاہ ریشمی بال تکیے پر پھیلے تھے۔ کچھ خوبصورت چہرے پر بکھرے تھے۔ ہاتھوں کی نزاکت پر آئی تھی۔ نرم تکیے پر اس کا حسین ہاتھ ملائمت سے پڑا تھا۔

وہ اٹھ تو صبح کاذب کو گئی تھی۔ لیکن ابھی تک بستر میں پڑی تھی۔ اٹھنے کو جی نہ چاہ رہا تھا۔ آج رات ان دیکھی جگہوں پر گھومتی پھری تھی۔ زندگی کا حسن و نکھار جذب کرتی رہی تھی۔ لیکن صبح آنکھ کھلی۔ تو اپنے آپ کو کلیم سے صدیوں کی مسافتوں پر پا کر عجیب سی افسردگی، بیچارگی اور کس مپرسی سی محسوس کر رہی تھی۔

مسہری کے ریشمی پردے سرسرائے۔ ثومی نے نیم وا آنکھوں سے دیکھا۔ مہ جبین کھڑی تھی۔ ثومی نے دانستہ آنکھیں بند کر لیں۔

کئی بار یوں ہوا تھا۔ کہ مہ جبین صبح صبح اٹھ کر اس کی پیشانی پر اپنے لب رکھ دیا کرتی تھی۔ ثومی اس کے شفیق لبوں کا لمس روح میں اترتا محسوس کرتی۔ گھنٹہ گھنٹہ بھر وہ اس لمس سے لطف لیا کرتی۔

اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ مہ جبین اپنے خوبصورت شب خوابی کے لباس میں اس پر جھک رہی تھی۔

مہ جبین نے آج اسے بوسہ نہیں دیا۔ اس کے چہرے کو سونگھنے لگی۔ ثومی نے ڈرتے ڈرتے آنکھیں کھولیں۔ وہ دم بخود ہو گئی۔

مہ جبین نے اس کا ماتھا۔ گال، ہونٹ، گردن اور ہاتھ ایک بار نہیں کئی بار سونگھے اس کی آنکھوں میں وحشت سی پھیلنے لگی۔

ثومی ڈر کر اٹھ بیٹھی۔ مہ جبین ہی کی طرح کا لباس شب خوابی اس نے بھی پہن رکھا تھا۔

"تم ۔" مہ جبین نے اس کا کندھا ہلایا۔

"جی ۔۔۔ ؟" وہ منتظر نظر آتی۔

"تم میرا صابن استعمال کرتی ہو۔ ؟"

"جی ۔ جی نہیں ۔"

"جھوٹ !"

"جی ۔ میں آپ کا صابن استعمال نہیں کرتی ۔"

"کرتی ہو ۔"

"جی نہیں ۔"

"جھوٹ مت بولو۔ میں بھی حیران تھی ۔ تمہارے چہرے سے میری خوشبو کیوں آتی ہے ؟"

"میں آپ کا صابن استعمال نہیں کرتی ۔"

"جھوٹ کیوں کہتی ہو۔ میں اپنی خوشبو پہچانتی ہوں ۔"

ثومی مسہری سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ مہ جبین کی اس انوکھی اوٹ پٹانگ کا جواب کیا دیتی ۔

"چوری پکڑ لی نا میں نے ۔" مہ جبین نے خوفناک سا قہقہہ لگایا۔ ثومی گاؤن پہنتے ہوئے گھبرا گھبرا گئی ۔ مہ جبین کی آنکھوں میں طوفان کے آثار تھے ۔ اس نے

ثومی ہی کا سہارا لیا۔

مہ جبین نے اپنا منہ ثومی کے منہ کے قریب کر لیا۔ ایک لمبا گہرا سانس لیتے ہوئے ماں کی پیشانی کو سونگھا ۔ " بتاؤ کیوں استعمال کرتی ہو میرا صابن ۔"

"جی ۔ میں ۔"

"بڑی آئی ۔ میری خوشبو چرانے والی ۔ جیسے میں اپنی خوشبو نہیں پہچانتی ۔ دیکھو ۔" اس نے ثومی کا ہاتھ پکڑ کر اپنے نتھنوں سے لگایا۔ " بالکل میری خوشبو۔ دیکھو، میرا ہاتھ سونگھ کر دیکھو۔ میرا چہرہ سونگھ لو۔ میری گردن سونگھ لو۔"

اس نے اپنا ہاتھ ثومی کے نتھنوں سے لگایا۔ ثومی پژمردہ پہلے ہی تھی۔ اس بہتان سے گھبرا گئی تھی۔ مہ جبین نے اپنا ہاتھ اس کے ناک سے لگایا۔ تو ثومی نے جلدی سے اس کا ہاتھ پکڑ کر ہونٹوں سے لگا لیا۔ دل بھر آیا تھا۔ دو آنسو آنکھوں سے ڈھلک کر ہاتھ کی پشت میں جذب ہو گئے ۔

مہ جبین حیران ہو کر اسے دیکھنے لگی۔ اس کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔ آہستہ آہستہ اپنے قریب کیا۔ کانپتے ہونٹوں سے ثومی کی پیشانی کو چوم لیا۔ لیکن دوسرے ہی لمحے اس کا چہرہ جھٹک کر چھوڑ دیا۔ اور اسی درشت لہجے میں بولی:

"تم میری خوشبو چراتی ہو۔ میرا صابن استعمال کرتی ہو۔"

سارا دن مہ جبین یہی رٹ لگاتی رہی۔ نوکر کمرے میں آیا تو اس سے یہی کہا۔ ملازمائیں آئیں ۔ تو یہی بات کی ۔ آفتاب عالم آیا تو یہی شکایت کی ۔

ثومی کٹ کٹ گئی ۔ اس بہتان سے سبکی سی محسوس ہوئی ۔ آفتاب عالم کے سامنے تو وہ رو پڑی ۔ " خدا قسم میں نے کبھی ان کے صابن کو ہاتھ نہیں لگایا۔"

" پگلی بیٹی ۔ " آفتاب عالم نے اس کے سر پہ پیار سے ہاتھ پھیرا۔ " یوں دل برداشتہ نہ ہو۔ جانتی تو ہو مہ جبین بھابی دماغی مریضہ ہیں۔ آج انہیں یہ وہم پڑ گیا ہے۔

گھبراؤ نہیں۔ یہ ان کے ذہنی انتشار کی ایک صورت ہے۔ خود بھی بھول جائیں گی۔"

آفتاب عالم کے الفاظ سے ثومی کو تسلی ہو گئی۔

دوسرا دن خاصہ خوش گوار گزرا۔ مہ جبین نے اپنی فرمائش پر ثومی کو سفید قیمتی ریشم کا لباس پہنایا۔

"تم جنت کی حور ہو۔ کوہ قاف کی پری ہو۔ اللہ تم کتنی حسین کتنی پیاری ہو۔ میں تمہیں پیار کر لوں۔"

"جی حضور ضرور!"

"کتنا سکون ملتا ہے مجھے عائشہ۔ یوں لگتا ہے۔ جیسے۔ جیسے۔ کیا لگتا ہے؟"

"جیسے میں آپ کی بیٹی ہوں۔"

"میری بیٹی ہو گی۔"

"آپ ہی کی تو ہوں۔"

"میری بیٹی ہو۔"

"جی۔"

"نہیں! تم تو شائستہ ہو۔"

"جی ہاں۔ میں شائستہ ہوں۔"

ثومی کو اس کی الٹ پلٹ بے ربط باتوں میں بھی بڑا لطف ملا۔ رات گئے تک مہ جبین اس کی بلائیں لیتی پھری۔

ثومی نے غنودگی میں بھی اس کے ہونٹوں کا لمس اپنی پیشانی پر دو تین بار محسوس کیا۔ اس کے ہاتھ اپنے بازوؤں پر پیار سے پھسلتے پائے۔

لیکن دوسرے دن پھر کچھ پرسوں کا سا واقعہ پیش آیا۔

ثومی نے آج بھی مہ جبین کے کہنے پر نفیس ریشم کے ہلکے پھلکے کپڑے پہنے تھے۔ پاؤڈر پر سنگھار میز کے ایک طرف لٹکا۔ تے وہ بالوں میں کنگھی کر رہی تھی۔ میز آرائشی چیزوں سے بھری پڑی تھی۔ قیمتی نایاب سامانِ آرائش۔ لیکن ثومی کے حسنِ بے مثال کو ان مصنوعی سہاروں کی ضرورت نہ تھی۔ وہ تو مہ جبین کا حکم تھا۔ اس حکم کی تعمیل میں پر ان چیزوں کی بھرمار سے کر دی گئی تھی۔

ثومی کنگھی کرتے ہوئے آئینے میں اپنا سراپا دیکھ رہی تھی۔ پھر آئینہ ایام پر نظر جا گئی۔ پچھلا دور یاد آ گیا۔ وہ ٹوٹا پھوٹا آئینہ یاد آ گیا۔ جس میں کبھی چہرہ بھی پوری طرح نظر نہ آتا تھا۔ فریدہ کے ڈریسنگ ٹیبل کا خیال آیا۔ اور پھر وہ لاشعوری طور پر اس خوبصورت میز کا موازنہ اس کی میز سے کرنے لگی۔

کبھی وہ وقت تھا۔ کہ فریدہ کی چیزیں دیکھ دیکھ کر اس کا دل ایسی چیزوں کے لیے تڑپا کرتا تھا۔ کئی دفعہ وہ اس کی لپ اسٹک لگا لیا کرتی تھی۔ جیسے غسلخانے میں گھس کر دوپٹے سے رگڑ رگڑ کر صاف کرتی تھی۔

آج یہ چیزیں اسے میسر تھیں۔ کئی چیزیں تو ایسی تھیں۔ جن تک فریدہ جیسی لڑکی بھی نہ پہنچ سکی تھی۔ اتنے اتنے قیمتی سینٹ اس کے پاس چھوڑ سلمیٰ کے پاس بھی نہ تھے۔

اپنے لباس کو بھی دیکھا۔ اس کے پاس ایسے ایسے کئی بیش قیمت لباس تھے فریدہ سے کہیں زیادہ خوبصورت۔ کہیں زیادہ قیمتی۔ لیکن ان سب چیزوں کو پا کر محرومی کا احساس کچھ زیادہ ہی ہو گیا تھا۔

خوشی! حقیقی خوشی سے اس کے نصیب وابستہ نہ تھے۔

کنگھی کرتے ہوئے وہ سوچوں میں ڈوبی تھی۔ ڈریسنگ روم میں ہر چیز قرینے سے رکھی تھی۔ اس کے اور مہ جبین کے کپڑے، جوتے اور دیگر ضروریات کی

چیزیں یہاں پڑی تھیں۔

آئینے میں اس نے مہ جبین کو پچھلے دروازے سے اندر آتے دیکھا۔ اس نے ہلکے نیلے رنگ کا خوش وضع لباس پہن رکھا تھا۔ ثومی نے یہی سمجھا کہ وہ اپنی کوئی چیز لینے اندر آئی ہے۔

لیکن مہ جبین اس کی طرف آ گئی۔ میز پر پڑے ثومی کے دوپٹے کو اٹھایا، حیران ہو کر اسے دیکھا۔ "یہ یہاں کیوں پڑا ہے۔"

"کنگھی کر کے اوڑھوں گی۔"

"تم۔ تم اوڑھو گی۔"

"تم۔ تم اوڑھو گی۔"

"جی۔ میرا ہے نا۔"

"جھوٹ۔ میرا ہے یہ دوپٹہ۔"

"ہاں۔ ہاں آپ ہی کا ہے۔"

"تو پھر تم نے کیوں چرایا۔"

"جی۔"

"میں اپنی چیزیں پہچانتی نہیں جیسے۔"

اس نے دوپٹہ گول کر کے بغل میں دبایا۔ اور کمرے سے نکل گئی۔ ثومی نے دوسرا دوپٹہ نکالا۔ مہ جبین کی مجنونانہ حرکت سے اسے بڑی کوفت ہوئی تھی۔

سارا دن وہ عجیب عجیب سی حرکتیں کرتی رہی۔ ثومی کے سارے کپڑے نکال کر اپنے بستر پر ڈھیر کر لیے۔ "چور لڑکی۔" وہ غرا غرا کر اسے دیکھتی رہی۔ "میرا سب کچھ چرا لے جائے گی۔"

وہ ایک ایک کپڑے کو سونگھ کر سینے سے لگا لیتی۔ تب میرے ہیں۔ میری اپنی

شے ہے۔ کتنے مزے سے چرا لیے کپڑے۔ میں تم سے سمجھوں گی۔"

کئی بار جنونی حالت میں اس نے ثومی کو چور کہا۔ آج ثومی پھر کٹ کٹ گئی۔ یہ نام اس کی برداشت سے باہر ہو گیا۔

دوسرے اور پھر کئی دن مہ جبین کا یہی حال رہا۔

وہ ثومی سے ہر چیز جھپٹ کر چھین لیتی۔ ثومی روہانسی ہو جاتی۔ وہ کبھی تو اس کی صورت دیکھ کر قہقہے لگانے لگتی۔ کبھی رونے لگتی۔ اور اکثر ایسی حالت میں بے ہوش ہو جاتی۔

پاگل پن کا یہ انوکھا کھیل ثومی کے لیے اذیت دہ تھا۔

———*———

اپنا کام جاری رکھنے سے معذور ہوں۔ آفتاب عالم کے پرتکلف ا
میں آراستہ دفتر میں اس کے بالمقابل کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔
آفتاب عالم نے ثومی کو سرتاپا دیکھا اور پھر افسردگی سے سر جھکا لیا۔
"بی بی ۔۔۔" وہ گہری آہ بھرتے ہوئے بولا۔ "میں تمہیں کام جاری رکھنے پر
تو نہیں کر سکتا۔ لیکن اتنا ضرور کہوں گا۔ کہ تمہارے اخلاقی سہارے سے ہمارے
میں بڑی کمی آ گئی تھی۔"
ثومی آفتاب کی دل گرفتہ آواز سے نادم سی ہو گئی۔ لیکن جی کڑا کر کے بولی۔ آ
ہی بتائیے۔ میں کام کیونکر جاری رکھوں۔"
"مہ جبین بھابی کا ذہنی توازن کبھی کبھی زیادہ ہی بگڑ جاتا ہے۔ ڈاکٹر اسلم اور
فیروز دونوں متفق ہیں۔ کہ یہ صورتِ حال جلد ہی بدل جائے گی۔ جنون کی کیفیت
بس۔" آفتاب عالم کے حلق میں جیسے آنسو اترنے لگے۔
"جی وہ تو میں بھی جانتی ہوں۔ لیکن ۔۔۔ میں کیا کروں۔ اب صبح سے بھنڈ
کر یہ آنکھیں میری ہیں۔ یہ بال میرے ہیں۔ یہ ہاتھ میرے ہیں۔ آپ ہی بتائیے
میں کیا کروں۔ کیسے کام جاری رکھوں۔ گھنٹہ بھر میرے بال ہاتھ پر لپیٹے بیٹھی
"تمہاری اذیت و تکلیف کا مجھے پوری طرح احساس ہے بیٹی۔" آفتاب
نے پھر گہری آہ بھری۔ "بدنصیب عورت کو جانے اس طرح کتنا سکون ملتا ہے۔
میں تمہیں مجبور نہیں کروں گا۔ تمہیں کام چھوڑ کر جانے کا اختیار ہے۔"

وہ چمڑے کی آرام دہ کرسی کی پشت پر کمر ٹکاتے ہوئے پیچھے ہو گیا۔ وہ مسکرا
تھا۔ لیکن ثومی اس پابند اور مجبور مسکراہٹ کو دیکھ کر تڑپ گئی۔
"آج ہی جانا چاہتی ہو۔" وہ دکھے لہجے میں بولا۔
ثومی چپ ہو گئی۔ تذبذب میں پڑ گئی۔ کہ کیا کرے۔ نوکری وہ سخت مجبوری کی
ات میں چھوڑنے پر تیار ہوئی تھی۔ ورنہ جانتی تھی۔ کہ نوکری کے بعد دور کی ٹھوکریں
ہوں گی۔ تباہ حال ماضی مستقبل بن کر جھپٹے گا۔ لیکن وہ کیا کرتی۔ مہ جبین کے
گل پن سے عاجز آ گئی تھی۔
"ثومی! ۔۔۔ میں تمہارے باپ کی جگہ پر ہوں۔ لیکن پھر بھی عرض کروں گا۔"
"اللہ۔ آپ۔ ایسا نہ کہیئے۔" ثومی تڑپ کر آفتاب عالم کی بات کاٹتے
ہوئے بولی۔ اس کی آنکھوں میں بیچارگی سے آنسو امنڈ آئے۔
"ثومی بیٹی! ۔۔۔ اتنے دن اور تکلیف برداشت کر لو۔ جب تک مہ جبین
کے لیے کسی دوسری عورت یا لڑکی کا انتظام نہ ہو سکے۔"
ثومی خدا جانے کیوں رونے لگی۔
"میں نے تمہیں اپنی بیٹی ہی سمجھا ہے۔" آفتاب عالم میز پر جھک کر بغور ثومی کو دیکھتے
ہوئے بولا:
"تم بھابی کے پاگل پن سے تنگ آ گئیں۔ فرض کیا۔ تم ان کی اپنی بیٹی ہوتیں۔ تو
بانگ آ کر انہیں چھوڑ کر کہیں چلی جاتیں؟"
ثومی کی گردن اس خاندان کے احسانوں سے جھک گئی۔ واقعی وہ یہاں ملازمہ
حیثیت سے تو نہ رہی تھی۔ اس کا خیال تو خاندان کی بیٹی سے بھی بڑھ کر رکھا جاتا
تھا۔ تو پھر وہ کیوں اس مصیبت میں ان کا ساتھ چھوڑ دینے کو تھی۔
سہارا بھی کونسا تھا۔ جس کے بل بوتے پر وہ اس عظیم سہارے سے کٹ جانے

پر تیار ہو گئی تھی۔

روتے روتے اس کے ذہن میں برق کی سرعت سے یہ سب خیال آئے۔ بے ساختہ پکار اٹھی۔ "میں نہیں جاؤں گی۔ میں اپنی خدمات ۔"

"میری بچی ۔ !" آفتاب عالم، عالمِ تشکر میں اس کی طرف دیکھنے لگا۔ "میں اس کام کا دگنا تگنا معاوضہ دوں گا۔"

"مجھے معاوضے کی ضرورت نہیں۔" وہ سسکیاں لیتے ہوئے بولی۔ "مجھے بیٹی کہا ہے۔ تو بیٹی سمجھیے بھی۔ مجھے صرف شفقت کی ضرورت ہے۔ پیسے کی نہیں۔"

آفتاب عالم بڑا متاثر ہوا۔ اپنی کرسی سے اٹھا۔ میز کے گرد گھوم کر ثومی کے پاس آیا۔

ثومی آنچل سے آنسو پونچھنے لگی۔ آنسو جو بند ٹوٹ کر بہہ جانے والے سیلاب کی طرح آنکھوں سے رواں تھے۔

"تم خود بھی دکھی ہو ۔" آفتاب عالم نے پیار سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ "امیر علی نے بتایا تھا۔ کہ تمہارے والدین حیات نہیں ہیں۔ اور تم نامساعد حالات سے دوچار رہی ہو۔"

ہر چند کہ ثومی نے اپنے متعلق آفتاب عالم کو کچھ نہیں بتایا تھا۔ امیر علی کو بھی منع کیا تھا۔ لیکن اس نے بتا دیا تھا۔ ثومی کا دل کانپنے لگا۔ کہیں اس کی پیدائش کی کہانی بھی تو آفتاب عالم تک نہیں پہنچ گئی۔

لیکن اسے جلد ہی تسلی ہو گئی۔ اس کی کہانی کا امیر علی کو بھی کہاں علم تھا۔ نگہت بھی صرف اتنا ہی جانتی تھی۔ کہ اس کے والدین جب وہ چند دن کی تھی۔ مر گئے تھے۔ اسے مالی اور مالن نے پالا تھا۔

آفتاب عالم محبت اور شوق و شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیر رہا تھا۔

"دکھی انسان دوسروں کے دکھ اپنے دکھ کی کسوٹی پر پرکھتا ہے بیٹی۔ شاید اسی لیے تمہارے ساتھ ہمیں کچھ قلبی سا لگاؤ ہو گیا ہے۔ یقیناً تم بھی پوری محبت سے مرجبین کی خدمت کر رہی ہو۔ اسی لیے تو وہ اس حد تک بہل گئی تھیں کہ دوروں کی نوعیت ہی بدل گئی ہے۔ آجکل ان کا موڈ بگڑا ہوا ہے۔ لیکن ان کے معالجوں کا خیال ہے یہ وقتی ہے۔"

"جو کچھ بھی ہے۔" ثومی آنکھیں پونچھ کر اک دم سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ "آئندہ میں کام چھوڑنے کا سوچوں بھی نہیں۔"

"تمہارا احسان۔"

"آپ مجھے بیٹی کہہ چکے ہیں۔ میرے فرض کو احسان نہ کہیے۔" ثومی نے سعادتمندی سے آفتاب کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"جیتی رہو۔ جیتی رہو۔" اظہارِ تشکر سے آفتاب کی آواز گھٹ گئی۔

شام آفتاب عالم نے ڈاکٹر فیروز اور ڈاکٹر اسلم سے ذکر کیا۔ "اس لڑکی کی وجہ سے مرجبین بھابی کی آدھی تکلیف رفع ہو چکی ہے۔ لیکن اب وہ اسی کے درپے آزار نظر آتی ہے۔ آج تو گھبرا کر وہ نوکری چھوڑ کر جا رہی تھی۔ ہماری حالت پر رحم کھا کر رک گئی۔ ورنہ بیچاری کی جان مصیبت میں آئی ہوئی ہے۔ آج دوپہر والا واقعہ آپ نے دیکھ لیا۔ ایک ہی رٹ ہے۔ "میری آنکھیں ہیں۔ اس نے چرا لی ہیں۔ سمجھ نہیں آتا کیا کیا جائے۔ کیسے سمجھائیں انہیں۔"

دونوں ڈاکٹر آپس میں تبادلۂ خیال کرنے لگے۔ ماہرِ نفسیات تھے۔ کچھ دیر کی چہ میگوئیوں کے بعد انہوں نے فیصلہ کیا۔ کہ ثومی کو مرجبین کے سامنے جانے سے چند دن کے لیے روک دیا جائے۔

"ممکن ہے یہ عمل کارگر ہو جائے۔ اور وہ ثومی کا پیچھا چھوڑیں۔" آفتاب عالم نے

کہا۔ دوسرے دن اس تجویز پر عمل کیا گیا۔

دوپہر ہو گئی۔ ثومی کے متعلق مہ جبین نے کچھ نہیں پوچھا۔ آج اس کو منہ دھلا کر لباس بھی دوسری ملازمہ سے تبدیل کروایا۔ چائے بھی پلائی۔ اور دوپہر کھانا بھی اسی نے کھلایا۔ دوپہر مہ جبین آرام سے سوئی۔

لیکن جب سو کر اٹھی تو سب سے پہلے شائستہ کو پکارا۔

شائستہ کی بجائے حفظہ آ گئی۔

"شائستہ کہاں ہے؟" مہ جبین نے ڈانٹ کر کہا۔

"وہ۔ وہ چلی گئیں۔" ڈاکٹر کی ایماء پر حفظہ نے جواب دیا۔

"کہاں؟" مہ جبین تڑپ کر اٹھی۔

"واپس کہاں؟" اس نے حفظہ کو کندھے سے جھنجھوڑا۔ وہ بری طرح گھبرا گئی۔ اسی وقت ڈاکٹر فیروز آفتاب عالم کے ساتھ ادھر آ گیا۔

"کیا ہوا بھابی۔" آفتاب عالم نے مہ جبین کے ہاتھوں حفظہ کو چھڑاتے ہوئے پوچھا۔

"یہ کہتی ہے۔ یہ کہتی ہے۔ یہ کہتی ہے۔" وہ ٹوٹے ہوئے ریکارڈ کی طرح یہی جملہ کہنے لگی۔

"کہتی ہے شائستہ چلی گئی۔" ڈاکٹر فیروز نے حفظہ کی بات سن کر کہا۔

"ہاں۔ ہاں۔ یہ کہتی ہے۔" مہ جبین کی آنکھوں میں دھند سے کھلنے لگے۔

"ٹھیک کہتی ہے۔" فیروز نے کہا۔

"کیا؟ ——" مہ جبین چیختے ہوئے فیروز کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔

"شائستہ۔ آپ۔ کو۔ چھوڑ کر۔ جا چکی۔ ہے۔" فیروز نے ایک ایک لفظ گویا مہ جبین کے ذہن نشین کراتے ہوئے کہا۔

"وہ مجھے چھوڑ کر جا چکی ہے ——؟" مہ جبین ہراساں ہو کر بولی۔ اس کے چہرے

پر وحشت برسنے لگی۔ اس نے آفتاب عالم کی طرف دیکھا اور پھر فیروز سے پوچھا۔

"وہ مجھے چھوڑ کر جا چکی ہے؟"

"بالکل۔ اب کبھی نہیں آئے گی۔" ڈاکٹر نے ہاں نہ کی صورت میں ہلایا۔ مہ جبین کے منہ پر جھپٹ پڑی۔ خونخوار سی ہو کر اس نے ڈاکٹر کے نفی کی صورت ہلنے والے ہاتھ کو دانتوں سے کاٹ لیا۔

پھر تیورائی اور حفظہ کے ہاتھوں پر گر گئی۔ وہ بیہوش ہو گئی۔ ہوش آنے پر پھر شائستہ کی رٹ تھی۔

"شائستہ۔ آؤ نا ادھر۔ سنتی نہیں ہو۔ میں بلا رہی ہوں۔" وہ دکھے لہجے میں کئی بار بڑبڑائی۔ پھر بستر سے اٹھ کر کمرے میں ٹہلنے لگی۔

"شائستہ۔" اس نے چیخ کر بلایا۔

"بیگم صاحبہ۔" ڈاکٹر فیروز اس کے سامنے آ کر بولا۔

"کیوں؟"

"شائستہ کو آپ بلانا چاہتی ہیں۔"

"ہاں۔"

"کیوں؟"

"کیوں؟" مہ جبین سوچنے لگی۔ لیکن سوچ کا کوئی پہلو ذہن میں نہ آیا۔ "پتہ نہیں کیوں؟۔"

"وہ آپ کو اچھی لگتی ہے؟" ڈاکٹر نے اسے صوفے پر بٹھاتے ہوئے پوچھا۔

"اچھی ——؟" مہ جبین پھر سوچ میں ڈوب گئی۔ "ہاں۔ ہاں۔ مجھے بہت اچھی لگتی ہے۔"

"تو پھر آپ اس سے پیار کیوں نہیں کرتیں۔ اسی لیے تو وہ چلی گئی۔ پیار کریں گی

تو آ جائے گی۔"

"میں پیار کروں گی۔ میں پیار کروں گی۔ وہ۔ وہ۔ شائستہ تو نہیں نا۔ وہ تو میں ہوں۔ آپ نے دیکھا نہیں میری آنکھیں میرے بال۔ میرے ہاتھ۔"

"ہاں بالکل۔ پھر اس سے جی بھر کر پیار کریں گی نا۔"

"کروں گی۔"

"بے آئیں اسے۔"

"ہاں۔"

"وعدہ کیا ہے آپ نے پیار کرنے کا۔"

"ہاں۔ اسے بلا لاؤ ڈاکٹر۔ بلا لاؤ۔"

مہ جبین ایکا ایکی رونے لگی۔ ثومی پردے کے پیچھے کھڑی تھی۔ اس سے برداشت نہ ہو سکا۔ ڈاکٹر کے بلانے سے پہلے ہی تڑپ کر آئی۔ اور مہ جبین کے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔

مہ جبین اور ثومی کے ملنے کا نظارہ ایسا رقت بھرا تھا۔ کہ آفتاب عالم بھی آنسو ضبط نہ کر سکا۔ اور فیروز بھی دیگر سا نظر آنے لگا۔

رونے دھونے کے بعد مہ جبین بالکل نارمل ہو گئی۔ ثومی نے اس کے سینے میں پیار کے سمندروں کا تموج محسوس کیا تھا۔ اس کی بھوکی روح سیرابی کے لیے ان سمندروں میں ڈوب جانا چاہتی تھی۔ یہ طلسماتی ماحول اس کی زندگی کی کمی کو پورا کر رہا تھا۔

مہ جبین کی آنکھیں بارش میں دھلے ہوئے کسی مسجد کے سنہری کلس کی طرح ٹھنڈی ٹھنڈی پاکیزہ سی چمک لیے ہوئے تھیں۔

وہ ثومی کا ہاتھ پکڑ کر دوسرے کمرے میں لے گئی۔

"ان کی بھٹکی ممتا کو اس لڑکی کی صورت میں مرکز مل گیا ہے۔" ڈاکٹر فیروز نے

سوچتے ہوئے کہا۔ "ہو سکتا ہے ان کے ٹھیک ہو جانے کا یہی لڑکی سبب بن جائے۔"

"خدا کرے۔" آفتاب عالم نے خلوص دل سے کہا۔

مہ جبین کا رویہ اب ثومی کے ساتھ بالکل ہی بدل گیا۔ وہ اسے یوں سمجھنے لگی تھی۔ کہ جیسے وہ چھوٹی سی بچی ہے۔ کبھی اس کے بالوں میں کنگھی کرنے لگتی۔ کبھی کھانا کھاتے ہوئے اس کے منہ میں لقمے دینا شروع کر دیتی۔

اور جب اس نے آفتاب عالم سے کہہ کر ثومی کے لیے خود کار گڑیاں منگائیں تو ثومی کو قدرت کی ستم ظریفی پر ہنسی آ گئی۔

لیکن مہ جبین کا ذہن جس رخ مڑ رہا تھا۔ ثومی مزاحم نہ ہوتی تھی۔ اس نے آفتاب عالم سے وعدہ کیا تھا۔ اسے نبھا رہی تھی۔

—— ٭ ——

مرجبین کے ہاتھوں کھلونا بنی ہوئی تھی۔ کبھی تو اس کھیل سے

ثومی لطف اندوز ہونے لگتی۔ اور کبھی دل برداشتہ ہو جاتی۔ لیکن آفتاب عالم کی مایوسی نے اس کے سوز دروں نے اسے اتنا متاثر کیا تھا۔ کہ پھر کبھی نوکری چھوڑنے کے متعلق اس نے سوچا تک نہیں۔

یوں بھی اسے نوکری چھوڑ کر کہاں جانا تھا۔ وہ شاخ ہی جل گئی تھی۔ جس پہ آشیانہ بنانے کی کبھی تمنا کی تھی۔ کلیم اس کے ماضی کا ایک خواب بن چکا تھا۔ گو اس خواب کی لذت اور اذیت اب تک تروتازہ تھی۔ زخم مندمل ہو جاتے ہیں۔ گھاؤ بھر جاتے ہیں۔ لیکن جو زخم ثومی کے عشق نے کھایا تھا۔ وہ ایسا نہ تھا جس کے مندمل ہو کر مٹ جانے کا خیال بھی کیا جا سکے۔

ثومی کے دن مرجبین کے مجنونانہ مشغلوں کی نذر ہو رہے تھے اور راتیں مجروح محبتوں کا نوحہ کرتے اور ٹھیس کھائی انا کو بہلاوے دیتے گزر رہی تھیں۔

کلیم سے اس نے سب ناطے توڑ لیے تھے۔ اس کی یادوں کو ذہن سے نوچ پھینکنے کی ہر ممکن کوشش کی تھی۔ لیکن اکثر رات کی ظالم تنہائیاں اس بت کافر کو بے گناہ ثابت کر کے ثومی کی بیقرار محبت کا مرکز بنا دیتیں۔ ثومی جھنجھلا جاتی۔ من کی غیرت کو جھنجھوڑتی۔ لیکن اس کے سلگتے خیال سے پیچھا نہ چھڑا سکتی۔ اس کی قربت کے لیے دل مچل اٹھتا۔ مجبور ہو کر وہ آنسو بہانے لگتی۔ اس کے ریشمی تکیے آنسوؤں سے بھیگ جاتے۔

اور انہی ظالم تنہائیوں میں وہ اپنے آپ کے متعلق بھی سوچتی۔ وہ کون تھی؟ کیا تھی؟ کہاں سے اس کا آغاز ہوا تھا اور کہاں انجام ہونا تھا۔ زندگی اب تک دوسروں کے رحم و کرم پہ ہی گزر رہی تھی۔

سوچوں نے اسے خاموشیوں میں ڈوب جانے کا عادی بنا دیا تھا۔ مرجبین پر ان دنوں باتیں کرنے کا موڈ طاری تھا۔ ثومی کو خاموش دیکھ کر اسے بے چینی سی ہوتی اس کا جی چاہتا۔ وہ پھولوں کی طرح شگفتہ نظر آئے۔ شگوفوں کی طرح چٹکے۔ کلیوں کی طرح مسکرائے۔

اس سہ پہر ثومی مرجبین کو پائیں باغ میں چہل قدمی کے لیے لے گئی۔ مرجبین کھلے ہوئے پھولوں، نفاست سے آراستہ کیاریوں، جھومتے درختوں اور سرسبز گھاس کے ہموار فرشوں پر خوش خوش ٹہلتی رہی۔

"کتنے خوبصورت پھول ہیں۔" اس نے ثومی سے کہا۔

"جی — ہاں"۔ ثومی نے جواب دیا۔

"کچھ پھول توڑ لوں۔"

"میں توڑ دیتی ہوں۔"

"گلاب کے پھول۔ توڑنا۔"

"جی بہت بہتر۔"

ثومی پھول توڑنے لگی۔ ایک دو تین۔ اس نے کئی پھول توڑے۔ مرجبین انہیں اپنے دوپٹے میں ڈالتی گئی۔ اچانک ثومی کے ایک کانٹا چبھا۔ انگلی سے لہو رسنے لگا۔ مرجبین قطرۂ خون دیکھ کر اس طرح بے چین ہوئی۔ کہ ثومی کو ہنسی آ گئی۔

"خون۔" وہ ثومی کی انگلی کو پکڑتے ہوئے بے تابی سے بولی۔

"کانٹا نکل گیا ہے۔ بیگم صاحبہ۔ بس ٹھیک ہے۔ ذرا سا ہی تو خون نکلا۔"
ثومی نے انگلی پھول کی پتی سے صاف کرتے ہوئے کہا۔

"خون۔ یہ۔ خون" مہ جبین خدا جانے کیا کہنا چاہتی تھی۔ اس خون کو دیکھ کر کسی بھولی بسری یاد نے ذہن میں ڈنک مارا تھا۔ یا یونہی خوف زدہ تھی۔ بہرحال وہ سخت مضطرب و بے چین نظر آنے لگی۔

ثومی نے اس کا دھیان دوسری طرف لگانے کو پوچھا۔ "ان پھولوں کا کیا کریں گی آپ۔"

"ان کا۔ ہاں۔ ان کے گجرے بناؤں گی۔"

"گجرے۔۔۔؟"

"ہاں۔ تمہاری کلائیاں ننگی ہیں نا۔ تمہیں پہناؤں گی۔ اتنی خوبصورت کلائیاں اور بالکل ننگی۔ مجھے اچھی نہیں لگتیں۔"

کمرے میں آکر اس نے سارے

"سوئی تاگہ دو مجھے۔" اس نے برابر کے پھول ایک جگہ کرتے ہوئے کہا۔ ثومی نے سوئی میں لمبا سا تاگا ڈال کر اسے دے دیا۔

مہ جبین بڑے انہماک سے کام میں مصروف ہو گئی۔ بڑے پیار سے پھولوں کے گجرے بنانے لگی۔

ثومی کی طبیعت آج کچھ بہت ہی بوجھل ہو رہی تھی۔ جی بھر بھر آ رہا تھا۔ آبگینوں کو ٹھیس لگنے والی بات تھی۔ مہ جبین نے جب پیار سے اسے گجرے پہنا کر اس کے ہاتھ چوم لیے۔ تو ثومی کی آنکھوں میں گھر گھر آنے والی گھٹائیں بوندا باندی پہ اتر آئیں۔ چپکے سے اس نے نم آنکھوں کے گوشے اپنی انگلی کی پور سے صاف کیے۔ وہ اس نیم پاگل عورت کی دیوانی محبت سے بڑی ہی متاثر ہوئی تھی۔ خدا جانے

ان مظلوم کو فریب کھا کر کیا لطف ملتا تھا۔ جو اپنی تمام تر محبت اس کی ذات پہ دل نچھاور کر رہی تھی۔

"شائستہ۔" مہ جبین نے بغور ثومی کو دیکھتے ہوئے خواب آلود لہجے میں کہا۔

"جی۔" ثومی بولی۔

"تم خوش نہیں ہو ثمیں۔"

"جی۔ جی۔ بہت خوش ہوتی ہوں۔"

"تو پھر رونے کیوں لگیں۔"

"رو تو نہیں رہی تھی۔"

"میں نے تمہاری آنکھوں میں آنسو دیکھے ہیں۔ تم مجھ سے چھپا رہی ہو۔"

"جی بالکل نہیں۔" ثومی نے کہا۔ دل اس وقت اس زخم کی طرح ہو رہا تھا۔ جو پھاہے سے بھی دکھ جاتا ہے۔ خلوص اور محبت کی فراوانی بھی بعض اوقات کانٹے کی طرح چبھ جاتی ہے۔ ثومی کو شدید بسیار کے باوجود آنسو نہ روک سکی۔

"شائستہ۔" مہ جبین نے گھبرا کر اسے اپنے سینے سے لگا لیا۔ ثومی بے اختیار ہو ہو کر رو دی۔ اپنی ذات کی تنہائی کا احساس سینے میں تیر کی طرح چبھ رہا تھا۔

"تمہیں گجرے پسند نہیں آئے نا۔" مہ جبین نے بے تابی سے پوچھا۔

"جی۔ ایسی بات نہیں۔" ثومی نے سنبھلتے ہوئے کہا۔ خائف بھی ہوئی۔ اس کی جذباتی لغزش کہیں مہ جبین کو الجھن میں ڈال کر اس کے کسی خوفناک دورے کی ابتدا نہ بن جائے۔

اپنی زندگی کو خزاں رسیدہ پتے کی سی تھی ہی۔ ہوائیں جہاں چاہیں اڑا کر لے جائیں۔ بے مقصد ڈولتا ہوا سوکھا پتہ۔ جو شاخ سے جدا ہو چکا تھا۔ مہ جبین کی خاطر ثومی نے آنکھیں خشک کر لیں۔ چہرے پر مسکراہٹ سجا لی۔ لیکن وہ تو

اب بڑی ہی متفکر تھی۔ بار بار کہہ رہی تھی۔

"تمہیں گجرے پسند نہیں آئے۔"

شام کھانے پر مہ جبین نے آفتاب عالم سے ان گجروں کا ذکر کیا۔ کچھ دنوں سے مہ جبین کھانے کے کمرے میں سب کے ساتھ کھانا کھانے لگی تھی۔ اس طرح وہ کافی بہلی رہتی۔ یہ محض ثومی کی صحبت کا اعجاز تھا۔

آفتاب عالم ثومی کا احسان مند تھا۔ اور اس احسان مندی کا وہ جس جس طرح اظہار کرتا تھا۔ ثومی کو اپنی جگہ ندامت سی بھی محسوس ہوتی تھی۔ اتنا بڑا رئیس۔ اتنا باوقار انسان اک چھوٹی سی غیر معروف ہستی کے احسانات تلے اپنے کو دبا پاتا تھا۔ ثومی کو اس بات سے کوفت ہوتی تھی۔

"شائستہ کو پھولوں کے گجرے پسند نہیں ہیں۔" مہ جبین نے نوالہ توڑتے ہوئے کہا۔ "میں سوچ رہی تھی۔"

"کیا؟" آفتاب عالم نے پیار سے ثومی کو دیکھا۔ پھر مہ جبین کی طرف متوجہ ہوا۔

"میری چوڑیاں کہاں ہیں۔" ایک دم مہ جبین بولی۔ "میری چوڑیاں۔"

"ہاں ہاں آپ کی ڈھیروں چوڑیاں پڑی ہیں۔" آفتاب عالم مہ جبین کو سوچتے ہوئے دیکھ کر ایک دم بولا:

"کہاں ہیں؟"

"سیف میں۔"

"کس کی سیف میں۔"

"آپ کی۔"

"اب تک بتایا کیوں نہیں تھا۔"

"آپ نے کبھی پوچھا ہی نہیں۔"

"میں بھی حیران تھی۔ شائستہ کی کلائیاں ننگی کیوں ہیں۔ ساری چوڑیاں سیف میں بند کر دیں آپ نے۔" "ہیں۔ میں ساری چوڑیاں شائستہ کو پہناؤں گی۔"

"ضرور۔ ضرور۔"

"آپ کھانا تو کھائیے نا۔" ثومی نے مہ جبین کو پیار سے چاول پیش کیے۔

"پہلے چوڑیاں پہن لو۔"

"نہیں۔ پہلے کھانا کھائیے۔ نہیں تو۔" "میں نہیں پہنوں گی۔"

مہ جبین ثومی کی بات مان گئی۔ اس نے آہستہ آہستہ کھانا ختم کیا۔

ثومی ڈر رہی تھی۔ اب اس کا جنون اسے زیور سے لادنے کی طرف کہیں نہ چل پڑے۔ لباس اور رہائش تو اس نے قبول کر لی تھی۔ لیکن یہ زیور کی ذمہ داری۔ اسے تو خوف سا آنے لگا تھا۔ اس نے شکر کیا۔ کھانے کے دوران مہ جبین کا دھیان دوسری طرف بٹ گیا۔ وہ زیور کو بھول گئی۔

رات ثومی بستر پر لیٹی تو طائر خیال پھر کہیں سے کہیں بے اڑا۔ اس طلسماتی دنیا کے متعلق بھی سوچتی رہی اور اس حقیقی دنیا کے متعلق بھی۔ جہاں وہ زندگی کے بڑے بھلے دن کاٹ آئی تھی۔ جہاں اس نے جوانی کا حسین سپنا بھی دیکھا تھا لیکن یہ سپنا دھوئیں کے بادلوں کی طرح اڑ گیا تھا۔

کلیم۔ کلیم۔! وہ روح کی پکار کے سامنے اب تو عاجز آ گئی۔ لیکن مجروح انا کی چنگھاڑ کے سامنے کچھ نہ کر سکتی تھی۔

کو کئی دنوں سے دردِ سر کی شکایت تھی۔ گردن کے پٹھوں میں کھچاؤ محسوس ہوتا تھا۔ کسی وقت تو تکلیف اتنی بڑھ جاتی۔ کہ سب پریشان ہو جاتے۔ اس کا خاندانی معالج ڈاکٹر اسلم مایوس ہو چکا تھا۔

ان دنوں شہر کے نئے ڈاکٹر کی دھوم دُور دُور تک پھیل چکی تھی۔ اس کے دستِ شفا کے چرچے تھے۔

آفتاب عالم کے ایک قریبی دوست نے اس ڈاکٹر کو بلا کر دکھانے کا مشورہ دیا۔ آفتاب عالم نے ڈاکٹر اسلم سے بات کی۔

"جی ہاں ۔ ضرور انہیں دکھا دیجئے۔ میں نے بھی ان کے متعلق بہت کچھ سنا ہے۔ خدا کرے بیگم صاحبہ کی تکلیف ان کے ہاتھوں رفع ہو جائے۔"

"تو پھر ان سے رابطہ قائم کیا جائے؟"

"ابھی ٹیلیفون کر دیجئے۔"

"خود کیوں نہ چلا جائے ان کے پاس۔"

"جیسے آپ کی مرضی۔"

"آپ بھی ساتھ چلیئے۔ ان کو سارا کیس بھی تو سمجھانا ہوگا۔"

"میں ان سے فون پر وقت لے لوں گا۔ کل ان سے مل لیا جائے گا۔"

"یہ ٹھیک ہے۔"

دوسرے دن آفتاب عالم ڈاکٹر اسلم کے ساتھ ڈاکٹر کے پاس گیا۔ نوجوان ڈاکٹر

ش خلقی سے دونوں متاثر ہوئے۔

اسلم نے سارا کیس ڈاکٹر کے گوش گزار کرتے ہوئے دردِ سر کی مسلسل شکایت خلق بات کی۔

ڈاکٹر چند لمحے کچھ سوچتا رہا۔ پھر آہستگی سے بولا۔ "یہ کیس تو خالص نفسیاتی نوعیت ے۔ بہر حال میں آج شام مریضہ کو دیکھنے آؤں گا۔ مجھے خود بھی نفسیات سے پی ہے۔ ویسے میں ڈاکٹر الٰہی بخش سے بھی اس سلسلہ میں تفصیلاً بات کروں گا۔"

"ڈاکٹر الٰہی کون؟" آفتاب عالم نے پوچھا۔

"ماہرِ نفسیات ہیں۔ حال ہی میں کراچی سے تبدیل ہو کر یہاں آئے ہیں۔ کراچی میں نے تقریباً تین سال ان کی رہنمائی پائی ہے۔ مجھے امید ہے وہ اس کیس کو ہاتھ میں لیں ۔ اور ان کی محنت، تجربے اور کوشش سے مریضہ صحت یاب ہو جائیں گی۔"

"شکریہ ڈاکٹر۔" آفتاب عالم نے فرطِ جذبات سے مغلوب ہو کر گھٹی ہوئی آواز کہا۔

"میں انشاء اللہ شام چار بجے مونا والی پہنچ جاؤں گا۔"

اور ٹھیک شام چار بجے ڈاکٹر کی فوکس ویگن حویلی کے صدر دروازے پر تھی۔ دربان نے آگے بڑھ کر تعظیم دی۔ اور پھر رفیق کو بلا کر ڈاکٹر صاحب کے ساتھ کر دیا۔

رفیق ڈاکٹر کو آفتاب کے عالی شان دفتر میں لے آیا۔

آفتاب نے اٹھ کر بڑے تپاک سے اس کا خیر مقدم کیا۔ عزت سے آبنوسی میز کے دوسری طرف بچھی چمڑے کی آرام دہ کرسی پہ بٹھایا۔ ڈاکٹر نے طائرانہ سی نظر ش قیمت نایاب چیزوں پر ڈالی۔ پھر ادھر ادھر کی چند ہی باتوں کے بعد ڈاکٹر نے ریضہ کے متعلق باتیں پوچھنا شروع کر دیں۔

"میں نے آج ڈاکٹر الٰہی سے پوری تفصیل سے بات کی ہے۔ مریضہ کے دردِ سر

کی تکلیف کچھ ایسی تشویش ناک نہیں ہے۔"

"لیکن وہ بڑی تکلیف میں ہیں ڈاکٹر۔ رات تو بڑی بے چین تھیں۔"

"ڈاکٹر الٰہی کے خیال کے مطابق یہ تکلیف بھی نفسیاتی نوعیت کی ہے۔ ان کے خیال کے مطابق لاشعور میں یادیں زندہ و تابندہ ہیں۔ لیکن لاشعور کا رابطہ شعور سے کٹ گیا ہے ـــ انہیں حال اور ماضی کی کڑیاں ملانے کی راہ نہیں ملتی۔ ہو سکتا ہے۔ درد سر کی یہی تکلیف ان کی صحت کی ضامن بن جائے۔"

"آفتاب عالم بغور ڈاکٹر کی باتیں سن رہا تھا۔

"کیا بھابی ٹھیک ہو جائیں گی۔" وہ بے تابی سے بولا۔

"فی الحال کیا کہہ سکتا ہوں۔" اس نے کہا۔ "ابھی تو میں نے مریضہ کو دیکھا بھی نہیں۔ ان کی تکلیف کی نوعیت کیا ہے؟ دورے کب پڑتے ہیں۔ دردوں کی شدت کیسی ہوتی ہے۔ یہ سب کچھ دیکھ کر ہی بتا سکوں گا۔ کچھ وقت ان کے ساتھ گزار کر ہی کسی نتیجے پر پہنچ سکتا ہے۔"

"اور یہ درد سر"

"اس کی فکر نہ کیجئے ـــ یہ وقتی ہے۔ ڈاکٹر الٰہی اور خود میرا بھی یہی خیال ہے۔"

"خدا کرے آپ فرشتۂ رحمت ثابت ہوں۔"

"اللہ تعالیٰ شفا دینے والا ہے۔ میں اپنی طرف سے پوری کوشش کروں گا۔ ڈاکٹر الٰہی بھی بھرپور تعاون کریں گے۔"

"خدا کرے بھابی اچھی ہو جائیں۔ آپ بھرپور کوشش کیجئے گا ڈاکٹر۔"

چائے پینے کے بعد ڈاکٹر نے وہ سارے نسخے دیکھے۔ جو اتنی مدت میں آزمائے جا چکے تھے۔

"چلئے آفتاب صاحب مجھے مریضہ سے ملا دیجئے۔" ڈاکٹر نے فائل ایک طرف

رکھتے ہوئے کہا۔

"بہتر۔" آفتاب اٹھا۔"

آفتاب عالم نئے ڈاکٹر کو لے کر کمرے سے باہر نکلا۔

"نصیر" آفتاب عالم نے ستون کے قریب بیٹھے ملازم کو پکارا۔

"جی صاحب" وہ لپک کر آیا۔

"بیگم صاحبہ کو ڈاکٹر صاحب دیکھنے آ رہے ہیں۔ جا کر فوراً اطلاع کر دو۔" آفتاب عالم نے کہا۔

"بہت اچھا سرکار۔" اس نے سر جھکاتے ہوئے سینہ پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ نصیر لمبے لمبے ڈگ بھرتا دائیں ہاتھ مڑ گیا۔ آفتاب ڈاکٹر کے ساتھ خراماں خراماں طویل برآمدے کو طے کرنے لگا۔ ڈاکٹر کو اس حویلی کی طلسماتی فضا بڑی اچھی لگی۔ اس کی نظر دور تک پھیلے ہوئے خوبصورت اور آراستہ چمنوں پر تھی۔ جگہ جگہ کے پارسنگ مرمری جالیوں والے مغلئی طرز کے طویل برآمدے تھے۔

حویلی کی لٹی پٹی شان کا یہ عالم تھا۔ تو جب یہاں رونقوں کا عنفوان شباب ہوگا کیا رنگ ہوگا۔ ڈاکٹر سوچ رہا تھا۔

آفتاب عالم، مہ جبین ہی کی باتیں کر رہا تھا۔ کس شدت سے اسے اس کے نارمل ہو جانے کی تمنا تھی۔ اس کے ضمیر کا بوجھ صرف اسی طرح ہلکا ہو سکتا تھا۔ کہ مہ جبین ٹھیک ہو جائے۔ اور وہ اس کے قدموں پر جھک کر اعتراف گناہ کر کے اپنے آپ کو بڑی سے بڑی سزا کے لیے پیش کر دے۔

گو سزا بھگتتے انیس برس بیت چکے تھے۔ کون نہیں جانتا۔ کہ جسمانی سزا سے ذہنی اور روحانی سزائیں کہیں زیادہ اذیت دہ ہوتی ہیں۔ پھر بھی وہ اپنے آپ کو معاف نہیں کر رہا تھا۔ اس سے بھی بڑی اور کڑی سزا کا مستوجب قرار دے رہا تھا

اپنے آپ کو۔

مہ جبین کے سر میں ہلکا ہلکا درد تھا۔ وہ اپنے نرم بستر میں تقریباً دھنسی ہوئی تھی۔ ریشمی لحافے تکیے پر سر رکھے آنکھیں بند کیے ہوئے تھی۔ مسہری کے پرلی طرف ایک سٹول پر ثومی بیٹھی دھیرے دھیرے اس کا سر سہلا رہی تھی۔ مہ جبین کیف و سرور سے لطف لے رہی تھی۔ ثومی کے ہاتھوں کا لمس اس کے لیے تو تسکین دہ تھا۔

ثومی نے سفید ریشمی بے داغ لباس پہن رکھا تھا۔ تصنع اور بناوٹ نام کی کوئی آرائشی چیز اس کے چہرے پر نہ تھی۔ چہرہ شگفتہ ہرگز نہیں تھا۔ اک نامحسوس سی پژمردگی نے حسن کو اور نکھار بخش دیا تھا۔ بڑی بڑی خوبصورت آنکھوں میں پہلے پہلے اضطراب کی لہریں آنکھوں میں سرخی بن کر پھیلی ہوئی تھیں۔ یہ سرخی نہ تھی کائنات کو تسخیر کر لینے کا جادو تھا۔

آفتاب عالم ڈاکٹر کو لے کر اندر آ گیا۔

ڈاکٹر — جو کلیم کے سوا کوئی اور نہ تھا۔

کلیم کی نظریں ثومی پر پڑیں — وہ ساکت سا کھڑا رہ گیا۔ ثومی کا ادھورا لفظ اس کے ہونٹوں پر تھرک گیا۔ اس کا دل بے اختیار ہو کر دھڑک اٹھا۔

قدموں کی آواز پر ثومی نے بھی سر اٹھایا تھا۔ کلیم کو یوں اچانک غیر متوقع طور پر دیکھ کر اس کی آنکھیں اور منہ کھلا کا کھلا رہ گیا تھا۔

"تشریف لائیے ڈاکٹر صاحب" آفتاب عالم نے ڈاکٹر کو دروازے میں کھڑے دیکھ کر کہا۔

کلیم کی نظریں لڑکھڑائیں۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھ عالم اضطراب میں مسل ڈالے۔ سر کو جھٹکا دے کر آنکھیں کھول کر بند کیں اور بند کر کے کھولیں۔

یقیناً یہ خواب نہیں تھا۔ ثومی ہی تھی۔ جو مسہری کے پرلی طرف بیٹھی اسے حیرت زا نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

آفتاب کے دوبارہ بلانے پر کلیم سنبھلا۔ نپے تلے قدموں سے مسہری کے قریب آ کر رک گیا۔ ثومی کے چہرے پر زردی کھنڈ چکی تھی۔ اس کی جھکی ہوئی پلکیں کانپ رہی تھیں اس نے مہ جبین کی پیشانی پر رکھا ہاتھ کھینچ لیا۔

"تشریف رکھیئے۔" مسہری کے قریب پڑی کرسی کی طرف آفتاب عالم نے اشارہ کیا۔ کلیم بیٹھ گیا۔ دوسری کرسی آفتاب نے اپنے لیے قریب کر لی۔

کلیم اب بھی گنگ سا ثومی کو تکے جا رہا تھا۔

ثومی جیسے مہلتوں کی تلاش بسیار کے باوجود پا نہ سکا تھا۔ قدرت کے انمول عطیے کی طرح آج خود بخود مل گئی تھی۔

یہ اس کے شدید جذبوں کی کشش تھی۔ کلیم کا دل اس کا فرادا محبوب کو سینے کی گہرائیوں میں سمیٹ لینے کو تڑپنے لگا۔ ثومی کی رنجش اپنی جگہ صحیح سہی۔ لیکن کتنی بڑی، کتنی کٹھن اور کتنی ناروا سزا دی تھی اس نے اسے۔ یوں روپوش ہو کر۔

"بھابی۔" آفتاب شاید مہ جبین کو متوجہ کر رہا تھا۔ کلیم کی روح ہمہ گوش ثومی کی دھڑکنیں سن رہی تھی۔ لیکن اپنے آپ کو بے قابو ہونے سے بچانا بھی ضروری تھا۔ کلیم بھی کوشش سے اپنی توجہ مہ جبین کی طرف مبذول کرنے لگا۔

"شائستہ —" مہ جبین نے آنکھیں بند کیے کہا۔ شاید اس نے آفتاب کی آواز نہیں سنی تھی۔

"جی —" ثومی کی آواز رک گئی۔

"دباؤ نا میرا سر —" مہ جبین نے آہستگی سے کہا۔ "کتنا سکون مل رہا تھا مجھے تمہارے ہاتھوں سے —"

شائستہ — ثومی — ثومی — شائستہ — کلیم حیران ہو کر کبھی ثومی اور کبھی مہ جبین کو دیکھنے لگا۔

آفتاب عالم نے پھر مہ جبین کو پکارا۔ اس نے آنکھیں کھول دیں۔

"ڈاکٹر صاحب آئے ہیں۔ ہمارے نئے دوست۔ بہت خلیق بڑے ملنسار آپ کو ملنے آئے ہیں۔"

مہ جبین تکیے کے سہارے اٹھ کر بیٹھ گئی۔ ثومی اس کے پیچھے آڑ میں ہو کر بیٹھ گئی اس کی حالت غیر ہوئی جا رہی تھی۔ وہ اپنی کوئی کمزوری کسی پر بھی ظاہر ہونے نہ دینا چاہتی تھی۔

مہ جبین نے کلیم سے خوش دلی سے باتیں کیں۔ لیکن جتنی باتیں بھی ہوئیں۔ ان میں ثومی کو شائستہ کہہ کر ضرور شامل کیا۔

نام کی تبدیلی کا مسئلہ کلیم حل نہ کر سکا۔ تقریباً بیس منٹ وہ وہاں بیٹھا رہا۔ ثومی گفتگو کے دوران اٹھ کر چلی گئی تھی۔ اس کے چہرے پر جو جامد سناٹے کلیم نے دیکھے تھے۔ ان کی اپنی نوعیت کا اسے احساس تھا۔

برآمدے میں آفتاب عالم کے ساتھ ساتھ چلتے جب وہ مہ جبین کے بارے میں آفتاب عالم سے باتیں کر رہا تھا۔ تو شائستہ کا ذکر بھی آ گیا۔ اسے ثومی کے شائستہ بننے پر الجھن ہو رہی تھی۔ اب برداشت کا حوصلہ تھا نہ صبر کا یارا۔ اس نے پوچھ ہی لیا

"اس لڑکی کا نام شائستہ نہیں۔"

"جی ہاں۔" آفتاب بولا۔ "اس کا نام ثومی ہے۔ کیا آپ اسے جانتے ہیں۔"

"جی ہاں۔" کلیم کی الجھن رفع ہو گئی۔

"ثومی سے شائستہ، مہ جبین بھابی نے بنا دیا۔" آفتاب عالم نے اک ٹھنڈی آہ بھری۔ شائستہ ان کی مرحومہ بچی کا نام تھا۔ حیرانگی کی بات ہے۔ ثومی کو شائستہ کہہ کر پکارا۔ حالاں کہ ہمارے خیال میں شائستہ نام ان کی یادداشت کے ساتھ ہی جا

ل چکا تھا۔ ہمارے لاکھ بار یاد کرانے پر بھی یہ نام انہیں مانوس نہیں ہوتا تھا۔ ثومی کو شائستہ کہا۔ خفا کر کے شائستہ کہا۔"

ہوں" کلیم سوچ میں ڈوب گیا۔

جب سے یہ لڑکی یہاں آئی ہے بھابی بہت حد تک سنبھل چکی ہیں۔ دورے اب تے ہیں۔ لیکن اس طرح کے طوفانی نہیں ہوتے۔ ایک خاص بات جو میں نے نوٹ ے۔ وہ یہ ہے کہ پہلے جب دورے پڑتے تھے تو اٹھ اٹھ کر بھاگتی تھیں۔ اور لوں کے پیچھے یوں دیکھتیں۔ جیسے کچھ تلاش کر رہی ہیں۔ اب دورہ پڑتا ہے ی دیر بعد بے ہوش ہو جاتی ہیں۔ تلاش چھوڑ دی ہے۔"

لیم کی نظروں میں سوچ الجھی ہوئی تھی۔ اس بیان سے جیسے وہ کوئی سرا ڈھونڈنے شش کر رہا تھا۔ کتنی ہی دیر وہ خاموش کھڑا بے معنی نظروں سے خلا میں گھورتا پھر آہستگی سے بولا!

مجھے ابھی ان کے دوروں کی نوعیت کا تو کچھ پتہ نہیں۔ وہ تو تجربہ کروں گا سکوں گا۔ ہاں یہ بات وثوق سے کہی جا سکتی ہے۔ کہ ان کی ممتا مردہ نہیں اور ثومی سے والہانہ چاہت یا اسے شائستہ کہنا اس بات کا غماز ہے کہ ے ذہن میں ممتا کا مرکز کوئی ایسی ہی شبیہہ ہے۔" کلیم نے سلجھے ہوئے انداز ا پھر کچھ دیر سوچتا رہا۔ آفتاب عالم مضطرب نظر آ رہا تھا۔

ان کی بیٹی شائستہ یقیناً خوبصورت بچی ہو گی۔!" کلیم نے پوچھا۔

بعد خوبصورت۔" آفتاب عالم کے سینے میں دلخراش یادیں چبھ رہی تھیں۔ یں سمجھ گیا۔ کلیم بڑبڑایا۔ ثومی سے ان کی یہ وابستگی اسی کا نتیجہ ہے۔ وہ لاشعوری اس سے وہی طرز عمل چاہتی ہیں۔ جو شائستہ کا ہونا چاہیئے تھا۔ اور خود ی طرح پیش آتی ہیں۔ جیسا اک ماں — ہوں۔" کلیم لب بھی سوچوں میں

گم تھا۔

"بالکل ڈاکٹر صاحب ۔ میں آپ کو بتا چکا نا ۔ کہ وہ ثومی کو کبھی ننھی سی بچی سمجھ لیتی ہیں ۔ کبھی اس کے بال سنوارتی ہیں ۔ کھانا کھلاتی ہیں ۔ گود میں سر رکھ کر تھپک تھپک کر لوریاں دیتی ہیں ۔ بہت زیادہ بہل گئی ہیں ۔ کبھی کبھی تو اس طرح لگتا ہے کہ بیماری بہانہ ہے ۔ اچھی بھلی خوش باش ۔"

کلیم کے ہاتھ ان کی بیماری کا اصل سرا آ گیا تھا ۔ وہ بہت زیادہ پُر امید نظر آ رہا تھا ۔ ضرورت مہ جبین کے مطالعے اور مشاہدے کی تھی ۔ وہ ان کے قریب رہ کر ہی یہ عمل کر سکتا تھا ۔ ایک دن دو دن کا کام نہیں تھا ۔ مہینوں میں بھی بیماری کا تجزیہ ہونا تو بڑی بات تھی ۔

کل آنے کا وعدہ کر کے ڈاکٹر برآمدے ہی سے بیرونی صدر دروازے کی طرف چل دیا ۔ آفتاب عالم نے مصافحہ کرتے ہوئے اس کا شکریہ ادا کیا ۔

کلیم کے من کی ادھیڑ بُن اسے بے قرار کیے ہوئے تھی ۔ مہ جبین کا کیس تو جو تھا سو تھا ۔ ثومی کو آج اچانک دیکھ لینے سے اس کی حالت عجیب ہو رہی تھی ۔ بے پایاں خوشی درد میں ڈوبی ہوئی تھی ۔ اپنے رویے کی سفاکی اور بہیمیت ثومی کے چہرے پر مسلط جامد سناٹوں سے کچھ زیادہ ہی دکھ دینے لگی تھی ۔

درد سے تو شناسائی تو مہینوں سے تھی ۔ آج لذتِ درد کا انوکھا تجربہ ہو رہا تھا ۔ وہ الجھے الجھے دل و دماغ سے اپنی موٹر کی طرف جا رہا تھا ۔ شام ڈھل رہی تھی ۔ خوبصورت ریشمی اندھیروں کا جال پھیل رہا تھا ۔ اترتی شام کا حسن حویلی کے وسیع عریض مہکتے چمنوں میں بڑا ہی فسوں خیز تھا ۔

وہ ابھی اپنی گاڑی تک پہنچ نہ پایا تھا ۔ کہ پھولوں سے لدی پھندی بوگن ویلیا کی تلے اس نے ثومی کو دیکھا ۔ چند لمحے وہ اسے دیکھتا رہا ۔

ثومی شاید اسی کے انتظار میں کھڑی تھی ۔ چند قدم اٹھا کر اس کے قریب آ گئی ۔

"ثو ۔ می" کلیم کے صبر و ضبط کی طنابیں ٹوٹ گئیں ۔ تڑپ کر وہ اس پر جیسے ٹوٹ پڑا ۔

کچھ ایسی ہی تڑپ سے ثومی پیچھے ہٹ گئی ۔ "ڈاکٹر صاحب ۔" اس نے ٹھہری آواز میں کہا ۔

"ثومی ۔" اس اجنبی لب و لہجے سے کلیم کا دل مسلا گیا ۔

"ڈاکٹر صاحب ۔ میں نہیں چاہوں گی ۔ کہ میری یہاں موجودگی کا وہاں کسی کو بھی علم ہو" اس نے ٹھوس سنجیدہ سی آواز میں حکم نما درخواست کی ۔ کلیم کچھ کہنے کو تھا ۔ کہ جلدی سے بولی : "اور ممکن ہے تو یہاں بھی ۔ میرے آوارہ لہو کا تذکرہ ـــــ نہ ہو گا ۔"

"ثو ـــ می ـــ" کلیم ایسے شدید وار کا یقیناً متوقع نہیں تھا ۔ اس نے اپنا لب دانتوں تلے دبا لیا ۔

ثومی پلٹ کر جا چکی تھی ۔ کلیم ساکت و جامد وہیں کھڑا تھا ۔ ثومی نے کتنا بھرپور وار کیا تھا ۔ کتنی تلخی انڈیلی تھی ۔ کیسا بے رحم حملہ کیا تھا ۔ کلیم تڑپ گیا ۔

تڑپ کچھ وہ بھی کم نہ رہی تھی ۔

رات یوں گزری ۔ جیسے سرکنڈوں پر کروٹیں لیتی رہی ہو ۔ روتے روتے تکیہ بھیگ گیا ۔ بڑی مشکل سے اس نے حالات سے مصالحت کر کے اپنے دل و دماغ کو نئے سانچے میں ڈھالا تھا ۔ وہ ایمان شکن یہاں بھی آ پہنچا تھا ۔ بے درد رہزن ۔ جس نے لوٹ کر سبھی کچھ لوٹ لیا تھا ۔ وہ اسے کبھی معاف نہ کر سکتی تھی ۔ اس کی مجروح انا میں خورد انا معافی کی متحمل ہی نہ ہو سکتی تھی ۔

آج کئی دنوں بعد اسے اپنی آوارہ ماں کا خیال تپتی ہوئی سلاخوں کی طرح جھلس

رہا تھا۔ کاش وہ ڈائن اسے کہیں مل جاتی۔ وہ اپنے ہاتھوں سے اس کا گلا دبا دیتا۔
ایک ماں نے کتنا بڑا ظلم کیا تھا۔ کاش پیدا ہوتے ہی اس کا گلا گھونٹ دیا
ہوتا۔ جرم یوں بھی تو چھپایا جا سکتا تھا۔

اپنی ماں کے ساتھ اسے مہ جبین کا خیال آیا۔ کتنی عظیم کتنی مقدس تھی یہ عورت
مر جانے والی بچی پر ہوش و حواس تک قربان کر ڈالے تھے۔ وہ مسہری کے پہلو
پردوں میں سوئی ہوئی مہ جبین کا عظیم پیکر عقیدت بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے
اپنی ڈائن ماں کو کوستی رہی۔

پھر اسے خوف ڈسنے لگا۔ اگر یہاں بھی سب کو علم ہو گیا۔ تو۔ تو۔ وہ کیا
کرے گی۔ یہاں سے کہاں جائے گی۔ اتنی اہمیت، محبت، شفقت اور عزت
پانے کے بعد ذلت و رسوائی کیونکر جھیلے گی۔

ثومی ٹوٹتی اکھڑتی نیند میں یہی سوچتی رہی۔

ثومی کو یوں اچانک پا کر کلیم نے جیسے ہفت اقلیم کی دولت پالی تھی۔ گو
ثومی کے ملا لمانہ وار اور بے درد پیغام سے وہ افسردہ ہو گیا تھا۔
تاہم اسے اپنے چاروں طرف خوشیوں کی نرم نرم پھوار پڑتی محسوس ہو رہی تھی۔
کئی ماہ کی چھائی ہوئی کہر چھٹ کر ہر طرف روشنی ہی روشنی پھیلی ہوئی لگتی تھی۔
ثومی اس سے شدت کی آخری حد تک ناراض تھی۔ لیکن اب وہ مل گئی تھی۔ وہ
اسے منا لے گا۔ رنجشیں ملنے ہی کے لیے تو پیدا ہوتی ہیں۔ اس کے مجنونانہ عشق نے
اس کے شوریدہ سر جذبوں کی کشش نے اس کے سوز دروں نے ثومی کو پا لیا تھا۔
سنگین اور کٹھن مرحلہ نپٹ گیا تھا۔ اب ثومی کو منا لینا کوئی مشکل بات نہ تھی۔ اپنے
رویے پر نادم ضرور تھا۔ لیکن ایکا ایکی خوشیوں کی یلغار سے دیوانہ ہوا جا رہا تھا
ثومی ـــ وہ جانِ آرزو۔ جانِ تمنا۔ اور جانِ بہاراں اب اس کی پہنچ سے دور
نہ رہی تھی۔

موناوالی سے گھر تک کا راستہ جیسے اس نے فضاؤں کے دوش پر لہراتے
طے کیا۔ راستے میں کئی بار گاڑی بے قابو ہو ہو گئی۔

نتھو برآمدے کی بتی جلانے کے بعد ابھی سوچ بورڈ کے پاس ہی کھڑا تھا
کہ کلیم گاڑی سے بڑے والہانہ لہراؤ سے باہر نکلا۔

"ثومی مل گئی نتھو۔ ثومی مل گئی۔" اس نے سب سے پہلے یہ خبر نتھو کو سنائی۔

"ثومی مل گئی۔" نتھو نے بدھو بنتے دہرایا۔ اور پھر اس جملے کا مطلب سمجھ

کر چیخا۔ "صاحب۔ ثومی مل گئی۔؟"

"ہاں نتھو۔ ثومی مل گئی۔ ثومی مل گئی۔" وہ نتھو کے کندھے پکڑ کر جھنجھوڑتے ہوئے کمرے کے اندر چلا گیا۔

نتھو حیران حیران آنکھیں جھپکتے کھڑے کا کھڑا رہ گیا۔

"اماں۔" کلیم نے بلند آواز میں ماں کو پکارا۔ جواب نہ پا کر وہ ایک کمرے سے دوسرے اور دوسرے سے تیسرے میں گیا۔

"اماں۔" اس نے پچھلے برآمدے میں کھڑے ہو کر پکارا۔ پھر باورچی خانے میں گیا۔ اماں کہیں نہ تھیں۔ وہ واپس کمرے میں آیا۔ نتھو بھی اندر آ گیا۔

"اماں۔" کلیم نے عالمِ وارفتگی میں پکارا۔

"وہ گھر پہ نہیں ہیں۔"

"کہاں گئیں۔"

"سلمیٰ بی بی اور وہ کسی کے ہاں گئی ہوئی ہیں۔"

"اوہ۔ کب آئیں گی۔"

کلیم نے بے تابی سے کہا۔ اور پھر نتھو کے جواب کا انتظار کیے بغیر لمبے لمبے ڈگ بھرتا فرید کے ہاں چل دیا۔

لائبریری میں روشنی دیکھ کر وہ ادھر ہی لپکا۔ فرید اپنی خوبصورت اور چمکیلی میز کے سامنے بیٹھا کاغذات الٹ پلٹ رہا تھا۔

"ثومی مل گئی فرید صاحب۔" وہ اسے دیکھتے ہی چیخا۔

"کیا؟" فرید کے ہاتھ سے پائپ نیچے گر گیا۔ وہ کرسی سے اچھل کر اٹھا۔ کلیم اس کی طرف بڑھا۔ اور فرطِ جذبات سے مغلوب ہو کر دونوں نے آپس میں لپٹ گئے۔

"ثومی مل گئی فرید صاحب۔ ثومی مل گئی۔" جنون چیخ رہا تھا۔ اور پدری محبت پگھل پگھل کر سیال بن گئی تھی۔

"کہاں ملی، کیسے ملی۔" چند لمحوں کی غیر اختیاری وارفتگی کے بعد فرید نے کلیم کو اپنے سے الگ کرتے ہوئے کرسی پہ بٹھا دیا۔

کلیم نے ساری روئداد سنا ڈالی۔

"شکر ہے تیرا بارالہا!" فرید نے ڈبڈبائی آنکھوں سے کہا۔

"ثومی اپنے شایانِ شان جگہ پہ پہنچ گئی ہے فرید صاحب۔" کلیم نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔

"جہاں تک میرے علم میں آیا ہے۔ وہ وہاں ملازمہ کی نہیں بیٹی کی حیثیت سے رہ رہی ہے۔ اس نیم پاگل عورت کی کہانی بھی بڑی پُر درد ہے۔ اس کی چند روزہ بچی کسی حادثے میں جاں بحق ہو گئی تھی۔ اسی کے صدمے میں اس کا ذہنی توازن بگڑا تھا۔ اب وہ ثومی کو عالمِ جنون میں اپنی بیٹی سمجھ رہی ہے۔ میں نے یہ کیس لے لیا ہے مجھے بڑی توقع ہے ثومی کی ذات اس عورت کے نیم پاگل پن کو دور کرنے میں ممد و معاون ثابت ہو گی۔ خیر فرید صاحب۔ اب۔ آپ اپنے ذہن کے سارے بوجھ جھٹک دیجئے۔ خدا تمہیں اس کارِ خیر کا اجر دے ڈاکٹر۔" فرید نے ہاتھوں سے چہرہ ڈھانپ لیا۔ "مجھ گنہ گار۔"

"آپ بار بار ایسا نہ کہیں فرید صاحب۔ انسان غلطی کا پیکر ہے۔ غلطی سے تو فرشتوں کے دامن ہی پاک ہوتے ہیں۔ اپنے گناہ کی آپ نے سزا بھی بھگت لی۔ اب آپ ثومی کے متعلق کوئی غم، کوئی فکر نہ کریں۔ اس کی ذمہ داری اب آپ اپنے اوپر نہ سمجھیں۔ یہ ذمہ داری مجھے سونپ دیں۔"

کلیم کے مخلصانہ انداز سے فرید نادم ہو گیا۔ کلیم اس کی ذہنی اور دلی حالت

سمجھ رہا تھا۔ اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بزرگانہ شفقت سے بولا۔

"آئندہ آپ ثومی کے متعلق فکرمند نہ ہوں۔ بھول ہی جائیے کہ اس کا آپ سے کوئی ناطہ ہے۔ سمجھ لیجئے۔ کہ ثومی اپنے مقام پر پہنچ گئی۔" وہ کچھ رکا اور پھر سر جھکاتے ہوئے بولا۔

"وہ مجھ سے سخت ناراض ہے۔ میرے بہیمانہ رویے سے اسے رنج پہنچا ہے لیکن میں ــــ میں اسے بہت جلد منا لوں گا۔ میں اس سے معافی مانگ لوں گا۔ پھر ــ پھر میں آپ کے سارے دکھ بانٹ لوں گا فرید صاحب۔ اب تو اماں بھی پگھل چکی ہیں۔ وہ ثومی کو گلے لگا لینے میں فخر محسوس کریں گے۔"

"آپ نے ان کو تو بتا دیا۔" فرید گھبرا کر بولا۔ پھر اس کی آواز گھٹ گئی۔

"آپ کا راز میرے سینے کی گہرائیوں میں دفن رہے گا فرید صاحب۔" کلیم نے مستحکم آواز میں کہا۔ "اسی لیے تو آپ سے بھی یہی استدعا کر رہا ہوں۔ کہ اپنے ذہن سے ہر بوجھ جھٹک دیجئے۔ گناہوں کی اس سے زیادہ سزا اور کیا مل سکتی تھی۔"

فرید سر جھکا کر میز کی سطح پر ہاتھ پھیرنے لگا۔

کلیم کچھ دیر اور بیٹھا۔ دونوں ثومی ہی کی باتیں کرتے رہے۔

اماں کو بھی رات اس نے ثومی کے متعلق بتایا۔ بیٹے کی خوشیاں ماں کو بھی عزیز تھیں ثومی کے مل جانے سے جس طرح اماں نے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا۔ وہ کلیم کو متاثر کرنے کو کافی تھا۔

"کل مجھے اس کے پاس لے چلنا۔ میں خود اسے جا کر لے آؤں گی۔" اماں نے کہا۔

"نہیں اماں ــ ابھی نہیں۔"

"کیوں؟"

"ابھی کچھ اور دن گزر جانے دیں۔"

"پر میں پوچھتی ہوں کیوں؟ کل ہی کیوں نہ جاؤں اسے لینے۔"

"وہ نہیں آئے گی۔"

"میں جانتی ہوں۔ اسے میرے رویے سے بڑا دکھ پہنچا ہے۔ لیکن۔ میں۔"

"آپ کے رویے سے شاید اتنا دکھ نہیں پہنچا۔ جتنا میرے سے ــــ"

اماں کچھ نہ سمجھ سکیں۔ کلیم نے سر جھکا کر کہا۔ "صدیق کی باتوں نے مجھے اس سے اتنا بدظن کر دیا تھا۔ کہ میں نے ــ غلط فہمی کی بنا پر اسے اتنا ذلیل کیا۔ کہ وہ یہاں سے روپوش ہونے پر مجبور ہو گئی۔"

"ہائے ہائے۔ اس کلموہے کو تو فرید صاحب نے اچھا ہی کیا جو یہاں سے نکال دیا۔ ساری آگ اس کی ہی لگائی تھی۔"

"میری غلط فہمی تو فرید صاحب نے دوسرے دن ہی دور کر دی تھی۔ لیکن۔ ثومی اب تک دل برداشتہ ہے اماں۔ فرید صاحب نے ہمیشہ اسے بیٹی سمجھا۔ بیٹی کا پیار دیا۔ لیکن اس ذلیل آدمی نے ــ خیر ــ اب ــ"

"اب اپنے کیے کو خود ہی بھگت۔" اماں نے ساری بات سن کر کہا۔ کلیم فرید صاحب کا راز خوبصورتی سے چھپا گیا تھا۔ بقول اماں سزا اسے ہی بھگتنا تھی۔ لیکن یہ سزا اتنی پیاری اتنی دلفریب تھی۔ کہ کلیم بہک بہک گیا۔

ثومی کے مل جانے کی خبر سب طرف پھیل گئی۔ جیراں اور فتو کلیم کے پاس دوڑے آئے۔ باقی نوکروں نے بھی ہلہ بول دیا۔ باتیں کرنے کو نیا موضوع جو ہاتھ آ گیا تھا۔

کلیم نے مختصراً ثومی کے متعلق سب کو بتا دیا۔ جیراں کے منہ میں تو پانی آ گیا۔ ثومی اتنے بڑے اور امیر گھرانے میں جا پہنچی تھی۔ وہ بھی ملازمہ کی حیثیت سے نہیں بیٹی کی حیثیت سے ــــ

"میں اسے کل ہی ملنے جاؤں گی۔ میرا تو دن رات کا چین حرام تھا۔" جیراں

نے مگر مچھ کے آنسو بہائے۔

"نہیں۔" کلیم نے سختی سے ڈانٹا۔ "وہاں کوئی نہیں جائے گا۔ ثومی کسی سے ملنا نہیں چاہے گی۔ وہ تو اتنا بھی نہ چاہتی تھی۔ کہ میں اس کے بارے میں یہاں کسی کو بتاؤں۔"

جیراں نے منہ لٹکا لیا۔ اس کی خوشیوں پر اوس پڑ گئی۔ ثومی کے چلے جانے سے اس کی تنخواہ کا جو خسارہ پہنچا تھا۔ جیراں تو اس کا بدل پانے سے پُر امید ہو گئی تھی۔ کلیم کی ڈانٹ سے خاموش ہو گئی۔

"ثومی یہاں امانت تھی۔ اور بس۔ اب امانت لوٹ چکی ہے۔" کلیم نے مستحکم آواز سے کہا۔

"ہمیں پالے کی محبت تو ہے سرکار۔" فتو نے آہستگی سے کہا۔

"سب میرے علم میں ہے۔" کلیم نے زہر خند سے کہا۔ جیراں اور فتو کے ہاتھوں جو جو صدمے ثومی نے جھیلے تھے۔ وہ ان سب کی روئداد سانولی اور جمو دھوبن سے سن چکا تھا۔

نوکر واپس ہو گئے۔ کلیم نے جیراں سے نرم لہجے میں کہا۔ "جب ثومی کو میں یہاں لاؤں گا۔ تو مل لینا۔ وہاں جانے کی ضرورت نہیں۔ اور اگر اسے پالنے کا معاوضہ ہی درکار ہے۔ تو میں تمہیں ضرورت سے بڑھ کر دے دوں گا۔ ثومی کا پیچھا کرنے کی ضرورت نہیں۔ سمجھ گئیں۔"

"جی۔" جیراں دل ہی دل میں خوش ہوتے بولی۔ لیکن ظاہر یوں کیا۔ جیسے ثومی کی ضرورت کو وہ شدت سے محسوس کر رہی ہو۔ رات کلیم کو اچھی طرح نیند نہ آئی۔ سوتے جاگتے میں وہ ثومی کو منا لینے کے کیف زا تصور میں ڈوبا رہا۔ جی چاہ رہا تھا۔ وہ وقت کی طوالتیں ایک جست میں پھاند جائے۔ اور حویلی میں جا کر ثومی کو اپنے بازوؤں کی آہنی گرفت میں جکڑ لے۔

مرجبین

اپنے کمرۂ نشست میں تھی۔ موسم آج بیحد نکھرا ہوا تھا۔ سردی کا خاتمہ اور بہار کی آمد آمد تھی۔ فضائیں بہار کی خوشبو سے بوجھل ہوئی جا رہی تھیں۔ ہواؤں میں ابھی تک خنکی تھی۔ لیکن یہ خنکی نئے نئے چٹکنے والے شگوفوں کی مہک چرائے ہوئے تھی۔

کمرہ انتہائی نفاست سے آراستہ تھا۔ چیزیں نایاب اور بیش قیمت تو تھیں ہی۔ لیکن ثومی نے جس حسن سے ان چیزوں کو ترتیب دی تھی۔ جس سلیقے سے آراستہ کیا تھا۔ اس سے کمرے کی ہیئت ہی بدل گئی تھی۔ اندر داخل ہوتے ہی فردوسی عناصر کا تاثر ملتا تھا۔

مرجبین صوفے پر بیٹھی تھی۔ اور نازو اس کے قریب ہی قالین پر۔ رنگ برنگے قیمتی ریشمی دوپٹے اس کے سامنے پھیلے پڑے تھے۔ نازو ان دوپٹوں پر کرنیں، نگینے اور دیگر آرائشی چیزیں ٹانک کر لائی تھی۔ مرجبین نے ثومی کے کئی نئے لباس تیار کروائے تھے۔ یہ دوپٹے انہی کے ساتھ تھے۔

"ٹھیک ہیں نا بیگم صاحب" نازو نے دوپٹے تہہ کرتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں۔ سب جا کر شائستہ کی الماری میں رکھ دو۔ ذرا آہستہ آہستہ دروازہ کھولنا۔ شائستہ کی طبیعت خراب ہے آج۔ سو رہی ہے وہ۔"

نازو اٹھنے ہی والی تھی۔ کہ کلیم آفتاب کے ساتھ اندر آیا۔

مرجبین نے مسکرا کر ڈاکٹر کا خیر مقدم کیا۔ جلدی سے بولی۔ "مجھے آپ ہی

کا انتظار تھا۔"

"میرا؟" کلیم نے قدرے حیرانی سے مہ جبین کو دیکھا۔ وہ اس وقت بالکل نارمل تھی۔

"جی ہاں ـــ شائستہ کی طبیعت خراب ہے۔" وہ قدرے پریشان ہو کر بولی۔

کلیم کا دل دھک سے رہ گیا۔ اور آفتاب جلدی سے بولا۔ "کیوں کیا ہوا اسے؟"

"سر میں شدت کا درد ہے۔" مہ جبین نے تشویش سے کہا۔ "بڑی نازک مزاج ہے۔ سر میں درد ہے اور رو رو کر برا حال کر لیا ہے۔"

کلیم کا چہرہ افسردہ نظر آنے لگا۔ وہ ثومی کے رونے کی وجہ جانتا تھا۔ اس کا دل دکھ گیا۔ جی چاہا۔ ظاہرداری اور تکلف کے سارے بندھن توڑ کر ثومی کے پاس جا پہنچے۔

"بیٹھئے ڈاکٹر صاحب۔" آفتاب صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ کلیم بے دلی سے بیٹھ گیا۔

"جاؤ نازو۔ دیکھو شائستہ سو رہی ہے یا جاگ رہی ہے۔" مہ جبین نے کہا۔

"بہتر بیگم صاحب جی۔ یہ دو پٹے بھی لے جاؤں۔"

"لے جاؤ۔ دیکھو شائستہ سوئی ہو۔ تو جگانا نہیں۔ وہ روتی رہی ہے اور اس کے سر میں درد بھی ہے۔ آہستہ آہستہ قدم اٹھانا۔"

"اچھا جی۔" نازو اٹھ کر چلی دی۔ دو پٹے اس نے کپڑے میں لپیٹ لیے۔ نازو اتفاقاً ہی ایک میز سے ٹکرا گئی۔ پیتل کا خوبصورت گلدان گرتے گرتے بچا۔

"اوہو۔" مہ جبین ہڑبڑا کر اٹھی۔ "کم بخت۔ تو اندھی ہے کیا۔ دیکھ کر نہیں چلا جاتا۔ شور مچانے سے شائستہ بے آرام ہو گی۔ تجھے پتہ نہیں کیا ـــ ہٹ میں جا کر خود اسے دیکھتی ہوں۔ تو کپڑے دوسرے کمرے میں لے جا ـــ"

"چلی ـــ جا ـــ"

مہ جبین اسے ہلکی سی ڈانٹ دیتے ہوئے کمرے سے نکل گئی۔

"بڑی مانوس ہو گئی ہیں شائستہ سے۔" آفتاب عالم نے سگریٹ کیس ڈاکٹر کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

"شکریہ" کلیم نے سگریٹ لیے بغیر کہا۔ وہ مہ جبین کی ثومی کے لیے بے چینی سے بڑا متاثر ہوا تھا۔

ڈاکٹر کو چپ دیکھ کر آفتاب عالم نے بات کرنے کی غرض سے کہا۔ "آپ مہ جبین بھابی کے لیے پر امید ہیں نا۔"

"جی ـــ!" ـــ جی۔" کلیم سوچوں میں گم تھا۔ چونک گیا۔

"جب سے یہ لڑکی یہاں آئی ہے۔ بھابی کو جینے جینے کا سہارا مل گیا ہے۔" آفتاب عالم نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔

"جی۔" کلیم نے متوجہ ہونے کی کوشش کی۔

"آپ نے بتایا تھا۔ آپ ثومی کو جانتے ہیں۔" آفتاب عالم نے گہری نظروں سے کلیم کو دیکھا۔

"جی ہاں۔ میرے ہمسایہ میں رہتی تھیں۔" کلیم نے دھک دھک کرتے دل کو قابو میں کرتے کہا۔ آفتاب عالم نے کلیم کے چہرے پر اک غائر نظر ڈالی۔

"اس کے والدین حیات نہیں۔" آفتاب نے پوچھا۔

"جی۔ بے سہارا ہے۔" کلیم کے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔

"بے سہارا نہ کہیئے ڈاکٹر صاحب۔ وہ خود ہمارا سہارا بنی ہوئی ہے۔ ہم اس کا سہارا ہیں۔ ہمارے لیے تو فرشتۂ رحمت ہے وہ۔ مہ جبین بھابی کی بیٹی بھی ہوتی۔ تو اتنی خدمت نہ کر سکتی۔ اتنا پیار نہ دے سکتی۔ اسے والدین کی کمی تھی۔ ہمیں بیٹی کی۔ دونوں ہی کے خلا پُر ہو گئے۔"

"جی ہاں۔ بیگم صاحبہ کو ان کی محبت کا مرکز مل گیا ہے۔"

"ٹھیک ہو جائیں گی۔"

"خداوند تعالیٰ رحم کرنے والا ہے۔ بہرحال میں ابھی کچھ نہیں کہہ سکتا۔ تحقیق کے بعد ہی کچھ بتا سکوں گا۔ آپ نے بتایا تھا۔ کہ منٹل ہسپتال میں بھی علاج کروا چکے ہیں۔"

"تین بار داخل کروایا۔ یوں سمجھیئے کہ ہر حیلہ آزما چکا ہوں۔" آفتاب نے مضمحل ہو کر کہا۔

"ہوں۔"

"انہیں میرے مرنے سے پہلے ضرور ٹھیک ہو جانا چاہیئے ڈاکٹر۔" آفتاب بیچارگی سے کہہ گیا۔ کلیم نے اسے تسلی و تشفی دی۔

"میں نا امید ہرگز نہیں ہوں — اور — اب تو — ثومی کی وجہ سے محسوس ہوتا ہے۔ وہ ضرور ٹھیک ہو جائیں گی۔"

"خدا کرے ایسا ہو۔"

"خیر — میں چند دنوں تک ہی کوئی بات کہہ سکوں گا۔ فی الحال تو وہ نارمل ہی دکھائی دیتی ہیں۔ میں نے تو ابھی انہیں دورے کی حالت میں نہیں دیکھا۔"

"اب تو خاصے دن ہو گئے ہیں۔ شائستہ ہی میں مگن رہتی ہیں۔ دیکھا نا آپ نے اس کے سر میں درد ہے۔ اور یہ کتنی بے چین ہیں۔"

کلیم کی آنکھوں میں درد کی کیفیت لہرائی۔ بے چین ہو کر کرسی پر پہلو بدلا۔

"خدا کرے شائستہ ان کے درد کا مداوا ثابت ہو۔" آفتاب نے ہاتھ ملتے ہوئے کہا۔

"جی — ہوں گی — ضرور ہوں گی۔" کلیم نے کہا۔

آفتاب کچھ کہنے کو تھا۔ کہ مرجبین اندر آ گئی۔ ہلکے کریم رنگ کے ڈھیلے ڈھالے لباس میں وہ کسی ملکہ کی طرح دکھائی دے رہی تھی۔ پُروقار۔ عظیم اور خوبصورت۔

"ڈاکٹر صاحب۔" وہ آتے ہی گھبرائے ہوئے انداز میں بولی۔

"جی۔" ڈاکٹر غور سے مرجبین کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

"آپ شائستہ کو دیکھیں نا آ کر۔ کوئی دوائی دے دیں۔ درد سے گھبرا گھبرا کر رو رہی ہے۔ رو رو کر ہلکان ہو جائے گی۔"

کلیم تڑپ کر اٹھا۔

"ہاں ہاں ڈاکٹر صاحب، بھابی کی تسلی کے لیے اسے دیکھ لیجیئے۔" آفتاب بولا۔

کلیم مرجبین کے ساتھ ساتھ اس کی خواب گاہ میں آیا۔

اس کا دل بے طرح دھڑک رہا تھا۔ ثومی کے آنسوؤں کا خیال سوہانِ روح تھا۔ پچھلے پہر کی نازک سی دھوپ محرابی دروں سے اندر جھانک رہی تھی۔ بھاری بھاری پردے اٹھے ہوئے تھے۔ کمرے میں ہر چیز امارت کی غماز تھی۔ قرینے اور سلیقے نے امارت کے مظاہر کی خوبصورتی کو دلکش حد تک ابھارا تھا۔

لیکن ان سب چیزوں کے باوجود کمرے پر اک سنگین سی دل فگار سی خاموشی چھائی تھی۔ یہ چھبتی ہوئی سنگین خاموشی بآسانی محسوس کی جا سکتی تھی۔

مرجبین کے پیچھے پیچھے کلیم بھی سر جھکائے اندر داخل ہوا۔

مرجبین مسہری کے قریب گئی۔ آہستہ سے پردہ ہٹایا۔

"شائستہ۔" اس نے محبت سے اس پر جھکتے ہوئے پکارا۔

کلیم چند قدم ادھر ہی رک گیا تھا۔ اس کی نظریں مسہری پر تھیں۔ ہلکے پیازی رنگ کے ساٹن کے بستر میں ثومی لجلجے تکیہ میں منہ چھپائے اوندھی پڑی تھی۔ اس کے سیاہ چمکیلے بال کچھ بکھرے تھے۔ اور لمبی ناگن ایسی چوٹی سے نکل گئے تھے۔ بازو کے حلقے

میں منہ دیئے وہ یقیناً اب بھی رو رہی تھی۔

"شائستہ۔" مہ جبین نے پیار سے اس کا کندھا ہلایا۔ "اٹھو نا۔"

"جی۔" وہ دبی دبی آواز میں صرف اتنا ہی کہہ سکی۔

کلیم مضمحل، بے چین اور نڈھال سا نظر آنے لگا۔

"اٹھو نا۔ ڈاکٹر صاحب آئے کھڑے ہیں۔ دوائی دیں گے تو۔ آرام آجائیگا۔"

مہ جبین کا جملہ ختم ہونے سے پہلے ہی وہ پارے کی مدوّر گولی کی طرح نظر آئی۔ یک لخت اٹھ کر مسہری سے اترنے کو ہوئی۔ تکیے پر پڑا دوپٹہ اپنے ڈھیلے ڈھالے سرمئی لباس پر اوڑھ لیا۔ اس کی نظریں کلیم کی نظروں سے ٹکرائیں۔

کلیم نے بھی اسے دیکھا۔ محبت سے دیکھا۔ احترام سے دیکھا۔

"دیکھئے نا اسے۔ کہیں بخار تو نہیں ہوگا۔ چہرہ لال ہو رہا ہے۔ آنکھیں سوج گئی ہیں۔" مہ جبین ڈاکٹر کی طرف مڑتے ہوئے بولی۔

کلیم کھنچتا چلا آیا۔

مہ جبین نے ثومی کی کلائی پکڑ کر کلیم کی طرف بڑھائی۔

کلیم نے اسے پکڑنے کو ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ ثومی نے تڑپ کر کلائی چھڑالی۔ "میں بالکل ٹھیک ہوں۔ مجھے کچھ بھی نہیں ہوا۔"

"دکھا تو دو نبض۔ مجھے تو تمہارے ہاتھ گرم محسوس ہوتے ہیں۔" مہ جبین نے اس کا ہاتھ گال سے لگا لیا۔

ثومی کلیم کو دیکھ رہی تھی۔ دیکھنے سے زیادہ گھور رہی تھی۔ اس کی بھیگی بھیگی آنکھوں سے شعلے سے نکلنے لگے تھے۔ قہر و غضب کا مرقع بنی تھی۔ کلیم نے سر جھکا لیا۔ ہونٹ کا سرا دانتوں تلے دبا لیا۔ ہاتھ بے بسی سے ملتے ہوئے وہ کچھ کہنے کو الفاظ تلاش کرنے لگا۔

"شائستہ۔ یوں نہیں کرتے۔ دوائی لوگی۔ تو ٹھیک ہو جاؤ گی۔ دیکھو نا۔ ڈاکٹر

صاحب کیا کہیں گے۔" مہ جبین نے پیار سے چمکارا۔ ثومی دونوں ہاتھوں میں منہ چھپا کر سسک سسک کر رونے لگی۔

مہ جبین بے طرح پریشان ہو گئی۔ وہ بے تابی سے ادھر سے ادھر گھومنے لگی۔

"انہیں آرام کی سخت ضرورت ہے بیگم صاحبہ۔ نہیں آرام کرنے دیں۔ چپ چاپ پڑا رہنے دیں۔ باتیں نہ کریں ان سے۔ اکیلا چھوڑ دیں۔ ٹھیک ہو جائیں گی۔" مہ جبین نے غور سے کلیم کی بات سنی اور پھر جانے کیا سوچ کر "اچھا" کہا اور کمرے سے نکل گئی۔

اسے یوں کمرے سے جاتے دیکھ کر کلیم کی جان پر جیسے بن آئی۔ ثومی کے سامنے سے گھبرا گیا۔ رات بھر کے بنائے منصوبے اور ثومی کو آناً فاناً منا لینے کی سکیمیں دھری کی دھری رہ گئیں۔

ثومی اس کے سامنے بیٹھی رو رہی تھی۔ اور اسے اس کو مخاطب کرنے کی ہمت نہ ہو رہی تھی۔ کئی لمحے گزر گئے۔ سکوت بوجھل ہو گیا۔ ثومی کی سسکیاں ٹوٹتی رہیں۔ کلیم نے بے قرار ہو کر اسے دیکھا۔ ایک بار نہیں کئی بار دیکھا۔ اور پھر بڑی ہی ہمت کر کے اس نے ثومی کو پکارا۔

"ثومی۔" اس نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے پھر اسے پکارا۔ ایک دوسرے کے اتنے قریب ہو کر بھی اجنبیت محسوس ہو رہی تھی۔ اپنائیت کی انتہا بیگانگی کی ابتدا بن رہی تھی۔

ثومی اسی طرح بیٹھی رہی۔ کلیم کی آواز پر اس نے سر اٹھایا نہ ہاتھ چہرے سے ہٹائے۔ کلیم نے کھنکار کر گلا صاف کیا۔ بڑے دل سوز طریقے سے بولا۔

"ثومی۔ میں تم سے معافی مانگ بھی لوں تو اس دکھ کا مداوا نہیں ہو سکے گا۔ جو میری وجہ سے تمہیں پہنچا۔" وہ قدرے رکا اور پھر ڈوبتی آواز میں بولا۔

"لیکن ثومی — اس رات جو کچھ ہوا تھا۔ وہ — وہ شدید ترین — غلط — فہمی"

"اوہ ۔" ثومی نے سر اٹھایا۔ بیزاری کے عالم میں بھنچے ہونٹوں سے صرف یہی آواز نکلی۔ اس نے دونوں ہاتھ کانوں پر رکھ کر آنکھیں بند کر لیں۔ وہ یقیناً کلیم سے کوئی صفائی یا ملازمت نہ چاہتی تھی۔

کلیم کا دل لبالب بھرے پیمانے کی طرح تھا۔ اس نے اس موقع کو غنیمت جانا۔ ثومی مانے یا نہ مانے، اس نے اپنے دل کی کہنے کی ٹھانی۔ قدم اٹھا کر ثومی کے بالکل قریب آ کر دھڑکتے دل سے اپنا ہاتھ اس کے کندھے پر رکھ دیا۔ "ثومی ۔"

ثومی جیسے بجلی کے ننگے تاروں سے چھو گئی۔ سختی سے کلیم کا ہاتھ اپنے کندھے سے جھٹک کر چیخی۔ "آپ۔ آپ چلے جائیے۔"

"ثومی ۔ میری ۔" اس نے دکھ بھرے لہجے میں کہا۔

"میں کچھ سننا نہیں چاہتی۔ آپ چلے جائیے۔ یہاں سے چلے جائیے۔" اس نے درشتی سے کہا۔

"چلا جاؤں گا۔" کلیم نے بھی ضدی لہجے میں کہا۔ لیکن اپنی غلط فہمی کے متعلق تمہیں ضرور بتاؤں گا۔"

"میں کچھ نہیں سننا چاہتی ۔ کچھ نہیں سننا چاہتی ۔ کچھ نہیں سننا چاہتی ۔" وہ چیخنے لگی۔

"ثومی ۔" کلیم نے اسے کندھے سے جھنجھوڑا۔ "تمہیں میری بات سننا ہوگی۔ ایک بار تو سن لو۔"

"نہیں ۔۔۔ نہیں ۔۔۔ نہیں ۔۔۔" وہ اتنے زور سے چیخی ۔ کہ اس کی آواز سن کر مرجبین بے قرار ہو کر بھاگی بھاگی آئی۔

کلیم بیچارگی سے ہاتھ ملنے لگا۔ ثومی کو مرجبین نے سینے سے لگا لیا۔ اور وہ اس کی چھاتی میں منہ چھپا کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

کلیم کی مرجبین کے ساتھ یہ چوتھی نشست تھی۔ وہ آفتاب عالم سے مرجبین کی گزشتہ زندگی کا ایک ایک واقعہ پوری تفصیل سے سن چکا تھا اب انہیں واقعات کی روشنی میں وہ مرجبین کے ذہن کو کرید رہا تھا۔ تین نشستیں تو محض دردسری ہی تھی۔ لیکن آج وہ محسوس کر رہا تھا ۔ کہ مرجبین کے سامنے جب وہ خورشید عالم کی باتیں دہرا رہا تھا۔ تو مرجبین کچھ بے چین سی ہو رہی تھی۔ یوں جیسے کسی بھولی بسری یاد کو ذہن میں ٹٹولنے کی کوشش کر رہی ہو۔

ان دنوں مرجبین بالکل نارمل تھی۔ ثومی سے وابستگی جنون کی حدوں کو چھو رہی تھی۔ کلیم کے ساتھ سلجھاؤ کی یہی کڑی آئی تھی۔ ثومی ہی کے واسطے سے وہ مرجبین کے الجھے اور منتشر ذہن کو ایک مرکز پر لا سکتا تھا۔ اس کام کے لیے اس نے مشہور ماہر نفسیات ڈاکٹر الٰہی سے بھی رابطہ قائم کر رکھا تھا۔

وہ کافی پُرامید تھا۔ آفتاب عالم کو بھی اس نے تسلی دی تھی۔ گو اس کا عمل سپنوں پر حاوی ہونے والا تھا۔ پھر بھی اسے توقع تھی۔ کہ مرجبین کا شعور لاشعور سے رابطہ قائم کر لے گا۔

ثومی کو مرجبین اپنے سے الگ نہ ہونے دیتی تھی۔ کلیم کے ہوتے ہوئے ثومی کو اس کا ساتھ دینا دوبھر ہوتا۔ لیکن مجبوری تھی۔

کلیم پوری سنجیدگی سے مرجبین کے کیس کے سلسلہ میں جدوجہد کر رہا تھا۔ ثومی سے گھنٹوں سامنا رہتا۔ لیکن وہ تو کچھ اس طرح روٹھی تھی۔ کہ اسے منا لینے کا خیال ہی

خیال رہ گیا تھا۔ کلیم نے ثومی کو اچانک دیکھ کر خوشیوں کی جو محفل سجائی تھی۔ وہ درہم برہم ہو چکی تھی۔ اک دل فگار سا خلا دونوں کے درمیان حائل تھا۔

آج ہسپتال میں چھٹی تھی۔ کلیم دس بجے کے قریب حویلی پہنچ گیا تھا۔ مہ جبین چمن میں ثومی کے ساتھ بیٹھی تھی۔ کلیم بھی ان کے پاس ہی آ بیٹھا۔ مہ جبین نے مسکرا کر اس کا خیر مقدم کیا۔

"شائستہ آجکل بڑی پریشان رہتی ہے ڈاکٹر صاحب۔" مہ جبین نے ادھر ادھر کی چند باتیں کرنے کے بعد اچانک کہا۔

ثومی کے افسردہ چہرے پر رنگِ ندامت دوڑ گیا۔ کلیم بے کل ہوا۔ نگاہوں میں تھکے ہوئے دکھ کی کیفیت لیے ثومی کی طرف دیکھا۔ ثومی وہاں سے جانے کو اٹھ کھڑی ہوئی۔ کلیم نے جلدی سے اٹھ کر اس کا راستہ روکتے ہوئے آہستگی سے کہا۔ مجھ سے بیزار سہی ثومی۔ تمہیں بیگم صاحبہ کا خیال ہونا چاہیئے۔ تمہارا واسطہ اک ذہنی مریضہ سے ہے۔"

ثومی کچھ نہ بولی۔ ہاں اس سرزنش سے چپ چاپ مہ جبین کے پہلو میں بیٹھ گئی۔ باتوں کا سلسلہ جاری رہا۔ کلیم وقفے وقفے کے بعد ڈاکٹر الٰہی کی ہدایات کے مطابق مہ جبین کو بیتے واقعات یاد دلانے کی کوشش کرتا رہا۔

شام چائے کے بعد وہ مہ جبین کی مسہری کے قریب ایک آرام دہ کرسی پر بیٹھا تھا۔ ثومی مسہری کے دوسری طرف تھی۔ اور مہ جبین بستر میں نیم دراز تھی۔ آج کلیم کی باتوں میں وہ کئی بار بے چین ہوئی کئی بار کھو گئی۔

اب بھی کلیم اسے خورشید عالم کی خوبصورت تصویر دکھا رہا تھا۔ اور وہ پھٹی پھٹی نظروں سے تصویر کو دیکھ رہی تھی۔ ڈاکٹر الٰہی کے ایماء پر کلیم خورشید عالم کی خامیاں بیان کر رہا تھا۔ ان کے مزاج کے کئی رُخ سامنے لا رہا تھا۔

مہ جبین سے زیادہ ثومی اس تصویر میں کھوئی ہوئی تھی۔ یہ تصویر اس نے پہلے بھی دیکھی تھی۔ لیکن اک سرسری نظر سے۔ لیکن آج وہ پورے انہماک سے تصویر کو دیکھ رہی تھی۔ خورشید عالم بڑے وجیہہ و بادقار رنگ رہے تھے۔ عنفوانِ شباب میں ان کی موت کا سانحہ کتنا دل فگار ہوگا۔ کاش یہ انسان زندہ ہوتا۔ ثومی کے دل میں یہ خواہش خواہ مخواہ مچل رہی تھی۔ اس کا اس تصویر کو آنکھوں سے لگا لینے کو جی چاہ رہا تھا۔

تصویر سینے پر رکھے مہ جبین کی آنکھیں بند ہونے لگیں۔ یوں جیسے نیند آ رہی ہو۔ کلیم خورشید عالم کے بارے میں باتیں کرتا رہا۔ جوں جوں اس کی نیند گہری ہوتی گئی وہ اونچی آواز میں بولتا گیا۔ ثومی نے آہستگی سے اس کے سینے سے تصویر اٹھانا چاہی۔

"پڑی رہنے دو۔" کلیم نے کرسی پر پیچھے کو ہٹتے ہوئے کہا۔ اس کی نظریں مہ جبین کے چہرے پر مرکوز تھیں۔ چہرہ جس پر رنج و خوشی کے ملے جلے تاثرات تھے۔ کلیم کو کامیابی کی ہلکی سی کرن نظر آئی۔ ثومی چند لمحوں بعد اٹھ کر کمرے سے باہر چلی گئی۔ کلیم وہیں بیٹھا رہا۔

گھنٹہ بھر بعد جب ڈاکٹر الٰہی یہاں پہنچا۔ تو اس نے آج کے تجربے کی پوری روئداد اسے سنا دی۔ وہ بھی پُر امید نظر آیا۔ آئندہ نشست کے لیے ہدایات دیں۔ کچھ تاثر کلیم نے تجویز کیے۔ دونوں گھنٹہ بھر تبادلۂ خیال کرتے رہے۔

ڈاکٹر الٰہی نے ثومی کو بھی بلایا۔ کیس پر چند الفاظ میں روشنی ڈالتے ہوئے بولا:

"تم آئندہ انہیں بیگم صاحبہ کی بجائے امی کہا کرو۔ بچوں کی طرح پیش آیا کرو۔ کوئی چیز لینا ہو تو ضد کر کے مانگا کرو۔ چھوٹی سی بات پر روٹھ کر بیٹھ جایا کرو۔ انہیں ہر طرح سے احساس دلاؤ۔ کہ تم ہی ان کی کھوئی ہوئی بچی ہو۔"

ڈاکٹر ہدایات دے رہا تھا۔ اور ثومی کے دکھے دکھے جذبات پگھل رہے تھے۔ اس کی آنکھیں بھیگ گئی تھیں۔

کلیم ان آنسوؤں سے بے چین ہو رہا تھا۔ ثومی کو حالات نے کس دوراہے پر لا کھڑا کیا تھا۔ اس بیچاری نے ماں کا پیار کہاں دیکھا تھا۔ ممتا کی چاشنی کہاں چکھی تھی۔ ثومی پر کلیم کو بے طرح ترس آ رہا تھا۔ اس دکھی اور مجروح روح کو اپنی روح کی پہنائیوں میں جذب کر لینے کو جی مچل رہا تھا۔

کلیم شام تک وہیں رہا۔ ثومی سے کئی بار اس نے تنہائی میں چند باتیں کرنے کی کوشش کی۔ لیکن ثومی نے موقع نہ دیا۔ وہ تو اس سے سنجیدگی کی آخری حدوں تک ناراض تھی۔ آخری حدیں۔ ابھی سارے رابطے ٹوٹتے محسوس ہوتے ہیں۔

کلیم کے دل میں کسک تھی۔ وہ ثومی کا گنہ گار تھا۔ لیکن اپنی غلط فہمی بھی دور کرنے کے درپے تھا۔ ثومی کے دل میں اس کے خلاف جو نفرت جنم لے چکی تھی اسے تو شاید ہی دور کر پاتا۔ ہاں اپنی بے گناہی ثابت کر کے وہ اپنے ضمیر کا بوجھ ہلکا کرنا چاہتا تھا۔

لیکن حالات ایسے ہو گئے تھے۔ کہ قربتیں صدیوں کے فاصلے بن گئی تھیں۔ اجنبیت اپنی پوری سفاکی سے چھا گئی تھی۔ دونوں ازل و ابد کے سرے دکھائی دیتے تھے۔

رات نو بجے کے قریب کلیم واپس جانے کو اٹھا۔ مہ جبین نے خورشید عالم کی تصویر اس وقت بھی سینے پر رکھی ہوئی تھی۔ اور اسے دیکھتے ہوئے سوچوں میں ڈوبی تھی۔

ثومی اس وقت وہاں نہیں تھی۔ کلیم انتہائی دل گرفتہ نظر آ رہا تھا۔ خوبصورت آنکھوں میں حالات کے الجھاؤ تنے تھے۔ دکھ سینے میں کائی کی طرح جم گیا تھا۔

شام اس نے ثومی سے معذرت کرنے کی کوشش کی تھی۔ لیکن اس نے شیرنی کی طرح غرا کر اسے دیکھا تھا۔ وہ کوئی صفائی سننے کو تیار نہ تھی۔ اس نے تو جیسے

کلیم سے ناطہ ہی توڑ لیا تھا۔

کلیم کمرے سے نکل کر برآمدے میں آیا۔ سر جھکائے افسردہ و پژمردہ برآمدے کو عبور کر کے چمن اور برآمدے کی درمیان والی سڑک پر چلنے لگا۔

تیز تیز قدموں کی چاپ پر اس نے سر اٹھایا۔ ثومی برآمدے میں تھی۔ وہ سامنے والے کمرے سے نکل کر یقیناً مہ جبین کے پاس جا رہی تھی۔

کلیم اک ثانیے کو رکا۔ اور پھر برق کی سی تیزی سے گول محرابی دروں والے مغلئی طرز کے برآمدے میں ثومی کے سامنے آ گیا۔

"ثومی ۔۔۔ کیا ہمارے درمیان فاصلے پھیلتے ہی جائیں گے۔" اس نے بالا تمہید ثومی کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

ثومی اسے بالکل اچانک اپنے بالمقابل دیکھ کر گھبرا گئی۔ لیکن گھائل انا چیخی اور اس نے کلیم کا ہاتھ کندھے سے جھٹکتے ہوئے بے رحم تلخی سے کہا۔ "میں کچھ سننا نہیں چاہتی۔"

مجھے صرف ایک دفعہ کچھ کہنے کی مہلت تو دو ثومی۔ تم کتنی بے رحم ہوتی جا رہی ہو۔ میرا قصور تو سن لو۔ مجھے کہنے کا موقعہ تو دو۔"

"ابھی کہنے کو کچھ اور بھی باقی ہے ۔۔۔؟" ثومی نے آنکھوں سے طنز کی کھولتی آگ انڈیلتے ہوئے کہا۔

"ثو ۔۔۔ می ۔۔۔" کلیم تڑپ گیا۔ وہ کچھ کہنے کو تھا۔ کہ آفتاب عالم پچھلے کمرے کے دروازے سے نمودار ہوا۔ ثومی کترا کر نکل گئی۔

"ڈاکٹر صاحب ۔۔۔ جا رہے ہیں ۔۔۔ آپ ۔۔۔" آفتاب عالم نے اک نظر ثومی اور دوسری نظر کلیم پر ڈالتے ہوئے پوچھا۔

"جی ۔۔۔ جی ہاں ۔۔۔" کلیم بے چین نظر آیا۔

آفتاب عالم اس کی حالت اور ثومی کے اس انداز سے چلے جانے پر معاملے کی تہہ تک کچھ کچھ پہنچ گیا۔

"ثومی ۔ آپ سے کچھ خفا معلوم ہوتی ہے ۔" وہ زیرِ لب مسکرایا۔

کلیم کی آنکھوں کا کرب متلاطم ہو گیا۔

"خدا حافظ ۔" وہ آفتاب عالم کی بات کا جواب دیے بغیر وہاں سے چلا گیا۔

آفتاب عالم اسے کئی لمحے مسکرا مسکرا کر دیکھتا رہا۔ محب و محبوب دونوں ہی اس کی نظر میں قابلِ احترام تھے ؛

کلیم اس سفینے کی طرح تھا۔ جو کنارے سے ٹکرا کر ڈوب رہا ہو۔

ثومی کو منا لینے کا تصور جتنا خوش کن اور آسان تھا۔ حقیقت سے سامنا ہوا۔ تو معلوم ہوا۔ کہ یہی دنیا کا مشکل ترین کام ہے۔

کلیم مایوس ہو چکا تھا۔ اس کی زندگی کی روشن ہوتی راہیں پھر اندھیروں میں ڈوب رہی تھیں۔ اک سوگوار سی اداسی ہر وقت اعصاب پر مسلط رہتی۔ دکھ تھا۔ تو صرف اسی بات کا کہ وہ ثومی پر اپنی بے گناہی نہ ثابت کر سکا تھا۔ اپنی غلط فہمی کی معافی نہ مانگ سکا تھا۔ ثومی تو اس کی صورت سے بیزار نظر آتی تھی۔ اس کی بات سننا کلمۂ کفر سننے سے بھی شاید بدتر لگتا تھا۔ ثومی کا رویہ کلیم کے لیے ناقابلِ برداشت ہو گیا تھا۔

ثومی جو کچھ کر رہی تھی۔ یہ اس کی انا کا عمل تھا۔ اس کی غیرت کا تقاضا تھا۔ وہ اس گالی کو کیسے بھلا دیتی۔ جو حقیقی تھی۔ وہ کلیم کو معاف بھی کر دے۔ جب بھی اس کی ذات سے وابستہ سیاہی دور نہ ہو سکتی تھی۔ اس کے آوارہ خون کا طعنہ اپنی جگہ قائم تھا۔

ثومی کی محبت تڑپ رہی تھی۔ اس کے جذبات پگھل رہے تھے۔ اس کی راتیں روتے گزرتی تھیں۔ کلیم سے بیگانگی اور غیریت کے روح فرسا مظاہرے کے باوجود وہ اپنے آپ کو اس کی یاد سے الگ کرنے پر قادر نہ تھی۔ غیرت اور محبت کی ٹکر تھی۔ غیرت کا وار کاری تھا۔ ثومی بے بس تھی۔

کلیم روز بروز الجھتا جا رہا تھا۔ ثومی سے مایوس ہو چکا تھا۔ اس کی محبت کھو چکا تھا۔ لیکن ان سب باتوں کے باوجود اپنے ضمیر کا بوجھ ثومی کے سامنے ہلکا کرنے کا شدت سے خواہش مند تھا۔ ثومی کی سرد مہری پر اب اسے غصہ آنے لگا تھا۔ اپنی بزدلی پر بھی کڑھتا رہتا۔

اس شام وہ مہ جبین کے پاس بیٹھے بیٹھے اکتا گیا۔ طبیعت افسردہ تھی۔ دل اچاٹ اچاٹ سا تھا۔ وہ اٹھ کر برآمدے میں آیا۔

دور چمن میں اسے ثومی نظر آئی۔ وہ مخالف سمت کو جا رہی تھی۔ کلیم اپنے آپ پر قابو نہ رکھ سکا۔ تیز قدم اٹھاتے چمن میں آیا۔ اور پھر ثومی لپک کر ثومی کی طرف آیا۔ اس کا انداز فیصلہ کن تھا۔

قدموں کی چاپ دل کی دھڑکن سے ہم آہنگ تھی۔ اس نے گردن موڑ کر پیچھے دیکھا۔ کلیم کو دیکھ کر وہ گھبرا گئی۔ اس نے تیز قدم اٹھانا شروع کر دیئے۔

"ثومی۔ ٹھہرو۔" کلیم نے اسے پکارا۔ لیکن وہ رکی نہیں۔ کلیم نے رفتار تیز کر دی ایک سیکنڈ میں وہ اس کے برابر چل رہا تھا۔

"ثومی۔" اس نے قدرے تلخ آواز میں پکارا۔

ثومی کے لیے اب رک جانے کے سوا چارہ نہ تھا۔ آنکھوں میں نفرت اور بیگانگی کا بھرپور تاثر لیے اس نے کلیم کو دیکھا۔

"فرمایئے۔" وہ بڑے سفاک لہجے میں بولی۔

کلیم اس کے بالکل سامنے کھڑا ہو گیا۔ اسے سرتاپا ایک بار نہیں کئی بار گہری گہری نظروں سے دیکھا۔ ہلکے گلابی ریشمی لباس میں وہ سرمئی اندھیروں میں یوں لگ رہی تھی۔ جیسے گلاب کے تازہ تازہ پھول دھند میں لپٹے ہوئے ہوں۔ کلیم اس وقت اس کے حسن جہاں سوز سے مرعوب تھا۔ نہ اس کی مہکتی قربت سے دیوانہ ہو رہا تھا

ان وقت تو اسے ثومی پر بے طرح غصہ آ رہا تھا۔ اگر اب کے بھی وہ بھاگنے کی کوشش کرتی۔ تو کوئی تعجب نہ تھا۔ کہ کلیم کا ہاتھ ایک بار پھر ثومی پر اٹھ جاتا۔

"تم مجھ سے یوں ہی بھاگتی رہو گی۔" اس نے سخت لہجے میں کہا۔

"آپ کہنا کیا چاہتے ہیں۔" ثومی کی آواز میں بھی گرمی تھی۔

"جو تم سننا نہیں چاہتیں۔"

"تو پھر مجھے یوں روکنے کی ضرورت کیا ہے۔"

"صرف یہی کہ تمہارے ذہن میں میرے متعلق جو غلط۔"

"اُف۔ خدایا۔ آپ بار بار اس بات کا تذکرہ کیوں کرتے ہیں۔"

"ثومی۔ تمہیں میری بات کا یقین کرنا چاہیئے۔"

"مجھے کسی بات کا بھی یقین نہیں رہا۔"

"ثومی۔ خدا شاہد ہے۔ اس رات مجھے شدید ترین غلط فہمی ہوئی۔"

"ہوئی ہو گی۔"

"سن تو لو۔ اس رات۔"

"میں بارہا کہہ چکی۔ میں کچھ سننا نہیں چاہتی آپ ناحق اپنا اور میرا وقت ضائع کر رہے ہیں۔"

"ثومی۔"

"مجھے جانے دیں۔"

"مجھے معاف نہیں کرو گی۔"

"معاف کر بھی دوں۔ تو بھی میری رگوں کا آوارہ لہو مقدس اور پاکیزہ نہیں ہو سکتا۔"

"ثو ــــ می ــــ"

ثومی کا سانس یوں پھول گیا جیسے میلوں کی مسافت دوڑتے طے کر کے آ رہی ہو۔

اس نے وہاں سے جانے کو قدم اٹھایا۔ لیکن کلیم نے آگے بڑھ کر اس کا راستہ روک لیا۔

"جب تک تم پوری بات نہ سن لوگی۔ میں تمہیں جانے نہیں دوں گا۔"

"ثومی نے جھلملاتی آنکھوں پر پلکوں کی چلمنیں گرا لیں۔ دھندلی روشنی میں آنکھوں کے بجھتے چراغ یوں بھی دکھائی نہ دے رہے تھے۔ ثومی نے قدرے رخ پھیر لیا۔ وہ اپنی کمزوری اب کلیم پر ظاہر نہ کرنا چاہتی تھی۔

"میں اس رات غلط فہمی کا شکار ہوا تھا ثومی۔" کلیم نے ثومی کو سمجھانے کی کوشش کی۔ "میں نے اس رات تمہیں فرید صاحب کے ـــ سینے ـــ سے لگا دیکھا تھا میں برداشت نہ کر سکا۔ فرید صاحب کے متعلق مجھے اتنا کچھ کہا گیا تھا۔ کہ میرا ذہن بالکل مسموم ہو چکا تھا۔ میں ان کی اور تمہاری بے تکلفی برداشت نہ کر سکا۔ مجھے حقیقت کا علم نہیں تھا۔"

کلیم ایک ہی سانس میں کہہ گیا۔ ثومی کا دل دھڑک اٹھا۔ اس کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ بے چین ہو ہو کر اس نے کلیم کی طرف دیکھا۔ لیکن خاموش رہی۔

کلیم نے اک گہری ٹھنڈی آہ کھینچتے ہوئے کہا۔ "ہو سکتا تھا۔ یہ ذرا سی غلط فہمی اس سے بھی مہیب صورت اختیار کر لیتیں۔ لیکن تمہاری روپوشی فرید صاحب پر اتنی اثر انداز ہوئی۔ کہ انہوں نے وہ راز اگل دیا۔ جو انہیں برسوں سے سینے میں چھپاتا تھا۔ کلیم کا سانس تیز ہو گیا۔ وہ رازداری سے بولا۔

"سن رہی ہو ثومی۔ سن رہی ہو نا۔ انہوں نے ـــ انہوں نے اعتراف کر لیا کہ تم۔ ان کی اپنی اولاد ہو ـــ وہ ـ وہ ـ" کلیم نے سب کچھ کہہ دیا۔

ثومی درخت کے تنے کے سہارے ڈول سی گئی۔ اس انکشاف سے اس کا سانس رک گیا۔ اس کے چہرے نے کئی رنگ بدلے۔ اندھیرا غنیمت تھا۔ کلیم ان بدلتے سایوں کو دیکھ نہ سکا

وہ دیکھ بے شک نہ سکتا تھا لیکن سانسوں کی رفتار، دل کی دھڑکن اور رگوں کی سنسناہٹ کو بخوبی محسوس کر رہا تھا۔

کئی لمحے خاموشی رہی۔ کلیم یوں چپ تھا۔ جیسے کہنے کو کچھ باقی نہ رہا ہو۔ اور ثومی سادھے نتیجے کا انتظار کر رہا ہو۔ واقعی اس نے سب کچھ کہہ ڈالا تھا۔ باقی کچھ بھی نہ رہ رہا تھا۔

ثومی چپ تھی۔ لیکن اس کا دل و دماغ اور ذہن طوفانوں کے شور سے متصادم تھا۔ فرید اس کا باپ تھا۔ اس نے یہ حقیقت ہمیشہ مفروضہ سمجھی تھی۔ کئی بار اس کے دل نے یہی کہا تھا۔ یہی چاہا تھا۔ قیامت کی خاموشی میں ثومی جذبات کے کئی مرحلے طے کر گئی۔ لیکن جب کلیم کے پکارنے پر جذبات کے بہتے تلاطم دھارے رکے۔ تو اس نے فرید کے لیے اپنے دل میں محبت کی بجائے نفرت کا لاوہ ابلتا پایا۔ جس باپ نے انیس سال اسے اس کا مقام نہ دیا تھا۔ اس سے وہ نفرت ہی کر سکتی تھی۔ انیس برسوں کی اذیتیں متحرک فلم کی طرح اس کی نظروں کے سامنے آئیں اور گزر گئیں۔

"ثومی ـــ فرید صاحب ـــ تمہاری روپوشی سے ـــ" کلیم نے آہستگی سے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ "تمہاری روپوشی سے سخت پریشان ہیں۔ میری طرح وہ بھی۔"

"اس انکشاف کے لیے بہت بہت شکریہ ڈاکٹر صاحب۔" ثومی نے طنز و تہر سے کہا۔ "لیکن افسوس ہے مجھے اس بات سے کوئی خوشی نہیں ہوئی۔ نہ ہی یہ انکشاف میرے لیے اجنبی اور نیا ہے۔"

"کیا تم جانتی تھیں؟ ـــ کلیم جلدی سے بولا۔

"آپ کو کچھ اور کہنا ہے؟" کلیم کا سوال انتہائی بے رحمی سے رد کرتے ہوئے ثومی نے بے رخی سے سوال کیا۔

"ثومی ـــ فرید صاحب تمہارے لیے پریشان ہیں۔" کلیم نے تیز تیز سانسوں

کے درمیان کہا۔ "اک باپ۔"

"میرا کوئی باپ نہیں۔ میں کسی کی کچھ نہیں لگتی۔ میرا کوئی نہیں ۔۔۔ کوئی نہیں میرا کوئی بھی نہیں۔" ثومی کی آواز رندھ گئی۔ لیکن اس نے جلد ہی اپنے اوپر قابو پا لیا۔ ٹھہری ٹھہری آواز میں بولی:

"ڈاکٹر صاحب۔ بس یہی کہنا تھا نا آپ نے ۔۔۔"

"ثومی ۔۔۔" اس کی اجنبی آواز سے کلیم تڑپ گیا۔

"فرید صاحب کی مجھے کوئی ضرورت نہیں۔" اس نے دو ٹوک انداز میں کہا۔ "وہ مجھے اپنی اولاد تسلیم کر بھی لیں۔ تو بھی میری رگوں کا آوارہ لہو۔"

"ثومی ۔۔۔ کلیم چیخ اٹھا۔" میں اپنے بہیمانہ رویے اور سفاکانہ الفاظ کے لیے نادم ہوں۔ پشیمان ہوں۔ خدا شاہد ہے۔ کہ یہ سب شدید ترین غلط فہمی کا ردِ عمل تھا۔"

"آپ کی غلط فہمی دور ہو گئی۔" وہ غضب ناک لہجے کو مدھم بنانے کی کوشش میں گویا ہوئی۔ اس کی آنکھوں سے چنگاریاں سی نکلنے لگیں۔ کلیم سر جھکائے مجرمانہ انداز میں کھڑا رہا۔

"ڈاکٹر صاحب۔" آپ ناحق نادم و پشیمان ہیں۔ وہ گہری آہ کو روکنے کی کوشش میں بولی:

"میں آپ کی شکر گزار ہوں۔ آپ نے مجھے حقیقت سے روشناس کرا دیا تھا۔ ورنہ۔ ورنہ۔ میں تو بڑے خوبصورت خواب دیکھنے لگی تھی۔ اپنی حیثیت اپنی ذات اور اپنے آپ کو بھول گئی تھی۔"

"ثومی ۔۔۔" کلیم تڑپ گیا۔ ثومی کی آواز ویرانوں میں بھٹکتی روح کی پکار لگ رہی تھی۔

"ثومی مجھے معاف کر دو۔ تم نے مجھے معاف نہ کیا تو میں۔۔۔"

کلیم کا جملہ ختم ہونے سے پہلے ہی ثومی ہنس پڑی۔ اس کی ہنسی یوں تھی جیسے مذاق سیلنے میں کھانسی کھڑکھڑا گئی ہو۔

"ثومی میں بڑی سزا بھگت چکا ہوں۔ اب تو میری ہمت بھی جواب دے گئی ہے۔ بخدا میرا جرم ناقابلِ معافی سہی۔ تم ایک بار معاف کر دو۔"

ثومی پھر ہنس پڑی۔ اور پھر ہنستے چلی گئی۔ کلیم نے گھبرا کر اس کی طرف دیکھا بے تاب ہو کر اس کی طرف بڑھا۔ لیکن ثومی نے سختی سے ہاتھ اس کی آمد کو روکنے کے لیے بڑھایا۔ آہنی اور طرز بھری آواز میں بولی۔ "آپ کھلونوں سے کھیلنے کے رسیا ہوں گے۔ ثومی کھلونا نہیں ہے۔"

"یا خدا۔" کلیم صرف اسی قدر بڑبڑایا۔

"ٹھیس سے تو شیشے میں بال آ جاتا ہے ڈاکٹر صاحب۔ دل تو بڑی نازک سی شے ہے۔" ثومی کی ہنسی پگھل پگھل کر آنکھوں میں گھلنے لگی۔

"مجھے یہ دل دنیا کی ہر چیز سے زیادہ عزیز ہے ثومی۔" کلیم نے انتہائی بیچارگی سے کہا۔ لیکن ثومی کا دل نہیں پسیجا۔ بڑی بے دردی سے وار کیا۔

"سچ کہتے ہیں آپ ۔۔۔"

"یقین کرو ثومی۔" کلیم کی بے بسی دید کے قابل تھی۔

"میری ماں کے کردار کے داغ کے باوجود آپ مجھ پر یوں مہربان ہیں۔" ثومی نے حیرانگی کا دانستہ اظہار کیا۔

"تم میری محبت کی توہین کر رہی ہو ثومی۔" کلیم طیش میں آ گیا۔ "میری غلطی میری بھول، میری خطا اپنی جگہ۔ تم یوں میری محبت کا تمسخر ۔۔۔"

"محبت ۔۔۔ محبت ۔۔۔" ثومی کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ کلیم نے آگے بڑھ

کر اسے جھنجھوڑ ڈالنا چاہا۔ لیکن اس کے قدم اٹھاتے ہی وہ وہاں سے تیزی سے چل دی۔ اس کی آنسوؤں میں ڈھلتی ہنسی کی آواز کلیم کو دور سے بھی سنائی دے رہی تھی۔

رات کلیم دیر تک آفتاب عالم کے پاس بیٹھا رہا۔

مہ جبین کے کمرے میں بھی کتنی دیر رہا۔ ثومی پھر اسے نظر نہ آئی۔

پریشان حال رات گئے وہ گھر لوٹ آیا۔

ثومی رات بھر اپنی تقدیر کی بے رحمی سے شاکی ہو کر آنسو بہاتی رہی۔

فرید اور کلیم دونوں ہی محور تھے۔ جن کے گرد اس کی ذات گھومتی رہی۔

فرید کے خیال سے کبھی بہاروں کا احساس تھا۔ کبھی خزاؤں کا۔ لیکن کلیم رات بھر خزاؤں کے جھکڑوں کی طرح یادوں میں در آتا رہا۔

تیسری بار کمرے میں آئیں۔ تو کلیم کو اسی انداز میں صوفے پر نیم دراز پایا۔

اماں اس نے ٹانگ پر ٹانگ رکھی تھی۔ اور صوفے کے بازو پر سر رکھے آنکھیں بند کیے پڑا تھا۔ سفید قمیض اور پاجامہ پہن رکھا تھا۔ ایک بازو سر کے نیچے تھا اور دوسرا ساتھ سے کھسک رہا تھا۔ وقفے وقفے سے پیر کا انگوٹھا ہلانے لگتا۔ جس سے اس کی بیداری کا پتہ چلتا۔ جلے ادھ جلے سگریٹوں کے بے شمار ٹکڑے قریبی میز پر پڑے تھے۔ ایش ٹرے سے بے نیاز سگریٹوں کی سفید سفید راکھ میز کی سطح کو بھنڈلائے جا رہی تھی۔

اماں بڑی غائر نظروں سے اس کے جذبات کے اتار چڑھاؤ اتنے دنوں سے دیکھ رہی تھیں۔ اس کی افسردگی۔ پریشانی اور کھوئے رہنے سے ان کے لیے یہ نتیجہ اخذ کرنا مشکل نہ رہا تھا۔ کہ وہ اب تک ثومی کو منا نہیں پایا۔

چار بج چکے تھے۔ لیکن وہ ابھی تک مونا والی نہیں گیا تھا۔ اماں ثومی کے متعلق پوچھنا چاہ رہی تھیں۔ اسی بہانے بات چھیڑنی چاہی۔

"کلیم بیٹے۔" اماں نے اس پر جھکتے ہوئے پیار سے اس کی پیشانی کو چھوا۔

اس نے آنکھیں کھول دیں۔ اماں کو دیکھتے ہی اٹھ بیٹھا۔ بالوں میں انگلیاں الجھا کر انہیں سلجھاتے ہوئے اماں کی طرف دیکھا۔

بیٹے کی پریشان صورت نے ممتا کو ہلا کر رکھ دیا۔

"کیا بات ہے" وہ صوفے پر اس کے برابر بیٹھتے ہوئے بولیں۔

"جی - کچھ بھی تو نہیں - " کلیم نے کہتے ہوئے اپنی دانست میں اماں کی نظر بچا کر اخبار سگریٹ کے بے شمار ٹکڑوں پہ رکھ دی۔ لیکن وہ تو یہ کارگزاری پہلے ہی دیکھ چکی تھیں۔

"آج مونا والی نہیں جاؤ گے - " اماں نے پوچھا۔

"جی نہیں - "

"کیوں - "

"کئی دنوں سے کلینک نہیں کھولا۔"

"یہاں کون سے مریض آئے بیٹھے ہیں - "

"پھر بھی - "

"ثومی کیسی ہے ؟"

"جی - ؟" - ٹھیک ہے ـــــ"

"آج مجھے اس کے پاس لے چلو۔"

"آپ کو - " کیوں ؟"

"یونہی - " ملنے کو جی چاہتا ہے - "

کلیم اُٹھ کر بے تابی سے ٹہلنے لگا۔ پھر ساتھ والے صوفے پر بیٹھتے ہوئے گردن صوفے کی پشت پر ڈالتے ہوئے چھت کو گھورنے لگا۔

"آپ وہاں جا کر کیا کریں گی" اماں کے دوبارہ کہنے پر اس نے مسکرانے کی کوشش کی۔

"تمہیں اس سے کیا - ؟"

"وہاں جانے کا خیال دل سے نکال ہی دیں تو اچھا ہے - "

"کیوں ؟"

"ثومی - ثومی - وہ - مجھ سے بری طرح بدظن ہے اماں - آپ - اس خیال ہی چھوڑ دیں - اس کے دل میں میرے خلاف بڑا زہر ـــ خیر - آپ مانیں ہی دیں - اس سے ملنے کی کوئی ضرورت نہیں - "

"تو تم آج نہیں جا رہے - "

"نہیں - "

"تو اس مریضہ - "

"وہ ذہنی مریضہ ہے اماں - روز دیکھنے کی ضرورت نہیں - ڈاکٹر الٰہی کی ہدایات عمل ہو رہا ہے - میں نے آفتاب عالم ـــ کو ٹیلیفون کر دیا ہے - کہ آج نہ آ سکوں گا - کوئی ضرورت پڑ گئی تو وہ بلا لیں گے - "

اماں نے کلیم سے تو کچھ نہیں کہا - لیکن اب ثومی سے ملنے کا مصمم ارادہ کر لیا - اپنی بزرگی کے پیش نظر انہیں قوی امید تھی - کہ ثومی کلیم سے رنجش دور کر لے گی -

دوسرے دن کلیم ہسپتال چلا گیا تو اماں نے جیرا کو بلا کر مونا والی جانے کا پروگرام بنایا - بیس میل کا فاصلہ تھا - وہ دونوں بس سے وہاں جا پہنچیں ـــ مونا والی پہنچ کر حویلی پہنچنا بہت ہی سہل تھا -

دس بجنے والے تھے - ثومی نے مہ جبین کے ساتھ چائے پی - پھر اسے ایک رسالے سے کہانی پڑھ کر سنانے لگی -

رخشندہ نے آ کر ثومی کے مہمانوں کی آمد کی اطلاع دی - تو ثومی حیران ہو کر اسے دیکھنے لگی - اسے کون ملنے آ سکتا تھا -

"دو عورتیں ہیں نشست گاہ میں بیٹھی ہیں - آپ سے ملنے آئی ہیں - " ثومی مہ جبین کے ہاتھ میں رسالہ دے کر اٹھ کھڑی ہوئی - دھڑکتے دل اور سنسناتے ہاتھوں ملتے ہوئے وہ نشست گاہ میں آئی -

وہاں اماں اور جیراں بیٹھی تھیں۔ دونوں حویلی کی عظمت اور ماحول کے ٹھاٹھ باٹھ سے مغلوب تھیں۔ انہیں دیکھ کر ثومی کا دل کانپ گیا۔

لیکن اماں نے جس والہانہ پن، محبت اور چاہت سے اسے لپٹا لیا۔ ثومی کا دل بھر آیا۔ جیراں نے بھی شفقت کا بے پناہ مظاہرہ کیا۔ اسے دیکھ کر ثومی کو اپنی روکھی پھیکی زندگی کے کئی باب یاد آ گئے۔

اماں نے ثومی کو اپنے پہلو میں بٹھا لیا۔ جیراں اس کی گم شدگی کے حادثہ پر اپنی پریشانی کا ذکر کرنے لگی۔

ثومی نے مالی بابا کا حال پوچھا۔ جیراں کے باقی بچوں کی احوال پرسی کی۔ فریدہ اور سلمیٰ کے متعلق پوچھا۔ فرید کا ذکر نہ کیا۔ اس کے خیال ہی سے وہ سہم سی گئی۔

"میں نے کلیم سے کہا تھا۔ کہ مجھے یہاں لے آئے۔" اماں نے ادھر ادھر کی باتوں کے بعد کہا۔

"کل تو خود بھی نہیں آیا۔ شاید آج بھی نہ آئے۔"

ثومی بے چین سی ہوئی۔ کل کلیم نہیں آیا تھا۔ اجنبیت اور بے گانگی کے باوجود اس نے پانی سے باہر آئی مچھلی کی طرح کانٹا تھا۔

"میری بچی۔" اماں نے ثومی کو سینے سے لگا لیا۔ "میری بے جا ضد سے تمہیں بہت دکھ پہنچا۔ میں اپنے رویے پر نادم ہوں بیٹی۔ اس شیطان صفت صدیق نے ہی ہم ماں بیٹوں کے ذہن میں زہر بھرا تھا۔ میں نے تم پر بڑی زیادتی کی تھی۔"

اماں کی آواز رندھ گئی۔ اور ثومی تو دکھی روح تھی۔ اس شفقت اور پیار سے مچل مچل گئی۔ آنسوؤں پر اختیار رہا نہ سسکیوں پر۔ اماں کے سینے میں منہ چھپائے بے اختیار رو دی۔ اماں کے آنسو بھی نکل آئے اور جیراں بھی پرنم آنکھوں سے اسے دیکھنے لگی۔

"مجھے معاف کر دو میری بیٹی۔ دیکھو! میں تمہاری ماں ہوں۔ اتنی دور سے چل آئی ہوں۔" ثومی کی پشت تھپکتے ہوئے اماں بولیں۔

وہ کتنی ہی دیر ثومی کے سامنے اپنی زیادتیوں کا ذکر چشم پرنم سے کرتے ہوئے عذرت خواہ ہوئیں۔ ثومی کو کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا۔ کہ انہیں کیا کہے۔ رخشندہ اور رفیق کھانے پینے کی اشیا لے کر اندر آ گئے۔ خاطر تواضع حویلی کی روایت تھی۔

اماں گھنٹہ بھر بیٹھیں۔ ثومی کے دل میں ان کے لیے عقیدت امنڈ آئی۔ اور جب اٹھنے سے پہلے اماں نے ثومی کے سامنے ہاتھ باندھ دیے۔ "مجھے معاف کر دو بیٹی" تو ثومی نے ان ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں تھام کر آنکھوں سے لگا لیا۔ اور اس کے آنسوؤں نے ان ہاتھوں کو نم کر دیا۔

ثومی نے انہیں رکنے کی اخلاقی پیش کش کی۔ لیکن اماں کو واپس جانا تھا۔ وہ اٹھ کھڑی ہوئیں۔

"کلیم کو پتہ نہ چلے ثومی بیٹی۔" اماں نے کہا۔ "وہ نہیں چاہتا تھا کہ میں یہاں آؤں۔ تم شاید اس سے اب تک ناراض ہو۔"

ثومی نے سر جھکا لیا۔ اور دوپٹے کا آنچل انگلی پر بے خیالی میں لپیٹنے لگی۔

"کلیم سے متعلق سارے وسوسے دل سے نکال دو بیٹی۔" اماں نے ثومی کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں تھام کر اس کی پیشانی چوم لی۔ "غلط فہمی ہو ہی جاتی ہے وہ تمہارے لیے دن رات پریشان رہتا ہے۔ میں بھی اب زیادہ دیر انتظار نہیں کر سکتی۔ اس اتوار فریدہ کی منگنی ہے۔ اگلے اتوار میں یہ فرض ادا کرنا چاہتی ہوں۔ کہو۔ ٹھیک ہے نا۔"

ثومی دہشت زدہ سی ہو کر اماں کے ہاتھوں سے چہرہ چھڑا کر پیچھے ہٹی۔ "آپ — آپ —"

"میرا سونا گھر تمہارا منتظر ہے بیٹی ——" اماں نے مسکرا کر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

"میں اس قابل نہیں ہوں۔" ثومی چہرہ ہاتھوں پر گرا کر رو دی۔ اس کی قسمت میں آنسو بہانا ہی لکھے تھے جیسے۔ "میں اس قابل نہیں ہوں۔" وہ بار بار کہے گئی۔

اماں نے اسے اپنے ساتھ لپٹا لیا۔ اس کی پیشانی چومی۔ اس کی پیٹھ تھپ تھپائی۔

"کیوں اس قابل نہیں ہو۔ تم تو ہیرا ہو۔ ہیرا۔"

"میری —— ماں —— میری ——" ثومی تڑپی۔

"ان باتوں کو جانے دو میری بچی۔ ان کے متعلق نہ سوچا کرو۔" اماں نے اسے جی بھر کر پیار کیا۔ ثومی پہلے ہی کیا کم دلگیر تھی۔ اب اور بھی دل گرفتہ نظر آنے لگی۔

اماں کے جانے کے بعد تذبذب کے عالم میں ثومی ڈوبتی ابھرتی رہی۔ اسے کیا کرنا چاہیئے۔؟ اسے کچھ سمجھ نہ آ رہا تھا۔

کیا کلیم کی غلط فہمی تسلیم کر کے اسے معاف کر دینا چاہیئے۔

کیا اس کی ہستی کا اس طرح سلگتا ہوا داغ مٹ سکے گا۔؟

اس کا جواب ہر رخ سوچنے کے بعد اسے نفی ہی میں مل رہا تھا۔

——

مہ جبین کو آج پھر کچھ درد سر کی شکایت تھی۔ ثومی پلنگ پر بیٹھی نرم نرم ہاتھوں سے اس کا سر سہلا رہی تھی۔

اچانک ثومی کے ہاتھ مہ جبین نے پکڑ لیے "شائستہ"

"جی"

"تمہاری کلائیاں ننگی ہیں۔"

"تو کیا ہوا۔"

"چوڑیاں کیوں نہیں پہنتیں۔"

"جی۔ مجھے کچھ شوق نہیں۔"

"پگلی —— میری ڈھیروں چوڑیاں کس لیے رکھی ہیں۔"

ثومی نے اسے دوسری باتوں میں لگانا چاہا۔ لیکن وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ ثومی کے چہرے کو دیکھتے ہوئے بولی۔ کانوں میں بھی کچھ نہیں پہنا۔"

"جی! پہن لوں گی۔"

"ابھی پہنو۔"

"آپ لیٹ جائیے میں پہن لوں گی۔"

"جاؤ۔ پہن کر آؤ۔"

ثومی کے پاس کوئی بندے نہ تھے۔ پہن کر کہاں سے آتی۔ اسے ٹالنے کی کوشش کی۔ لیکن مہ جبین بندے پہننے کی رٹ لگانے لگی۔

اسی وقت آفتاب عالم اور ڈاکٹر کلیم آ گئے۔ آج کلیم تین یوم کے بعد آیا تھا۔ ثومی نے یہ تین دن جس کرب و اذیت میں گزارے تھے۔ کچھ وہی جانتی تھی۔

اس نے نظر بھر کر کلیم کی طرف دیکھا۔ بڑا ہی مضمحل نظر آ رہا تھا۔ ثومی بے چین ہو گئی۔ لیکن پھر وہی انا کا مسئلہ تھا۔ خاموش بیٹھی رہی۔

"بہن لو نا بندے۔" مہ جبین نے ڈاکٹر اور آفتاب عالم کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ اور جب اس نے بار بار یہی کہا۔ تو ڈاکٹر نے ثومی سے بالکل اجنبیوں کی طرح پوچھا

"کیا کہہ رہی ہیں بیگم صاحبہ۔"

ثومی نے کلیم کی بجائے آفتاب عالم کو ساری بات بتا دی۔

"چند دن پہلے بھی شائستہ کو زیور پہنانے کا ضبط ہوا تھا۔" آفتاب نے کلیم سے کہا۔

کلیم مہ جبین کے چہرے کا جائزہ لیتے ہوئے سوچ میں ڈوبا تھا۔ معاً اسے کچھ خیال آیا۔ اور آفتاب عالم کو سرگوشی کی "ان کا زیور کہاں ہے۔"

"اس سیف میں۔"

"میرے خیال میں زیور نکال کر انہیں دیجئے۔ ممکن ہے۔ زیور سے وابستہ کوئی یاد عود کر آئے۔"

"سارا زیور یہیں رکھا ہے۔ میں نکال کر دیتا ہوں۔"

ثومی زیور نکالنے پر پریشان ہو گئی۔ مہ جبین اب بستر پر اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس کی رگ میں جنون کی جھلک نظر آنے لگی۔ کلیم اسے بغور دیکھتا رہا۔ طوفان کے آثار نظر آ رہے تھے۔ اس نے ڈاکٹر الٰہی کو ٹیلیفون کرنا مناسب سمجھا۔

وہ ٹیلی فون کر کے آیا۔ تو مہ جبین اپنے سامنے زیور کی خوبصورت صندوقچی کھولے بیٹھی تھی۔ نگاہوں کو خیرہ کر دینے والے زیورات دیکھ کر ثومی کچھ ڈر سی

گئی۔ آفتاب عالم سامنے صوفے پر بیٹھا۔ اور کلیم نے کرسی کھینچ کر مہ جبین کے قریب کر لی۔ مہ جبین زیور کو ہراساں ہو کر دیکھ رہی تھی۔ اس نے ایک جڑاؤ ہار نکالا۔

"میں۔ میں نہیں پہنوں گی۔" ثومی نے جلدی سے کہا۔

"خاموش بیٹھی رہو۔" کلیم نے بوجھل آواز میں سرگوشی کے انداز میں کہا۔

"دیکھتی جاؤ۔ بیگم صاحبہ کیا کرتی ہیں۔ جو چاہتی ہیں انہیں کرنے دو۔"

ثومی مضطرب ہو کر اسے دیکھنے لگی۔

ہار کو بغور دیکھ کر مہ جبین نے بستر پر رکھ دیا۔ پھر جڑاؤ کنگن نکالے انہیں بھی پھٹی پھٹی نظروں سے یوں دیکھا۔ جیسے پہچاننے کی کوشش کر رہی ہو۔

پھر کنگن بھی رکھ دیے۔ ثومی کی موجودگی کا شاید اسے احساس ہی نہ رہا تھا۔

کچھ ہی لمحوں بعد اس نے سارا بکس پلنگ پر الٹ دیا۔ اک اک چیز وہ پاگلوں کی طرح اٹھا اٹھا کر دیکھنے لگی۔ کلیم اور ثومی بھی چوکس نظروں سے مہ جبین کو دیکھنے لگے۔

اس نے اک خوبصورت مخملی ڈبیہ اٹھا لی۔ اسے کھولا۔ اس کے چہرے پر ویرانی پھیل گئی۔ رنگ فق ہو گیا۔ آنکھیں پھٹ سی گئیں۔ دورے کے ابتدائی آثار دیکھ کر ثومی نے مہ جبین کا کندھا جھنجھوڑنا چاہا۔

"اوں ہوں۔" کلیم نے سر نفی میں ہلاتے ہوئے کہا۔ وہ مہ جبین کے تاثرات دیکھ رہا تھا۔

"یہ ایک۔ ایک۔ دوسرا کہاں گیا۔" مہ جبین نے ڈبیہ دیکھتے ہوئے کہا۔

ثومی اور کلیم کی نظر بیک وقت ڈبیہ پر پڑی۔ کلیم نے دیکھا۔ ایک بندہ ڈبیہ میں تھا۔ ثومی بندے کو دیکھتے ہی پیلی پڑ گئی۔

"دوسرا کہاں گیا۔" مہ جبین چیخی۔ ثومی نے بے اختیار ہو کر ڈبیہ اس

کے ہاتھ سے جھپٹ لی۔ ایک بُندہ نیلی مخملی ڈبیہ میں چمک رہا تھا۔

ایک بُندہ! ایک خوبصورت بُندہ!

بالکل ایسا ہی بُندہ تو جیراں کے پاس تھا۔ یقیناً ایسا ہی تھا۔ ثومی کا سانس رکنے لگا۔ "دوسرا کہاں گیا۔؟" ثومی کی آواز پھٹ پڑی۔

"ثومی۔" کلیم نے ڈانٹا۔ بیگم صاحبہ کو ——"

وہ کچھ اور نہ کہہ سکا تھا۔ کہ مہ جبین زور زور سے چیخنے لگی۔ "دوسرا کہاں گیا۔ دوسرا کہاں گیا۔" اس کے چہرے سے مترشح تھا۔ کہ کوئی آنا ردہ یاد اس کے لاشعور کے بند دروں سے ٹکرا ٹکرا کر تڑپ رہی ہے۔

ثومی بستر سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ پھٹ جانے والی نظروں سے بُندے کو دیکھ رہی تھی۔

بالکل ایسا ہی بُندہ تو جیراں کے پاس بھی تھا۔ ایک بُندہ! ایک بُندہ!

جیراں کے پاس بُندہ ہونا کوئی بڑی بات نہ تھی۔ لیکن اس بُندے سے وابستہ سنی ہوئی کہانی ثومی کا دماغ ماؤف کر رہی تھی۔ یہ کہانی اس نے ایک بار نہیں کئی بار مالی بابا سے سُنی تھی۔

یہ بُندہ اس عورت کی کالی شال سے اٹکا ہوا مالی کو ملا تھا۔ جو اپنی چند دن کی بچی کو گولڈ مور کے درخت کے نیچے گیٹ کے پیچھے ڈال کر بھاگ گئی تھی۔

ثومی کے ذہن میں جھکڑ چلنے لگے۔ سائیں سائیں کرتی مالی کی باتیں کانوں سے ٹکرانے لگیں۔ اس نے پلٹ کر مہ جبین کو دیکھا۔

کیا مہ جبین اس کی ماں تھی؟

یہ سوال گرگراہٹ بن کر ذہن میں پھیل گیا۔ ثومی کا سارا وجود اس احساس سے ٹھنڈا ہو گیا۔

لیکن مہ جبین کی بیٹی تو مر چکی۔ اس کی تو قبر بھی خورشید عالم کی قبر کے پاس موجود ہے۔ ثومی چکراتے ہوئے دماغ سے سوچنے لگی۔ وہ اس کی بیٹی کیسے ہو سکتی ہے۔ وہ —— وہ —— تو —— وہ تو فریدہ کی کسی لغزش کا نتیجہ ہے۔ اُف! یہ سب کیا ہے۔ یہ سب کیا ہے۔ ثومی بُندے کو پاگلوں کی طرح دیکھتے ہوئے آفتاب کی طرف بڑھی۔

کلیم مہ جبین ہی کا جائزہ لے رہا تھا۔ وہ چیختے چیختے بے دم ہو رہی تھی۔ آفتاب عالم کے چہرے پر پریشانی ہی پریشانی تھی۔ مہ جبین کو دورہ پڑ گیا تھا۔ ضمیر کی کسک بے چین ہوا اٹھی تھی۔ وہ اپنے ہونٹ کاٹ رہا تھا۔ اپنے ہاتھ مسل رہا تھا۔

چیخ و پکار سن کر نوکر چاکر دوڑے آئے۔ کلیم نے سب کو واپس چلے جانے کا کہا۔ مہ جبین چیختے چیختے مسہری سے اترنے کی کوشش کرنے لگی۔ کلیم نے اسے بمشکل سنبھالا۔ وہ بے دم ہو کر مسہری پر گر گئی۔ اس کے لبوں پر اب بھی یہی الفاظ تھے۔

"دوسرا کہاں گیا۔"

"دوسرا کہاں گیا۔" ثومی نے یہی الفاظ آفتاب کا گھٹنا جھنجھوڑتے ہوئے بے صبری سے کہے۔ اس نے بُندے والی ڈبیہ آفتاب کے سامنے کر دی۔

"دوسرا کہاں گیا۔" ثومی کے بچے کی طرح سپید ہوتے ہونٹ ہلے۔

"کھو گیا تھا۔" آفتاب عالم کی نظریں مہ جبین پر تھیں۔

"کیسے کھو گیا تھا۔ کہاں کھو گیا تھا۔" ثومی پاگلوں کی طرح پوچھ رہی تھی۔

"اسی حادثے میں کھویا تھا۔ جس میں شائستہ مری تھی۔" آفتاب عالم نے اپنا سر ہاتھوں میں تھام لیا —— کلیم مہ جبین کی نبض پر ہاتھ رکھے اس کے پھوٹے پلٹ پلٹ کر آنکھوں کی پتلیاں دیکھ رہا تھا۔

ثومی کا دل ساکت ہو گیا جیسے —— ہتھیلی پر بُندہ رکھے وہ پوری آنکھیں کھولے

بُندے کو وحشت سے دیکھ رہی تھی۔ بُندہ حادثے میں کھویا تھا۔ اور — اور۔ حادثہ اسی شہر میں ہُوا تھا۔ یہ سب کیا تھا؟

کیا جیراں کے پاس مہ جبین ہی کا بُندہ تھا؟

تو کیا — کیا —!!

لیکن وہ کون تھی؟ اور خورشید عالم کے پہلو میں قبر کس کی تھی؟

"کیا آپ — آپ کو یقین ہے کہ بُندہ حادثے ہی میں کھویا تھا۔" پاگلوں کی طرح ثومی نے پھر آفتاب کا گھٹنا جھنجھوڑ ڈالا۔

"ہاں ہاں —" آفتاب نے الجھتے ہوئے کہا۔ لیکن جب اس کی نظر ثومی کے بے رنگ چہرے اور سپید کانپتے ہونٹوں پر پڑی۔ تو اس نے جلدی سے ثومی کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر پوچھا۔ "تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے نا —"

ثومی کی پیشانی پر ٹھنڈے پسینے کی بوندیں چمکنے لگیں۔ وہ سنبھلنے کی کوشش میں بے حال ہو گئی۔

کلیم ڈاکٹر الٰہی کو پھر ٹیلی فون کرنے لپکا۔ اس کا یہاں آنا ضروری تھا۔

"شائستہ" آفتاب نے ثومی کی دگرگوں حالت دیکھ کر اسے پکارا۔

"یہ — یہ بُندہ کس کا — ہے —" اس کے لبوں سے بمشکل نکلا۔

"مہ جبین بھابی کا —" آفتاب نے جلدی سے کہا۔

"دوسرا کہاں گیا —" اس نے تڑپ کر پوچھا۔

"کھو گیا تھا بیٹی — مہ جبین بھابی — کو اس منحوس حادثے کے بعد جب اٹھا کر لایا گیا۔ تو ان کے کان میں بُندہ تھا۔ میں نے ہی اس ڈبیہ میں یہ اکیلا بُندہ رکھ کر زیور بند کیا تھا — ایک وہیں کہیں گر گیا ہو گا — اب تو برسوں —

لیکن شائستہ — تمہیں —"

"یہ — یہ سب کیا ہے — یہ سب کیا ہے — یہ سب کیا ہے —" بڑبڑاتے ہوئے وہ چکرائی۔ اور قالین پر ہی گر گئی۔

کلیم واپس آیا تو ثومی بے ہوش پڑی تھی۔ آفتاب عالم اسے پکار رہا تھا۔ "بے ہوش ہو گئی ہے۔" آفتاب عالم نے کلیم سے کہا۔

کلیم بے اختیار ہو کر اس کی طرف بڑھا — ثومی — ثومی — اس نے اس کا چہرہ پکڑ کر بے تابی سے پکارا۔ پھر نبض پر ہاتھ رکھا۔ سینے پر تھپکی دی۔

"خدا جانے کیا ہُوا —" آفتاب عالم نے بُندے کے متعلق ثومی کا استفسار کلیم کو سناتے ہوئے کہا۔

کلیم نے بے ہوش ثومی کو دونوں ہاتھوں پر اٹھایا۔ اور دوسرے کمرے میں لے جا کر بستر پر ڈال دیا۔

"وہ اور آفتاب کوئی بھی تو نہ جان سکا۔ کہ اسے ہُوا کیا ہے۔"

— ٭ —

کلیم نے جس تڑپ، جس جان سوزی اور جس بے تابیٔ دل کا ثومی کے بیہوش ہونے پر بے زبان مظاہرہ ہوا۔ وہ اس کے نہاں اور مستور جذبۂ عشق کے اظہار کا کھلا وسیلہ تھا۔ آفتاب عالم جہاں دیدہ آدمی تھا۔ پہلے بھی کچھ آگاہی تھی۔ لیکن اب تو اس حقیقت کو پوری طرح جان گیا۔ کہ ثومی و کلیم دونوں محبت کے اٹوٹ بندھن میں جکڑے ہوئے ہیں۔

کلیم ثومی کو ہوش میں لانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اور آفتاب اس کے جذبۂ عشق کی گہرائی و گیرائی کو ماپنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اسے کلیم اور ثومی کے خاموش افسردہ چہروں سے یہ بھی اندازہ ہو گیا تھا۔ کہ دونوں کچھ خفگی کا بھی شکار ہیں۔ لیکن دونوں کو دیکھ کر اسے یہ خوشی ضرور تھی۔ کہ قدرت نے ان کا جوڑ خوب سجایا ہے۔

کلیم کی کاوش سے ثومی کو تھوڑی ہی دیر بعد ہوش آ گیا۔ اس کے لب لرزنے لگے پلکیں کانپنے لگیں۔ دو ایک بار پلکیں جھپکیں۔ ہونٹ ہلائے۔ ہاتھ پیشانی تک لے گئی۔

کلیم اسے ہوش سے قریب ہوتے دیکھ کر پلنگ سے قدرے ہٹ کر تکیے کی طرف کھڑا ہو گیا۔ وہ نہیں چاہتا تھا۔ ثومی اسے اپنے اوپر جھکا دیکھ کر بیزاری کا تاثر دے۔

ثومی نے آنکھیں کھول کر چاروں طرف دیکھا۔ اپنی انگلیوں سے پھر پیشانی چھوئی۔ پھر آنکھیں میچ لیں۔ حواس میں آتے ہی بندے والے واقعے کی شیرینی و تلخی کا جان لیوہ احساس ہوا۔

وہ بستر پر اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس کا رنگ اب بھی بے رنگ تھا۔ اور ہونٹوں پر قدرتی سرخی عود کر نہیں آئی تھی۔ اس کی آنکھوں میں بھی وحشت و ویرانی تھی۔ وہ پھیلی پھیلی آنکھوں سے چاروں طرف دیکھنے لگی۔

"کیا ہوا تھا بیٹی" آفتاب نے پیار سے پوچھا۔ "مرجینن بھابی۔"

"وہ۔ وہ بندہ۔" ثومی نے دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا۔ اس کی آنکھیں پھر بند ہو گئیں۔ لب لرزنے لگے۔

"شائستہ۔" آفتاب نے اسے کندھے سے پکڑ کر ہلایا۔ وہ پھر گری جا رہی تھی۔

کلیم کا دل کٹ کٹ گیا۔ اس نے بڑھ کر ثومی کو بازوؤں میں تھام لینا چاہا۔ لیکن قدم رک گئے۔ وہ آفتاب کے سامنے ثومی کی بیزاری کا مظاہرہ دیکھ کر اپنے آپ کو۔ اپنی محبت کو اپنے پیار کو رسوا نہیں کرنا چاہتا تھا۔

"وہ بندہ۔۔۔؟" ثومی تکیے پر پھر گر گئی۔ آفتاب نے اسے ٹھیک سے پلنگ پر لٹاتے ہوئے حیرانگی سے پوچھا۔ "تم بار بار اس بندے کو کیوں پوچھ رہی ہو۔" ثومی کی بند آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔

کلیم کی بے تابی و بد کے قابل تھی۔ آفتاب بھی پریشان ہو رہا تھا۔ مرجینن ہی کی پریشانی کیا کم تھی۔ جو یہ نئی افتاد۔

"وہ بندہ۔" ثومی بے قرار ہو کر پھر اٹھ بیٹھی۔ اس کی حالت اس بند تڑے کی سی تھی۔ جس کے داخلی عناصر کو باہر پھوٹ پڑنے کا راستہ نہ مل رہا ہو۔

"ثومی۔" کلیم تکیے سے گھوم کر اس کے سامنے آ گیا۔ اجنبی سی آواز میں اسے پکارا اور پھر لہجے میں اک ڈاکٹر کی شفقت آ گئی۔ "تم اس بندے کو بار بار کیوں پوچھ رہی ہو۔"

"کلیم ۔" ثومی نے بے اختیار ہو کر کلیم کا ہاتھ سختی سے پکڑ لیا۔ اسے جو کچھ ہو رہا تھا۔ اس کے اظہار کا یہ لاشعوری طریقہ تھا۔ ثومی نے کلیم کے پکڑے ہوئے ہاتھ پر اپنا ماتھا ٹکا دیا۔

کلیم کا دل اس کی بے اختیاری حرکت سے رقیق مادے کی طرح ہو گیا۔ لیکن اپنے آپ پر قابو پاتے ہوئے اس نے نرمی سے پوچھا۔ "کیا بات ہے ثومی ۔"

"ایسا ہی بندہ ۔۔۔ ایسا ہی بندہ ۔ مالی بابا کے پاس ہے ۔" اس نے کلیم کا ہاتھ چھوڑ کر دونوں ہاتھ مٹھی کی صورت الجھا کر تشنجی سی کیفیت میں کہا۔

"تو کیا ہوا ؟ ۔۔۔" کلیم کے ساتھ یہی الفاظ آفتاب نے بھی کہے ۔ دونوں کے لیے یہ بات کچھ ایسی اہم نہ تھی۔

"تمہارے شہر ہی میں تو حادثہ ہوا تھا ۔ ہو سکتا ہے ۔ مالی کو کہیں گرا ہوا یہ بندہ مل گیا ہو۔" آفتاب عالم نے دلگیر آواز میں کہا۔ وہ بڑا ہی مضطرب و بے چین نظر آنے لگا۔ "یہ کوئی ایسی بات نہیں ۔ کہیں گرا پڑا ہو۔"

"نہیں ۔۔۔" ثومی پاگلوں کی طرح چیخی ۔ اس کے ہاتھوں میں پھر تشنجی اکڑاؤ کی کیفیت تھی۔ کلیم نے اس کے قریب کرسی پر بیٹھتے ہوئے اس کے دونوں ہاتھ پکڑ کر اپنے ہاتھوں سے سہلاتے ہوئے پوچھا۔ "تم کیا کہنا چاہ رہی ہو ثومی ۔۔۔ بندے کے متعلق ۔۔۔"

"وہ بندہ ۔۔۔ بندہ ۔ مالی بابا نے ۔۔۔" ثومی کی آواز گھٹ گھٹ گئی۔ آفتاب عالم بھی اب اس کی طرف دھڑکتے دل کو لیے پوری طرح متوجہ ہوا ۔ مسہری کے قریب پڑی دوسری کرسی پر بیٹھتے ہوئے ثومی کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "بخدا ۔ جو کچھ کہنا ہے ۔۔۔ کہہ ڈالو ۔"

"ثومی ۔ حوصلہ رکھو ۔ ہمت سے کام لو ۔ ساری بات کھل کر کہو۔" کلیم نے

اپنے ہاتھوں میں برف کی طرح ٹھنڈے ہاتھ سہلاتے ہوئے کہا۔

ثومی لمبے لمبے گہرے گہرے سانس لینے لگی ۔ اس کی آنکھیں کبھی بند ہو جاتیں کبھی کھلنے لگتیں ۔ سر گھومتے پہیے کی طرح چکرانے لگتا ۔ اور کبھی یخ بستہ برف کی طرح ہو جاتا۔

"مجھے کیا ہو رہا ہے ۔۔۔ مجھے کیا ہو رہا ہے ۔" وہ پھر گرنے لگی۔ کلیم نے پٹی پر بیٹھتے ہوئے اسے اپنے بازو کے سہارے تھام لیا۔ "ثومی ۔۔۔ کوئی خاص بات ہے تو کہہ ڈالو ۔ کچھ کہو تو ۔۔۔"

کلیم نے اس کے کانپتے وجود کو محسوس کیا ۔ وہ بیحد پریشان نظر آنے لگا۔ ثومی کو سمجھ نہ آ رہا تھا ۔ کہ کیا کہے ۔ اس کے نازک جسم کو زلزلے کی طرح جھٹکے لگ رہے تھے ۔

کیا ایسا ہی بندہ مالی بابا کے پاس بھی ہے ۔ ؟" کلیم نے اس کی پشت پر ہاتھ رکھتے ہوئے سہارا دے کر ملائمت سے پوچھا۔

"ہاں ۔ ہاں ۔ بالکل ایسا ہی ہے ۔" ثومی بڑبڑائی۔ "وہ بندہ مالی بابا کو گرا پڑا نہیں ملا تھا۔"

"تو کہاں سے لیا اس نے ۔" کلیم نے جلدی سے پوچھا ۔ آفتاب چونک گیا تھا لیکن کلیم نے اسے آنکھ کے اشارے سے چپ رہنے کو کہا ۔ وہ ثومی کو بات کرنے کے قابل بنا رہا تھا ۔

"مالی بابا ۔۔۔ کہا کرتا ہے ۔ یہ ۔۔۔ یہ بندہ ۔۔۔ اس عورت کا ہے جو مجھے ۔۔۔ مجھے گیٹ کے پیچھے ڈال کر ۔۔۔ بھاگ گئی تھی ۔۔۔" ثومی نے کانپتے ہاتھوں سے پھر کلیم کا ہاتھ پکڑ لیا ۔ "یہ بندہ ۔۔۔ میری ماں کا ہے کلیم ۔۔۔"

آفتاب عالم کچھ نہ سمجھا ۔ لیکن کلیم اس بات سے چکرا سا گیا ۔ ثومی کے

جذبات کی شدت اس کے ہاتھ کے دباؤ سے ظاہر تھی۔ چند لمحے وہ کچھ نہ سمجھ سکا۔ اور ثومی بھی بے حال ہو گئی۔

"ثومی ــــ ثومی ــــ" کلیم نے اسے بستر پر لٹاتے ہوئے پکارا۔ پھر پانی کے دو گھونٹ اسے پلائے۔ اس کے ماتھے کا ٹھنڈا پسینہ اپنے رومال سے پونچھا۔

آفتاب عالم کمرے سے اٹھ کر بے تابی سے ٹہلنے لگا تھا۔ اس نے دوسرے کمرے میں جھانک کر دیکھا۔ مہ جبین بے ہوش پڑی تھی۔ ادھر شائستہ پر غشی کی کیفیت تھی۔

"میرا تو اپنا دماغ ماؤف ہوا جا رہا ہے۔ شائستہ کیا کہہ رہی ہے" آفتاب عالم نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے سر تھام لیا۔ "مالی بابا کون ہے۔ ثومی کا کیا قصہ ہے۔؟"

کلیم خود نہیں سمجھ پا رہا تھا۔ اس کی اپنی حالت غیر ہو رہی تھی۔ چند منٹ اور گزر گئے کلیم نے ثومی کو دوائی کے چند قطرے دیے۔ اس نے بمشکل سنبھالا لیا۔

"مالی بابا کے بارے میں تم بتا رہی تھیں نا ــــ" کئی لمحوں کے بوجھل سکوت کے بعد کلیم نے ثومی سے پوچھا۔

"میری ماں مجھے فرید صاحب کے گیٹ کے پیچھے پھینک کر بھاگ گئی تھی۔" ثومی نے بستر پر لیٹتے ہوئے جیسے اپنے آپ سے کہا۔ آفتاب حیرانگی سے اس کا چہرہ تکنے لگا۔

"ہاں ــــ میں جانتا ہوں۔" کلیم نے پتھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"مالی بابا ــــ اس کے پیچھے دوڑا تھا۔ لیکن وہ بھاگ گئی۔ اس کی شال بابا کے ہاتھ آئی۔ اسی کے ساتھ یہ بندہ اٹکا ہوا تھا۔" بے خودی کے عالم میں کہہ گئی۔ "وہ

بندہ میری ماں کا ہے کلیم ــ اور یہ ــ یہ اکیلا بندہ ــــ یہ ــــ یہ ــــ"

ثومی نے پھر سر تھام لیا۔ کلیم بھی گنگ ہو گیا۔ آفتاب کی حالت دیدنی تھی۔ کسی کی سمجھ میں کچھ نہ آ رہا تھا۔

ثومی پانی کی وہ لہر تھی۔ جو کبھی ساحل کی آغوش میں آسودہ ہوتی ہے۔ اور کبھی کھنچ کر گہرے گہرے پانیوں میں مدغم ہو جاتی ہے۔

بندہ وہی تھا۔ وہ پورے وثوق پورے یقین سے کہہ سکتی تھی۔

لیکن شائستہ کی قبر ــ اور فرید کا اعتراف!

یہ سب کیا تھا ــــ؟ اس کا ذہن جھٹکے پہ جھٹکا کھا رہا تھا۔

کلیم کے ذہن میں بھی دو متضاد حقیقتیں ٹکرا رہی تھیں۔ اگر بندہ واقعی ثومی کی ماں کا تھا۔ تو کیا مہ جبین ثومی کی ماں تھی! ــــ ثومی مہ جبین کی بیٹی تھی ــــ تو ــــ فرید کون تھا؟

آفتاب عالم کا ذہن بھی گڈمڈ ہو رہا تھا۔ ثومی کا وثوق اور یقین الجھاؤ کا باعث بن رہا تھا۔ اگر واقعی بندہ اسی طرح کا ہوا تو ــــ؟ تو؟ ــــ لیکن اسے حقیقت جان لینے کی گنجائش کہاں تھی۔ اس نے مایوسی سے سر ادھر ادھر ہلاتے ہوئے ثومی کو نگاہِ ترحم سے دیکھا۔

ثومی نے اپنی بے اختیاری پر اختیار پاتے ہی کلیم کی طرف دیکھا۔ جو سر جھکائے سوچوں میں الجھا کھڑا تھا۔ "بندہ مالی بابا کے پاس اب بھی ہے۔" ثومی نے کہا۔

کلیم نے سر اٹھایا۔ ثومی کے چہرے پر بے بسی کچھ اس طرح جامد ہو گئی تھی کہ کلیم کا دل تڑپ گیا۔ اس کی طرف چند ثانیے دیکھتے ہوئے وہ سوچوں میں الجھا نظر آیا۔

"آپ مالی بابا کو پوچھتے نا۔ وہ بندہ لے آتے۔" ثومی نے پھر تڑپا دینے

والی بے بسی سے کہا۔

"مالی بابا کون ہے" آفتاب عالم نے کلیم کے کچھ کہنے سے پہلے ہی بیتابی سے پوچھا۔ "یہ سب کیا قصہ ہے ـــــ" مجھے تو کچھ سمجھ نہیں آرہا۔"

کلیم نے چند لفظوں میں ثومی کے متعلق سنی ہوئی کہانی آفتاب عالم کے گوش گزار کردی۔ ثومی بیچارگی کے عالم میں اپنے ہاتھ مسلتی رہی۔

آفتاب چونکا۔ آنکھیں جھپک جھپک کر ثومی کو دیکھا۔ کچھ تو تھا اس لڑکی میں جو اسے دیکھتے ہی پدری جذبے ہمک ہمک پڑتے تھے۔ لیکن معاملہ یقین کی حدود سے کوسوں دور تھا۔

"آپ بندہ لے آیئے نا ـــــ" ثومی نے یاس و بیم سے کلیم کو دیکھا۔

"میں ابھی جاتا ہوں۔ کلیم نے اس کی بے تابیوں سے مرعوب ہو کر کہا۔

"لیکن ـــــ" آفتاب عالم کچھ نہ سمجھ پایا۔

"وہ بندہ اس بندے سے ملا دیکھنے میں کیا ہرج ہے۔ ثومی کو پورا یقین ہے۔ کہ وہ بندہ اسی کی جوڑی کا ہے۔"

"لیکن ـــــ؟" آفتاب عالم کچھ کہتے ہوئے جھجک رہا تھا۔ ہاتھ ملتے ہوئے بیتابی سے کمرے میں ٹہلنے لگا۔

"میں ابھی مالی کو مع بندے کے لے آتا ہوں۔" کلیم نے گوشۂ چشم سے ثومی کی بے بسی اور بے چینی کو بھانپا۔

آفتاب تذبذب کے عالم میں تھا۔ جلدی سے بولا۔ "مرجبین بھابی بیہوش ہیں۔" ابھی ڈاکٹر الٰہی پہنچ جائیں گے۔" کلیم نے دروازے کی طرف جاتے ہوئے کہا۔

"ویسے ان کی بے ہوشی تشویش ناک بھی نہیں۔"

کلیم تیزی سے کمرے سے باہر نکل گیا۔

ثومی اپنی پل پل بگڑتی حالت کو بمشکل سنبھالنے کی کوشش کر رہی تھی۔ آفتاب کا ذہن گڈمڈ ہو رہا تھا۔ ثومی کو دیکھ دیکھ کر اس کو اپنے سینے میں کچھ عجیب سی کیفیتیں ٹوٹتی محسوس ہو رہی تھیں۔

بندے کی کہانی اس نے پھر ثومی سے سنی۔

"تمہیں یقین ہے کہ بندہ بالکل ہی ایسا ہے۔" اس نے بے صبری سے پوچھا۔

"جی۔ بالکل ہی ایسا ہے۔ میں اسے پہچانتی ہوں۔ وہ بندہ میں نے ہزاروں مرتبہ دیکھا ہے۔ بالکل یہی ہے۔" ثومی ہاتھ بے تابی سے مسلتے ہوئے بیچارگی سے بولی۔

"یہ کب کا واقعہ ہے۔؟ تمہیں کچھ تاریخ ـــــ" آفتاب نے پوچھا۔

"سترہ ستمبر کی صبح۔" ثومی نے تاریخ کے ساتھ سن بھی بتا دیا۔

"کیا؟" آفتاب حیرت زدہ سا ہو کر چیخا۔

ثومی نے پھر وہی تاریخ دہرا دی۔

"خداوندا۔" آفتاب عالم کا سر چکرا گیا۔

وہی تاریخ۔ وہی سن۔ وہی شہر اور وہی سڑک۔ لیکن وہی الجھا ہوا سوال۔ شائستہ کی قبر؟

ثومی کو الجھتے سلجھتے اسی حال میں چھوڑ کر وہ اپنے دفتر میں آکر کرسی میں گر گیا۔

ـــــ ؛ ـــــ

"گامے"

"جی صاحب"

"یہ سب کیا ہے۔ کیا ماجرا ہے۔ میرا تو دماغ ماؤف ہوا جا رہا ہے۔"

"ایک بات سمجھ میں آتی ہے سرکار۔"

"کیا؟"

"اگر بندہ واقعی اس بندے کی جورو کا ہوا۔ تو شائستہ بی بی یقیناً ثومی بی بی ہی ہے؟"

"کیا؟ ——"

"سرکار۔ میرا دل یہ کہتا ہے۔"

"دل کی مت کہو۔ عقل کیا کہتی ہے یہ کہو۔"

"سرکار۔ ایک بات ہے۔"

"کہہ بھی ڈالو۔"

"شائستہ بی بی کو بدمعاشوں نے مار ڈالا تھا۔"

"ہاں؟"

"ہو سکتا ہے انہوں نے ہم سے غلط کہا ہو۔"

"کیا؟ ——"

"انہوں نے ہمیں لاش تو نہ دکھائی تھی۔ بچی کو خود ہی دفن کر دیا تھا۔"

آفتاب عالم نے کرسی پہ بیٹھتے ہوئے اپنا چکراتا ہوا سر ہاتھوں میں تھام لیا۔

"ہم نے بھی اس وقت اس معاملے کی تحقیق نہ کی۔"

"ہم تو یہی غنیمت جان رہے تھے۔ کہ بچی سے چھٹکارا ہوا۔ حالاں کہ دبی دبی زبان میں لوگوں نے بڑے بڑے اعتراض کیے تھے۔"

"مجھے سب یاد ہے۔"

ان واقعات کی روشنی میں تو یہی لگتا ہے۔ کہ بدمعاشوں نے روپے کے لالچ میں قبر بنا دی۔

"کیا یہ ممکن ہے۔"

"کیوں نہیں — سرکار — ورنہ سوچیے ذرا۔ بچی کی لاش مسخ شدہ ہی سہی انہیں کس نے دفنانے کو کہا تھا۔ لاش اصولاً ورثاء کو ملنا چاہیے تھی۔"

"تم ٹھیک کہہ رہے ہو گامے۔ خدا کرے یہ بات حقیقت ہو — لیکن — لیکن پتہ کیسے چلے گا —"

"فضلا ان دنوں مونا والی ہی میں ہے۔"

"تو پھر؟"

"اس سے حقیقت اگلوائی جا سکتی ہے۔ جان بخشی کا وعدہ۔ انعام و اکرام کا لالچ۔ کسی نہ کسی طرح اسے اصل بات کہنے پر مجبور کیا جا سکتا ہے۔"

"تو پھر جلدی کرو گامے۔ کیا عجب خدائے قدوس کو مجھ پر رحم آ ہی گیا ہو۔ مجھ گنہ گار کی اس نے سن لی ہو۔"

"میں ابھی جا کر فضلے سے ملتا ہوں۔ مجھے تو یہی لگتا ہے۔ پیسے کے لالچ میں انہوں نے ہمیں دھوکا دیا تھا۔"

"جاؤ۔ خدا کے لیے جلدی جاؤ۔ میرا دل بیٹھا جا رہا ہے۔ ہمت و برداشت

نہیں رہی۔ اُف! میں کتنا گنہ گار ہوں۔ رحمتِ خداوندی ہی ہو گی۔ جو۔ جو۔"

"آپ اپنے آپ کو سنبھالیے سرکار ــــ حالات امید افزا نظر آ رہے ہیں۔ وہی تاریخ، وہی سن، وہی وقت، وہی شہر، وہی سڑک ــــ یہ محض اتفاق نہیں سرکار۔ میرا دل کہتا ہے۔ یہ صرف اتفاق نہیں۔"

"میرا دل بھی یہی گواہی دیتا ہے گامے ــ شائستہ کی بیان کردہ حقیقت کو جھٹلانے کو جی نہیں چاہتا۔ اس لڑکی کو جب پہلی بار میں نے دیکھا تھا۔ تو یوں لگا تھا جیسے وہ کوئی غیر نہیں۔ خدا کرے وہ ہماری اپنی شائستہ ہو۔"

"آمین۔"

"تم فضلے کو تلاش کرو جا کر۔"

"میرے خیال میں ڈاکٹر صاحب آ لیں۔ بُندہ دوسرے بُندے کے ساتھ مل گیا۔ تو میں دس منٹ میں اسے آپ کی خدمت میں حاضر کر دوں گا۔ ضرورت پڑی تو قبر بھی کھود کر دیکھ لیں گے۔"

"خدا کرے یہ قبر جعلی ہو۔"

"خدا کرے گا سرکار۔ آپ اپنا حوصلہ برقرار رکھیئے۔ میری امید بندھ گئی ہے سرکار۔"

دونوں کافی دیر اس مسئلے پر بات چیت کرتے رہے۔ آفتاب عالم بے قرار تھا۔ بے صبری سے کلیم کا انتظار کر رہا تھا۔

ڈاکٹر الٰہی بھی پہنچ گیا۔ آفتاب نے آج کی عجیب و غریب واردات اس کے گوش گزار کر دی۔

"لیکن آپ کی بچی تو مر چکی تھی۔" ڈاکٹر الٰہی نے حیرانگی سے کہا۔

آفتاب سے کوئی جواب نہ بن پڑا۔ گامے نے حاضر دماغی سے کام لیتے ہوئے

کہا۔ "بچی حادثے میں ہلاک ہونے کی خبر ہمیں ضرور ملی تھی۔ لاش ہم نے نہ دیکھی تھی۔ بیگم صاحبہ کی پریشانی کی وجہ سے کسی کو لاش کا ہوش ہی نہ تھا۔ وہ ــ وہ لوگوں نے ہی دفن کر دی۔"

ڈاکٹر الٰہی نے گامے کی طرف غور سے دیکھا۔ پھر اس کی نظریں آفتاب عالم سے ملیں۔ بات کچھ جچی نہ تھی۔ ابھی کچھ کہنے ہی کو تھا۔ کہ کلیم مع مالی کے آ گیا۔ مالی نے سب کو مؤدبانہ سلام کیا۔

"لے آئے بُندہ ڈاکٹر" آفتاب عالم نے بیتابی سے پوچھا۔ "کیا ویسا ہی ہے۔؟"

"یقیناً ویسا ہی ہے۔" کلیم نے جیب سے بُندہ نکال کر میز کی چکنی چمکتی سطح پر رکھ دیا۔ آفتاب کی آنکھیں پھیل گئیں۔ جلدی سے بُندے والی ڈبیہ کھول کر دوسرا بُندہ نکالا اور اس بُندے کے برابر رکھ دیا۔ سب دونوں بُندوں کو دیکھنے لگے۔

"اس میں کوئی شک نہیں۔ کہ دونوں بُندے ایک ہی جوڑی کے ہیں۔" ڈاکٹر الٰہی نے بندے ہتھیلی پر رکھتے ہوئے کہا۔

"یا خدا۔" آفتاب عالم نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے اپنا سر تھام لیا۔

"تو کیا ثومی واقعی ــ شائستہ ہے ــــ" وفورِ جذبات سے کلیم کی آواز کانپ گئی۔ اس نے کرسی کی پشت کو مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا۔

ڈاکٹر الٰہی مالی سے باتیں کرنے لگا۔

"تم نے یہ بُندہ کیسے پایا تھا۔"

"یہ بُندہ ــ اس کالی کشمیری شال کے ساتھ اٹکا ہوا تھا۔ جو میں نے اس عورت کو پکڑنے کی کوشش میں پائی تھی۔ جو ثومی بیٹی کو گیٹ پیچھے ڈال کر بھاگ گئی تھی۔"

"سارا واقعہ دہراؤ ــــ کب کی بات ہے یہ ــــ"

مالی نے تاریخ بتائی۔ آفتاب عالم نے اپنے متلاطم جذبات کو بمشکل قابو میں کرتے

ہوئے اس تاریخ پر اثبات میں سر ہلایا۔

"پورا بھی پوری طرح نہ پھٹی تھی صاحب جی۔ میں گیٹ کھول کر ابھی پلٹا ہی تھا۔ کہ ایک جوان خوبصورت عورت کوٹھی کے پچھلے احاطے سے دیوانہ وار بھاگتی آئی۔ کپڑوں میں لپٹی کوئی چیز ادھ کھلے گیٹ کے پیچھے رکھی۔ اور برق رفتاری سے بھاگ گئی۔ میں اس کے پیچھے لپکا۔ لیکن وہ پاگلوں کی طرح چیختی سڑک پار کر کے بھاگتی گئی۔ اور پھر میرے پکڑنے سے پہلے ہی ایک کوٹھی کی باڑ پھلانگ گئی۔ میرے ہاتھ اس کی کالی شال ہی آئی۔ جس کے ساتھ یہ بندہ اٹکا ہوا تھا۔ میں نے واپس آکر گیٹ کے پیچھے دیکھا۔ بمشکل دس پندرہ یوم کی بچی پیازی کپڑوں میں لپٹی ہوئی وہاں پڑی تھی۔"

سب دم بخود مالی کی باتیں سن رہے تھے۔ گاما اسی وقت کمرے سے باہر نکل گیا۔ اب اس کا یقین پختہ ہو چکا تھا۔ کہ بچی حادثے میں ہلاک نہ ہوئی تھی۔

"تم نے اس عورت کی شکل دیکھی ہو گی۔"

"جی۔ بھلی سی عورت تھی۔ جوان اور خوبصورت۔"

"اب اس کی شکل یاد ہے۔"

"جی؟"

"میرا مطلب ہے اسے دیکھو تو پہچان لو گے۔"

"کیا کہہ سکتا ہوں صاحب۔ انیس بیس برس ہو گئے۔ اس کی ایک جھلک ہی تو دیکھی تھی۔"

"ذہن پر زور دو۔ شاید اس کا حلیہ یاد آجائے۔"

"اس کے گال پر موٹا سا کالا تل تھا۔ یہ مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ ناک نقشہ کیسا تھا؟ یہ یاد نہیں پڑتا۔"

گال کے تل پر سب نے ایک دوسرے کو حیرت و مسرت کی ملی جلی نظروں سے دیکھا۔ آفتاب کی حالت ناگفتہ بہ تھی۔ جو کچھ سن رہا تھا۔ جو کچھ دیکھ رہا تھا۔ خواب کی طرح لگ رہا تھا۔ اتنی بڑی حقیقت ناقابل یقین نظر آرہی تھی۔

مالی سے تھوڑی دیر اور باتیں کرنے کے بعد کلیم اور ڈاکٹر الٰہی آپس میں تبادلۂ خیال کرتے رہے۔ کلیم نے بھی ڈاکٹر الٰہی کے اس خیال کی تائید کی۔ کہ مالی کو مہ جبین کے کمرے میں لے جانا چاہیئے۔

فتو مالی کو لے کر سب مہ جبین کی خواب گاہ میں پہنچے۔ وہ اب تک بے ہوش پڑی تھی۔ مالی حویلی کی عظمت سے پہلے ہی بھونچکا تھا۔ اس خواب گاہ کے مدہوش کن ماحول اور خواب ناک فضا سے بڑا مرعوب ہوا۔

ڈاکٹر الٰہی نے آگے بڑھ کر مسہری کے مہین پردے آہستگی سے ہٹا دیے۔ زرد مہ جبین کی آنکھیں بند تھیں۔ ریشمی بستر میں وہ دھنسی پڑی تھی۔ اس کے گال کا تل نمایاں طور پر نظر آرہا تھا۔

"انہیں دیکھو" ڈاکٹر الٰہی نے فتو مالی سے کہا۔

مالی نے مہ جبین کو دیکھا۔ پلکیں جھپکائیں۔ آنکھیں کھولیں۔ بند کیں۔ پھر کھولیں۔

"یقیناً یہی تھیں صاحب۔ ان کے گال کا یہ تل میرے ذہن میں اب بھی محفوظ ہے۔ یہی تھیں۔ یہی تو بی بی کو گیٹ کے پیچھے پھینک گئی تھیں۔ یہی تھیں صاحب۔ یہی تھیں۔"

آفتاب عالم کی حالت دید کے قابل تھی۔ کلیم بھی گنگ سا کھڑا تھا۔ ڈاکٹر الٰہی کا دماغ بھی چکرا رہا تھا۔ مالی پورے تیقن، پورے وثوق سے مہ جبین کو دیکھ کر اپنی کہے جا رہا تھا۔

سب آہستہ آہستہ قدم اٹھاتے کمرے سے نکل آئے۔ اور ساتھ والے کمرے

میں داخل ہو گئے۔

"تو اب ۔۔۔؟" ڈاکٹر الٰہی نے کلیم سے پوچھا۔

"کیا عرض کر سکتا ہوں۔ مالی کے بیان سے تو صاف ظاہر ہے کہ ثومی ہی شائستہ ہے۔ لیکن ۔ شائستہ کی قبر ۔۔۔؟ یہ معمہ حل نہیں ہو رہا۔"

"یہ معمہ بھی حل ہو جاتا ہے ڈاکٹر ۔۔۔" آفتاب عالم نے بے تابی سے کہا "یقیناً شائستہ ہلاک نہیں ہوئی تھی۔ یقیناً وہ زندہ بچ گئی تھی۔"

وہ کچھ اور کہنے کو تھا۔ کہ گاما ہانپتا ہوا آن پہنچا۔ مبارک ہو سرکار۔ مبارک ہو۔" وہ وفورِ مسرت سے دوزانو ہو کر آفتاب عالم کی ٹانگوں سے لپٹ گیا۔

"آپ بڑے خوش نصیب ہیں سرکار۔ مبارک ہو۔"

"تم فضلے سے مل آئے۔" آفتاب عالم نے سب کی حیرانگی کو نظر انداز کرتے ہوئے مجنونانہ انداز میں گامے کو کندھے سے پکڑ کر اٹھایا۔

"اسے میں اپنے ساتھ ہی لایا ہوں سرکار۔" گاما فرطِ مسرت سے چیخ اٹھا۔ "ثومی بی بی۔ آپ ہی کی شائستہ بی بی ہے سرکار۔ سارے شک دور ہو گئے سرکار۔ وہ ۔ وہ قبر بھی جعلی ہے۔ شائستہ بی بی ہلاک نہیں ہوئی تھیں۔"

"میرے مولا۔" آفتاب عالم کے منہ سے چیخ نما آواز نکلی۔ وہ فرطِ جذبات سے لہرا سا گیا۔ کلیم اور ڈاکٹر الٰہی نے آگے بڑھ کر اس کا بھاری بھرکم وجود تھام لیا۔ گاما وفورِ مسرت سے بار بار وہی الفاظ دہرا رہا تھا۔ اس کی باتوں کی کلیم کو کچھ سمجھ آئی نہ ڈاکٹر الٰہی کو۔

دونوں نے سہارا دے کر آفتاب عالم کو گدے دار کرسی پر بٹھا دیا۔ وہ کئی لمحے سامنے پڑے چکنی سطح والے خوبصورت میز پر اپنا سر رکھے بے خود سا رہا۔

جذباتی لمحوں کے خاتمے پر جب وہ قدرے پُرسکون ہوا۔ تو اس نے سر اٹھایا۔

گامے کو دیکھا اور مسرت بھری آواز میں بہکتے ہوئے بولا۔ "کیا واقعی گامے ۔۔۔؟ وہ قبر جعلی ہے۔ شائستہ ہلاک نہیں ہوئی تھی۔"؟

گاما کوئی جواب دینے سے پہلے لپک کر باہر گیا۔ اور دوسرے لمحے جب وہ اندر آیا تو اس کے پیچھے فضلا بھی سر جھکائے اندر داخل ہوا۔ ڈاکٹر الٰہی اور کلیم نے بیک وقت اس کی طرف دیکھا۔

فضلے! کیا واقعی وہ قبر جعلی ہے۔" آفتاب عالم کی بیتابی دید کے قابل تھی۔

"ہاں سرکار۔" فضلے نے دونوں ہاتھ باندھ کر سر جھکا دیا۔

"میرے مالک! ۔۔۔" آفتاب عالم کے منہ سے نکلا۔ "کیا میں واقعی اتنا خوش نصیب ہوں۔" فضلے نے اسی طرح ہاتھ باندھے لرزاں آواز میں کہا:

"سرکار! ۔۔۔ ہم نے آپ کو دھوکا دیا تھا۔"

"ڈرو نہیں۔ پوری بات کہہ کر سرکار کی تسلی کر دو۔ تمہیں کچھ نہیں کہا جائیگا فضلے۔ تمہارا دھوکا تو آج سرکار کے لیے باعثِ رحمت بن گیا ہے۔"

ڈاکٹر الٰہی میز کے دوسری طرف رکھی کرسی پر بیٹھ گیا۔ کلیم آفتاب عالم کی کرسی کی پشت پر اپنے ہاتھوں کی گرفت مضبوطی سے رکھے کھڑا رہا۔ اسرار و رموز کھل رہے تھے۔ ثومی شائستہ ہی تھی۔ یہ انکشاف مسرتوں کا پیغامبر سہی۔ لیکن ابھی تک کلیم کے لیے الجھن کا باعث بنا ہوا تھا۔ اس سارے معاملے میں فرید کا کیا مقام تھا۔ اس کا ذہن اس مقام کا تعین نہ کر پا رہا تھا۔

ڈاکٹر الٰہی کی حوصلہ افزائی۔ اور آفتاب عالم کی معافی کے وعدے سے فضلے نے انیس برسوں کا چھپایا راز مستحکم آواز میں اگل دیا۔

"میں اور میرا ساتھی بیگم صاحبہ کی گاڑی کی تاک میں تھے۔ ہم نے گاڑی روک لی اور سب سے پہلے آیا۔ اور ڈرائیور سے نپٹنے کا سوچا۔ لیکن جب ہم ان دونوں کو

بیہوش کر کے مشکیں باندھ رہے تھے۔ کہ بیگم صاحبہ بچی کو سینے سے لگا کر گاڑی سے بھاگ نکلیں۔ ہم نے ان کا پیچھا تو کیا۔ لیکن وہ کوٹھیوں کے احاطے پھلانگتے ہوئے کہیں سے کہیں نکل گئیں۔ جب گھنٹہ بھر کی تلاش کے بعد ہم نے ان کو بے ہوشی کی حالت میں ایک دوسری سڑک پر پایا۔ تو ان کے ساتھ بچی نہ تھی۔"

"پھر! ——" آفتاب کی تڑپ دید کے قابل تھی۔

"ہم نے بہتیرا تلاش کیا۔ لیکن بچی نہ ملی۔ ہمیں پانچ ہزار کا لالچ تھا۔ ہم نے یہ منصوبہ بنایا۔ کہ بچی کی قبر آپ کے آبائی قبرستان میں بنا کر آپ سے کہہ دیا جائے۔ کہ بچی کی لاش کا قبیہ بن گیا تھا۔ ہماری خوش نصیبی تھی۔ کہ آپ نے زیادہ پوچھ گچھ نہ کی اور بیگم صاحبہ نے یادداشت کھو دی —— جس سے ہمارے راز سے پردہ نہ اٹھ سکا۔ سرکار —— ! ہم نے پانچ ہزار کے لالچ میں یہ سب کچھ کیا تھا۔ لالچ انسان کو اندھا کر دیتا ہے سرکار ——"

فضلے نے ساری داستان کہہ سنائی۔ ہر کوئی دم بخود تھا۔ آفتاب عالم کی حالت تو دید کے قابل تھی۔ گامے بھی مسرتوں کا بار برداشت نہ کر پا رہا تھا۔ فتو مالی بھی خوش تھا۔

"بیگم صاحبہ نے اپنی طرف سے بچی کو گیٹ کے پیچھے چھپا دیا تھا۔" فتو مالی فضلے کی باتیں سن کر بولا:

"حملہ آوروں کے ڈر سے یقیناً انہوں نے بچی کو چھپایا ہوگا۔" ڈاکٹر الٰہی نے سوچتے ہوئے کہا۔

"میں نے اپنی کوٹھڑی سے گیٹ کے پیچھے چھپاتے ہی دیکھا تھا جناب۔" فتو بولا:

"بیچاری بیگم صاحبہ ——" ڈاکٹر الٰہی بولا۔ "ممتا کی ماری نے یہی راہ سوچی ہوگی

خیال ہوگا حملہ آوروں سے نپٹ کر بچی کو اٹھا لیں لیکن بدقسمتی دیکھیے وہ یادداشت ہی کھو بیٹھیں۔ کتنی عجیب بات ہے۔ کیا انوکھا انکشاف ہے۔ انیس بیس برس کے بعد۔"

"یہ میرے جرم کی سزا تھی ڈاکٹر۔" آفتاب عالم کرسی کی پشت پر سر رکھتے ہوئے بے تابی سے بولا۔

"یہ انیس برس میں نے کانٹوں پر گزارے ہیں۔ کوئی نہیں جان سکتا۔ میرے ضمیر کی خلش نے مجھے کیسے کیسے تڑپایا۔ اف! مجھ سے گنہ گار پر یہ رحمتِ خداوندی۔"

آفتاب عالم نے دونوں ہاتھ باندھ دیے۔ اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب بہہ نکلا۔ "میں بڑا گنہ گار ہوں۔ میں نے بہت بڑا جرم کیا تھا۔ میں رب عزّ و جل کی اس نوازش کا مستحق تو نہیں تھا۔ لیکن قدرت نے مجھ پر رحم فرمایا۔ آج میرے سینے سے انیس برسوں کا بوجھ اتر گیا ہے۔ میں —— میں آج ہلکا پھلکا ہو گیا ہوں۔"

"آفتاب صاحب" کلیم نے اس کے کندھے پر ملائمت سے ہاتھ رکھا۔

"حوصلہ رکھیئے آفتاب صاحب" ڈاکٹر الٰہی نے نرمی سے کہا۔

"آپ نہیں جانتے ڈاکٹر —— آپ نہیں جانتے۔ میں نے کتنا بڑا جرم کیا تھا۔"

کلیم اور ڈاکٹر الٰہی نے ایک دوسرے کو معنی خیز نظروں سے دیکھا۔

"سرکار ——" گامے نے اشارۃً کنایۃً کچھ کہنا چاہا۔ لیکن آفتاب عالم نے اس کی طرف دھیان دینے کی ضرورت ہی نہ سمجھی۔ "میں آج آپ سب کے سامنے اپنے گھناؤنے جرم کا اعتراف کروں گا ڈاکٹر ——"

"سرکار ——" گامے نے پھر ٹوکنا چاہا۔

لیکن آفتاب عالم نے اس کی ایک نہ سنی۔ "انیس برس پہلے جو حادثہ ہوا

تھا۔ وہ حادثہ نہیں تھا ڈاکٹر۔"

"جی" کلیم کے منہ سے نکلا۔ ڈاکٹر الٰہی اور فتو مالی ہمہ تن گوش ہو گئے۔ گاما مضطرب سا نظر آیا۔ اور مفضلا بھی بے چینی سے اسے دیکھنے لگا۔

آفتاب عالم نے آنسوؤں اور ہچکیوں کے درمیان اعترافِ جرم کرتے ہوئے انیس برسوں کی خونی روئداد ان کو سنا دی۔ "میں اس طرح ستر اسی لاکھ کی جائیداد پر قابض ہونا چاہتا تھا۔ لیکن مہ جبین بھابی کی حالت نے میرے سوئے ہوئے ضمیر کو اس طرح جھنجھوڑا۔ کہ میں مسلسل انیس سال اپنی ہی آگ میں جلتا رہا۔"

کلیم ساکت سا کھڑا تھا۔ اور ڈاکٹر الٰہی بھی گنگ تھا۔

"مجھے شائستہ کے پاس لے چلو۔" آفتاب عالم ایک دم اٹھ کھڑا ہوا۔ مجھے اپنی بچی کے قدموں میں گر کر اس بھیانک جرم کی معافی مانگ لینے دو۔"

وہ گرا جا رہا تھا۔ کلیم نے بڑھ کر اسے سہارا دے لیا۔ "آپ حوصلہ رکھیئے آفتاب صاحب۔ جو ہونا تھا ہو چکا۔" ڈاکٹر الٰہی بولا۔ "آپ کی خوش قسمتی ہے۔ جو ناممکن ممکن ہو گیا۔ شائستہ سے مل کر کسی جذباتی کمزوری کا اظہار نہ کیجیئے گا۔"

"وہ پہلے ہی بہت گھبرائی ہوئی ہیں۔" کلیم نے آہستگی سے کہا۔

"میرے دل کی حالت کوئی نہیں سمجھ سکتا۔ کوئی نہیں جان سکتا۔" آفتاب عالم نے دل فگار لہجے میں کہا۔

کلیم اور ڈاکٹر الٰہی اسے سہارا دے کر ثومی کے کمرے میں لے آئے۔ جہاں وہ مضطرباً ٹہل رہی تھی۔

"میری بچی۔" آفتاب عالم کمان سے نکلے ہوئے تیر کی طرح ثومی کی طرف بڑھا۔ اور مجنونانہ انداز میں اسے بازوؤں میں لے کر سینے سے لگاتے ہوئے بچوں کی طرح پھوٹ

پھوٹ کر رو پڑا۔

"میری شائستہ میری بچی!" وہ صرف یہی بڑبڑا رہا تھا۔

ثومی بوکھلا گئی۔ دماغ چکرا رہا تھا۔ کچھ سوچنے سمجھنے کی صلاحیت نہ رہی۔ کلیم کی طرف تڑپتی نظروں سے دیکھ کر صرف اتنا پوچھا۔ "آپ لے آئے بندہ؟"

"مبارک ہو بیٹی" ڈاکٹر الٰہی نے کلیم کے کچھ کہنے سے پہلے ہی کہا۔ "تم۔ تم ثومی نہیں شائستہ ہو۔ اس خاندان کی کھوئی ہوئی بیٹی۔"

"میں؟ ــــ میں ــــ" ثومی تڑپ کر آفتاب عالم کے بازوؤں سے نکلی۔ اس کا کانچ ایسا نازک بدن ڈول رہا تھا۔ اس کی خوبصورت پیشانی پر پسینے کے قطرے تھے۔ ڈاکٹر الٰہی نے آفتاب عالم کو صوفے پر بٹھاتے ہوئے ثومی سے مختصراً ساری بات کہہ دی۔ "بندہ تمہاری اماں ہی کا تھا۔ مالی نے تمہاری امی کو پہچان لیا۔ وہی تمہیں فرید صاحب کے گیٹ کے پیچھے چھپا کر ــــ"

"اُف ــــ" ثومی لہرا گئی۔ کلیم نے جلدی سے بڑھ کر اسے بازو کا سہارا دینا چاہا۔ لیکن ثومی نے صوفے کی پشت پر ہاتھ رکھ کر اپنے کانپتے وجود کو سہارا دیتے ہوئے کلیم سے بیچارگی سے کہا۔ "اگر ــــ اگر یہ سچ ہے۔ تو۔ تو وہ ــــ فرید صاحب۔"

"انہیں کوئی شدید غلط فہمی تھی۔ ورنہ ــــ یہ ثابت ہو گیا ہے۔ کہ تم۔ تم شائستہ ہو ــــ ثومی ــــ" کلیم نے جلدی سے کہا۔ "تم ــــ شائستہ ہو ــــ ثومی ــــ تم شائستہ ہو ــــ ثومی ــــ"

"کیا یہ سچ ہے ــــ؟ کیا یہ سچ ہے ــــ؟" وہ دیوانوں کی طرح چیخی۔

"ہاں بیٹی ــــ" ڈاکٹر الٰہی نے اس کا تھرتھر کانپتا وجود بازو کے سہارے تھام لیا۔ "شک کی کوئی گنجائش نہیں رہی۔ ثابت ہو گیا ہے۔ کہ تم ہی بیگم صاحبہ کی بیٹی شائستہ ہو ــــ"

امّی ــــ!" ثومی کے لبوں پر یہ ترسی ہوئی محبت بھری چیخ نکلی۔ اس پر غشی کی سی کیفیت طاری ہو گئی۔ اس کی تڑپ سے کلیم تڑپ گیا۔ ڈاکٹر الٰہی نے اسے بازو کا سہارا دیئے صوفے پر بٹھا دیا۔ جہاں کئی لمحے وہ غافل سی رہی۔ آفتاب عالم نے اس غافل وجود کو محبت سے بازوؤں میں سمیٹ لیا۔ ڈاکٹر الٰہی اس منظر کو دیکھ کر آبدیدہ ہو گیا۔ اور کلیم نے بھی منہ پھیر لیا۔ یہ رقت بھرا نظارہ دیکھنے کی اس میں تاب ہی نہ رہی تھی۔

گامے نے شائستہ کے یوں ملنے کی خبر حویلی کے ساکنین کو پہنچا دی تھی۔ رشتہ دار نوکر، کارندے سبھی اس کمرے پر ٹوٹ پڑے۔ ہر کوئی اس غیر متوقع لیکن خوش گوار واقعے سے مسرور نظر آ رہا تھا۔ ثومی کو عقیدت بھری نظروں سے دیکھنے کو ہر کوئی بے تاب تھا۔

ثومی اب تک بوکھلائی ہوئی تھی۔ اس پر کئی بار غشی کی سی کیفیت ٹوٹی۔ اتنی بڑی حقیقت پر ایمان لے آنا اس حقیقت سے بھی بڑی بات تھی۔ یقین نہ آ رہا تھا۔ ڈاکٹر الٰہی سارے واقعات پوری تفصیل سے اسے سنا چکا تھا۔ مالی بابا نے بھی ساری کہانی از سرِ نو اسے سنائی تھی۔ دونوں بندے بھی اسے دکھائے گئے تھے نفلے نے بھی پھر اعتراف کیا تھا۔ کلیم نے بھی فرید کے متعلق اس کی غلط فہمی مٹائی تھی۔

کلیم نے اس کے سامنے ہی مالی سے پوچھا تھا۔ "کیا فرید صاحب نے اس عورت کو دیکھا تھا۔ جو ثومی کو گیٹ کے پیچھے ڈال کر بھاگ گئی تھی۔"

مالی نے پورے یقین سے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا تھا۔ "اس وقت فرید صاحب نہ تھے۔ صرف میں نے دیکھا تھا۔"

"فرید صاحب غلط فہمی کا شکار رہے۔" کلیم نے رازداری کے انداز میں آہستگی سے ثومی کو کہا۔ ثومی کے حواس بجا ہو ہو کر مختل ہوئے اور مختل ہو ہو کر بجا ہوتے رہے۔

"کیا یہ سچ ہے؟" وہ بار بار کہہ رہی تھی۔ "کیا میں واقعی شائستہ ہوں۔ مرجبین میری امی ہیں۔"

جذباتی غوطوں کے بعد جب وہ قدرے سنبھلی۔ تو تڑپ کر اٹھی۔ "امی ــــ" وہ ماہیٔ بے آب بن کر مرجبین کے کمرے کی طرف بڑھی۔

اور جب پگلی ماں کے سینے پر برسوں کی بچھڑی بیٹی نے تڑپتے ہوئے سر رکھ کر "امی" پکارا۔ تو ہر آنکھ نم ہو گئی۔ آفتاب عالم کی حالت تو قابلِ رحم تھی۔ ضمیر کی خلش مٹ گئی تھی۔ لیکن اس خلش کا مٹنا بھی تو اک قیامت تھا۔

ــــ ٭ ــــ

حویلی

پر آج رات اک انوکھے نکھار سے اتری۔ صبح امید کی سی چمک والی یہ رات یادگار رات تھی۔ آج ایک مدت کے بعد حویلی کے در و دیوار کے جامد سناٹے ٹوٹے تھے۔ رونق گہما گہمی اور زندگی ایک شان سے بیدار ہو گئی تھی۔ آج کے حسین انکشاف سے جیسے فضا میں نقرئی گھنٹیوں کی مدہوش کن کھنک آپ ہی آپ پیدا ہو گئی تھی۔ جمود ٹوٹ گیا تھا۔ ہر فرد آج کے سہانے واقعے پر نثار نظر آتا تھا۔ ثومی حقیقتاً فرش سے عرش پر جا پہنچی تھی۔ نگاہیں عقیدت و احترام سے بچھی جاتی تھیں۔ پیار و محبت پھوار بن کر برس رہے تھے۔ حویلی کے مکین اسے عقیدت سے سر آنکھوں پر بٹھانے کو بے تاب نظر آ رہے تھے۔

آفتاب عالم کی خوشیوں کا تو ٹھکانہ نہیں تھا۔ بے تاب ہو ہو کر سجدے میں گر رہا تھا۔ تڑپ تڑپ کر مہ جبین کو مبارک باد دے رہا تھا۔ لپٹا لپٹا کر ثومی کو پیار کر رہا تھا۔

ڈاکٹر الٰہی واپس جا چکا تھا۔ حالات کے اس رخ پلٹا کھا جانے سے اسے مہ جبین کے صحت یاب ہونے کی امید بندھ گئی تھی۔ ماضی کے واقعات اک تسلسل اور تواتر سے مہ جبین کے سامنے دہرائے جانے سے اس کا پختہ یقین تھا۔ کہ کسی دن اچانک اس کے حافظے کی ٹوٹی کڑیاں مل جائیں گی۔

ممتا نے تو پاگل پن میں بھی اپنا خون پہچان لیا تھا۔ اب ثومی کی محبت اس کے ذہن کے منتشر رابطوں کو ضرور یک جا کر دے گی۔ ثومی کو اس نے اس سلسلے میں بڑی

لمبی چوڑی ہدایات دیں۔

مالی کو بھی انعام و اکرام سے نوازا گیا۔ وہ خوشی سے پھولا نہ سمایا۔ لدا پھندا شام کو گھر چل دیا۔

کلیم ابھی تک حویلی ہی میں تھا۔ ڈاکٹر الٰہی کے بعد اس نے بھی رخصت چاہی تھی۔ لیکن آفتاب عالم نے بڑی اپنائیت سے اس کا ہاتھ تھام کر اپنے قریب صوفے پر بٹھا لیا۔ اس کے دوسرے ہاتھ ثومی بیٹھی تھی۔

ثومی جو اب ثومی نہیں شائستہ بانو تھی۔

جو اک بے سہارا لڑکی نہیں۔ بے انتہا دولت کی وارث اور خاندان کی عظمت کا نشان تھی۔

آج اس کے چہرے پر محرومی کے سائے نہ تھے۔ سکون، اعتماد اور وقار کے ہالے تھے۔ اس کا چہرہ چمک رہا تھا۔ کسی سنگھار کے بغیر بھی ایسا نکھار تھا کہ نگاہیں خیرہ ہو رہی تھیں۔

وہ ابھی ابھی حویلی کے ساکنین۔ ملازمین اور دیگر افراد سے مل کر آ رہی تھی۔ اک شان افتخار سے بیٹھی وہ شاہزادی سی لگ رہی تھی۔

کلیم بھی اس وقت بڑا پرسکون نظر آ رہا تھا۔ آج ثومی کی سوئی ہوئی تقدیر یک لخت جاگ اٹھی تھی۔ اسے اپنا مقام مل گیا تھا۔ اس کی ذہنی آزمائشوں اور آلائشوں کا دور ختم ہو چکا تھا۔ اس کا پس منظر ایکا ایکی جگمگا اٹھا تھا۔ یہ باتیں باعث تسلی و سکون تھیں۔ یوں بھی آج ثومی نے جذبات کے ہچکولوں میں جس جس طرح کلیم کا سہارا چاہا تھا۔ جس اپنائیت سے اس کا ہاتھ تھاما تھا۔ کلیم کا حوصلہ بڑھ گیا تھا۔ تین دن پہلے جو ثومی سے ملاقات تلخ لمحوں پر ختم ہوئی تھی۔ اس کا اثر زائل ہو چکا تھا۔ لیکن ان سب باتوں کے باوجود اس نے ثومی کو کھل کر مبارک باد کہی تھی نہ آج

کے حسین انکشاف پر اظہارِ مسرت براہِ راست اس سے کیا تھا۔ پچھلے دنوں کی گھٹن تھی۔ جو جھجک بن کر مانع تھی۔

وہ سوچ تو بہت کچھ رہا تھا۔ الفاظ ٹٹول رہا تھا۔ جملے وضع کر رہا تھا۔ لیکن یہ سب تلاطم ذہن ہی میں تھے۔ زبان پر کچھ بھی نہ آسکا۔ کوشش کے باوجود ایک لفظ ہونٹوں پر نہ آسکا۔

اس کے باوجود وہ خوش تھا۔ آج نہیں تو کل۔ کل نہیں تو پرسوں۔ وہ اپنے میں اتنا اعتماد ضرور پالے گا۔ کہ روٹھی ہوئی ثومی کو منا کر دلی مبارک باد پیش کر سکے۔

آفتاب عالم نے اسے اپنے قریب اپنائیت سے بٹھا لیا۔ نو بج رہے تھے۔ اسے گھر جانے کی اس لیے بھی جلدی تھی۔ کہ مالی سرِ شام ہی وہاں پہنچ کر ثومی کے متعلق سب کو بتا چکا ہوگا۔ اسے فرید کا خیال آرہا تھا۔ یقیناً وہ اس منکشف حقیقت سے ہراساں ہوگا۔ انیس برس اس نے بھی تو خلش اور کسک میں گزارے تھے۔ اپنے جرم کی سزا اس نے غلط فہمی کی بنا پر ہی پالی تھی۔ کلیم فرید کی تسکین و تسلی کے لیے اس کے پاس جانا چاہتا تھا۔

آفتاب سرشار سا بیٹھا آج کے عجیب و غریب اتفاق پر سر دھنتے ہوئے ثومی کو اس کے عزیزوں، رشتہ داروں سے متعارف کروا رہا تھا۔

"سب حیرت میں ڈوب جائیں گے۔ کسی کو وہم و گمان بھی نہ ہوگا۔ تمہارے ماموں خالائیں۔ پھوپھیاں، کوئی بھی تو یقین نہ کرے گا۔ کتنی عجیب بات ہے ہے نا ڈاکٹر صاحب ——"

"بالکل۔" کلیم نے گوشۂ چشم سے ثومی کے خوشیوں سے دمکتے چہرے کو دیکھا۔ "تمہارا خاندان اتنا وسیع ہے بیٹی۔ سب اکٹھے ہوں گے تو حیران رہ جاؤ گی۔"

"میں کب ملوں گی سب سے" ثومی کے لہجے میں اشتیاق تھا۔

"آج ہی سب کو اطلاع مل جائے گی۔ حیران کن اطلاع۔ میرے خیال میں صبح ہوتے ہی قریبی عزیز یہاں پہنچنا شروع ہو جائیں گے۔ تم سب سے مل کر بہت خوش ہوگی۔ تمہارے ماموں زاد۔ خالہ زاد، پھوپھی زاد ماشاء اللہ سب لگ بھگ تمہاری عمر ہی کے ہیں۔ ان کی صحبت میں تم بے حد خوش ہوگی۔ خاص کر زاہد۔ عمران اور روحی تم سے یوں گھل مل جائیں گے۔ جیسے برسوں ساتھ رہے ہوں۔"

"زاہد، عمران، روحی۔" ثومی نے آہستہ آہستہ دہرایا۔ "سب نام یاد کرنے پڑیں گے۔ ان سے رشتے بھی رٹنے ہوں گے۔"

"زاہد تمہارے بڑے ماموں کا بیٹا ہے۔ بڑا شریر، بڑا شوخ و شنگ۔ نچلا تو اس سے بیٹھا ہی نہیں جاتا۔ عمران اور روحی تمہاری پھوپھی کے بچے ہیں عمران بڑا سلجھا ہوا نوجوان ہے۔ اور روحی —— خدا بچائے اس شریر سے۔"

کلیم ان باتوں سے نہ جانے کیوں کچھ مضطرب سا ہو گیا۔ بے چینی سے صوفے پر پہلو بدلا۔ ٹانگ پر رکھی ٹانگ ہلاتے جا رہا تھا۔ یہ بات اس کی مضطرب بے چینی کی غماز تھی۔

شاید ثومی نے یہ بات بھانپ لی۔ زیرِ لب مسکرائی۔ اور پھر جان بوجھ کر عمران اور زاہد کے متعلق آفتاب سے پوچھنے لگی۔ ان سے ملنے کا بے تابی سے اظہار کرنے لگی ——

"مجھ سے تو رات گزارنا مشکل ہو جائے گی چچا حضور۔ آپ نے میرے شوق کو اتنا بیتاب کر دیا ہے۔" اس نے جان بوجھ کر کہا۔ اس کا انگ انگ مسکرا رہا تھا۔

"زاہد، عمران، نفیس، سیف، سب سے مل کر کتنی مسرت ہوگی۔ اُف وہ کب طلوع ہوگا۔"

"مجھے اب اجازت دیجئے۔" کلیم ایک دم اٹھ کھڑا ہوا۔

"میاں کچھ دیر اور بیٹھو۔" آفتاب عالم نے اپنائیت سے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ "شاید ہماری باتوں سے تم تنگ آ گئے۔"

"جی نہیں۔" کلیم نے جلدی سے کہا۔ اس نے ایک نگاہ ثومی پر ڈالی۔ جو سر جھکائے بڑے دلفریب انداز میں اپنی مخروطی انگلیوں کے سرے مروڑ رہی تھی۔

"ابھی تو دس بھی نہیں بجے۔" آفتاب عالم نے کہا۔

"اماں منتظر ہوں گی۔" کلیم نے پھر ثومی کو دیکھا۔ بے چین، مضطرب اور بیقرار نگاہوں سے۔ ثومی اسی انداز میں بیٹھی تھی۔ کلیم کے جانے سے جیسے اسے کوئی سروکار ہی نہ تھا۔ کلیم کچھ بجھ سا گیا۔ اس کی خوشیوں کے چہرے دھندلا گئے۔ زاہد عمران لفیس، سیف، یہ سب نام صدائے بازگشت کی طرح ذہن میں بجنے لگے۔

"ہماری پاگل خوشیوں کا تم کیا اندازہ کر سکتے ہو ڈاکٹر۔ مجھے تو اپنی خوش نصیبی پر رشک آ رہا ہے۔" آفتاب عالم نے گرم جوشی سے مصافحہ کرنے کے بعد کلیم کا ہاتھ چھوڑ دیا۔

"ہم سا بھی کوئی خوش نصیب ہو گا ڈاکٹر۔"

"آپ کی خوش قسمتی میں کسے شک ہے آفتاب صاحب۔" کلیم نے آہستگی سے کہا۔ اک بوجھل نگاہ اس نے ثومی پر بھی ڈالی۔ جو اس کی موجودگی کے احساس سے لاتعلق سی بیٹھی تھی۔

"اور میری بیٹی کی خوش قسمتی؟" آفتاب عالم نے پیار سے ثومی کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ اور پھر بوجھل آواز میں بولا:

"کتنی صعوبتیں سہی ہیں میری بچی نے۔ لاکھوں کی مالک اور نوکروں کے گھیرے میں زندگی گزارتی رہی۔"

"وقت جیسا بھی تھا گزر گیا۔" ثومی نے اک ادائے دلربائی سے کہا۔

"مجھے تو صرف اس بات کی خوشی ہے چچا حضور۔ کہ اب۔ اب لوگ مجھے آوارہ لہو کا طعنہ نہ دے سکیں گے۔"

کلیم اس چوٹ سے تڑپ ہی تو گیا۔ مضطربانہ ثومی کی طرف دیکھا۔ وہ بڑے سکون سے آفتاب عالم کے کندھے سے سر لگائے بیٹھی تھی۔

"میری مظلوم بچی۔" آفتاب کی آواز رندھ گئی۔

کلیم وہاں کھڑا نہ رہ سکا۔ دوریاں زمانوں پر محیط نظر آئیں۔ بے چین ہو کر وہ پلٹا۔ اور بغیر کوئی لفظ کہے کمرے سے باہر نکل گیا۔ اس کے اٹھتے قدموں سے ثومی کی مسکراتی نظریں الجھ رہی تھیں۔ وہ خوش تھی۔ اس کا وار کاری پڑا۔ کلیم نے بھی تو حد ہی کر دی تھی۔ ایک لفظ بھی مبارک کا اسے نہ کہا تھا۔ آج ہی تو رنجشیں بھلا کر نیا آغاز کرنے کا موقعہ تھا۔

—— ٭ ——

مالی نے ثومی کے متعلق سب سے پہلے فرید ہی کو بتایا۔ وہ کہیں جانے کو تیار ہو کر برآمدے میں آیا تھا۔ مالی کی نظر اس پر پڑی۔ اپنی دانست میں یہ مژدہ جانفزا تھا۔ جو اس نے فرید کو سنا دیا۔

فرید گنگ، ششدر، حیرت زدہ اسے دیکھتا رہ گیا۔ ثومی کے والدین مل گئے تھے۔ وہ مونا والی کے رئیس کی بیٹی تھی۔ دس پندرہ دن کی تھی۔ جب کھوئی پورے انیس سال دو ماہ بعد اپنے بچھڑے عزیزوں سے ملی تھی۔ مہ جبین بیگم کا کھویا ہوا بندہ ہی سراغ بن گیا۔ یہ سب باتیں فرید نے مالی سے سنیں۔ ہکا بکا اسے دیکھتا رہ گیا۔

"تمہیں یہ سب کس نے کہا۔؟" کئی لمحوں کے سکوت کا سینہ جیسے پھٹ گیا۔ فرید کی بیتابی مالی کیا جانتا؟ — کھل کر آغاز سے انجام تک جتنی کہانی کا اسے علم تھا۔ پھر کہہ سنائی۔

فرید ایسے یقین کر لیتا۔ کہ ثومی بلو کی بیٹی نہیں۔ اس کے انتقام کی آواز نہیں۔ اس کے جرم کی بازگشت نہیں۔

اسے ششدر و پریشان دیکھ کر مالی نے مونا والی کی پرشکوہ حویلی میں منائی جانے والی خوشیوں کا ذکر کرتے ہوئے اپنا انعام و اکرام بھی فرید کو دکھایا۔

فرید اپنے گھومتے ہوئے دماغ کو لیے برآمدے میں پڑی لکین کی کرسی پر بیٹھ گیا۔

"کیا یہ سب سچ ہے۔" اس نے ڈوبتی ابھرتی آواز میں کہا۔

"جی صاحب بالکل سچ۔" مالی نے پُر وثوق آواز میں کہا۔

"تو وہ — بلو — کیا وہ واقعی مر گئی تھی۔" وہ بڑبڑایا۔

"جی؟" فتو نے حیران ہو کر فرید کی طرف دیکھا۔

"کچھ نہیں — کچھ نہیں۔" فرید نے جلدی سے کہا۔

فتو کے کچھ کہنے سے پہلے ہی فریدہ ساتھ والے دروازے سے نکل کر باہر آ گئی۔

"کیا ہوا زیدی — آپ ٹھیک تو ہیں۔" اس نے باپ کے کندھے پر پیار سے ہاتھ رکھ دیا۔ "طبیعت تو خراب نہیں ہو رہی۔"

"کتنی عجیب بات ہے بیٹی — کتنی عجیب بات۔ فتو کہتا ہے۔ ثومی۔" فرید کے منہ سے ڈھنگ کی بات نہ نکل رہی تھی۔

"فتو کہتا ہے۔ ثومی کے والدین مل گئے۔" فریدہ نے استفہامیہ مالی کی طرف دیکھا۔ اس نے ساری بات چند لفظوں میں اس کے گوش گزار کر دی۔

"کیا واقعی؟" وہ بھی حیران رہ گئی۔ فرید کی کرسی کے ہتھے پر بیٹھتے ہوئے وہ مالی کو دیکھنے لگی۔

"ہاں بٹیا — میں وہیں سے آ رہا ہوں۔" مالی نے پھر ثومی کے آج کے حسین حادثے کو دہرا دیا۔

"تم نے اس بندے کا کبھی ذکر تو نہ کیا تھا۔" فریدہ نے کہا وہ ششدر تھی۔

"جی — بس۔" فتو پیلے پیلے دانت نکال کر ہنس دیا۔

"بڑی ہی حیران کن بات ہے —" فریدہ نے کہا "یقین نہیں آتا اس کی بات پر۔ کتنی انہونی سی بات لگتی ہے۔"

"بی بی — یقین کرو۔" فتو نے کہا۔ "میں حویلی ہی سے آ رہا ہوں۔ یہ سب سچ ہے۔"

"ڈاکٹر صاحب کہاں ہیں؟" ان سے پوری تفصیل پتہ چلے گی۔" فریدہ نے حیرانگی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

"ہاں۔ ڈاکٹر صاحب سے پوری بات پتہ چلے گی۔" فریدہ نے سنبھلتے ہوئے کہا

"میں سچ کہہ رہا ہوں جناب۔ ڈاکٹر صاحب ابھی وہیں ہیں۔ وہاں تو وہ خوشیاں منائی جا رہی ہیں۔ کہ بیان نہیں کی جا سکتیں۔"

مالی نے بار بار قسمیں کھائیں۔ اب یقین نہ کرنے کا جواز نہ رہا تھا۔ فریدہ تو ثومی کے والدین کی امارت۔ حویلی کی شان و شوکت کا سن کر حیرت زدہ سی رہ گئی

"ہائے اللہ۔ بیچاری ثومی سے سب کیا سلوک کرتے تھے۔ نوکروں سے بھی بدتر۔ بیچاری نوکروں میں زندگی گزارتی رہی۔ توبہ۔ توبہ۔"

"بیچاری۔" فریدہ نے زیر لب کہا۔

فریدہ یہ انوکھی خبر سلمیٰ کو سنانے وہ رہی اور مالی بھی اپنے کوارٹر کی طرف بڑھا جو بھی سامنے آیا۔ اس نے یہ خوش خبری سنا ڈالی۔

فریدہ وہیں بیٹھا رہا۔ اس کی آنکھوں میں برسوں کے واقعات گھومنے لگے۔ پہاڑ۔ بلو۔ بچہ اور انتقام۔ متحرک فلم کی طرح اس کی نظروں میں گھومنے لگے دونوں ہاتھوں پر سر گرائے وہ سوچ میں ڈوب گیا۔

انیس برس۔ پورے انیس برس اس نے اپنے کیئے کی سزا پائی تھی۔ ایک ایک لمحہ جس سنگین اذیت سے دوچار رہا تھا۔ اس اذیت کا پھیلاؤ اس نے بے طرح محسوس کیا۔

لیکن آج اس خبر سے اسے یوں لگا۔ جیسے عمر قید کا مجرم اچانک رہائی پا گیا ہو۔ فرطِ مسرت سے اس نے چیخنا چاہا۔ لیکن چیخ اس کے حلق ہی میں اٹک گئی۔ فریدہ اور سلمیٰ اس کی طرف آ رہی تھی۔

"کیا واقعی ثومی اپنے والدین سے مل گئی۔" سلمیٰ نے بے صبری سے سوال کیا۔

"تو یہی خبر لایا ہے" آج پہلی بار فریدہ نے ثومی کے ذکر پر سلمیٰ سے پوری جرأت کے ساتھ آنکھیں ملائیں۔

"توبہ۔ توبہ۔ مجھے تو ندامت سے پسینہ آ رہا ہے۔ میں نے تو اس لڑکی سے کبھی بھی اچھا سلوک نہ کیا تھا۔ کیا خبر تھی۔ کہ وہ اتنے عظیم خاندان کی بیٹی ہے۔ اتنے دولت مند لوگ ہیں وہ تو۔"

"ان کی دولت کا کچھ شمار ہی نہیں۔" فریدہ نے کہا۔ "مونا والی کے ان رئیسوں کو کون نہیں جانتا۔"

"مزے ہو گئے ثومی کے۔" فریدہ نے کہا۔ "ویسے ڈیڈی مجھے اس لڑکی میں ہمیشہ ہی اک وقار اور ٹھہراؤ نظر آیا۔ معمولی لڑکی تو ہرگز نہ لگتی تھی۔ کچھ تو تھا اس میں۔"

"اب تو یہی کہے گی۔" سلمیٰ نے مسکرا کر کہا۔

"نہیں ممی۔ سچ کہہ رہی ہوں۔" فریدہ نے کہا۔

تینوں اس عجیب و غریب خبر پر تبصرہ کرتے ہوئے ثومی سے کی ہوئی زیادتیوں پر نادم ہونے لگے۔ سلمیٰ تو دل ہی دل میں سوچ رہی تھی۔

"شکر ہے جو میں نے کبھی فرید کو نہ جتلا دیا۔ ورنہ مجھے تو اکثر یہی شک گزرا کہ وہ فرید کی ناجائز اولاد ہے۔ اُف جو میں کبھی ایسا کہہ دیتی۔ تو آج۔ فرید کے سامنے کیسے سر اٹھاتی۔"

فریدہ بھی نادم نادم سی سوچ میں مبتلا تھی۔ کئی واقعات اس کی نظروں میں گھوم گھوم گئے۔

"میں نے تو اسے ہمیشہ بیٹی ہی سمجھا۔" فریدہ نے ڈوبتے ابھرتے جذبات سے بھرپور

آواز میں کہا۔ "مجھے وہ ــــ ہمیشہ ــ اپنی ہی بچی لگی ــــ"

"ہاں ڈیڈی ــــ آپ اس سے پیار و محبت سے ہی پیش آئے تھے۔ لیکن ممی ــــ تو ــــ" فریدہ نے مسکرا کر ماں کی طرف دیکھا۔

"مجھے کیا پتہ تھا۔" سلمیٰ نے شرمندگی سے ہنستے ہوئے کہا۔

"ہمارے ڈیڈی کتنے نیک دل ہیں۔" فریدہ نے پیار سے باپ کے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔ فرید کی آنکھیں نم سی ہو گئیں۔ اس نے فریدہ کے ہاتھ پدری شفقت سے ہونٹوں سے لگا لیے۔ اس نے کہنا چاہا۔

"میں اتنے اعزاز کے قابل نہیں ہوں بیٹی۔ میں تو بڑا ہی گنہ گار انسان ہوں جو انیس سال اپنے جرم کی آگ میں جھلستا رہا۔" "تمہیں کیا خبر کہ میں کیا ہوں۔"

ثومی کے متعلق جس جس نے بھی سنا دنگ رہ گیا۔ ناقابلِ یقین حقیقت تھی۔ جیران۔ صغرا۔ سانولی۔ جمعہ بار بار یقین چاہ رہی تھیں۔ دھوبی۔ جمعدار۔ خانساماں بھی اس انکشاف پر حیرت زدہ تھے۔ سب بار بار فتو سے ایک ہی بات پوچھ رہے تھے۔ ایک ہی کہانی دہرانے کو کہہ رہے تھے۔

صدیق نے بھی یہ خبر سنی۔ اسے تو سکتہ سا ہو گیا۔

کلیم کی اماں کو بھی فتو نے یہ خوش خبری سنائی۔ سب کی طرح انہیں بھی یقین نہ آیا۔ وہ تو حویلی کی شان و شوکت بھی دیکھ آئی تھیں۔ کیسے مان لیتیں۔ کہ یہ سب کچھ ثومی کا ہے۔

اپنی اپنی جگہ پر کوئی ششدر تھا۔ رات گئے تک چہ می گوئیاں ہوتی رہیں۔ تقدیر کی اس نوازش کا ذکر حیرانگی سے ہوتا رہا۔ کوئی مالی کو جھٹلانے کی کوشش کرتا تو کوئی قدرت کے رحم و کرم کے یوں موج میں آ جانے کا ذکر کرنے لگتا۔ ثومی موضوعِ کلام تھی۔

اماں تو بھاگی بھاگی سلمیٰ کے پاس آئی تھیں۔ حویلی کے رئیسانہ ٹھاٹھ باٹھ کا ذکر کرتے ہوئے ثومی کی تقدیر کے اس سنہری رخ پر حیرانگی اور اچنبھے کا اظہار بھی کر رہی تھیں۔

"کلیم آ جائے تو پوری بات کا پتہ چلے گا۔" وہ بار بار کہہ رہی تھیں۔

اور جب رات کلیم نے آ کر بھی مالی کے بیان کی تصدیق کی۔ تو شک و شبہ نکل گیا۔ سلمیٰ کی ندامتوں میں اور اضافہ ہو گیا۔ اماں بھی اس برے وقت کو کوسنے لگیں جب ثومی پر مصائب توڑے تھے۔

فرید تو بہک بہک گیا۔ رات گئے تک وہ بارگاہِ ایزدی میں سربسجود اپنی لغزشوں کی اس معافی پر چشم نم گڑگڑاتا رہا۔ اس کے ضمیر میں چبھی ہوئی پھانس نکل گئی۔ اس کی روح کا بوجھ اتر گیا۔ اس کے دل کی خلش مٹ گئی۔

آفتاب عالم کی طرح وہ بھی آج اپنے آپ کو ہلکا پھلکا محسوس کر رہا تھا۔ آج وہ کڑی آزمائشوں کے دور سے گزر چکا تھا۔ کش مکش کا عالم ختم ہو گیا تھا۔ بلو کے انتقام کی منزل خاتمے تک آ پہنچی تھی۔

واقعی اس نے ایسا انتقام لیا تھا۔ کہ انیس برس فرید ذہنی کرب میں مبتلا رہا تھا مگر کبھی اپنے ساتھ کی گئی زیادتی کی سزا فرید کو دے ڈالی تھی۔ فرید سر ہاتھوں میں تھامے بار بار یہی سوچ رہا تھا۔ انیس برسوں کے واقعات ذہن میں پھیل رہے تھے۔ رمضانی نے بلو کے مرنے کی صحیح خبر اسے پہنچائی تھی۔ لیکن حالات نے اسے اتنا بوکھلا دیا تھا۔ کہ اسے کبھی اطمینان سے سوچنے کی فرصت ہی نہ ملی تھی۔ اگر بلو ہی بچی پھینک گئی تھی تو انیس برسوں میں ایک دفعہ بھی اس کی ممتا بچی کو دیکھنے کے لیے نہ تڑپی۔ بلو تو کیا اس نے تو ان برسوں میں بلو کا سایہ تک نہ دیکھا تھا۔ کاش وہ رمضانی کی خبر کی تصدیق اسی وقت خود ہی کر لیتا۔ ان انیس برسوں کے ذہنی کرب سے تو بچ جاتا۔ لیکن قدرت کو یہی منظور تھا۔ آج فرید یوں محسوس کر رہا تھا۔ جیسے اس نے بلو کا قرضہ بڑی محنت اور ریاضت سے چکا دیا ہو۔ اس نے آج پورے خلوص سے بلو کی مغفرت کی دعا کی۔

کے ضمیر کی پھانس نکل گئی تھی۔ خلش مٹ گئی تھی اور اک طویل اندھیری رات کے بعد جگمگاتی ہوئی صبح طلوع ہوئی تھی۔

لیکن یوں لگتا تھا جیسے کلیم کے ساتھ معاملہ الٹ ہوا ہے۔ پھانس۔ خلش اور کسک اس کا مقدر بن گئی تھیں۔ اور روشن روشن صبح رات کے گھمبیر اندھیروں میں ڈوب گئی تھی۔

ثومی اس سے ناراض تھی۔ تین دن پہلے اسے منا لینے کی کوشش ناکام ہو گئی تھی۔ وہ دل برداشتہ سا ہو گیا تھا۔ لیکن آج اس کی امیدیں پھر جاگ اٹھی تھیں۔ ثومی نے بندے کے ذکر پر جس جس اضطراب اور والہانہ وارفتگی کا اظہار کیا تھا۔ اور اس نے جس اذیت اور بے چین تڑپ کا کلیم کا ہاتھ پکڑ کر مظاہرہ کیا تھا۔ خفگی کے باوجود کلیم سے یوں باتیں کی تھیں۔ جیسے یہاں اس کا کلیم کے سوا اور کوئی تھا ہی نہیں۔ یہ سب جذباتی مظاہرہ کلیم کے لیے خوش آئند تھا۔ ثومی کو منا لینے کا تصور جاندار ہو گیا تھا۔

اور پھر اس عجیب و غریب انکشاف۔ اس حسین اتفاق اور واقعات کے اس خوش گوار پلٹے کے بعد ثومی کی بہکی بہکی خوشیوں میں بھی کلیم کو اپنا وجود اپنی ذات اجنبی سی لگی تھی۔ ناراضگی کا احساس ضرور تھا اور یہی جھجک بن گئی تھی۔ لیکن اس کے باوجود اب ثومی اسے ازل کا سرا نہ لگ رہی تھی۔ وہ دل ہی دل میں اسے منا کر اپنا لینے کی سوچ رہا تھا۔

لیکن ــــ رات جب ہنگامہ کچھ سکون پذیر ہوا تو جذباتی مظاہرے ٹھہراؤ میں آ گئے۔ تو کلیم کو احساس ہوا۔ کہ ثومی وہ روشن ستارہ ہے جسے دیکھا تو جا سکتا ہے چھو

لینے کی خواہش عبث ہوتی ہے وہ اپنے مقام پر پہنچ گئی تھی۔

اور اب کلیم کا مقام اس کے مقام سے صدیوں کے پھیلاؤ پر تھا۔

مضطرب، بے چین اور نڈھال ہو کر وہ آج کے واقعے کے بارے میں بار بار سوچ رہا تھا۔ تھا کیا؟ اور ہو کیا گیا تھا؟ اس کا ذہن جھٹکے کھا رہا تھا۔ ثومی کے نوجوان۔ مالدار بے فکرے رشتہ دار ــــ زاہد عمران، نفیس سیف دیکھے بغیر بھی وہ انہیں دیکھ رہا تھا۔ بے چینی۔ تڑپ رہی تھی۔ ثومی کے الفاظ کانوں میں بوند بوند آگ کی طرح تڑپ رہے تھے۔ "لوگ مجھے آوارہ لہو کا طعنہ نہ دیں گے۔" لفظ لوگ میں جتنی اجنبیت، جتنی غیریت تھی۔ کلیم اچھی طرح محسوس کر رہا تھا۔

رات ظلمتیں بکھیر بکھیر کر نڈھال ہو گئی۔ کلیم نے کپڑے تبدیل کیے نہ بوٹ اتارے کبھی اٹھا اٹھ کر ٹہلا۔ کبھی کروٹیں بدل بدل کر لیٹا۔ قرار تقدیر سے حرفِ غلط کی طرح مٹ گیا تھا۔ پریشانیاں بڑھتی گئیں۔ اضطراب پھیلتا گیا۔ سینے میں ہوک سی دم توڑتی رہی۔ درد کی کیفیتیں الجھاؤ کا باعث بنتی گئیں۔

دو بج چکے تھے۔ رات بھی شاید سو چکی تھی۔ اک سناٹا تھا۔ جو ماحول پر چھایا تھا یہ سناٹا کلیم کی روح میں مسلسل اتر رہا تھا۔ گھبرا کر وہ اٹھا۔ بوٹوں کے تسمے کھولے کپڑے تبدیل کیے۔ اور اپنی بے چین اور دکھتی پریشانیوں کو سینے سے لگا کر کلینک میں گیا۔ سو نرل پلز ہی اس کے گھمبیر اور ٹھہرے ہوئے دکھ کا مداوا تھیں۔

گولیاں کھا کر وہ بستر میں لیٹ گیا۔

صبح دو دفعہ نتھوا اور تین دفعہ اماں نے اسے بیدار کرنا چاہا۔ لیکن وہ غنودگی میں ڈوبا اوں آں کر کے کروٹ بدل کر سو گیا۔

اور دس بجے کے بعد جب اماں متفکر سی ہو کر اس کے کمرے میں گئیں۔ تو وہ اپنی خوبصورت بوجھل آنکھوں کو کھولتے، بند کرتے تکیے کے نیچے سے اپنی گھڑی نکال

کو وقت دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ دس بج جانے کا یقین نہ آ رہا تھا۔

"آج اتنی نیند" اماں نے اسے بیدار ہوتے دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا۔

وہ بستر میں اٹھ بیٹھا۔ اس کا سارا جسم تھپ تھپا سا ہو رہا تھا۔

"ہسپتال نہیں جانا آج" اماں نے پھر کہا۔

اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔

"کیوں؟"

"آج طبیعت کچھ ٹھیک نہیں۔"

"اتنی دیر جو پڑے سوتے رہے۔ طبیعت تو بوجھل ہو گی ہی۔ چائے پی لو۔"

"نتھو سے کہئے لے آئے۔"

کلیم نے کہا اور بستر سے اتر کر پاؤں میں چپل اڑسے۔ غسلخانے کی طرف جاتے ہوئے بولا۔ "نتھو سے کہیں تیز گرم چائے لائے۔"

چائے کا گھونٹ گھونٹ حلق سے اتارتے ہوئے اسے کل کے واقعے کی تلخی کا احساس پھر شدت سے ہونے لگا۔ اماں آج بیحد خوش تھیں۔ ثومی کی زندگی کے خوش گوار پلٹے نے انہیں سکون کی بے پناہ دولت سے مالا مال کر دیا تھا۔ گو وہ ذہنی طور پر اسے پہلے ہی قبول کر چکی تھیں۔ حویلی اس کے پاس ہو آنا۔ اس قبولیت کی کھلی دلیل تھا۔ لیکن آج کی خوشی کا تو اپنا ہی رنگ تھا۔ ثومی نشاط انگیز مستقبل کا تصور بن کر ان کے ذہن پہ چھائی ہوئی تھی۔

وہ بار بار ثومی کا ذکر کر رہی تھیں۔ اس کے والدین سے یوں مل جانے کو اس کی بہت بڑی خوش بختی قرار دے رہی تھیں۔ اس کی خوشیوں کا پوچھ رہی تھیں۔ اس کے تاثرات معلوم کرنے کو باتیں کر رہی تھیں۔ کلیم یونہی ہوں ہاں کر رہا تھا۔ لیکن جب اماں نے حویلی کے رئیسانہ ٹھاٹھ باٹھ کا ذکر کیا۔ تو کلیم نے چونک کر اماں

کو دیکھا۔

"آپ نے حویلی کب دیکھی۔؟"

"میں وہاں گئی تھی۔" اماں اعتماد سے مسکرائیں۔

"آپ وہاں گئی تھیں؟"

"ہاں۔"

"کس لیے؟"

"ثومی سے ملنے۔"

"اوہ۔ آپ!"

"کیوں۔"

کلیم بے چین ہو کر اماں کو دیکھنے لگا۔

"یہ تو اچھا ہی ہوا۔ جو اس انکشاف سے پہلے ہی میں ثومی سے اپنی غلطیوں کی تلافی کے لیے ہو آئی۔ ورنہ اب جاتی تو وہ یقیناً یہی سمجھتی۔ کہ میں اس کی مالی اور خاندانی حیثیت سے مرعوب ہو کر آئی ہوں۔"

"اب جانے کی قطعاً ضرورت نہیں۔" کلیم نے مضطرب ہو کر اماں کی طرف دیکھا۔

"کیوں بھلا۔" اماں نے بڑے اعتماد سے اس کی طرف دیکھا۔ "اب تو میں پورے اعتماد اور وقار سے اس کے پاس جاؤں گی۔"

"اماں!"

"لگتا ہے وہ تم سے اب تک ناراض ہے۔" اماں مسکرائیں۔ "اب فکر نہ کرو۔ میں سارا معاملہ خود ہی سمیٹ لوں گی۔"

"اُف۔ اماں آپ خدا کے لیے ثومی کے متعلق کسی خوش فہمی میں مبتلا نہ ہوں۔ وہ اب مالی کی لے پالک نہیں۔ اک رئیس کی بیٹی ہے۔"

"یہ تو خوشی کی بات ہے۔"

"اماں ——!!"

وہ کچھ کہنے ہی کو تھا۔ کہ سلمیٰ اور فریدہ آگئیں۔ دونوں ثومی ہی کا ذکر کرنے لگیں۔ فریدہ تو اسے اس نوابانہ ماحول میں دیکھنے کو بے چین نظر آ رہی تھی۔ کلیم کو دل پہ پتھر رکھ کر وہی باتیں کرنا پڑیں جن سے وہ گریز چاہ رہا تھا۔

رات ثومی کی نیند بھی اڑی ہوئی تھی۔ کیا سے کیا ہو گیا تھا؟ زندگی یوں بھی پلٹ سکتی تھی ——؟ عمر بھر کا وسوسہ اور دھڑکا یوں آناً فاناً مٹ کر اتنا سہانا بدل مل گیا تھا۔ یقیناً وہ دنیا کی خوش قسمت ترین لڑکی تھی۔ لیکن جوں جوں رات بھیگتی گئی۔ یہ باتیں اس کے ذہن سے محو ہوتی گئیں۔

کلیم اور صرف کلیم کا خیال دل و دماغ پر مسلط رہا۔ اپنی والہانہ بے تابیوں کا بھی خیال آیا۔ عالمِ وارفتگی میں اس نے بڑی اپنائیت سے کلیم کا ہاتھ پکڑ کر سر اس پر ٹکا دیا تھا۔ اس سے باتیں بھی یوں کی تھیں۔ جیسے اس کا مونس، غمگسار وہی اور صرف وہی ہے —— لیکن ان سب باتوں کے باوجود اسے کلیم کے تکلفانہ برتاؤ پر غصہ آ رہا تھا۔ اس نے کیوں اسے منا نہ لیا تھا؟ مبارک باد تک نہ کہی تھی؟ پچھلی باتوں کو یاد رکھنے کا جواز ہی کیا تھا اب؟

اب تو اس کا خون آوارہ نہیں تھا! اس طعنے کی اب وقعت ہی کیا رہی تھی!

ثومی، ماضی اور حال کے تلخ و شیریں تجربات کی روشنی میں کلیم کی شخصیت کو پرکھتی رہی۔ یقیناً وہ عظیم تھا۔ اس کا پیار، اس کا عشق اس کی زندگی کا کلیم ہی تھا زندگی نے آج اسے اتنا کچھ دے ڈالا تھا۔ کہ دامنِ مراد تنگ نظر آتا تھا۔ لیکن مسرتوں کی اس فراوانی میں بھی اسے محسوس ہو رہا تھا۔ کہ اس کی زندگی کی سب سے بڑی حقیقت اور سب سے ارفع خوشی صرف کلیم ہی ہے۔

آج تک وہ کلیم سے روٹھی ہوئی تھی۔ اس ظالم رات کلیم کے بہیمانہ رویے کی کوفت کو بھلا نہ پاتی تھی۔ کلیم کا یہ جرم اس کے اعتراف کے باوجود معاف کرنے کو تیار نہ تھی۔ اپنی آگ میں آپ ہی جل رہی تھی۔ لیکن کلیم سے پھر ناطہ استوار کرنے سے توہینِ انا محسوس ہوتی تھی۔

لیکن آج! —— آج —— ان سب باتوں کی وقعت رہی تھی نہ اہمیت۔ اس کا پس منظر گھناؤنا نہیں تھا۔ اس کی رگوں کا لہو آوارہ نہیں تھا۔ آج وہ پورے اعتماد پورے وقار اور پوری شان کے ساتھ سر اٹھا سکتی تھی۔ اس خوشی میں اس نے کلیم کی خطا بھی بخش دی تھی۔ اس کی بے تاب خوشیاں تو آج کلیم کے سینے سے لگ کر تسکین پانے کو مچل اٹھی تھیں۔

لیکن کلیم کو نہ جانے کیا ہو گیا تھا۔ چپ ہی سادھ لی تھی۔ رات اس کے جاتے جاتے اس نے مسکرا کر طنز کا تیر بھی چلایا تھا۔ "لوگ مجھے آوارہ لہو کا طعنہ نہ دے سکیں گے۔" کہہ کر اس نے کلیم کو چھیڑا تھا۔ لیکن ردِ عمل اس کی توقع کے خلاف ہوا تھا۔ وہ معذرت خواہ نظروں میں چھلکتی محبت لے کر اسے دیکھنے کی بجائے تیزی سے کمرے سے نکل گیا تھا۔

ثومی من ہی من میں کلیم سے روٹھ گئی۔ اسے ستانے تڑپانے کا منصوبہ بنانے لگی۔ اور دوسری شام جب کلیم آیا تو وہ اپنے اس منصوبے کو عملی جامہ پہنانے پہ کمربستہ تھی۔

کلیم گھنٹہ بھر کے تذبذب کے بعد یہاں آیا تھا۔ آنکھوں سے پریشانی مترشح تھی۔ آج حویلی میں کسی میلے کا گمان ہو رہا تھا۔ ثومی کے عزیز و اقارب اس غیر متوقع لیکن خوش گوار واقعے کا سنتے ہی اٹھ دوڑے تھے۔ رنگ برنگے لباس۔ کھنکتے قہقہے ابلتی خوشیاں آج حویلی کا مقدر جگا رہی تھیں۔

کلیم مغلئی طرز کے آراستہ پیراستہ برآمدے سے گزر رہا تھا۔ ثومی نے اسے دور سے آتے دیکھ لیا تھا۔ وہ دائیں ہاتھ کی خوبصورت بارہ دری میں اپنے نوجوان عزیزوں میں گھری بیٹھی تھی۔ حسین لڑکیاں اور خوب رو نوجوان بے تکلفی سے باتیں کر رہے تھے۔ قہقہے اڑا رہے تھے۔ ثومی کی قلقل کرتی ہنسی کھنک رہی تھی۔ وہ خوبصورت ریشمی لباس میں کوئی آفاقی مخلوق لگ رہی تھی۔

کلیم نے اسے دیکھا۔ اس سے زیادہ اس سے بے تکلفانہ گفت و گو کرتے خوبرو نوجوانوں کو دیکھا۔ ثومی ازلی کا سرا محسوس ہوئی۔ بل کھاتے درد کو سینے میں دبائے شاید وہ پلٹ جاتا۔ لیکن آفتاب عالم ادھر آنکلا۔ اس کا ہاتھ اپنائیت اور بے تکلفی سے تھام کر اپنی نشست گاہ میں لے گیا۔ جہاں اس کے خاندانی عزیز جمع تھے۔

آفتاب عالم نے کلیم کا تعارف زاہد عمران، نفیس اور سیف سے بھی کروایا۔ بے فکرے دولت مند جو دولت کے علاوہ لیاقت میں بھی بے مثال تھے۔ اخلاق میں بھی یکتا نظر آتے تھے۔ کلیم ان کی خوبیوں کا معترف ہونے کے باوجود ان سے کھل نہ سکا۔

ثومی اس کی پریشانی بھانپ بھانپ کر مسکراتی رہی۔ اور امکانی حد تک جتنی بھی بے تکلفی ان سے ممکن تھی، جتلاتی رہی۔

کلیم کے سینے میں اٹھتی ہوک اس کے چہرے پر پریشان تاثرات سے ظاہر تھی۔ وہ مراجعین کے پاس بھی گھنٹہ بھر بیٹھا ڈاکٹر الٰہی کی ہدایات کے مطابق خورشید عالم کی تصویر کے متعلق اس سے باتیں کرتا رہا۔ لیکن باتوں کے دوران وہ بہک بہک گیا۔ باہر سے ابلنے والے قہقہوں میں اس کی ساری ہستی تھرتھرا جاتی تھی۔

اگلے دن وہ حویلی نہ گیا۔ تو ثومی بے چین ہو گئی۔

اور تیسرے دن تو اس کے نہ آنے سے ثومی کا انتظار اذیت دہ ہو گیا۔ دل ڈوب ڈوب ہی تو گیا۔ اپنا منصوبہ اپنی ہی اذیت و پریشانی کا باعث بن گیا۔ کلیم اس کے صبر کو یوں آزمائے گا۔ یہ تو اسے خیال ہی نہ آیا تھا۔

رات اضطراب اتنا بڑھا۔ کہ اس نے جھجکتے جھجکتے آفتاب عالم سے پوچھ ہی لیا "ڈاکٹر صاحب کیوں نہیں آ رہے ——"

"میں نے کل بھی فون کیا تھا آج بھی۔" آفتاب عالم نے ثومی کے معصوم چہرے پر مقدس پیار کی لپٹیں دیکھ کر شفقت سے کہا۔ "شام میں خود بھی ان کے ہاں گیا تھا۔" ثومی نے نگاہ اٹھا کر اسے دیکھا۔ اور پھر مضطرب ہو کر سر جھکا لیا۔

"وہ دس دن کی چھٹی لے کر کہیں باہر چلے گئے ہیں۔" آفتاب عالم نے کہا۔

"اور —— امی ——" ثومی بے تاب ہو کر بولی۔

"ڈاکٹر الٰہی کے سپرد کر دیا ہے سارا کام۔ ڈاکٹر عرفان بھی دیکھ بھال کریں گے۔"

ثومی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ خاموش نگاہوں نے دلی کیفیت اگل دی۔ دلی کیفیت جو پگھلے ہوئے درد کے سوا اور کچھ نہ تھی۔

ثومی کمرے سے باہر نکل گئی۔ آفتاب مسکراتے ہوئے آج کلیم کی اماں سے ملنے اور ان کے جھجک جھجک کر کلیم کا رشتہ ثومی سے استوار کرنے کا کہنے کے بارے میں سوچنے لگا۔ کلیم اسے بھی بے حد پسند تھا۔ اور کوئی وجہ نہ تھی۔ جو وہ دونوں کے ملاپ کا وسیلہ نہ بن جاتا۔ جشن کی رات وہ دونوں کے ازلی بندھن کا اعلان بھی کرنے کا سوچ رہا تھا۔

——

آج جشن کی رات تھی۔ حویلی جگمگاتی روشنیوں سے بقعۂ نور بنی تھی۔ رنگ و نور کا سیلاب تھا۔ جو ہر طرف سے امنڈ رہا تھا۔ اک مترنم سا شور تھا جس میں قہقہے اور ہنسی مدغم ہو رہی تھی۔

جشن ہال کی سجاوٹ دید کے قابل تھی۔ آج برسوں بعد اس ہال میں زندگی نے ایسی سرور کن کروٹ لی تھی۔ سکوت و جمود کی کائی جو برسوں سے جمی تھی اب لہراتی روشنیوں اور مدھر نغموں کی دلفریب لہروں سے چاٹی جا چکی تھی۔ ایک سحر انگیز ماحول تھا۔ اک طلسماتی نظارہ تھا۔

آج ثومی کے حسن جہاں سوز کی تاب کوئی آنکھ نہ لا رہی تھی۔ اس نے انتہائی خوبصورت لباس پہن رکھا تھا۔ خاندانی زیورات اسے [illegible] گئے تھے۔ مشاق ہاتھوں نے اس کے حسن کو قاتل بنایا تھا۔ آج ثومی عزیزوں، رشتہ داروں کی آنکھوں کا تارا بنی تھی۔ اس کی اہمیت مانی جا رہی تھی۔ لیکن اس مسرور ہنگامے میں بھی اس کے حسین چہرے پر افسردگی کے سائے تھے۔ آنکھوں میں بار بار نمی آ رہی تھی۔ دل کے کچھ گوشے بے طرح دکھ رہے تھے۔ بھری محفل میں بھی تنہائی کا احساس ڈس رہا تھا۔ جس جان تمنا کو دیکھنے اور پانے کی تڑپ تھی۔ وہ کہیں نظر نہ آ رہا تھا۔

کلیم دس دن کی آوارہ گردی کے بعد آج ہی گھر واپس آیا تھا۔ روح کو سکون آشنا کرنے گیا تھا۔ لیکن اور بھی ناآشنا کر کے لوٹا تھا۔ اماں کو جشن مسرت میں شرکت کی تیاری کرتے دیکھ کر وہ بے چین ہو گیا تھا۔ فرید کے ہاں بھی سب اس عظیم الشان اجتماع

میں شرکت کو تیار ہو رہے تھے۔ ثومی کے لیے بیش قیمت تحائف خریدے گئے تھے۔ اپنی زیادتیوں کا ازالہ ہر کوئی شاید اس طرح کرنا چاہتا تھا۔

اماں نے کلیم سے بھی تیار ہونے کو کہا۔ سلمیٰ بھی آ گئی۔ فریدہ نے بھی جشن میں بلاوے کا ذکر کیا۔ کلیم کو جشن میں شریک ہونا ہی پڑا۔ وہ اپنے آپ کو تماشا بنانا نہیں چاہتا تھا۔ اپنی سبکی ابھی اسے منظور نہ تھی۔ اجنبیوں کی طرح اس نے بھی جشن میں شرکت کرنا ہی تھی۔

دل مضطر کو بہلاوے دیتے جب وہ جشن ہال میں پہنچا۔ تو تقریب عروج پر تھی۔ ماہر فن رقاصہ روحی حاضرین پر سحر کی سی کیفیت طاری کر رہی تھی۔ مشہور گلوکار راحیل اپنی آواز کا جادو جگا رہا تھا۔

جگمگاتی تخت نما مسند پر ثومی مہ جبین کے پہلو میں بیٹھی کسی ملک کی نوعمر ملکہ دکھائی دے رہی تھی۔ کلیم نے اسے دیکھا۔ اپنی محرومی کا احساس کچھ شدید ہو گیا۔

آج وہ واقعی روشن ستارہ تھی۔

روشن ستارہ!

جسے دیکھا تو جا سکتا ہے لیکن چھوا نہیں جا سکتا۔

ثومی نے بھی اسے دیکھ لیا۔ خوشیوں کی یلغار کے سامنے وہ بے قابو سی ہو کر مہ جبین سے لپٹ گئی۔ محفل کا جیسے رنگ ہی بدل گیا۔ افسردگی کے سائے چھٹ گئے۔ اور دل کے مجروح گوشے جو اب تک بے طرح دکھ رہے تھے۔ فتحیابی کے احساس سے بھر گئے۔ اس کے ہونٹوں پر قاتلانہ تبسم لہرانے لگا۔ اس کی آنکھوں میں مسرتوں کی جوت پھوٹنے لگی۔ اور جب خوشیوں کے یہ جذبے کچھ سکون پذیر ہوئے۔ تو اسے اس بیدرد محبوب پر غصہ آنے لگا۔ اس بے رحم جفا کار کو اس کا دل کوسنے لگا۔

کلیم کے دل کا اضطراب یہاں آ کر بے طرح بڑھ گیا۔ ہجوم میں دم گھٹنے لگا۔

مسرتوں کے نغمے کانوں میں سیال آگ بن کر اترنے لگے۔ کبھی یہاں بیٹھا۔ کبھی وہاں اٹھ کر گیا۔ طبیعت کی بے کلی نہ گئی۔

اماں آفتاب عالم سے سر جوڑے خدا جانے کیا باتیں کر رہی تھیں۔ کلیم کی ذہنی کوفت انہیں یوں مصروفِ تکلم دیکھ کر اور بڑھ گئی۔ بیدردی سے سگریٹ پر سگریٹ پھونکتا چلا گیا۔ طبیعت پھر بھی نہ سنبھلی۔ اداسی کا تاثر بڑھتا چلا گیا ـــــ دل گھبرانے لگا۔

ثومی اب مسند سے اٹھ کر مہمانوں میں آ گئی تھی۔ اس کے نوجوان رشتہ دار اسے گھیرے ہوئے تھے۔ کسی سے تعارف ہو رہا تھا۔ کسی سے باتیں۔ آج اس کا عم زادہ نواب آصف بھی اس سے ملا تھا۔ حسین و خوبرو نوجوان جس کے قہقہوں میں بے فکری کی بشاشت تھی۔ کلیم کے ذہن میں پھانس بن رہا تھا۔ ثومی سے بے تکلفی اس کا شاید خاندانی حق تھا۔ لیکن کلیم کی برداشت اب جواب دے گئی۔ وہ خاموشی سے اٹھ کر جشن ہال سے باہر چلا گیا۔ وسیع و عریض چمنوں کی طوالتیں بے قراری سے ماپتا ہوا بیدردی سے سگریٹ پھونکتا چلا گیا۔ اپنے جلنے کا تماشا دیکھنے کو بھی حوصلہ درکار تھا۔ اب جلنے کا تماشا دیکھنے کو بھی حوصلہ درکار تھا۔ اب وہ حوصلہ کھو چکا تھا۔

وہ اس پرجوش ہنگامے سے دور چلا جانا چاہتا تھا۔ محرابی دروں والے برآمدوں سے ہوتا ہوا ـــــ وہ جشن ہال کے پچھلی طرف نکل گیا۔ یہاں نسبتاً سکون تھا۔ برآمدے کی مرمریں جالی سے ٹیک لگائے ہوئے اس نے احمریں ستون کے ساتھ سر ٹکا دیا۔ گہرے گہرے دکھے دکھے سانس لیتے ہوئے وہ کتنی ہی دیر آنکھیں بند کیے وہاں کھڑا رہا۔ بند آنکھوں سے بھی وہ نواب آصف کی وجیہہ شخصیت کو دیکھ رہا تھا۔ اچانک ـــــ بالکل اچانک اسے کچھ جانی پہچانی سی مہک، کچھ مانوس سی کپڑوں

کی سرسراہٹ محسوس ہوئی۔ اس نے ایک دم آنکھیں کھول دیں۔

اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی۔ جذبۂ دل کی کشش کا یہ عالم۔

ثومی سامنے والے دروازے میں کھڑی اسے ہی دیکھ رہی تھی۔

نظروں سے نظروں کا ملنا قیامت بن گیا۔ اس قیامت کو سہہ جانے کی ہمت ثومی میں نہ رہی۔ آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔ اس نے واپس لوٹ جانے کو قدم اٹھایا۔

اک جھٹکے سے کلیم مرمریں ستون سے الگ ہو کر آگے بڑھا۔ دل کے تقاضے مچل اٹھے۔ جذبات تڑپے۔ تیزی سے وہ ثومی کی طرف بڑھا۔ جو کمرے میں داخل ہو چکی تھی۔

"ثومی ـ" اس نے بے اختیار ہو کر اسے پکارا۔ وہ اس کی پشت پر آ گیا تھا۔ ثومی کچھ نہیں بولی۔ آنکھوں کی نمی کو آنکھوں ہی میں جذب کرنے کی کوشش کرنے لگی۔ کلیم چند ثانیے خاموشی سے ثومی کی پشت پر نظریں جمائے کھڑا رہا۔ پھر اس کا اضطراب پھیل گیا۔

"ثومی ـ" اس نے بڑے گھمبیر اور دل گرفتہ لہجے میں کہا۔

"شاید تمہیں اس بے تکلفی سے مخاطب کرنے کا مجھے اب کوئی حق نہیں ـ" قدرے رک کر اس نے دل سوز لہجے میں کہا۔ "لیکن ـــ"

ثومی بے تاب ہو کر کسمسائی۔

"تمہیں آج کی خوشیاں مبارک ہوں ـ" کلیم نے سر جھکا کر ہاتھ بے قراری سے مسلتے ہوئے اجنبی لہجے میں کہا۔

"اس مسرور موقعے میں اپنی حرماں نصیبی کا ذکر کرنا تو نہیں چاہتا۔ لیکن ـــ دل میں یہ خلش ضرور ہے کہ میں ـــ اپنی بے گناہی ـــ ثابت نہ کر سکا۔"

ثومی اس کی آواز کے ڈوب جانے سے تڑپ اٹھی بے چین ہو کر اس نے اپنے

کانچ ایسے نازک بدن کو ہلکا سا جھٹکا دے کر رخ موڑا۔

"میں — نادم ہوں۔" کلیم نے اس کے خوبصورت چہرے کو دیکھ کر نگاہیں جھکاتے ہوئے کہا۔

"میں — اب یہاں — نہیں آؤں گا۔ میری اس رات کی بہیمانہ کوتاہی کو معاف کر دینا —"

نگاہیں جھکائے جھکائے وہ مڑا۔ واپس لوٹ جانے کو اس نے تیزی سے قدم اٹھایا۔ لیکن وہ ابھی دروازے تک بھی نہ پہنچ پایا تھا۔ کہ ثومی کی چیخ نما آواز پہ پلٹ پڑا۔

"کلیم —" ثومی دونوں ہاتھوں کو مٹھی کی صورت میں الجھا کر سینے سے لگائے بند آنکھوں کی لرزتی پلکوں پر آنسوؤں کے قطرے لیے کانپتے ہونٹوں سے اسے پکار رہی تھی۔

کلیم کچھ بھی تو نہ سمجھ سکا۔ ثومی لہرائی۔ تو اس نے لپک کر اسے اپنے بازوؤں میں تھام لیا۔

"کلیم" وہ بے اختیار ہو کر اس کے سینے میں منہ چھپا کر سسک اٹھی۔

"ثومی" کلیم کے بازوؤں کی گرفت شکنجہ بن گئی۔

ثومی تڑپ کر اس کے کشادہ سینے میں سما جانے کو مچل گئی۔

"ثومی" کلیم کے لبوں سے سرگوشی پھسل گئی۔ اس نے اپنے بازوؤں میں اپنی زندگی کی حسین ترین متاع کو سمیٹ لیا۔

یہ

سب کچھ

اتنا ایکا ایکی اور ایسا اچانک ہوا۔ کہ وہ بالکل بوکھلا گیا۔ ثومی کو چپ کرانے

کو ایک لفظ زبان سے نکال سکا۔ نہ اس کے بہتے آنسو ہی خشک کر سکا۔

ہاں اس کے تنومند بازوؤں کی گرفت تنگ سے تنگ تر ہوتی گئی۔ اور اس کا چہرہ ثومی کے بالوں کی گھنیری چھاؤں میں گم ہوتا گیا۔

اور

جب

کئی لمحوں کی طلسماتی گرفت کے بعد جب مدہوشیوں کو ہوش آیا تو کلیم نے چھاتی سے لگی ثومی کا چہرہ ایک ہاتھ کی انگلیوں سے قدرے اونچا کرتے ہوئے اس کی خوبصورت جھلملاتی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے دھیرے سے کہا۔

"کہیں یہ خواب تو نہیں ثومی — کیا تم نے واقعی مجھے معاف کر دیا۔"

"بے درد کہیں کے" ثومی کے بھیگے ہونٹوں پہ یہ جملہ تھرک گیا۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ اور آنسو اس کے گلابی گالوں پہ پھیلنے لگے۔

"بے درد میں! — یا تم —" کلیم نے اس کی ٹھوڑی کو پیار سے ہلایا۔

"آپ" ثومی نے اس کی ٹائی جھنجھوڑتے ہوئے اپنا سر اس کے سینے پہ پٹخ دیا۔

"میری جان! —" کلیم نے بے صبری سے اسے بازوؤں میں دبوچتے ہوئے کہا۔ ثومی کو اپنے سینے کی وسعتوں میں سمو لینے کی اس نے مجنونانہ سی کوشش کی۔ اور جنوں کی بے خودی کے ان لمحوں میں دونوں یوں کھڑے رہے۔ کہ دو وجودوں کو الگ الگ نام دینے کی گنجائش نہ رہی۔

رضیہ بٹ

فرح۔ وزیر آباد

(سلطان احمد خوش نویس گجرات ۱۹۷۳ء)